فتاویٰ حقانیہ
۵
از افادات
شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ
و دیگر مفتیانِ کرام دارالعلوم حقانیہ
نگرانی و اہتمام
حضرت مولانا سمیع الحق صاحب مہتمم جامعہ حقانیہ
ترتیب
مفتی مختار اللہ حقانی
ناشر
جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک

وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْبِطُوْنَهٗ (الآیۃ)

جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کے نصف صدی سال کے فتاوی کا مجموعہ

فتاوی حقانیہ

جلد پنجم

افادات

شیخ الحدیث مولانا عبدالحق و دیگر مفتیانِ کرام

جامعہ دارالعلوم حقانیہ

نگرانی واہتمام

مولانا سمیع الحق مہتمم و استاذِ حدیث

جامعہ دارالعلوم حقانیہ

ترتیب: مفتی مختار اللہ حقانی

شائع کردہ جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک نوشہرہ پاکستان

نام کتاب .... فتاویٰ حقانیہ (جلد پنجم)

افادات .... شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ
بانی جامعہ دارالعلوم حقانیہ ودیگر مفتیان کرام جامعہ ہذا

نگرانی واہتمام .... شیخ الحدیث حضرت مولانا سمیع الحق صاحب، مہتمم جامعہ ہذا

ترتیب .... مولانا مفتی مختار اللہ حقانی استاذ شعبہ التخصص فی الفقہ والافتاء

ضخامت ۵۵۰صفحات

تاریخ طبع ہفتم ۱۴۳۱ھ/۲۰۱۰ء

طابع .... مکتبہ سید احمد شہید اکوڑہ خٹک
Mob:0300-4572899

ناشر .... جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک ضلع نوشہرہ

فہرست مضامین جلد پنجم

باب المساجد

کتاب الحدود والتعزیرات

کتاب الجہاد

كتاب
النفقات
والأيمان
والنذر

لينفق ذو سعة من سعته

ومن قدر عليه رزقه

فلينفق مماآ أته الله

↑↓
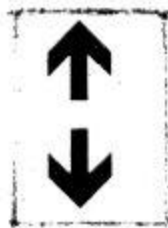
من حلف كاذباً

ادخله الله النار.

کتاب النفقات

(خرچہ کے احکام و مسائل)

بیوی کا علاج کرانا خاوند پر لازم نہیں

سوال:۔ زید کی بیوی کافی عرصہ سے بیمار تھی اُس کے والدین بخوشی علاج کی غرض سے اپنے گھر لے گئے اور وہاں اس کا علاج معالجہ کرایا گیا، کچھ عرصہ بعد عورت کے والدین نے زید سے علاج معالجہ پر خرچ ہونے والی رقم کا مطالبہ کیا، تو کیا ان کا یہ مطالبہ درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ بیوی کا علاج معالجہ کرانا بہر حال خاوند پر واجب نہیں البتہ مروت کے باب میں علاج کرانا مناسب ہے۔

لما قال العلامة ابن الھمام رحمه الله: ولقائل ان یقول علیھا کاجرة الطبیب الخ

(فتح القدیر ج ۴ ص۲۰۰ باب النفقة۔کتاب النکاح) [1]

والدین کے نان ونفقہ کا حکم

سوال:۔ والدین کا نان ونفقہ اولاد پر واجب ہے یا نہیں؟ نیز اگر اولاد تنگدست ہو تو پھر بھی اسے والدین کے نفقہ کے لیے مجبور کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ والدین اگر خود غنی ہوں تو اولاد کو ان کے اخراجات برداشت کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا چاہے اولاد خوشحال ہی کیوں نہ ہو، لیکن جب والدین کا متبادل بندوبست نہ ہو تو ان کے اخراجات کی ذمہ داری بالغ اولاد پر عائد ہوتی ہے تاہم اگر اولاد خود تنگدست ہو تو اُسے اس کے لیے مجبور کرنا بھی مناسب نہیں۔

لما قال العلامة ابن نجیمؒ: (ولابویه واجداده وجداته لو فقراء) ای تجب

---

[1] قال العلامة ابن نجیمؒ: وقید بالنفقة لان المداواة لاتجب علیه اصلاً۔ (البحر الرائق ج۴ ص۱۸۲ باب النفقة)

ومثلهٗ فی الھندیة ج۱ ص۵۴۹ کتاب النکاح۔الباب النفقة۔

النفقة لهٰولاء...... واطلق فی الابن ولم یقید فی الغنی مع انہٗ مقید بہ لما فی شرح الطحاوی ولا یجبر الابن علی نفقة للابوین المعسرین اذا کان معسرًا۔
(البحر الرائق ج ۴ ص ۲۰۵ باب النفقة ۔ کتاب النکاح) لہ

بالغ اولاد کے نفقہ کا حکم

سوال:۔ بالغ اولاد کے اخراجات کی ذمہ داری والد پر عائد ہوتی ہے یا وہ اپنے اخراجات کی خود ذمہ دار ہوتی ہے؟

الجواب:۔ اولاد جب تک نابالغ ہو تو اس کے جملہ اخراجات کی ذمہ داری والد پر عائد ہوتی ہے، یہاں تک کہ اگر والد فقیر ہو تو پھر بھی اس کو اپنی ذمہ داری نبھانا ضروری ہے، البتہ جب بچے بالغ ہو جائیں تو ان کی ذمہ داری والد سے اٹھ جاتی ہے لیکن بچیوں کا خرچہ ان کی شادی ہونے تک والد ہی برداشت کرے گا۔

لما قال العلامة ابن نجیمؒ: وقید بالعجز عن الکسب وھو بالانوثة مطلقاً...... فلا یعتبر فی الانثی الا الفقر۔ (البحر الرائق ج۴ ص۲۱ باب النفقة) ۲ لہ

عدت کے دوران بیوہ کے اخراجات کا حکم

سوال:۔ خاوند کی وفات کے بعد اس کی بیوہ کے عدت کے دوران اخراجات کون برداشت کرے گا؟

الجواب:۔ کسی شخص کی وفات سے اس کے ترکہ میں جملہ شرعی ورثاء کے حقوق ثابت ہو جاتے ہیں، اسی طرح خاوند کی وفات کے بعد اس کے ترکہ میں ثمن (آٹھواں حصہ) یا ربع

لہ لما قال شیخ الاسلام برھان الدین المرغینانیؒ: وعلی الرجل الموسر ان ینفق علی ابویہ واجدادہ وجداتہ اذا کانوا فقراء وان خالفوہ فی الدین۔
(الھدایة ج۲ ص۴۲۴ باب النفقة۔کتاب النکاح)
وَمِثْلُہٗ فی الھندیة ج ۱ ص۵۸۳ کتاب النکاح ۔ الباب فی النفقة۔

۲ لہ لما قال العلامة ابن ھمامؒ: والاولاد کبارًا ماناث..... فللاناث علیہ نفقتھن الی ان یتزوجن اذا لم یکن لھن مالٌ ۔ (فتح القدیر ج۴ ص۲۱۶ باب النفقة)
وَمِثْلُہٗ فی الھندیة ج ۱ ص۵۸۳ کتاب النکاح ۔ الباب فی النفقة۔

دیچوتھا حصہ ہے کے علاوہ اخراجات کے نام سے کچھ زائد لینے کی عورت مجاز نہیں اور نہ ہی دیگر ورثاء پر اس کے اخراجات کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، عورت خاوند کے ترکہ سے اپنا حصہ لے کر عدت کے دوران گذارہ کرے گی، اگر اس سے اُس کے اخراجات پورے نہ ہوسکتے ہوں اور محارم میں سے کوئی بھی اس کے اخراجات برداشت کرنے کے لیے تیار نہ ہو تو پھر وہ ہاتھ کی کمائی سے گذارہ کرے گی۔

لما قال العلامة ابن نجیمؒ: (قوله لا للموت .....) ای لا تجب النفقة لمعتدة الموت۔ (البحر الرائق ج۴ ص۳۰۰ کتاب النکاح۔ باب النفقة) [۱]

چھوٹے بچوں کا نفقہ باپ پر واجب ہے

سوال :۔ ایک شخص کی بیوی کے بطن سے دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے اگر وہ اسے طلاق دے دے تو ان بچوں کا خرچہ باپ کے ذمہ ہوگا یا ماں کے؟

الجواب :۔ بچوں کا جب اپنا مال نہ ہو تو ان کا نفقہ باپ پر واجب ہے خواہ یہ بچے باپ کے گھر میں رہ رہے ہوں یا میاں بیوی میں جدائی کی صورت میں والدہ کے ساتھ رہائش پذیر ہوں۔

لما قال العلامة طاہر بن عبد الرشید البخاریؒ: نفقة البنت البالغة یجب کالصغیرة وکل علیه اذا لم یکن للصغیر مال۔

(خلاصة الفتاوی ج۲ ص۶۳ کتاب النکاح۔ فصل فی النفقة) [۲]

والدین کے گھر رہنے کی صورت میں نفقہ کا حکم

سوال :۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر ایک شخص کی بیوی اس کی رضامندی سے اپنے والدین کے گھر رہتی ہو تو کیا شوہر کو اس کے

---

[۱] قال العلامة برهان الدین المرغینانیؒ: ولا نفقة للمتوفی عنها زوجها۔ (فتح القدیر ج۴ ص۲۱۴ باب النفقة)

[۲] قال العلامة قاضیخانؒ: نفقة الاولاد الصغار والاناث المعسرات علی الاب لا یشارکه فیها احد ولا یسقط بفقره۔ (الخانیة علی هامش الهندیة ج۱ ص۴۴۵ فصل فی النفقة) ومثله فی الهندیة ج۱ ص۵۶۰ کتاب النکاح۔ باب النفقة۔

اخراجات برداشت کرنے پڑیں گے یا اس کے والدین کو؟

الجواب:۔ خاوند کی اجازت سے والدین کے گھر جانا عورت کے لیے مرخص ہے اس لیے اگر کوئی عورت اپنے خاوند کی اجازت سے والدین کے گھر رہے تو اس کے اخراجات خاوند کے ذمہ ہوں گے، گویا عورت کے محض والدین کے گھر رہنے سے خاوند اخراجات کی ذمہ داری سے فارغ نہیں ہوسکتا جب تک یہ عورت ناشزہ (نافرمان) نہ ہو۔

لما قال العلامة علاؤالدین الحصکفیؒ: فتجب للزوجة علی زوجها (ولو ھی فی بیت ابیھا) اذا لم یطالبھا الزوج بالنقلة بہ یفتی۔

(الدر المختار شرح تنویر الابصار ج ۳ ص ۵۷۵ باب النفقة) [1]

معذور اولاد کے نفقہ کا حکم

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین کہ بچہ جب بالغ ہوجائے لیکن معذور یعنی نابینا ہو اور اپنے اخراجات پورے کرنے سے قاصر ہو تو اس کا خرچہ باپ پر واجب ہے یا اس کے بالغ ہونے کے ساتھ ہی باپ کی ذمہ داری ساقط ہوجاتی ہے۔

الجواب:۔ اگر کسی کا بچہ معذور ہو تو بالغ ہوجانے کے باوجود اس کا نفقہ باپ سے ساقط نہیں ہوتا، جب تک والد زندہ ہو تو یہ اس کی ذمہ داری ہے کہ معذور بچے کے اخراجات پورے کرے ورنہ بصورتِ دیگر دوسرے ورثاء پر بقدر الارث یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

لما قال العلامة ابن الھمامؒ: والذکور اما عاجزون عن الکسب لزمانة وعمی اوشلل اوذھاب عقل فعلیہ نفقتھم۔ (فتح القدیر ج ۴ ص ۲۱۷ باب النفقة) [2]

---

[1] قال العلامة قاضی خانؒ: الناشزة لا نفقة لھا وھی التی خرجت عن منزل الزوج بغیر حق۔ (الخانیة علی ھامش الھندیة ج ۱ ص ۴۲۶ باب النفقة)
وَمِثْلُہٗ فی الھندیة ج ۱ ص ۵۴۴ باب النفقة۔

[2] قال العلامة ابن نجیمؒ: وحکم ولد الکبیر الزمن اوالانثیٰ مطلقاً کالصغیر لما سیأتی۔ (البحر الرائق ج ۴ ص ۱۹۶ باب النفقة۔ کتاب النکاح)
وَمِثْلُہٗ فی الھندیة ج ۱ ص ۵۶۳ کتاب النکاح۔ باب النفقة۔

ناراضگی کے ایام کا نفقہ شوہر کے ذمہ نہیں

سوال:۔ اگر کوئی عورت خاوند سے ناراض ہو کر کئی سال تک والدین کے ہاں رہے اور بعد میں عدالت میں ناراضگی کے ایام کے نفقہ کی دعو یداری کر دے تو کیا یہ عورت گذشتہ ایام کے نفقہ کی حقدار ہے یا نہیں جبکہ زیادتی شوہر کی طرف سے ہو؟

الجواب:۔ غلطی شوہر کی ہو یا بیوی کی اگر عورت ناراض ہو کر اپنے والدین کے گھر چلی جائے تو ناراضگی کے زمانہ کا نفقہ خاوند کے ذمہ واجب نہیں تاہم اگر قاضی بیوی کے حق میں فیصلہ کرے کہ شوہر بیوی کو اتنا نفقہ سالانہ یا ماہانہ ادا کرے گا لیکن بعد القضاء بھی اگر خاوند نفقہ نہ دے تو اس صورت میں یعنی قضاء کے بعد والے ایام کا نفقہ خاوند کے ذمے واجب الاداء ہے جو قرض شمار ہو گا۔

لما قال العلامة قاضیخانؒ: لا تطالب بنفقة ما مضی من الزمان قبل الفرض لانا عندنا لا تصیر النفقة دیناً الا بالقضاء۔ (فتاویٰ الخانیة علیٰ هامش الهندیة ج۱ ص۴۳۰ باب النفقة) [۱]

نافرمان عورت کا خرچہ خاوند کے ذمہ واجب نہیں

سوال:۔ اگر ایک عورت بلاوجہ خاوند کے گھر سے چلی جائے اور بار بار بلانے کے باوجود خاوند کے گھر نہ آئے تو اس کا نفقہ خاوند کے ذمہ رہے گا یا نہیں؟

الجواب:۔ عورت کا بلاوجہ خاوند کے گھر سے چلے جانا اور بلانے کے باوجود نہ آنا نشوز کے حکم میں ہے، ایسی ناشزہ (نافرمان) عورت کا نفقہ خاوند کے ذمہ واجب نہیں، جب تک عورت نافرمانی ترک کر کے خاوند کے گھر نہ آجائے اس وقت تک وہ خاوند سے خرچہ کا مطالبہ نہیں کر سکتی۔

قال المرغینانیؒ: وان نشزت فلا نفقة لها حتی تعود الی منزله۔ (الهدایة ج۲ ص۴۱۶ باب النفقة) [۲]

---

[۱] قال العلامة ابن همامؒ: واذا مضت مدة لم ینفق الزوج علیها وطالبته بذلك فلا شیٔ لها الا ان یکون القاضی فرض لها النفقة۔ (فتح القدیر ج۴ ص۲۰۵ باب النفقة)
وَمِثْلُهٗ فی الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۳ ص۵۹۳ باب النفقة۔

[۲] قال العلامة الحصکفیؒ: لا نفقة لاحد عشر (وعد منها) وخارجة من بیته بغیر حق وهی الناشزة۔ (الدر المختار علیٰ هامش رد المحتار ج۲ ص۶۰۲ باب النفقة)
وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج۱ ص۵۴۵ الباب السابع عشر فی النفقات الفصل الاول فی نفقة الزوج۔

ناچاقی کے باوجود شوہر پر اہل وعیال کا خرچہ لازم ہے

سوال:۔ گھریلو ناچاقی کی وجہ سے زید نے اپنے اہل وعیال پر نفقہ بند کردیا اب اس کی بیوی کو کیا کرنا چاہیئے؟

الجواب:۔ شوہر کے ذمے اہل وعیال کا خرچہ شرعاً لازم ہے اگر وہ کسی وجہ سے خرچہ دینے میں ٹال مٹول سے کام لیتا ہو تو اس کو بذریعہ جرگہ وغیرہ خرچہ دینے پر مجبور کیا جائے یا پھر وہ طلاق دے کر بیوی کو فارغ کردے، بلاعذر شرعی اہل وعیال کا خرچہ بند کرنا جائز نہیں۔

قال العلامة الحصکفی رحمة الله علیه: ویجب لو فات الامساك بالمعروف۔

(الدر المختار علیٰ ہامش ردّ المحتار جلد۲ ص۵۷۲ کتاب الطلاق)[1]

نامرد شوہر پر بیوی کا نفقہ لازم ہے

سوال:۔ اگر شوہر عنین (نامرد) ہو اور وظیفہ زوجیت ادا کرنے پر قادر نہ ہو تو ایسے شخص کی بیوی کا نفقہ کس کے ذمے ہے؟

الجواب:۔ چونکہ یہ عورت اس شخص کے لیے محبوس ہے، اس لیے کہ دونوں کا نکاح ہوچکا ہے تو بیوی کا خرچہ اس کے ذمے لازم ہے اگرچہ وہ وطی کرنے پر قادر نہ ہو۔

قال العلامة الحصکفی رحمه الله: فتجب للزوجة بنکاح صحیح ۔الخ علیٰ زوجها لانها جزاء الاحتباس ۔ (الدر المختار علیٰ ہامش ردّ المحتار ج ۲ ص۶۹۹ باب النفقة)[2]

---

[1] قال الامام ابوزهرةؒ: لقوله تعالیٰ: (ولا تمسکوهن ضرارًا لتعتدوا) وقوله تعالیٰ: (فامساك بمعروف او تسریح باحسانٍ) وان الواقع عدم الانفاق ضرارٌ۔ وامساك بغیر معروف، وکان حقًا علیه ان یطلق زوجته ۔ ولما لم یقم بذلك وقد تعین علیه قام القاضی مقامه فیه ۔ (الاحوال الشخصیة ص۳۴۹ باب اللعان ۔ التفریق لعدم الانفاق)

وَمِثْلُهٗ فی فتاوٰی دار العلوم دیوبند ج۱۱ ص۱۱۳ باب النفقة ۔

[2] قال العلامة ابوبکر المرغینانی رحمه الله: النفقة واجبةٌ للزوجة علیٰ زوجها مسلمة کانت او کافرةً اذا سلمت نفسها الیٰ منزله فعلیه نفقتها وکسوتها وسکناها الخ ۔

(الهدایة ج۲ ص۴۱۳ کتاب الطلاق، باب النفقة)

وَمِثْلُهٗ فی بدائع الصنائع ج۴ ص۱۵ کتاب النفقة ۔

فاحشہ اور بدکردار بیوی کے نفقہ کا حکم

سوال:۔ اگر کسی شخص کی بیوی بدچلن اور بدکردار ہو اور شوہر کے بار بار منع کرنے کے باوجود بھی بدچلنی سے باز نہیں آتی ہو مگر رہتی شوہر کے ساتھ اسکے گھر میں ہو تو کیا ایسی عورت کا نفقہ بھی شوہر پر لازم ہوگا؟

الجواب:۔ جو کوئی جس کی وجہ سے محبوس ہو اُس کا خرچہ بھی اُسی کے ذمے لازم ہے، چونکہ صورتِ مسئولہ میں یہ عورت باوجود اپنی بدکرداری اور بدچلنی کے شوہر کے لیے محبوس ہے اس لیے شوہر پر اس کا نفقہ لازم ہے۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ : فتجب للزوجۃ بنکاح صحیح ...... علیٰ زوجها لانها جزاء الاحتباس ۔ (الدر المختار علیٰ هامش ردّ المختار ج۲ ص۶۹۹ باب النفقۃ) [۱]

خاوند سے ناراض ہو کر باپ کے گھر گذارے ہوئے سالوں کا نفقہ خاوند کے ذمہ واجب نہیں

سوال:۔ ایک عورت خاوند سے ناراض ہو کر کئی سال اپنے والدین کے گھر رہی، اب جرگہ (پنچایت) والے میاں بیوی کے درمیان فیصلہ (راضی نامہ) کرانا چاہتے ہیں لیکن عورت والدین کے گھر گذارے ہوئے سالوں کے خرچے کا مطالبہ کرتی ہے، کیا شرعاً شوہر کے ذمے ان گذشتہ سالوں کا خرچہ لازم ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ فقہی ذخائر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا صورت میں ان سالوں کا خرچہ شوہر کے ذمے واجب نہیں اس لیے عورت مذکورہ کا یہ مطالبہ ناقابلِ قبول ہے تاہم اگر شوہر بخوشی یہ خرچہ دینا چاہے تو دے سکتا ہے، اس میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامۃ علاؤالدین الحصکفی رحمہ اللہ :۔ والنفقۃ لا تصیر دینا

---

[۱] قال العلامۃ قاضی خان رحمہ اللہ : واما نفقۃ المرأۃ فمقابلۃ بالاحتباس وقد احتبست بحق الزوج فکان لها النفقۃ علی الزوج ۔ (الخانیۃ علیٰ هامش الهندیۃ ج۱ ص۴۲۵ باب النفقۃ)

ومثلہ فی الهدایۃ ج۲ ص۴۱۵ باب النفقۃ ۔ هکذا فی مجمع الانهر ج۲ ص۴۹۲ باب النفقۃ)

الا بالقضاء او الرضاء۔ (الدر المختار علیٰ ہامش ردّ المحتار ج ۲ ص ۷۱۵ باب النفقۃ) لہ

چھوٹے بچے کا نفقہ باپ کے ذمّے ہے

سوال:۔ ایک شخص نے اپنی بیوی کو طلاق دیدی ہے جبکہ اس کا ایک چھوٹا بچّہ ماں کے پاس ہے، تو کیا اُس بچے کا خرچہ باپ کے ذمّے ہے یا نہیں؟ جبکہ بچے کا باپ خرچہ دینے سے انکار کرتا ہے؟

الجواب:۔ شریعتِ مقدّسہ نے اگرچہ سات سال تک بچے کی پرورش کا حق عورت (ماں) کو دیا ہے، صورتِ مسئولہ میں اس بچے کا خرچہ باپ کے ذمّہ ہوگا، باپ حقِ حضانت کی وجہ سے بچے کے نفقہ سے بری نہیں ہوگا اور اس کا انکار درست نہیں ہے۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ:۔ وتجب النفقۃ بانواعہا علی الحر لطفلہ یعم الانثیٰ والجمع۔ (الدر المختار علیٰ ہامش ردّ المحتار ج ۲ ص ۷۲۸ باب النفقۃ) ۲ہ

زچہ بچہ کا خرچہ شوہر کے ذمّے ہے

سوال:۔ بچے کی ولادت کے وقت زچہ خانے میں عورت پر جو خرچہ ہو تو اسکی دائیگی شوہر کے ذمّے لازم ہے یا عورت کے والدین کے ذمّے ہے؟

الجواب:۔ چونکہ شرعاً یہ بچہ شوہر کا ہے لہٰذا اس کی پیدائش پر جو خرچہ ہوگا وہ بھی اسی کے ذمّے لازم ہوگا۔

قال المرغینانیؒ: ونفقۃ الاولاد الصغار علی الاب لایشارکہ فیہا احد کما لایشارکہ فی نفقۃ الزوجۃ۔ (الہدایۃ ج ۲ ص ۴۲۰ باب النفقۃ) ۳ہ

لہ قال المرغینانیؒ: واذا مضت مدۃ لم ینفق الزوج علیہا وطالبتہ بذلک فلاشئ لہا الا ان یکون القاضی فرض لہا النفقۃ او صالحت الزوج علی مقدار نفقتہا فیقضی لہا بنفقۃ ما مضی۔ (الہدایۃ ج ۲ ص ۴۲۰ باب النفقۃ)
ومثلہ فی مجمع الانہر باب النفقۃ ج ۲ ص ۴۹۹ باب النفقۃ۔

۲ہ قال المفتی عزیز الرحمٰنؒ: نفقۂ صغیر بذمہ پدر است، حسبِ عرف نفقہ از پدر گرفتہ شود وتا ہفت سال نزد حاضنہ اُمّ یا اُمّ الاُمّ یا غیر اوشاں بماند۔ (فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ج ۱۱ ص ۱۱۸ باب النفقۃ)
ومثلہ فی شرح الوقایۃ ج ۲ ص ۱۸ باب النفقۃ۔

۳ہ قال العلامۃ قاضیخانؒ: نفقۃ الاولاد الصغار والاناث المعسرات علی الاب لایشارکہ فی ذلک احد۔
(فتاویٰ الخانیۃ علیٰ ہامش الہندیۃ ج ۱ ص ۴۴۵ فصل فی نفقۃ الاولاد)
ومثلہ فی الہندیۃ ج ۱ ص ۵۶۰ الفصل الرابع فی نفقۃ الاولاد۔

نادار والدین کا نفقہ اولاد پر لازمی ہے

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! میں بوڑھا اور نادار شخص ہوں جبکہ میرے دو بیٹے صاحب ثروت (مالدار) ہیں، کیا میرا نان و نفقہ ان کے ذمے ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ماں باپ جب محتاج ہوں اور ان کے پاس زندگی گذارنے کے لیے کوئی ذریعہ آمدن نہ ہو تو ان کا نان و نفقہ اولاد پر لازم ہے، اگر اولاد ادا نہ کرتی ہو تو گنہگار ہوگی۔

قال العلامة الحصکفیؒ: وتجب علی موسر الخ النفقة لاصوله الفقراء۔

(الدر المختار علی ہامش ردّ المحتار جلد ۲ ص۶۳۶ باب النفقة) [۱]

باپ کی وفات کے بعد بچے کے نفقہ کا حکم

سوال:۔ اگر کسی بچے کا باپ فوت ہو جائے اور وہ خود کمانے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو تو اس بچے کا خرچہ ماں کے ذمے ہے یا کسی اور کے؟

الجواب: جس بچے کی حالتِ صغر میں اس کا باپ فوت ہو جائے اور وہ بچہ خود کمانے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو تو اس کا جملہ خرچہ اس کی ماں کے ذمے لازم ہوگا۔

قال العلامہ ابن عابدینؒ: وھی اولی بالتحمل من سائر الاقارب۔

(ردّ المحتار ج۲ ص۹۲۲ باب النفقة) [۲]

---

[۱] قال العلامة برهان الدین المرغینانی رحمه الله: وعلی الرجل ان ینفق علی ابویه واجداده وجداته اذا کانوا فقراء وان خالفوه فی دینه۔

(الهداية ج ۲ ص۴۲۴ باب النفقة)

وَمِثْلُهٗ فی معین القضاة والمفتین ص۸۵ مادة ع۴۹۵ الفصل الثالث عشر فی احکام النفقة۔

[۲] وفی الهندية: الامّ اولی بالتحمل من سائر الاقارب حتی لو کانت الام معسرًا والأمّ موسرة وللصغیر جدّ موسر تؤمر الأمّ بالانفاق من مال نفسها۔ (الفتاوی الهندية ج ۱ ص۵۶۲ باب النفقة)

وَمِثْلُهٗ فی فتاوی الخانية علی هامش الهندية ج ۱ ص۴۴۷ باب النفقة۔ کتاب الطلاق۔

کتاب الأیمان والنّذر

(قسم اور نذر کے احکام و مسائل)

یمینِ منعقدہ کا حکم

سوال: ایک لڑکی کے والد نے قسم کھائی کہ میں فلاں شخص کے نکاح میں اپنی لڑکی نہیں دوں گا۔ اب فریقین کی آپس میں صلح ہو گئی ہے البتہ قسم کا معاملہ باقی ہے، اب اگر یہ آدمی (لڑکی کا والد) اُس شخص کے نکاح میں اپنی لڑکی دیدے تو اُس پر کیا لازم آئے گا؟

الجواب: اگر لڑکی کے والد نے یوں قسم کھائی ہو کہ میں فلاں شخص کے نکاح میں اپنی لڑکی نہیں دوں گا تو عقدِ نکاح کر دینے سے حانث ہو گا جس کے بدلے میں کفارہ لازم آئے گا۔ تاہم اگر لڑکی بالغ ہو تو وہ والد کے کسی دخل کے بغیر اس شخص سے نکاح کر سکتی ہے اور اس سے اُس کا والد حانث نہیں ہو گا۔

قال العلامة الحصکفیؒ: (و) ثالثها (منعقدة وهی حلفه علیٰ مستقبل (آت) الخ ... (و) هذا القسم (فی الکفّارة) الخ ... فقط الخ ... ان حنث۔ (الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۳ ص۵۲ کتاب الایمان) [1]

حلال اشیاء کو اپنے اوپر حرام کرنے کا حکم

سوال: اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں نے فلاں فلاں کام نہ کیا تو تمام حلال چیزیں مجھ پر حرام ہوں گی، تو اس شخص کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟ کیا اس سے قسم منعقد ہو گی یا نہیں؟ اگر منعقد ہو گی تو اس کا کفّارہ کس وقت ادا کیا جائے گا؟

الجواب: صورتِ مذکورہ میں یہ شخص موت سے قبل وہ جائز کام کرے تو حنث سے بچ جائے گا، تاہم اگر پوری زندگی معہودہ جائز کام کرنے سے یہ شخص قاصر رہے تو زندگی کی آخری گھڑیوں میں حانث متصوّر ہو گا جس کی وجہ سے اس کے ورثاء پر کفّارہ ادا کرنا ہو گا۔ تمام

---

[1] قال العلامة ابو البرکات النسفیؒ: وعلیٰ آت منعقد وفیه الکفّارة فقط۔ (کنز الدقائق ص۱۶۴ کتاب الایمان) ومثله فی الهندیة ج۲ ص۵۲ کتاب الایمان۔ الباب الاوّل۔

حلال چیزوں کے عموم کو دیکھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ بیوی بھی اس وقت طلاقِ بائن سے جدا ہوگی۔

قال العلامة الحصکفیؒ: (کل حل) او حلال اللہ او حلال المسلمین (علیّ حرام) زاد الکمال او الحرام یلزمنی ونحوہ (فھو علی الطعام والشراب) ولکن (الفتوٰی فی زماننا (علی انہ تبین امرأتہ الخ۔ (الدر المختار علیٰ ہامش رد المحتار ج ۳ ص ۶۵ کتاب الایمان)[1]

اگر فلاں کام کروں تو کافر ہو جاؤں یمین ھے یا نھیں؟

سوال:۔ایک شخص نے یوں قسم کھائی کہ اگر میں نے فلاں کام کیا تو کافر ہوں گا۔اب اگر وہ اس کام کو کرے تو اس کے عقیدے پر کیا اثر پڑتا ہے؟

الجواب:۔اگر یہ شخص بے علم ہو اور یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ ایسی قسم سے حانث کافر ہو جاتا ہے تو یہ حنث کی صورت میں کافر ہو جائے گا، بصورتِ دیگر کافر تو نہ ہوگا بلکہ حانث ہو کر کفارہ لازم آئے گا۔

لما فی الھندیۃ: ولو قال ان فعل کذا فھو یھودی أو نصرانی أو مجوسی أو بریٔ من الاسلام أو کافر أو یعبد من دون اللہ أو یعبد الصلیب او نحو ذلک مما یکون اعتقاد کفر فھو یمین استحساناً کذا فی البدائع فی لو فعل ذلک الفعل یلزمہ الکفارۃ وھل یصیر کافراً اختلف المشائخ فیہ قال شمس الائمۃ السرخسیؒ والمختار للفتوٰی انہ کان عندہ انہ یکفر متیٰ أتی بھذا الشرط ومع ھذا أتی یصیر کافراً لرضاء بالکفر وکفارتہ أن یقول لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ وان عندہ انہ اذا أتی بھذا الشرط لا یصیر کافراً لا یکفر وھذا اذا حلف بھذا الالفاظ علیٰ أمر فی المستقبل وأما اذا حلف بھذہ الالفاظ علی أمر فی الماضی بان قال ھو یھودی أو نصرانی أو مجوسی ان فعل کذا أمس وھو یعلم انہ قد کان فعل أنہ

---

[1] قال العلامۃ ابوالبرکات عبداللہ بن احمد بن محمود النسفیؒ: کل حل علیّ حرام علی الطعام والشراب والفتوٰی علیٰ انہ تبین امرأتہ بلا نیۃ۔ (کنز الدقائق ص ۱۶۶ کتاب الایمان)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج ۲ ص ۵۵، ۵۶ کتاب الایمان۔ الباب الثانی۔ الفصل الاوّل۔

لا یلزمه الکفارة عندنا لانه یمین غموس وهل یصیر کافراً اختلف المشائخ فیه قال شمس الائمة السرخسی والمختار الفتوی انه کان عنده ان هذا یمین ولا یکفر متی حلف به لا یکفر وان عنده انه یکفر متی حلف به یکفر رضاه بالکفر۔ (الفتاوی الهندیة ج ۲ ص ۵۴ کتاب الایمان، الباب الثانی) ۱؎

قرآن مجید کی قسم کھانے کا حکم

سوال:۔ قرآن پاک کی قسم کھانا کیسا ہے؟ کیا اس سے قسم ہوجائے گی یا نہیں؟

الجواب:۔ چونکہ قسم کا دارومدار عرف پر ہوتا ہے اس لیے متأخرین ارباب فتویٰ نے عرف کی بناء پر قرآن کریم کی قسم کھانے کو الفاظِ یمین سے شمار کیا ہے۔

قال العلامة الحصکفی رحمه الله: قال الکمال ولا یخفی ان الحلف بالقرآن الآن متعارف فیکون یمینا واما الحلف بکلام الله فیدور مع العرف۔ وقال العینی وعندی ان المصحف یمین لا سیما فی زماننا وعند الثلاثة المصحف والقرآن وکلام الله یمین۔ (الدر المختار علی هامش رد المحتار ج ۲ ص ۵۱، ۵۲ کتاب الایمان) ۲؎

۱؎ قال العلامة الحصکفی رحمه الله: (و) القسم بقوله (ان فعل کذا فهو) یهودی او نصرانی او فاشهدوا علی بالنصرانیة او شریك الکفار او (کافر) فیکفر بحنثه لو فی المستقبل اما الماضی عالما بخلافه فغموس واختلف فی کفره (و) الاصح ان الحالف (لم یکفر) سواء (علقه بماض او آت ان کان عنده) فی اعتقاده انه (یمین وان) جاهلا و عنده انه یکفر فی الحلف بالغموس وبمباشرة الشرط فی المستقبل (یکفر فیها لرضاه بالکفر)۔ (الدر المختار علی هامش ردّ المحتار ج ۳ ص ۵۹ کتاب الایمان)

وَمِثْلُهٗ فی خلاصة الفتاوی ج ۳ ص ۱۲۷ کتاب الایمان۔ الفصل الثانی۔

۲؎ قال العلامة زین الدین ابن نجیم المصری: وفی فتح القدیر ثم لا یخفی ان الحلف بالقرآن الآن متعارف فیکون یمینا کما هو قول الائمة الثلاثة (البحر الرائق ج ۴ ص ۲۸۶ کتاب الایمان)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج ۲ ص ۵۳ کتاب الایمان، الباب الثانی، الفصل الاول۔

ہزار روزے رکھنے کی قسم کھانے کا حکم

سوال:- ایک شخص نے کہا کہ میں کسی کی غیبت نہیں کروں گا اور اگر کی تو قسم ہے میں ایک ہزار روزے رکھوں گا، بعد ازاں اس شخص نے کسی کی غیبت کی تو اب اس پر پورے ہزار روزے رکھنا لازم ہیں یا کفارۂ قسم؟

الجواب:- یہ شخص کفارۂ یمین (یعنی تین روزے رکھنے) سے فارغ الذمہ ہوسکتا ہے۔

لما فی الهندیة: وان علق بشرط لا یرید کدخول الدار ونحوه یتخیر بین الکفّارة و بین عین ما التزمه۔ وروی ان اباحنیفةؒ الی التخییر ایضاً وبهذا یفتی اسماعیل الزاهد قال رضی الله عنه هو اختیاری ایضاً کذا فی المبسوط۔
(الفتاوی الهندیه ج۲ ص۶۵ کتاب الایمان، الفصل الثانی فی الکفّارہ)[1]

فلاں مسجد میں نماز پڑھاؤں تو کافر ہوں گا

سوال:- ایک شخص نے کہا کہ اگر میں فلاں مسجد میں نماز پڑھا دوں تو کافر ہوں گا، پھر اُس نے اس مسجد میں نماز پڑھا دی، اب اس شخص کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

الجواب:- یہ شخص اس مسجد میں نماز پڑھانے کے بعد حانث ہوکر کفارہ ادا کرے گا لیکن کافر نہ ہوگا۔

لما فی الهندیة: ولو قال ان فعل کذا فهو یهودی أو نصرانی أو مجوسی أو بریٔ من الاسلام أو کافر أو یعبد من دون الله او یعبد الصلیب أو نحو ذلك مما یکون اعتقاده کفر فهو یمین استحسانًا کذا فی البدائع حتی لو

---

[1] قال العلامة ابن نجیم المصری رحمه الله: ان فعلت کذا فعلیّ حجة أو صوم سنة اوصدقة ما أملکه أجزاه من ذلك کفارة یمین وهو قول محمدؒ و یخرج عن العهدة بالوفاء بما سمی ایضاً اذا کان شرطاً لا یرید کونه لان فیه معنی الیمین وهو المنع وهو بظاهره نذر فیتخیر و یمیل الی ای الجهتین شاء۔ (البحر الرائق ج۴ ص۲۹۵ کتاب الایمان)
و مثله فی الهدایة ج۲ ص۵۲ کتاب الایمان، الفصل الثانی۔

نعل ذٰلك الفعل يلزمه الكفارة وهل يصير كافرًا اختلف المشائخ فيه۔ قال شمس الائمة السرخسیؒ والمختار للفتوٰی انه ان كان عندهٗ انهٗ يكفر متی أتی بهذا الشرط ومع هٰذا اتی يصير كافر الرضاءه بالكفر وكفارته أن يقول لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ط وان كان عندهٗ انهٗ اذا أتی بهذا الشرط لايصير كافرًا لايكفر الخ۔ (الفتاوٰی الهندية ج ۲ ص۵۴ الباب الثانی فيما يكون يمينًا وَمَا لَا يكون يمينًا) لـه

اگر عمر سے بات کروں تو ماں سے زنا کروں، قسم نہیں

سوال: زید نے کہا اگر میں نے عمر سے بات کی تو یہ ایسا ہے کہ میں نے اپنی ماں سے زنا کیا، اب زید کو عُمر سے باتیں کرنے پر مجبور کیا جا رہا ہے تو باتیں کرنے کی صورت میں زید پر کچھ لازم آئے گا یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مذکورہ میں زید عمر سے باتیں کر سکتا ہے اور اس میں کوئی مواخذہ نہیں کیونکہ یہ قسم نہیں، مزید برآں یہ الفاظ موجبِ ظہار بھی نہیں لعدم التشبیہ اور نہ موجبِ ایلاء ہے لعدم ارادۃ زوجۃ۔

لما فی الهندية: لو قال أن فعلت كذا فانا زان أو سارق أو شارب خمر أو اكل ربو فليس بحالف كذا فی الكافی۔ (الفتاوٰی الهندية ج ۲ ص۵۵ الباب الثانی فيما يكون يمينًا ومالايكون يمينًا۔ الفصل الاول) ۲ـه

لـه قال العلامة الحصكفیؒ: (و) القسم بقوله (أن فعل كذا فهو يهودی او نصرانی أو فاشهدوا علیّ بالنصرانية او شريك الكفار او كافر) تيكفر بحنثه لو فی المستقبل امّا الماضی عالمًا بخلافه فغموس واختلف فی كفره (و) الاصح أنّ الحالف (لم يكفر) سواء (علقه بماض أو آت ان كان عندهٗ) فی اعتقاده انهٗ (يمين وان) جاهلاً و (عنده انهٗ يكفر فی الحلف) بالغموس وبمباشرة الشرط فی المستقبل (يكفر فيهما الرضاه بالكفر)۔ (الدر المختار علی هامش رد المحتار ج ۳ ص۵۵ كتاب الايمان) وَمِثْلُهٗ فی خلاصة الفتاوٰی ج ۲ ص۱۲ كتاب الايمان، الجنس الاول)

۲ـه قال العلامة الحصكفی رحمه الله: (والا ان) فعله غضبه الخ أو هو زان أو سارق أو شارب خمر أو اكل ربا لا) يكون قسمًا لعدم التعارف فلو تعورف هل يكون يمينا ظاهر كلامهم نعم وظاهر كلام الكمال لا وتمام فی

(الدر المختار علی هامش رد المحتار ج ۳ ص۶۲ كتاب الايمان)
وَمِثْلُهٗ فی كنز الدقائق ص۱۵۵ كتاب الايمان۔

بھائی کے ساتھ تعلقات نہ رکھنے کی قسم کھانا

سوال:۔ ایک شخص نے قسم کھائی کہ میں آج کے بعد اپنے حقیقی بھائی کے ساتھ تعلقات نہیں رکھوں گا، اب وہ والدہ کے ناراض ہونے کی صورت میں بھائی سے تعلقات بحال کرنا چاہتا ہے، اور اگر وہ قسم توڑ دے تو شرعاً اس کیلئے کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ ایسی قسم کا توڑ دینا واجب ہے، یہ شخص بھی قسم توڑ کر کفارہ دیدے ورنہ گنہگار ہوگا۔

قال العلامة الحصكفي رحمه الله: ومن حلف على معصية كعدم الكلام مع ابويه اوقتل فلان اليوم وجب الحنث والتكفير۔ (الدر المختار على هامش رد المحتار ج ۳ ص۶۲ مطلب كفارة اليمين)[1]

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اُمتی نہ ہونے کی قسم کھانا

سوال:۔ ایک شخص نے یوں کہا کہ اگر میں نے فلاں کپڑے پہن لیے تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اُمتی نہیں ہوں گا، بعد میں اُس شخص نے وہ کپڑے پہن لیے، اب اس شخص کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ یہ الفاظ یمین میں سے ہیں، لہٰذا حنث کی صورت میں یہ شخص کفارہ ادا کرے گا تاہم حانث ہونے سے ایمان پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

قال العلامة الحصكفيؒ: تعليق الكفر بالشرط يمين ويسمّى بانه ان اعتقد الكفر به يكفر والّا يكفر اى تلزمه الكفارة)۔ (الدر المختار على هامش رد المحتار ج۳ ص۵۲ مطلب في القرآن انما الخلق بكلام الله)[2]

---

[1] قال العلامة عبيد الله بن مسعود بن تاج الشريعةؒ: ومن حلف على معصية كعدم الكلام مع ابويه حنث وكفر۔ (شرح الوقاية ج۲ ص۱۳۹ كتاب الايمان)

ومثلهٔ فی مختصر القدوری ص۲۰۲ كتاب الايمان۔

[2] قال العلامة طاهر بن عبد الرشيد البخاريؒ: وفی قوله هو يهودی ان فعل كذا وحنث لزمته الكفارة وهل اختلف المشائخ فيه قال الشيخ الامام شمس الائمة ان اعتقده يمينا يكون يمينا واعتقده كفرا يكون كفرا على ما يأتی فی الفاظ الكفر۔ (خلاصة الفتاوىٰ ج۲ ص۱ كتاب الايمان)

ومثلهٔ فی الهندية ج۲ ص۵۲ الباب الاول، الفصل الثانی۔

کلمۂ توحید پڑھنے سے قسم کے انعقاد کا حکم

سوال:۔ بعض علاقوں میں یہ رواج ہے کہ کسی بات کا یقین دلانے اور مخاطب کو مطمئن کرنے کے لیے کلمہ توحید پڑھ کر بات کرتے ہیں، عرف میں اس فعل کو قسم سمجھا جاتا ہے، کیا صرف کلمہ پڑھنے سے قسم منعقد ہو جاتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ واضح رہے کہ قسم کے انعقاد کا حکم نیت اور ارادہ پر ہے جس کے انعقاد میں عرف کا کافی عمل دخل پایا جاتا ہے۔ کلمہ پڑھنا اگرچہ بذاتِ خود قسم نہیں لیکن جہاں عرف کی موجودگی میں کلمہ پڑھنا قسم کی نیت سے ہو تو اس سے قسم واقع ہو جائے گی۔

لمافی الهندية: ولوقال لا اله الا الله لا فعلن كذا لايكون فليس بيمين الا أن ينوى يمينًا وكذالك سبحان الله والله اكبر لا فعلن كذا فى سراج الوهاج۔

(الفتاوی الهندية ج ۲ ص۵۵ الباب الثانی الفصل الاول) [۱]

آسمانی کتابوں سے بری ہونے کی قسم کھانا

سوال:۔ زید نے قسم کھائی کہ اگر میں نے فلاں کام کیا تو میں چاروں آسمانی کتابوں سے بری ہوں گا، اس کے بعد اُس نے وہ کام کرلیا، تو اب اس صورت میں وہ حانث ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ یہ الفاظ قسم کے ہیں اس لیے حنث کی صورت میں اس شخص پر قسم کا کفارہ واجب ہے۔

قال العلامة ابوالليث السمرقندیؒ: ولوقال ان افعل كذا فانا بری من الكتب الاربعة فان حنث فعليه كفارة واحدة۔ (الفتاوى النوازل ص۱۶۳) [۲]

---

[۱] قال الشيخ طاهر بن عبد الرشيد البخاریؒ: وفى التجريد عن محمد لوقال لا اله الا الله افعل كذا اوسبحان الله ليس بيمين إلا ان ينوى۔

(خلاصة الفتاوى ج ۲ ص۱۲۶ كتاب الايمان۔ الجنس الاول)

وَمِثْلُهٗ فى ردّ المحتار ج ۳ ص۵۲ كتاب الايمان۔

[۲] وفى الهندية: ولوقال ان فعلت كذا فانا بری من الكتب الاربعة فهو يمين واحدة

(الفتاوى الهندية ج ۲ ص۵۴ الباب الثانی۔ الفصل الاول)

وَمِثْلُهٗ فى البحر الرائق ج ۴ ص۲۸۵ كتاب الايمان۔

کسی دینی مصلحت کے لیے قسم توڑنا

سوال :- اگر قسم کھانے کے بعد انسان کو یہ احساس ہو کہ قسم کھانے وقت میں نے بے احتیاطی سے کام لیا ہے، تو کیا ایسی حالت میں قسم کا پورا کرنا ضروری ہے یا حانث ہو کر کفارہ دینا مناسب ہے ؟

الجواب :- اگر کوئی شخص کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے پر قسم کھائے اور بعد ازاں اس کام کی مخالفت میں کوئی دینی مصلحت سامنے آئے تو اس شخص پر لازم ہے کہ وہ اس قسم کی مخالفت کر کے کفارہ ادا کرے۔

عن ابی موسیٰ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال ما علی الارض یمین احلف علیہا فاریٰ غیرھا خیرًا منھا الا اتیتہ۔ (سنن النسائی ج۲ ص۱۴۳ باب من حلف علیٰ یمین فرأی غیرھا خیرًا۔) [1]

کفارات یمین میں تداخل کا حکم

سوال :- ایک شخص نے متعدد بار قسمیں کھا کر ہر دفعہ قسم پوری نہ کر سکنے کی وجہ سے حانث ہوتا رہا، اب اس کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے تو کیا اس شخص کے لیے تمام قسموں کا ایک ہی کفارہ کافی ہوگا یا متعدد کفارہ جات کی ادائیگی ضروری ہوگی ؟

الجواب :- صورت مسئولہ کے مطابق احتیاط اسی میں ہے کہ متعدد کفارات ادا کئے جائیں۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ : تتعدد الکفارۃ لتعدد الیمین۔ (الدر المختار علیٰ ہامش رد المحتار ج۳ ص۵۲)

ہاں اگر پہلے کفارہ ادا نہیں کیا تو امام محمدؒ کے نزدیک ایک کفارہ بھی کافی ہے۔

قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ : وفی البغیۃ کفارات الأیمان اذا کثرت تداخلت ویخرج بالکفارۃ الواحدۃ عن عھدۃ الجمیع۔ وقال شھاب الائمۃ

---

[1] قال الامام الحافظ المجتہد ابو عبد اللہ محمد بن الحسن الشیبانیؒ : وقد بلغنا عن النبیؐ انہٗ قال من حلف علیٰ یمین فرأی غیرھا خیرًا منھا فلیأت الذی ھو خیر ولیکفر عن یمینہ۔ (کتاب الاصل المعروف بالمبسوط ج۳ ص۱۹ کتاب الایمان)

ومثلہٗ فی الھدایۃ ج۲ ص۴۸۳ کتاب الایمان۔

هٰذا قول محمدؒ قال صاحب الاصل هوا لمختار عندی اھ مقدسی۔ ومثلہ فی القہستانی عن المنیۃ۔ (ردالمحتار ج ۳ ص۵۲ کتاب الایمان) لہ

کفارۂ قسم ادا کرنے کا طریقہ

سوال:۔ اگر کوئی شخص قسم توڑ دے تو اس پر کتنا کفارہ لازم ہوگا؟

الجواب:۔ قسم کا کفّارہ ایک غلام کو آزاد کرنا یا دس مسکینوں کو دو وقت کھانا کھلانا یا دس مسکینوں کو پوشاک دینا جو بدن کے اکثر حصہ کو ڈھانپ لے، البتہ اگر کوئی مالی کفّارہ ادا کرنے سے عاجز ہو تو پھر تین روزے رکھنے سے وہ اپنی ذمہ داری سے فارغ ہو سکے گا۔

قال اللّٰہ تبارک وتعالیٰ: فَكَفَّارَتُهُۥٓ إِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسَٰكِينَ مِنْ أَوْسَطِ مَا تُطْعِمُونَ أَهْلِيكُمْ أَوْ كِسْوَتُهُمْ أَوْ تَحْرِيرُ رَقَبَةٍ ۖ فَمَن لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلَٰثَةِ أَيَّامٍ ۚ ذَٰلِكَ كَفَّارَةُ أَيْمَٰنِكُمْ۔ (سورۃ المائدۃ آیت ع) لہ

کھانا کھلانے میں تسلسل کا حکم

سوال:۔ جس طرح روزہ کے کفارہ میں مساکین کو کھانا کھلانے میں تسلسل کا ضروری ہے اسی طرح قسم کے کفّارہ میں بھی تسلسل کا ہونا ضروری ہے یا نہیں؟ یا یہ کہ کبھی ایک مسکین کو دو وقت کھانا کھلایا اور پھر ناغہ کر دیا پھر کبھی ایک دو مسکینوں کو دو وقت کھانا کھلا دیا، اسی طرح مختلف اوقات میں

لہ وفی الہندیۃ: اذا حلف الرجل علی امر لا یفعلہ ابداً ثم حلف فی ذٰلک المجلس او مجلس اخر لا افعلہ ابداً ثم فعلہ کانت علیہ کفارۃ یمینین وھٰذا اذا نوی یمیناً اخریٰ او نوی التغلیظ اولم یکن لہ نیۃ وا ذا نوی بالکلام الثانی الیمین الاولیٰ علیہ کفّارۃ واحدۃ۔

(الفتاویٰ الہندیۃ ج ۲ ص۵۲ کتاب الایمان)

وَمِثْلُہٗ فی کتاب الاصل المعروف بالمبسوط ج ۳ ص۲۳۷، ۲۳۸ کتاب الایمان۔

لہ قال ابوالبرکات النسفیؒ: وکفارتہ تحریر رقبۃ او اطعام عشرۃ مساکین کہما فی الظہار او کسوتہم بما یستر عامۃ البدن فان عجز عن احدھما صام ثلٰثۃ ایام متتابعات

(کنزالدقائق ص۱۶۵، ۱۶۶ کتاب الایمان)

وَمِثْلُہٗ فی الدرالمختار علی ھامش ردالمحتار ج ۳ ص۷۶ کتاب الایمان۔

حساب پورا کر دینے سے کفارہ ادا ہو سکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب : قسم کے کفارہ میں اگر دس دن مسلسل کھانا نہیں کھلایا جا سکا بلکہ بیچ میں کچھ ناغے ہو گئے تو کچھ حرج نہیں صرف شمار اور تعداد پوری کرنا ضروری ہے ۔

قال العلامۃ قاضیخان رحؒ : وفی کفارۃ یمین یعتبر العدد ۔ (فتاوی قاضیخان ج۲ ص۲۸۶) [1]

کفارہ کے روزوں میں تسلسل ضروری ہے

سوال : حانث ہونے کی صورت میں کفارہ کے روزے رکھنے میں تسلسل قائم رکھنا ضروری ہے یا نہیں ؟

الجواب : قسم کے کفارہ میں رکھے جانے والے روزوں میں تسلسل ضروری ہے اگر کسی وجہ سے درمیان میں ناغہ ہو جائے تو از سرِ نو روزے رکھنے ہوں گے ۔

قال العلامۃ المرغینانی رحؒ : فان لم یقدر علی احد الاشیاء الثلاثۃ صیام ثلاثۃ ایام متتابعات ۔ وقال الشافعی رحؒ : یخیر لاطلاق النص ولنا قرأۃ ابن مسعود رضی اللہ عنہما فصیام ثلاثۃ ایام متتابعات وھی کالخبر المشھور ۔ (الہدایہ ج۲ ص۴۶۱ فصل فی کفارۃ الیمین) [2]

کفارۂ یمین ایک شخص کو دینے کا حکم

سوال : کفارۂ یمین (قسم) کی ادائیگی میں اگر دس مسکینوں کو کھانا کھلانے کی صورت پیش ہو تو کیا یہ تمام فدیہ کسی ایک مسکین کو بطورِ ملکیت دیا جا سکتا ہے یا نہیں ؟ یا دس مسکینوں کو ہی دینا ضروری ہے ؟

الجواب : کفارۂ یمین کا فدیہ کسی ایک مسکین کو ایک ہی دن میں یکمشت دینا اگرچہ بعض

---

[1] قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ : ولو عشاھم فی رمضان عشرین لیلۃ اجزاہ الخ ۔ (رد المحتار ج ۳ ص ۵۳ کتاب الایمان)

وَمِثْلُہٗ فی خلاصۃ الفتاوی ج۲ ص۱۲۵ جنس آخر فی کفارۃ الیمین ۔

[2] قال الشیخ طاھر بن عبد الرشید البخاری رحؒ : وفیہ ایضاً کفارۃ المعسر صیام ثلٰثۃ ایام متتابعات ولو حاضت المرأۃ فی الثلاث استقبلت بخلاف کفارۃ صیام رمضان ۔

(خلاصۃ الفتاوی ج۲ ص۱۲۵ کتاب الایمان، کفارۃ الیمین)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج۲ ص۶۱ کتاب الایمان ، الفصل الثانی ۔

اقوال کی رُو سے فراغتِ ذمّہ کے لیے کافی ہے لیکن صحیح رائے کے مطابق ایسا کرنا درست نہیں، اس لیے بہتر یہی ہے کہ اس میں تعدد کی رعایت ہو اور فدیہ دس مسکینوں کو علیحدہ علیحدہ دیا جائے۔

وفی الھندیۃ: ولو اعطی مسکیناً واحداً عشرۃ اثواب فی مرۃ واحدۃ لم یجزہ کما فی الطعام وان اعطاہ فی کل یوم ثوباً حتی استکمل عشرۃ اثواب فی عشرۃ ایام اجزاہ کما فی الطعام۔ (الفتاویٰ الھندیہ ج۲ ص۶۲ کتاب الایمان، الفصل الثانی) [۱]

ناذر کا نذر سے کچھ کھانے کا حکم

سوال:۔ اگر نذر ماننے والا شخص بہت زیادہ غریب ہو تو وہ اپنی نذر میں سے کچھ کھا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ نذر شدہ چیز واجب التصدق ہوتی ہے اس کا مصرف صرف فقراء اور مساکین ہیں اس لیے نذر سے نہ تو اغنیاء کو کچھ کھلایا جا سکتا ہے اور نہ ناذر خود کھا سکتا ہے اگرچہ نذر ماننے والا فقیر ہی کیوں نہ ہو اس لیے کہ نذر غربت سے متاثر نہیں ہوتی۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: ولو ترک التضحیۃ ومضت ایامھا تصدق بھا حیۃ ناذر فاعل تصدق (لمعینۃ) ولو فقیرا ولو ذبحھا تصدق بلحمھا ولو نقصھا تصدق بقیمۃ النقصان ایضاً ولا یأکل الناذر منھا فان اکل تصدق بقیمۃ ما اکل۔ (الدر المختار علیٰ ہامش رد المحتار ج۵ ص۲۰۳، ۲۰۴ کتاب الاضحیۃ) [۲]

---

[۱] قال العلامۃ ابن عابدینؒ: ای تحقیقاً او تقدیراً حتی لو اعطی مسکینا واحداً فی عشرۃ ایام کل یوم نصف صاع یجوز ولو اعطاہ فی یوم واحد بدفعات فی عشر ساعات قیل یجزی وقیل لا ھو الصحیح۔ (ردّ المحتار ج۳ ص۶۰ کتاب الایمان، مطلب کفارۃ الیمین)

وَمِثْلُہٗ فی فتاویٰ قاضیخان ج۲ ص۲۸ کتاب الایمان۔

[۲] قال الشیخ طاھر بن عبد الرشید البخاریؒ: لا یأکل الناذر منھا ولو اکل منھا فعلیہ قیمتھا۔ (خلاصۃ الفتاویٰ ج۴ ص۳۲۰ کتاب الاضحیۃ، الفصل الرابع فیما یجوز من الاضحیۃ وفیما لا یجوز)

وَمِثْلُہٗ فی بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ج۵ ص۶۸ کتاب التضحیۃ۔ فصل واما کیفیۃ الوجوب فانواع۔

نذر مانی ہوئی چیز کی قیمت ادا کرنے کا حکم

سوال:- ایک شخص نے یوں نذر مانی کہ اگر میرا فلاں کام ہوگیا تو میں گائے یا بھینس ذبح کر کے اس کا گوشت فقراء میں تقسیم کروں گا، کام ہو جانے پر اب نذر ماننے والا گائے یا بھینس کا گوشت فقراء میں تقسیم کرنے کی بجائے اس کی قیمت دینا چاہتا ہے تو کیا ایسا کرنے سے نذر ادا ہو جائے گی یا عینِ منذور چیز ہی دینا ضروری ہے؟

الجواب:- صدقاتِ واجبہ کی ادائیگی میں بنیادی فلسفہ فقراء اور غرباء کی ضروریات کی تکمیل اور انکی حاجت برآری ہے جس کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا سے کیا ہے، اس لیے ناذر کو اختیار ہے کہ عینِ منذور ادا کرے یا اس کی قیمت ادا کرے۔

قال العلامة الحصكفيؒ: نذر ان يتصدق بعشرة دراهم من الخبز فتصدق بغيره جاز ان ساوى العشرة كتصدقه بثمنه - (الدر المختار على هامش رد المحتار ج۳ ص۷۱ مطلب في احكام النذر - النذر غير المعلق لا يختص بزمان ومكان ودرهم وفقير)[1]

نذر کی پیشگی ادائیگی کرنا

سوال:- ایک شخص نے کہا کہ اگر میرا فلاں کام ہوگیا تو میں فلاں چیز اللہ کے نام پر دوں گا، اب اگر وہ کام ہو جانے سے پہلے ہی نذر دے دے تو کیا اس سے نذر ادا ہو جائے گی یا نہیں؟ یا کام ہو جانے کے بعد نذر پوری کرنا ضروری ہے؟

الجواب:- نذر کا وجوب جب کسی کام کے ساتھ مشروط ہو جائے تو شرط کی موجودگی سے پہلے مشروط واجب نہیں ہوتا اور نہ اس کی ادائیگی درست ہے اس لیے کام ہونے سے پہلے نذر دینے سے فارغ الذمہ نہیں ہو سکتا بلکہ کام ہو جانے کے بعد دوبارہ نذر پوری کرنا ہوگی۔

قال العلامة ابن عابدين رحمه الله: بخلاف النذر المعلق فانه لا يجوز

---

[1] وفي الهندية: ويجوز دفع القيم في الزكوٰة عندنا وكذا في الكفارات وصدقة الفطر والعشر والنذر كذا في الهداية - (الفتاوى الهندية ج۱ ص۱۸۱ الباب الثالث في زكوٰة الذهب والفضة والعروض، الفصل الثاني في العروض)

ومِثْلُهٗ في خلاصة الفتاوى ج۱ ص۲۴۳ كتاب الزكوٰة - الفصل الثامن في اداء الزكوٰة۔

تعجیلہ قبل وجود الشرط۔ (الرد المحتار ج۳ صٓ مطلب فی احکام النذر، النذر غیر المعلق لا یختص بزمان ومکان ودرھم)[1]

نذر کے روزوں میں تسلسل کا حکم

سوال:۔ اگر کوئی شخص چند روزے رکھنے کی نذر مانے تو کیا ان میں تسلسل ضروری ہے یا جب چاہے مختلف اوقات میں رکھ کر پورے کر سکتا ہے؟

الجواب:۔ اگر پے درپے روزوں کی نیت نہیں کی ہو تو نذر کے روزے رکھنے میں تسلسل ضروری نہیں ورنہ تسلسل کا خیال رکھنا لازمی ہے۔

وفی الهندیة: ولو قال لله علیٰ ان اصوم شهرًا متتابعًا لزمه التتابع وان اطلق لیخیر۔ (الفتاوی الهندیة ج۱ ص۲۱۱ کتاب الصوم الباب السادس فی النذر)[2]

نذر کی ہوئی گائے کے منافع کا حکم

سوال:۔ ایک گائے جو کہ اللہ کیلئے نذر کی گئی ہو اگر اس گائے کے بچہ پیدا ہو جائے تو اس کا کیا حکم ہے؟ کیا یہ بچہ ناذر کا ہوگا یا اس کو بھی صدقہ کیا جائے گا؟

الجواب:۔ جب کسی جانور کو نذر کیا جائے تو یہ حکم اس کے جملہ اجزاء کو شامل

---

[1] قال العلامة علاؤ الدین الکاسانیؒ: وان کان معلقًا بشرط نحو ان یقول ان شفی الله مریض او ان قدم فلان الغائب فلله علیٰ ان اصوم شهرًا او اصلی رکعتین او تصدق بدرهم ونحو ذلك فوقته وقت الشرط فما لم یوجد الشرط لا یجب بالاجماع ولو فعل ذلك قبل وجود الشرط یکون نفلًا لان المعلق بالشرط عدم قبل وجود الشرط۔

(بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ج۵ ص۹۳ کتاب النذر۔ فصل واما حکم النذر الخ

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۴ ص۲۹۱ کتاب الایمان۔

[2] قال العلامة فخر الدین حسن بن منصور بن محمود المعروف بقاضیخانؒ: لو قال لله علیٰ صوم مثل شهر رمضان قال ان اراد ومثلهٗ فی الوجوب فلهٗ ان یفرق وان اراد فی التتابع فعلیه ان یتتابع وان لم یکن له نیة فله ان یصوم متفرقًا۔

(الفتاوی قاضیخان ج۱ ص۲۰۵ کتاب الصوم)

وَمِثْلُهٗ فی الفتاوی الهندیة ج۱ ص۲۰۹ کتاب الصوم۔ الباب السادس فی النذر۔

ہوتا ہے بچہ بھی اس کا ایک جزء ہے، اس لیے گائے کی طرح بچہ بھی واجب التصدّق ہوگا۔

قال العلامة الحصکفیؒ: و ت الاضحیة ولد قبل الذبح یذبح الولد معها و عند بعضهم یتصدق به بلا ذبح۔ (الدر المختار علی ہامش رد المحتار ج ۵ ص۲۰۵ کتاب الاضحیۃ) [1]

نذر کا دار و مدار الفاظ پر ہے

سوال:۔ ایک شخص نے کہا کہ اگر مجھے فلاں چیز مل گئی تو اتنی رقم خیرات کروں گا جبکہ دل میں ارادہ یہ تھا کہ اگر وہ چیز صحیح ہو لیکن زبان پر یہ تعین نہیں ہوا، اب متعلقہ چیز ملنے پر معلوم ہوا کہ وہ تو خراب ہے، تو کیا اس شخص پر اتنی ہی رقم خیرات کرنا واجب ہے یا مطلوبہ چیز میں نقص کی وجہ سے خیرات کی رقم میں کمی بیشی ہو سکتی ہے؟

الجواب:۔ نذر کی تکمیل کا تمام تر دار و مدار الفاظ پر ہوتا ہے، نیت کا زیادہ دخل نہیں رہتا اس لیے جب الفاظ مطلق ہوں تو اس چیز کے ملنے پر مقررہ رقم خیرات کرنا واجب ہے اگر وہ چیز درست حالت میں نہ ہوں۔

قال العلامة التمرتاشیؒ: ومن نذر نذراً مطلقاً او معلقاً بشرط وکان من جنسه (واجب) فرض وهو عبادة مقصودة وجد الشرط المعلق به لزم الناذر (کصوم وصلوٰة وصدقة۔ (تنویر الابصار علی ہامش رد المحتار ج ۳ ص۶۶، ۶۷ کتاب الایمان) [2]

---

[1] قال الامام فخر الدین حسن بن منصور المعروف بقاضی خانؒ: ولو ولدت ولدا یکون ولدها للاضحیة۔ (فتاویٰ قاضی خان علی ہامش الہندیة جلد ۳ ص۳۴۷ کتاب الاضحیة۔ فصل فی صفة الاضحیة ووقت وجوبها ومن تجب علیه)

وَمِثْلُهٗ فی بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ج ۵ ص۷۸، ۷۹ کتاب التضحیة فصل واما بیان مایستحب قبل التضحیة۔

[2] قال العلامة برهان الدین ابو الحسن علی بن ابی بکر المرغینانیؒ: وان علق النذر بشرط فوجد الشرط فعلیه الوفاء بنفس النذر۔

(الهدایة ج ۲ ص۴۶۳ کتاب الایمان۔ فصل فی الکفارة)

وَمِثْلُهٗ فی شرح الوقایة ج ۲ ص۲۴ کتاب الایمان۔

معذور روزوں میں عدم تسلسل کا حکم

سوال :۔ جناب مفتی صاحب! مجھے کینسر کا مرض لاحق تھا، بیماری کے دنوں میں میں نے یہ نذر مانی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے صحت عطا فرمائی تو میں دو ماہ روزے رکھوں گا۔ اب الحمد للہ میں صحتیاب ہوں اور روزے رکھنے کے قابل ہوں تو کیا میں دو ماہ مسلسل روزے رکھوں یا غیر مسلسل بھی رکھ سکتا ہوں۔ یہ یاد رہے کہ بیماری کی وجہ سے جسم میں کمزوری بھی بہت ہے۔ قرآن و سنت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں؟

الجواب :۔ صورتِ مسئولہ کے جواب میں قدرے تفصیل ہے، وہ یہ کہ اگر تو آپ نے نذر مانتے وقت تتابع یعنی دو ماہ مسلسل روزے رکھنے کی نیت کی ہو تو پھر دو ماہ مسلسل روزے روزے رکھنے ہوں گے اور اگر یہ نیت نہ کی ہو تو شرعاً آپ کو اجازت ہے کہ غیر مسلسل روزے رکھیں یا مسلسل، غیر مسلسل کی صورت میں ساٹھ روزے پورے کرنے ہوں گے۔ باقی اگر کمزوری بہت زیادہ ہے تو مکمل صحتیابی تک انتظار بھی کر سکتے ہیں۔

لما قال العلامة الحصكفي رحمه الله : وكذا الحكم لو نكر السنة أو شرط التتابع فيفطرها لكنه يقضيها هنا متتابعة ويعيد لو افطر يوماً بخلاف المعينة ولو لم يشترط التتابع يقضي خمسة وثلاثين۔[1]

(الدر المختار على صدر رد المحتار جلد ۲ ص ۴۳۴ كتاب الصوم، مطلب في الكلام على النذر)

نابالغ بچے کی نذر کی شرعی حیثیت

سوال :۔ جناب مفتی صاحب! میرے ایک بچے کی عمر دس سال ہے اور وہ پانچویں جماعت کا طالبعلم ہے جب اس کا سالانہ امتحان قریب آیا تو اس نے اپنی والدہ سے کہا کہ اگر میں امتحان میں

---

[1] لما قال العلامة مولانا اشرف علی التھانویؒ : فی الدر المختار قبیل بالاعتکاف : وکذا الحکم لو نکر السنة او شرط التتابع الی قوله ولو لم یشترط التتابع یقضی خمسة وثلاثین اھ اس روایت سے ثابت ہوا کہ اگر تتابع کی شرط نہیں تو تتابع واجب نہیں البتہ ایام منہیہ کے عوض روزے رکھنے پڑیں گے تاکہ ایک ماہ کی تکمیل ہو جاوے۔

(امداد الفتاوی ج ۲ ص ۵۵۷، ۵۵۸ کتاب النذر)

وَمِثْلُهُ فی خلاصة الفتاوی ج ۱ ص ۲۶۱ الفصل الرابع فی النذر۔

کامیاب ہوگیا تو چار روزے اور سو روپے اللہ کے نام نذر دوں گا۔ اب دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ امتحان میں پاس ہونے کے بعد اس بچے کے لیے چار روزے اور سو روپے اللہ کے نام نذر دینا لازم ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ نابالغ بچہ چونکہ غیر مکلف ہوتا ہے اسی وجہ سے اس کی مانی ہوئی نذر کا پورا کرنا واجب نہیں ہوتا۔ اس لیے اگر آپ کا بچہ پانچویں جماعت کے امتحان میں کامیاب بھی ہو جائے تو بھی اس کے ذمے چار روزے رکھنا اور سو روپے کی نذر دینا واجب نہیں۔

لما قال الشیخ اشرف علی التھانویؒ : **سوال (۶۷۶)** طفلِ نابالغ جو عقل رکھتا ہے اس نے نذر معین یا غیر معین مانی، بعد حصولِ مقصود اس پر ادا کرنا اس نذر کا واجب ہوگا یا نہیں ؟

الجواب : واجب نہ ہوگا، اگر وہ نذر مالی ہے تو ادا کرنا جائز بھی نہ ہوگا۔

(امداد الفتاویٰ ج ۲ ص ۵۵۷ کتاب النذر)

منذور چیز نہ ملنے پر اس کے قائم مقام کا حکم

سوال :۔ ایک شخص نے اونٹ ذبح کرنے کی نذر مانی لیکن اس کے علاقے میں اونٹ ملنا مشکل ہے اور اگر ملتا بھی ہے تو اتنا مہنگا کہ اس کی قوتِ خرید سے باہر ہے، اب اس شخص کے لیے اونٹ ہی ذبح کرنا ضروری ہے یا کوئی اور جانور اس کے بدلہ میں ذبح کر سکتا ہے؟ قرآن وسنت کی روشنی میں جواب عنایت فرما کر مشکور فرمائیں۔

الجواب :۔ اگر یہ شخص واقعی کسی ایسے علاقہ میں رہتا ہے جہاں اونٹ ملنا مشکل ہے تو اب اس کو اختیار ہے کہ یا تو سات بکریاں ذبح کر کے اپنی نذر پوری کرے یا پھر درمیانی قسم کے اونٹ کی قیمت صدقہ کر دے، اس سے اس کی نذر پوری ہو جائے گی۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ : ولو قال للہ علی ان اذبح جذوراً واتصدق بلحمہ فذبح مکانہ سبع شاۃ جاز۔ (الدر المختار بحوالہ امداد الفتاویٰ ج ۲ ص ۵۵۲ کتاب النذر) [1]

---

[1] لما قال العلامۃ اشرف علی التھانویؒ : اس صورت میں اختیار ہے خواہ سات بکریاں ذبح کر کے مساکین کو خیرات کر دیجیے یا متوسط درجہ کے اونٹ کی قیمت مساکین کو تقسیم کر دیجیے۔ (امداد الفتاویٰ ج ۲ ص ۵۵۲ کتاب النذر)

نذر مطلق واجب علی التراخی ہے

سوال: ایک شخص نے نذر مانی کہ اگر میرا فلاں کام ہو گیا تو میں تین روزے رکھوں گا، لیکن اس کے لیے کوئی وقت مقرر نہیں کیا تھا۔ اب الحمدللہ اس شخص کا کام ہو گیا ہے، جبکہ موسم بہت گرم ہے جس کی وجہ سے اس کے لیے روزے رکھنا بہت مشکل ہے۔ تو کیا یہ شخص سردی کے موسم میں یہ روزے رکھ سکتا ہے یا کام ہو جانے کے فوراً بعد گرم موسم میں ہی رکھنے ضروری ہیں؟

الجواب:۔ نذر مطلق جس کے لیے کوئی وقت مقرر نہ ہو اس کی ادائیگی علی التراخی واجب ہوتی ہے۔ اس لیے صورتِ مسئولہ کے مطابق اس شخص کے لیے نذر روزوں کا رکھنا مرخص ہے۔ البتہ بہتر یہ ہے کہ کام ہو جانے کے فوراً بعد نذر کے روزے ادا کیے جائیں۔

لما فی الهندیة: لو قال لله علی ان اصوم یومًا فانهٗ یلزمه صوم یوم و تعیین الاداء الیه وهو علی التراخی بالاجماع۔ (الفتاویٰ الهندیة ج ۱ ص ۲۰۹ الباب السادس فی النذر)

درود شریف پڑھنے کی نذر ماننے کا حکم

سوال:۔ میں نے ایک کارخانے میں نوکری کے لیے درخواست دی تھی، اس کی منظوری کے لیے میں نے نذر مانی کہ نوکری ملنے کے بعد چالیس دن تک روزانہ سو بار درود شریف پڑھوں گا، اب جبکہ میری درخواست منظور ہو گئی ہے اور اسی جگہ مجھے نوکری مل گئی ہے تو کیا مجھ پر چالیس دن تک روزانہ درود شریف پڑھنا واجب ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ نذر کے انعقاد کے لیے ضروری ہے کہ وہ عمل کسی مقام پر فرض یا واجب ہو، درود شریف پڑھنا بھی بعض مواقع میں واجب ہے، اس لیے درود شریف پڑھنے کی نذر ماننا صحیح ہے، اگرچہ بعض علماء کرام کا اس میں کلام ہے مگر صحیح اور راجح قول صحت کا ہے۔ لہٰذا اب آپ پر چالیس دن تک روزانہ سو بار درود شریف پڑھنا واجب ہے۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: ولو نذر ان یصلی علی النبی صلی الله علیه وسلم کل یوم کذا لزمة وقیل لا۔ قال ابن عابدینؒ: تحته قوله لزمه لان من جنسه فرضاً......... منه یعلم انه لا یشترط کون الفرض قطعیًا وقوله قیل لا لعل وجهه اشتراط کون الفرض قطعیًا...... قلت والاحوط الاول۔

(رد المحتار ج ۳ ص ۱۰۵ بحواله امداد الفتاویٰ ج ۲ ص ۵۹۲ کتاب النذور)

"میں اپنے باپ سے نہیں ہوں گا" کہنے کی شرعی حیثیت

سوال:۔ پختون معاشرے میں یہ بات عام ہے کہ جب کوئی شخص اپنی بات پر کسی کو پختہ یقین دلانا چاہتا ہے تو یوں کہتا ہے کہ اگر میں نے یہ کام اس طرح نہ کیا تو میں اپنے باپ کے نطفہ سے نہیں۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا اس قسم کے الفاظ سے یمین (قسم) منعقد ہو جاتی ہے یا نہیں؟ اگر کوئی شخص اپنی اس قسم کو پورا نہ کرسکے تو کیا اس کے ذمہ کفارہ لازم ہو گا یا نہیں؟

الجواب:۔ قسم کے انعقاد کے لیے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات پر اٹھائی جائے بدون اس کے یمین منعقد نہیں ہو گی۔ صورتِ مسئولہ کے الفاظ سے قسم منعقد نہیں ہوتی اور نہ مخالفت کرنے پر کفارہ لازم آتا ہے۔

لما قال العلامۃ المفتی عزیز الرحمٰن رحمہ اللہ: (سوال) اگر یہ کہہ دے کہ اگر میں آپ کے گھر جاؤں تو اپنے باپ سے نہیں بلکہ کسی خاکروب سے ہوں، پھر اگر چلا جاوے تو کفارہ لازم ہے یا نہ؟

(الجواب) اس میں کچھ کفارہ نہیں جانا درست ہے۔ (عزیز الفتاویٰ ج ۱ ص ۵۷۲ کتاب الایمان)

کسی گناہ سے توبہ کرنا قسم نہیں

سوال:۔ ایک شخص نے بھرے مجمع میں کہا میں توبہ کرتا ہوں کہ آئندہ چوری نہیں کروں گا، کچھ عرصہ تو وہ اس توبہ پر قائم رہا لیکن پھر اس سے چوری کا جرم سرزد ہو گیا، اب اس شخص پر شرعاً کیا حکم لاگو ہو گا؟ یعنی توبہ کے مذکورہ الفاظ قسم شمار ہو کر اس شخص پر کفارۂ قسم لازم ہو گا یا نہیں؟

الجواب:۔ اس قسم کے الفاظ اگرچہ کسی بات کی توثیق کے لیے مفید ہوتے ہیں مگر یہ یمین کے لیے مثبت نہیں اس لیے اس شخص پر کوئی کفارہ نہیں، البتہ چوری جیسے قبیح فعل کے دوبارہ ارتکاب پر مال اصل مالک کو واپس کرے اور اللہ تعالیٰ سے استغفار کرے تو انشاء اللہ گناہ معاف ہو جائے گا۔

لما قال العلامۃ اشرف علی التھانوی رحمہ اللہ: (سوال) اگر کسی نے یہ کہا کہ میں فلاں گناہ سے توبہ کرتا ہوں اب کبھی نہ کروں گا، تو یہ قسم ہو گی یا نہیں؟

(الجواب) یہ قسم نہیں ہے۔

(امداد الفتاویٰ ج ۳ ص ۵۴۹ کتاب الایمان)

کفارۂ یمین میں بیس مساکین کو ایک وقت کھانا کھلانا

سوال:۔ اگر کوئی شخص کفارۂ یمین کی ادائیگی اس طرح کرے کہ بیس۲۰ مساکین کو ایک ہی وقت کھانا کھلادے تو کیا اس سے کفارہ ادا ہو جائے گا یا نہیں؟

الجواب:۔ کفارۂ یمین میں دس۱۰ مساکین کو دو وقت کا کھانا کھلانا ضروری ہے، اگر کوئی شخص ایک وقت میں بیس۲۰ مسکینوں کو کھانا کھلادے تو اس سے دو وقتوں کی تلافی نہیں ہوگی بلکہ یہ ایک وقت کا کھانا متصور ہوگا اس کے ذمے دوسرے وقت کا کھانا کھلانا لازم ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: واذا غدی مسکیناً وعشی غیرہ عشرۃ ایام لم یجزہ لانہ فرق طعام العشرۃ علی عشرین کما اذا فرق حصۃ المسکین علی مسکینین۔

(ردّ المحتار ج ۳ ص۷۲۶ کتاب الیمین۔ مطلب کفارۃ الیمین)[۱]

غیر اللہ پر قسم کھانے کا حکم

سوال:۔ بعض علاقوں کے لوگ جب کسی بات کی توثیق کرتے ہیں تو دوسرے سے کہتے ہیں کہ تیرے سر کی قسم میں یہ کام کروں گا۔ تو کیا اس سے شرعاً قسم منعقد ہوتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ قسم اٹھانے کی صورت میں دو مقصد پیشِ نظر ہوتے ہیں (۱) مقسم بہ کی تعظیم (۲) بات کی پختگی۔ اگر صورتِ مسئولہ میں اس قسم کی یمین سے بات کی پختگی مراد ہو اور مقسم بہ کی تعظیم کا کوئی شائبہ نہ ہو تو یہ شرعی قسم نہیں صرف بات کو پختہ کرنے کی وجہ سے اس کو یمین کہا گیا ہے، اس لیے فقہاء کرام نے اس کو جائز کہا ہے اور اگر مقسم بہ کی تعظیم مقصود ہو تو اللہ تعالیٰ کی صفات میں مشارکت کی بناء پر جائز نہیں۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ: وھل یکرہ الحلف بغیر اللہ تعالیٰ قیل نعم للنھی وعامتھم لا وبہ افتوا لا سیما فی زماننا وحملوا النھی علی الحلف بغیر اللہ لا علی وجہ الوثیقۃ کقولھم بابیك ولعمرك ونحو ذلك۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۳ ص۷۰۵ کتاب الیمین مطلب فی حکم الحلف بغیرہ تعالیٰ)

---

[۱] ولما قال العلامۃ ابوبکر بن علی الحدادالیمنیؒ: وان غدا عشرۃ وعشا عشرۃ غیرھم لم یجزیہ وکذا اذا غدا مسکیناً وعشاغیرہ عشرۃ ایام لم یجزیہ لانہ فرق طعام العشرۃ علی عشرین یحصل لکل واحد منھم المقدار المقدر کما اذا فرق حصۃ المسکین علی مسکینین۔

(الجوھرۃ النیرہ ج۲ ص۲۹۲ کتاب الایمان)

وَ مَا اُھِلَّ بِہٖ لِغَیْرِ اللّٰہِ سے کیا مراد ہے؟

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ ایک آدمی جنگل میں سفر کر رہا ہے اور اس کے پاس کھانے پینے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے، بھوک کی شدت کی وجہ سے اس کی موت واقع ہونے کا بھی خدشہ ہے، جبکہ اس کے پاس کھانے کی صرف دو چیزیں موجود ہیں، ایک نذر غیر اللہ کی اور دوسرے خنزیر کا گوشت۔ اس صورت حال میں ان دونوں چیزوں میں سے کون سی کھانا اس کے لیے رخص ہے کہ اس سے اُس کی جان بچ جائے؟ جبکہ قرآن کریم کی اس آیت اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَیْکُمُ الْمَیْتَۃَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِیْرِ وَمَا اُھِلَّ بِہٖ لِغَیْرِ اللّٰہِ فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّ لَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَیْہِ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ( ) میں مردار، خون، خنزیر کا گوشت اور نذر لغیر اللہ کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا آیتِ کریمہ کی روشنی میں اس مسئلہ کی وضاحت فرمائی جائے؟

الجواب:۔ مَا اُھِلَّ بِہٖ لِغَیْرِ اللّٰہِ کی دو تفسیریں کی گئی ہیں۔ ایک[1] یہ کہ اس سے مراد وہ جانور ہے جس پر بوقتِ ذبح غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو، دوسری[2] یہ کہ اس سے غیر اللہ کے نام کی نذر مراد ہے، یعنی کھانے پینے کی وہ تمام چیزیں جو غیر اللہ کے لیے نامزد کی گئی ہوں اور اس سے غرض یہ ہو کہ غیر اللہ کا تقرب حاصل ہو جائے۔ مَا اُھِلَّ بِہٖ لِغَیْرِ اللّٰہِ کی پہلی قسم اور خنزیر حرمت میں دونوں برابر ہیں، مضطر کو اختیار ہے کہ حالتِ اضطرار میں ان دونوں میں سے جو چاہے بقدرِ ضرورت اتنا کھالے کہ مرنے سے بچ جائے۔ اور دوسری[2] قسم جو کہ نذر لغیر اللہ ہے وہ اگرچہ حرام ہے مگر حرمت میں خنزیر سے کمتر ہے۔ اور وجہ اس کی یہ ہے کہ خنزیر کی حرمت لعینہٖ ہے اور غیر اللہ کے نام کی نذر کی حرمت لغیرہٖ ہے، اور حرمت لغیرہٖ بہ نسبت حرمت لعینہٖ کے کمتر درجے کی حرمت ہے۔ اس لیے مضطر پر لازم ہے کہ خنزیر کو چھوڑ کر نذر لغیر اللہ سے بقدرِ ضرورت اتنا کھالے کہ مرنے سے بچ جائے۔ فقط واللہ اعلم

ایصالِ ثواب کے لیے مانی گئی نذر کی شرعی حیثیت

سوال :۔ ایک شخص نے یہ نذر مانی کہ میں اپنے مرحوم والد کے ایصالِ ثواب کے لیے ہر روز چار رکعت نفل نماز پڑھوں گا اور ہر ماہ ایک بکرا اللہ کے نام پر ذبح کروں گا۔ کئی ماہ تک تو اس شخص نے اس پر عمل کیا مگر کچھ حادثات کی وجہ سے اب وہ مالی مشکلات سے دو چار ہے اور نفل نماز تو پڑھ لیتا ہے مگر ہر ماہ بکرا ذبح کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا، اس شخص کے لیے شریعتِ مقدسہ کا کیا حکم ہے؟ اگر یہ شخص ہر ماہ بکرا ذبح نہ کرے تو کیا وہ عنداللہ مجرم ہو گا یا نہیں؟

الجواب :۔ نذر کے انعقاد کے لیے ضروری ہے کہ اس کی جنس سے کوئی واجب یا فرض عمل موجود ہو۔ چونکہ ایصالِ ثواب ایک ایسا عمل ہے کہ جس کی جنس میں کوئی واجب عمل موجود نہیں اسلئے صورتِ مسئولہ میں بھی ایصالِ ثواب کے لیے مانی گئی نذر منعقد نہیں ہوئی ہے، اور اب یہ شخص چونکہ نادار اور غریب ہے اور ہر ماہ بکرا ذبح نہیں کر سکتا تو اس عمل کے ترک کرنے سے وہ عنداللہ مجرم نہ ہو گا۔

لما قال العلامة ظفر احمد العثمانیؒ : (الجواب) ایصالِ ثواب کی نذر منعقد نہیں ہوتی کیونکہ اس کی جنس سے کوئی واجب نہیں اور یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ مالیس من جنسہ واجب لاینعقد النذر بہ۔ اور گو تصدق کی جنس سے واجب ہے مگر یہاں اصل مقصود ایصالِ ثواب بروحِ میت ہے تصدق کی نذر تبعاً ہے، اور نذرِ صحیح میں بھی صحت نذر کی تعیین مکان و زمان و تعیین فقیر نہیں بلکہ اس میں تغیر کا اختیار رہتا ہے۔ (امداد الاحکام ج۳ ص۳۰ کتاب الأیمان والنذر)[1]

---

[1] قال العلامة ابن العربیؒ : حقیقة النذر التزام الفعل بالقول مما یکون طاعة للہ عزوجل ومن الاعمال قربة ولا یلزم نذر المباح، بدلیل ماروی فی الصحیح ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم رأی اباسرائیل قائماً فسال عنہ فقالوا نذر ان یقوم ولایقعد ولایستظل ویصوم فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم مروہ فلیصم ولیقعد ولیستظل فاخبرہ باتمام العبادة ونہاہ عن فعل المباح۔

(احکام القرآن ج۱ ص۳۵۲ سورة آل عمران)

وَمِثْلُهٗ فی احکام القرآن للشیخ ظفر احمد العثمانی رحمہ اللہ ج۲ ص۱۸ سورة آل عمران۔

كتاب
الوقف

کتاب الوقف
(وقف کے مسائل واحکام)

مسجد کے لیے وقف مکان میں دعوٰی ارث نہیں چلتا

سوال:۔ مسجد کیلئے وقف مکان میں امام مسجد رہائش پذیر تھے ان کی وفات کے بعد ورثاء ارث کا دعوٰی کرتے ہیں جبکہ ورثاء مسجد کی امامت و خطابت جیسی ذمہ داریوں سے وابستہ نہیں ہیں، توکیا ایسی حالت میں ورثاء اس مکان میں ارث کا دعوٰی کرسکتے ہیں یا نہیں ؟

الجواب:۔ مسجد کی موقوفہ جائیداد پر کسی کو ارث کے دعوٰی کا حق حاصل نہیں، مذکورہ مکان اگر مسجد کے لیے باقاعدہ وقف ہو تو امام کی موت کے بعد اس کے ورثاء کا اس میں کسی قسم کا کوئی حق نہیں، صرف مسجد کے منافع کے لیے اس کا استعمال ہوگا۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: وعندهما هو حبسها علیٰ حکم ملك الله تعالیٰ وصرف منفعتها علیٰ من احب ولو غنیا فیلزم فلا یجوز ابطاله ولا یورث عنه وعلیه الفتوٰی۔
(الدر المختار علیٰ هامش رد المحتار ج۳ ص۳۹۷ کتاب الوقف)[1]

موقوفہ زمین کو فروخت کرنے کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے اپنی مملوکہ زمین مسجد یا قبرستان کے لیے باقاعدہ طور پر وقف کی، اب واقف موقوفہ زمین کو فروخت کرنا چاہتا ہے، توکیا موقوفہ زمین کو فروخت کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب: وقف تام ہونے کے بعد واقف کو موقوفہ جائیداد میں کسی قسم کے

---

[1] وقال العلامة المرغینانی رحمہ اللہ: ومن اتخذ ارضه مسجداً لم یکن له ان یرجع فیه ولا یبیعه ولا یورث عنه لانه یحرز عن حق العباد وصار خالصاً لله تعالیٰ۔
(الهدایة ج۲ ص۶۴۵ کتاب الوقف، فصل فی المسجد۔)
ومثله فی الهندیة ج۲ ص۴۶۶ کتاب الوقف، الباب الثانی عشر فی الرباطات والمقابر۔

ردّوبدل کا اختیار حاصل نہیں اور نہ اس کو فروخت کرنا شرعاً درست ہے۔

لما قال العلامة برهان الدين المرغيناني: واذا صح الوقف لم يجز بيعه ولا تمليكه۔ (الهداية ج ۲ ص ۶۴۰ کتاب الوقف)[1]

باغ کے میوہ کو وقف کرنے کا حکم

سوال: ایک آدمی نے اپنا باغ وقف کرتے وقت زمین یا آمدن کا تعین نہیں کیا، اس کی وفات کے بعد جب باغ کے درخت فائدہ کے قابل نہ رہے تو ورثاء نے زمین کا دعویٰ کر دیا، ان کا مؤقف یہ ہے کہ ہمارے مورث نے باغ کے درخت اور اس کی آمدنی وقف کی تھی زمین نہیں، چونکہ اب نہ تو باغ کے درخت رہے ہیں اور نہ اس کی آمدنی، اس لیے یہ زمین ہم آپس میں تقسیم کرتے ہیں، تو اس معاملہ میں ان کو کہاں تک حق بجانب سمجھنا چاہیئے؟

الجواب: شرعاً باغ کی زمین کی طرح اس کے درخت اور میوہ کا وقف کرنا بھی جائز ہے، اس لیے مذکورہ صورت میں واقف کے الفاظ اور عرف کو مدِ نظر رکھ کر فیصلہ کرنا زیادہ مناسب ہے، اگر علاقہ میں وقف صرف درخت اور میوہ کیا جاتا ہو تو پھر اس کا اعتبار ہوگا ورنہ زمین بھی وقف متصور ہوگی۔

لما قال العلامة برهان الدين المرغيناني رحمه الله: لان هذا صدقة بالمنفعة او بالغلة وذلك قد يكون مؤبداً فمطلقه لا ينصرف الى التابيد فلا بد من التنصيص۔ (الهداية ج ۲ ص ۶۳۹ کتاب الوقف)[2]

وقف سے رجوع کرنے کا حکم

سوال: ایک شخص نے اپنی مملوکہ زمین مسجد کے لیے وقف کی اور وقف تام بھی ہوگیا، اب وہ اس

---

[1] قال العلامة التمرتاشيؒ: فاذا تم ولزم (اي الوقف) لا يملك ولا يعار ولا يرهن اي لا يملك لتمليك لغيره بالبيع۔ (تنوير الابصار على صدر رد المحتار ج ۴ ص ۳۵۲ کتاب الوقف)

وَمِثْلُهُ فی بدائع الصنائع ج ۶ ص ۲۲۱ فصل حکم الواقف الجائز۔

[2] وقال العلامة طاهر بن عبد الرشيد البخاريؒ: واذا وقف مالاً لاجل المساجد فانه جائز لجريان العرف به۔ (خلاصة الفتاوى ج ۴ ص ۴۱۵ کتاب الوقف الفصل الثالث)

وَمِثْلُهُ فی التاتارخانية ج ۵ ص ۸۲۷ کتاب الوقف۔

وقف سے رجوع کرنا چاہتا ہے، توکیا واقف اپنے وقف سے رجوع کرسکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب: جو کوئی اپنی مملوکہ زمین ایک دفعہ مسجد کے لیے وقف کردے اور وقف بھی تام ہوجائے تو اس کے بعد واقف اپنے وقف سے رجوع کرنے کا شرعاً مجاز نہیں۔

لما قال العلامة فخر الدین الرازی الشھیر بقاضی خانؒ: وعن محمدؒ وعن ابی حنیفةؒ اذا جعل ارضه وقفاً علی المسجد جاز ولا یکون له ان یرجع۔

(فتاوی قاضیخان علی ھامش الھندیة ج۳ ص۲۹۱ باب الرجل یجعل دارہ مسجداً الخ)[1]

موقوفہ زمین میں امام مسجد کے لیے مکان بنانے کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے مسجد کے مصالح کے لیے کچھ زمین وقف کی ہے اب مسجد کی انتظامیہ امام مسجد کے لیے اس موقوفہ زمین میں رہائشی مکان تعمیر کرنا چاہتی ہے، توکیا انتظامیہ کا یہ اقدام شرعاً درست ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ جو زمین مسجد کے مصالح کے لیے وقف ہو اس میں انتظامیہ کو امام مسجد کے لیے مکان تعمیر کرنا شرعاً درست ہے، کیونکہ امام مسجد کی ضرورت بھی مسجد کے مصالح میں شامل ہے۔

لما قال العلامة ابن نجیمؒ: وبما ذکرناہ علم انه لو بنی بیتاً علی سطح المسجد لسکنی الامام فانه لایضر فی کونه مسجداً لانه من المصالح۔ (البحر الرائق ج۵ ص۲۵۱ کتاب الوقف فصل فی احکام المسجد)[2]

عیدگاہ میں کھیلنا جائز نہیں

سوال:۔ عیدگاہ میں کھیلنا اور ورزش کرنا ازروئے شریعت جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ اگرچہ عیدگاہ مسجدِ شرعی کے حکم میں نہیں، اسی لیے بعض فقہاء اس میں

---

[1] وقال العلامة برھان الدین المرغینانی رحمه الله: واذا صح الوقف لم تجز بیعه ولا تملیکه۔ (الھدایة ج۲ ص۶۴۰ کتاب الوقف)

وَمِثْلُهٗ فی بدائع الصنائع ج۶ ص۲۲۰ فصل الذی یرجع الی الموقوف۔

[2] وقال العلامة علاؤ الدین الحصکفی رحمه الله: ویبدأ من غلته بعمارته ثم ما ھو اقرب لعمارته کامام مسجد ومدرس مدرسة یعطون بقدر کفایتھم۔

(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۴ ص۳۶۶ مطلب یبداء من غلة الوقف بعمارته)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۵ ص۲۱۱ کتاب الوقف۔

ادب واحترام کے اس درجہ کے قائل نہیں جو مساجد کے لیے ہوتا ہے تاہم ہمارے معاشرہ میں عیدگاہ کو مسجد کی طرح سمجھا جاتا ہے اس لیے اس کا احترام زیادہ مناسب ہے اور اس میں ہر قسم کے کھیل کود سے اجتناب کرنا چاہیئے۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ : اما مصلّی العید لا یکون مسجداً مطلقاً وانما یعطی لهٗ حکم المسجد فی صحة الاقتداء بالامام وان کان منفصلاً عن الصفوف وفیما سوٰی ذٰلك فلیس له حکم المسجد وقال بعضهم یکون مسجداً حال اداء الصلوٰة لا غیر وهو الجبانة سواءٌ ویجنب هٰذا المکان عما یجنب عنه المساجد احتیاطاً والظاهر ترجیح الاول لانهٗ فی الخانیة یقدم الاشهر۔ (رد المحتار ج ۴ ص ۳۵۶ الوقف فی احکام المسجد)[1]

موقوفہ زمین میں عشر ادا کرنا ضروری ہے

سوال:۔ ایک شخص نے مدرسہ کیلئے کچھ زمین وقف کی ہے اور وقف تام بھی ہوگیا ہے تو کیا اس موقوفہ زمین میں عُشر دینا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب: جو زمین مدرسہ وغیرہ کے لیے وقف ہو جائے اور اس کے بعد اس میں کاشت وغیرہ کی جائے تو اس کی آمدنی میں عُشر دینا ضروری ہے۔

لما قال فی الهندیة : قال ارض الوقف اذا کانت عشریة دفعها القیم مزارعة او معاملة فعشر جمیع الخارج فی نصیب الدافع وهٰذا علی قول ابی حنیفةؒ فان عندهٗ فی الاجارة بالدراهم العشر علی الآجر کالخراج وعندهما یجب فی الخارج

---

[1] وقال العلامة عالم بن العلاء الانصاریؒ : وما تخذ لصلوٰة العید فانهٗ لا یکون مسجداً مطلقاً وانما یعطی لهٗ حکم المسجد فی صحة الاقتداء بالامام وان کان منفصلاً عن الصفوف امافیما سوی ذٰلك لیس لهٗ حکم المسجد قال بعضهم لهٗ حکم المسجد حال اداء الصلوٰة لا غیر هو والجبانة سواء ویجنب هٰذا المکان عما یجنب المسجد احتیاطاً وفی الواقعات المسجد الذی اتخذ لصلوٰة العید۔ فالمختار للفتوٰی انهٗ مسجد فی حق جواز الاقتداء وان انفصلت الصفوف واما فی ما عدا ذٰلك فلا رفقاً بالناس۔
(فتاوٰی تاتارخانیة ج ۵ ص ۸۴۵ کتاب الوقف، مسائل وقف المساجد)
وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج ۵ ص ۲۴۸ کتاب الوقف۔

فکذلک المزارعة۔ (الفتاوی الھندیة ج ۲ ص۲۲۴ کتاب الوقف۔ الباب الخامس) [1]

موقوفہ زمین پر ملکیت کا دعویٰ کرنے کا حکم

سوال:۔ کافی مدت سے ایک زمین مسجد کے لیے وقف کی ہوئی ہے لیکن اب وہ آدمی اسی زمین کی دوبارہ ملکیت کا دعویٰ کر رہا ہے، تو کیا شرعاً اس شخص کا یہ دعویٰ درست ہے یا نہیں؟

الجواب: اگر اس زمین کا وقف ہونا مسلّم اور مبرہن ہو تو یہ زمین باقاعدہ مسجد ہی رہے گی اور کسی کی ملکیت متصور نہ ہوگی اور نہ رجوع صحیح ہے۔

لما قال العلامة برھان الدین المرغینانیؒ: ومن اتخذ ارضه مسجداً لم یکن له ان یرجع فیه ولا یبیعه ولا یورث عنه لانه یحرز عن حق العباد وصار خالصاً للّٰه تعالیٰ۔

(الھدایة ج ۲ ص۶۴۵ کتاب الوقف) [2]

موقوفہ قبرستان میں مردے دفنانے سے منع کرنے کا حکم

سوال: ایک شخص نے قبرستان کے لیے اپنی زمین وقف کی جس میں سینکڑوں کی تعداد میں مُردوں کو دفنایا جا چکا ہے، اب محلہ کی تنظیم والے اس قبرستان میں لوگوں کو اموات کے دفنانے سے روکتے ہیں، تو کیا اس تنظیم والوں کا یہ رویہ شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر اس قبرستان کا وقف ہونا مسلّم اور مبرہن ہو تو یہ بھی باقاعدہ قبرستان ہی رہے گی، اور محلہ کی تنظیم والوں کا یہ رویہ شرعاً درست نہیں ہے، اس قبرستان میں مُردوں کو دفنایا جائے گا منع کرنا ناجائز ہے۔

---

[1] قال العلامة المرغینانیؒ: قال ابو حنیفةؒ فی قلیل ما اخرجته وکثیره العشر سواء سقی سیحاً او سقته السماء۔ (الھدایة ج ۱ ص۲۰۱ باب العشر)

وَمِثْلُهٗ فی تنقیح الحامدیة ج ۱ ص۹ کتاب الصلوٰة۔

[2] وقال فی الھندیة: اما حکمه عندھما زوال العین عن ملکه ...... فانه یصح حتّی لایملك بیعه ولایورث۔ (الفتاوی الھندیة ج ۲ ص۳۵۲ الوقف، الباب الاول فی تعریفه)

وَمِثْلُهٗ فی الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۴ ص۳۵۲ کتاب الوقف، مطلب فی شرط واقف الکتب۔

لما قال فی الھندیۃ: واذا کان یزول الملک عندھما یزول ملکہ بالقول عند ابی یوسفؒ وھو قول الائمۃ الثلاثۃ وھو قول اکثر اھل العلم وعلی ھذا مشائخ بلخ وعلیہ الفتوی ...... امّا حکمہ عندھما زوال العین عن ملکہ الی ...... فانہ یصح حتی لایملک بیعہ ولا یورث۔
(الفتاوی الھندیۃ ج ۲ ص ۳۵۲ الوقف، الباب الاول فی تعریفہ الخ) [۱]

وقف میں واقف کی شرائط کے معتبر ہونے کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے حالتِ حیات میں محلہ والوں کو مدرسہ کی تعمیر کے لیے جگہ دے دی اور کہا کہ جب تک اس مدرسہ میں طلباء تعلیم حاصل کرتے رہیں گے تو مجھے اور میرے ورثاء کو اس زمین میں مداخلت کا حق نہیں ہوگا لیکن اگر کسی وجہ سے مدرسہ میں سلسلہ تعلیم بند ہوگیا تو پھر یہ وقف میرا یا میرے ورثاء کی ملکیت شمار ہوگا۔ تو کچھ عرصہ کے بعد سلسلہ تعلیم بند ہوگیا ہے تو اس شخص نے کہا کہ اب میں اپنی زمین واپس لینا چاہتا ہوں، اس پر لوگوں نے اُسے منع کیا کہ وہ ایسا نہ کرے۔ تو کیا اس آدمی کو حقِ استرداد شرعاً حاصل ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ صورۃ مذکورہ میں چونکہ واقف نے یہ شرط لگائی ہے کہ اگر سلسلہ تعلیم بند ہوگیا تو پھر یہ وقف کردہ زمین میری یا میرے ورثاء کی ملکیت شمار ہوگی، تو یہ وقف عدم تابید کی وجہ نامنظور رہے اور وقف تام نہ ہونے کی وجہ سے یہ جگہ واقف کی ملکیت سے خارج نہیں ہوئی ہے اس لیے واقف مذکورہ زمین کو واپس لے سکتا ہے۔

لما قال العلامۃ ابن عابدینؒ: فان شرائط الواقف معتبرۃ اذا لم تخالف الشرع وھو مالک فلہ ان یجعل مالہ حیث شاء مالم یکن معصیۃ ولہ ان یخص صنفاً من الفقراء۔
(ردالمحتار ج ۴ ص ۳۶۱ کتاب الوقف) [۲]

---

[۱] قال العلامۃ برھان الدین المرغینانیؒ: ومن اتخذ ارضہ مسجداً لم یکن لہ ان یرجع ولا بیعہ ولا یورث عنہ۔ (الھدایۃ ج ۲ ص ۶۴۵ کتاب الوقف)
وَمِثْلُہٗ فی ردالمحتار ج ۳ ص ۳۶۷ کتاب الوقف۔

[۲] قال العلامۃ ابن نجیمؒ: شرط الواقف یجب اتباعہ لقولھم شرط الواقف کنص الشارع ای فی وجوب العمل بہ وفی المفھوم والدلالۃ۔ (الاشباہ والنظائر ج ۲ ص ۲۲۸ کتاب الوقف)
وَمِثْلُہٗ فی تنقیح الحامدیۃ ج ۱ ص ۱۲۶ کتاب الوقف۔

طلباء کے لیے مخصوص وقف کا حکم

سوال:۔ دینی مدارس کے لیے جو بکرے یا گوشت آتا ہے کیا طلباء کے علاوہ اساتذہ اور دیگر عملہ بھی اس میں سے کھا سکتے ہیں یا نہیں ؟

الجواب:۔ اگر گوشت اور بکرے واقف نے صرف مدرسہ کے طلبہ کے لیے وقف کیے ہوں تو اس گوشت وغیرہ کو طلباء کے علاوہ کوئی اور استعمال نہیں کر سکتا کیونکہ اس میں واقف کی شرط سے مخالفت لازم آتی ہے جو کہ ناجائز ہے کیونکہ شرطِ واقف شارع کی نص کی طرح ہے، تاہم صرف مدرسہ کو دے کر مدرسہ کے ذمہ دار حضرات کو اختیار دینے کی صورت میں مدرسہ کے لیے دیئے گئے دیگر عطایا کے حکم میں ہو کر طلباء کے علاوہ مدرسہ کے اساتذہ اور ملازمین بھی استعمال کر سکتے ہیں۔

لما قال العلامۃ ابن عابدینؒ : قال فی الاسعاف یجب صرف الغلۃ علی ما شرط الواقف وفی غیرہ شرط الواقف کنص الشارع ای فی المفهوم والدلالۃ۔
(تنقیح الحامدیۃ ج ۱ ص ۱۲۶ کتاب الوقف)[1]

شاملاتِ دیہہ زمین کے وقف کا حکم

سوال:۔ ایک قطعہ اراضی تمام گاؤں والوں کی مشترکہ ملکیت ہے اور سرکاری کاغذات میں وہ شاملاتِ دیہہ ہے، گاؤں کے چند آدمیوں نے اس کو اللہ تعالیٰ کے نام پر وقف کر دیا اور وقف کی تحریری دستاویز پر انگوٹھے اور دستخط وغیرہ ثبت کیے، جبکہ گاؤں کے تمام لوگ اس وقف پر راضی نہیں، تو کیا ایسا وقف شرعاً درست ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ اگر مذکورہ زمین واقعی پورے گاؤں والوں کی مشترکہ ہے اور اس کو تمام مالکان نے نہیں بلکہ بعض نے وقف کیا ہو تو یہ وقف شرعاً صحیح نہیں کیونکہ یہ وقف مشاع ہے لہٰذا شاملات دیہہ زمین کا وقف بدون تمام شرکاء کی رضا کے درست نہیں۔

لما قال العلامۃ فخر الدین حسن بن منصور الشهیر بقاضی خانؒ : وقف المشاع

---

[1] قال العلامۃ الحصکفیؒ : قولهم شرط الواقف کنص الشارع ای فی المفهوم والدلالۃ۔
(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۴ ص ۴۳۳ کتاب الوقف)
ومثلہ فی الفتاوی الخیریۃ علی هامش تنقیح الحامدیۃ ج ۱ ص ۱۳۴ کتاب الوقف۔

عند محمدؒ لا یجوز والفتوٰی علیٰ قول محمدؒ۔ (فتاوٰی قاضیخان علیٰ ہامش الہندیۃ ج۳ ص۳۰۳ فصل وقف المشاع)[1]

قاضی کے لیے استبدالِ وقف جائز ہے

سوال:۔ اگر کوئی شخص کسی دینی مدرسہ کے لیے کچھ زمین وقف کرے اور بعد میں کسی مصلحت کی بناء پر اس کو بدلنا چاہے تو شریعت کی رو سے اس طرح کی استبدال جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ فقہاء کرام نے تصریح فرمائی ہے کہ اگر قاضی استبدالِ وقف میں مصلحت سمجھے تو اسے شرعاً اختیار حاصل ہے کہ وہ وقف میں استبدال کرے البتہ قاضی کے علاوہ کسی اور کو شرعاً یہ اختیارات حاصل نہیں۔

لما قال العلامۃ فخرالدین حسن بن منصور الشہیر بقاضی خانؒ: إما بدون الشرط اشار فی السیر انہ لا یملک الاستبدال الا القاضی اذا رأی المصلحۃ فی ذٰلک۔

(فتاوٰی قاضیخان علیٰ ہامش الہندیۃ ج۳ ص۳۰۶ فصل فی مسائل الشرط فی الوقف)[2]

مشترکہ جائیداد بلاتقسیم مسجد کے لیے وقف کرنا

سوال:۔ کئی مالکوں میں ایک زمین مشترکہ تھی ان میں سے چند ساتھیوں نے کچھ زمین مسجد کے لیے وقف کی جبکہ ان میں بعض ساتھی اس پر راضی نہیں ہیں، تو کیا شریعت کی رو سے یہ وقف جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مشترکہ جائیداد بغیر تقسیم کیے وقف مشاع کے مترادف ہے، اس لیے وقف تام نہ ہونے کی وجہ سے ناراض مالکوں کی طرف وقف کنندگان بھی اپنے اپنے حصص سے استفادہ کرسکتے ہیں۔

لما قال فی الہندیۃ: واتفقا علیٰ عدم جعل المشاع مسجداً او مقبرۃ

---

[1] قال العلامۃ ابن نجیم رحمہ اللہ: والحاصل ان وقف المشاع مسجداً او مقبرۃ غیر جائز مطلقاً اتفاقاً۔ (البحر الرائق ج۵ ص۱۹۷ کتاب الوقف)

وَمِثْلُہٗ فی فتح القدیر ج۵ ص۴۲۶ کتاب الوقف۔

[2] قال العلامۃ زین الدین بن ابراہیم الشہیر ابن نجیمؒ: شرط الوقف عدم الاستبدال فللقاضی الاستبدال اذا کان اصلح۔ (الاشباہ والنظائر ج۲ ص۲۳ کتاب الوقف)

وَمِثْلُہٗ فی مجموعۃ الفتاوٰی ج۲ ص۱۱۲ کتاب الوقف۔

مطلقاً سواء کان مما لا یحتمل القسمة او یحتملها۔

(الفتاوی الهندیة ج ۲ ص۳۶۵ فصل فی وقف المشاع) ؎۱

قبرستان کے درختوں کو فروخت کرنے کا حکم

سوال:- ایک قبرستان میں بڑے بڑے درخت ہیں جن کو فروخت کر کے ان کی قیمت اگر قبرستان میں ہی لگا دی جائے تو کیا شرعاً یہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- جہاں کہیں درخت زمین کے قبرستان بن جانے سے قبل اُگے ہوں تو مملوکہ زمین ہونے کی صورت میں درخت مالکِ زمین کے ہوں گے، خواہ مالک کوئی ایک شخص ہو یا قوم، البتہ زمین کے قبرستان بن جانے کے بعد درخت اُگے ہوں اور یہ زمین کسی کی ملکیت نہ ہو بلکہ عام مسلمانوں کے قبرستان کے لیے وقف ہو تو اس کے درخت فروخت کر کے ان کی قیمت قبرستان یا دوسرے اجتماعی مفاد میں خرچ کی جاسکتی ہے۔

لما فی الهندیة: مقبرة علیها اشجار عظیمة فهذا علی وجهین اما ان کانت الاشجار قبل اتخاذ الارض مقبرة او نبت بعد اتخاذ الارض مقبرة ففی الوجه الاول المسألة علی قسمین اما ان کانت الارض مملوکة لها مالک او کانت مواتاً لا مالک لها واتخذها اهل القریة مقبرة۔ (الفتاوی الهندیة ج ۲ ص۴۷۳ الباب الثانی عشر الخ) ؎۲

؎۱ وقال العلامة ابن نجیمؒ: والحاصل ان وقف المشاع مسجداً او مقبرة غیر جائز مطلقاً اتفاقاً وفی غیرهما ان کان مما لا یحتمل القسمة جاز اتفاقاً۔ (البحر الرائق ج ۵ ص۱۹۷ کتاب الوقف)

وَمِثْلُهٗ فی فتح القدیر ج ۵ ص۴۲۶ کتاب الوقف۔

؎۲ وقال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ: مقبرة علیها اشجار ان کانت نابتة قبل اتخاذ الارض مقبرة والارض مملوکة لها مالک جعلها مقبرة فالاشجار باصلها علی ملک رب الارض یصنع الورثة بالاشجار ما شاؤا لان الشجرة لا تدخل تحت الوقف.... وان کانت الارض مواتا لا مالک لها باصلها علی حالها القدیمة هذا کله اذا کانت الاشجار نابتة قبل اتخاذها مقبرة ولم ینبت بعد ذلک لا یخلوا اما ان علم غارسها او لا یعلم ان علم کانت للغارس وان لم یعلم بها غارس فالحکم للقاضی۔

(خلاصة الفتاوی ج ۴ ص۴۱۹ کتاب الوقف الفصل الثالث نوع آخر)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج ۵ ص۲۰۱ کتاب الوقف۔

وقف مشاع کی خرید و فروخت کرنے کا حکم

سوال:۔ اگر چند آدمی کچھ رقم اکٹھی کر کے مسجد کے لیے زمین خریدیں جس کے مالکانہ حقوق بھی ان کو منتقل ہوئے ہوں لیکن اب اس جگہ کو تبدیل کرنے کی ضرورت پڑ گئی ہے، تو کیا یہ اشخاص اس جگہ کو فروخت کر کے کسی دوسری جگہ مسجد کے لیے زمین خرید سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب:۔ چند اشخاص کا مشترکہ طور پر مسجد کے لیے زمین خریدنا وقف مشاع کے حکم میں ہے جو صحیح نہیں، اس لیے صورتِ مذکورہ میں ان اشخاص کی خریدی ہوئی جگہ مسجد کے لیے وقف نہ ہونے کی وجہ سے اس کو فروخت کرنے میں کوئی امر مانع نہیں، ایسی حالت میں بہتر یہ ہے کہ زمین خریدنے سے قبل یہ اشخاص کسی ایک کو رقم ہبہ کر دیں اور موہوب لہٗ اپنی رقم اور موہوبہ رقم ملا کر اس سے زمین خریدے اور بعد ازاں اس کو مسجد کے لیے وقف کر دے، اس طرح کرنے سے اس جگہ کی تبدیلی جائز نہیں ہوگی۔

لما قال فی الهندیة: وقف المشاع المحتمل للقسمة لایجوز عند محمدؒ وبه اخذ مشائخ بخاری وعلیه الفتوی۔ (الفتاوی الهندیة ج۲ ص۳۶۵ فصل فی وقف المشاع)[۱]

مغصوبہ جائیداد کی آمدنی مساجد کی تعمیر کیلئے وقف کرنا

سوال:۔ ایک شخص تقریباً ۶۰ سال سے ایک وسیع جائیداد پر غاصب ہے اور اس جائیداد کی کافی آمدنی ہے، اب اگر یہ شخص اس جائیداد کی آمدنی کا کچھ حصہ مساجد کی تعمیر یا دیگر رفاہ عامہ کے کاموں کے لیے وقف کرے تو کیا شریعت کی رو سے یہ جائز ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ مغصوبہ جائیداد واجب الرد ہے اور ایسی جائیداد کی آمدنی غاصب کیلئے ذاتی طور پر استعمال کرنا حلال نہیں اور نہ ثواب کی نیت سے کسی مسجد یا مفاد عامہ کے لیے وقف کر سکتا ہے، کیونکہ وقف کی صحت کے لیے اس چیز کا مالک ہونا ضروری ہے۔

---

[۱] قال العلامة ابن نجیمؒ: والحاصل ان وقف المشاع مسجداً او مقبرة غیر جائز مطلقاً اتفاقاً۔ (البحر الرائق ج۵ ص۱۹۷ کتاب الوقف)
وَمِثْلُهٗ فی الهدایة ج۲ ص۶۰۱ کتاب الوقف۔

لما قال العلامة التمرتاشیؒ: ھو حبس العین علیٰ ملك الواقف والتصدق بالمنفعة۔ (تنویر الابصار علیٰ ھامش رد المحتار ج ۳ ص۳۹۱ کتاب الوقف) ؎۱

پرانے قبرستان پر مدرسہ تعمیر کرنے کا حکم

سوال:۔ یہاں ایک ایسا قبرستان ہے جس کی تاریخ معلوم نہیں، قبریں بالکل ہموار ہوچکی ہیں، ان کے آثار پر حیوانات چرتے ہیں اور لوگوں کے واسطے بول و براز کا مرکز بن چکا ہے، کیا ایسے قبرستان پر دینی مدرسہ قائم کرنا شریعت کی رُو سے جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر واقعی قبرستان کی موقوفہ زمین پر قبروں کے نشانات نہ ہوں اور پرانا قبرستان ہو اور اس کی زمین بھی ہموار ہوچکی ہو تو چراگاہ بنانے اور بول و براز پھینکنے کے بجائے یہ بہتر اور ضروری ہے کہ اس پر کوئی دینی مدرسہ تعمیر کرلیا جائے۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: ولو بلی المیّت وصار ترابًا جاز دفن غیرہٖ فی قبرہ وزرعه والبناء علیه۔ (رد المحتار ج۱ ص۶۵۹ کتاب الجنائز) ؎۲

جنازہ گاہ میں کنواں کھودنا جائز ہے

سوال:۔ ایک شخص نے اپنی مملوکہ زمین جنازہ گاہ کے لیے وقف کی جبکہ ایک دوسرے شخص نے اس میں ایک کنواں اس غرض سے کھودا کہ لوگ اس کے پانی سے وضو وغیرہ کریں گے، تو کیا اس شخص کا یہ عمل شرعًا درست ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مرقومہ کے مطابق چونکہ کنواں کھودنے والے کا عمل اور ارادہ زمین وقف کرنے والے کے عمل اور ارادے کے منافی نہیں بلکہ کنواں کھودنے والا واقف

؎۱ وقال العلامة ابن نجیم المصریؒ: ھو حبس العین علیٰ ملك الواقف والتصدق بالمنفعة۔ (البحر الرائق ج ۵ ص۱۸۷ کتاب الوقف)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج ۲ ص۳۵۰ کتاب الوقف۔ الباب الاول فی تعریفه۔

؎۲ وقال فی الهندیة: ولو بلی المیت وصار ترابًا جاز دفن غیرہٖ فی قبرہ وزرعه والبناء علیه۔ (الفتاوی الهندیة ج ۱ ص۱۶۷ باب الجنائز)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج ۲ ص۱۹۵ باب الجنائز۔

کے عمل وارادے کے لیے مکمل اور معاون ہے، لہٰذا مذکورہ شخص کا یہ عمل شرعاً درست ہے اس میں کوئی قباحت نہیں۔

لما قال فی الهندیة : الذی یبدأ من ارتفاع الوقف عمارته شرط الواقف ام لا ثم إلی ماهو اقرب إلی العمارة واعم للمصلحة کالامام للمسجد والمدرس للمدرسة ثم السراج و البسط کذلك الی آخر المصالح۔ (الفتاوی الهندیة ج۲ ص۳۶۸۔ الوقف۔ الباب الثانی)[1]

ہبہ کے لفظ سے وقف کرنے کا حکم

سوال :۔ اگر ایک شخص زمین وقف کرتے وقت "ہبہ" کا لفظ استعمال کرے یا یوں کہے کہ میں نے یہ زمین مسجد کو دے دی ہے، کیا اس سے وقف جائز ہے یا نہیں؟ اور کیا یہ زمین وقف متصور ہو گی یا نہیں؟

الجواب :۔ چونکہ "ہبہ" اور "اعطاء" کے لفظ سے بھی دائمی حقوق دیئے جاتے ہیں اس لیے فقہاء کی تصریحات کی روشنی میں "ہبہ" اور "اعطاء" سے بھی وقف صحیح ہے، لہٰذا یہ زمین موقوفہ (وقف شدہ) زمین ہو گی۔

لما قال فی الهندیة : ولو قال وهبت داری للمسجد او اعطیتها له صح ویکون تملیکاً فیشترط التسلیم کما لو قال وقفت هٰذه المائة للمسجد یصح بطریق التملیك اذا سلمه للقیم۔ (الفتاوی الهندیة ج۲ ص۴۶۰ الفصل الثانی فی الوقف علی المسجد)[2]

عیدگاہ میں ہسپتال بنانے کا حکم

سوال :۔ شہر سے باہر لوگوں نے نمازِ عیدین کے لیے ایک میدان مقرر کیا ہے تقریباً نو سال تک

---

[1] وقال العلامة علاؤ الدین الحصکفی رحمه الله : الشعائر التی تقدم شرط ام لم یشرط بعد العمارة هی امام .... وقنادیل وحصر وماء وضوء۔
(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۴ ص۳۷۱ کتاب الوقف)
وَمِثْلُهٗ فی الخانیة علی هامش الهندیة ج۳ ص۳۸۸ قبل کتاب اللقطة۔

[2] قال العلامة عالم بن العلاء الانصاری رحمه الله : ولو قال وهبت داری للمسجد او اعطیتها له صح ویکون تملیکاً فیشترط التسلیم کما لو قال وقفت هٰذه المائة للمسجد۔ (الفتاوی التاتارخانیة ج۵ ص۸۵۳ کتاب الوقف۔ مسائل وقف المساجد)

اس میدان میں نماز عیدین ادا کی گئی ہے، اب حکومت اس جگہ پر ہسپتال بنانے کا ارادہ رکھتی ہے اور عید گاہ کے لیے اس کے بدلے میں ایک دوسری جگہ بھی دینے کو تیار ہے، کیا حکومت کا یہ اقدام شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: اگر مذکورہ عید گاہ موقوفہ ہو تو حکومت کا اس پر ہسپتال وغیرہ بنانا شرعاً جائز نہیں کیونکہ یہ جہت وقف کو تبدیل کرنے کے مترادف ہے جو کہ ناجائز ہے کیونکہ واقف کی شرط شارع کی نص کی طرح ہوتی ہے، البتہ اگر یہ جگہ وقف نہ ہو بلکہ ویسے ہی اس جگہ پر کئی سالوں سے نماز عیدین پڑھی جا رہی ہو تو اس صورت میں اس کو دوسرے مقاصد کے لیے استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامۃ ابن عابدینؒ: فان شرائط الواقف معتبرۃ اذا لم تخالف الشرع و هو مالك فله ان يجعل ماله حيث شاء مالم يكن معصية۔[1]

(رد المحتار ج ۴ ص ۳۹۵ کتاب الوقف۔ مطلب ما خالف شرط الواقف)

واقف کی شرط کے اعتبار کا حکم

سوال: اگر ایک شخص مسجد سے ملحقہ اپنی ۲ دو مرلہ زمین اس شرط پر مسجد کے لیے وقف کرے کہ مسجد سے ملحقہ ایک دوسرا پلاٹ خرید کر اس پر جنازہ گاہ بنایا جائے گا، اور اگر کسی وجہ سے ملحقہ پلاٹ نہ مل سکے تو کیا یہ شخص اپنی دو مرلہ زمین کی واپسی کا حق رکھتا ہے یا نہیں؟

الجواب: جو زمین واقف نے کسی شرط کے ساتھ وقف کی ہو اور وہ شرط پوری نہ ہو سکتی ہو تو واقف اپنی زمین کو واپس لینے کا شرعاً مجاز ہے، لہٰذا موصوف اپنی ۲ دو مرلہ زمین واپس لے سکتا ہے۔

لما قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ: و ما خالف شرط الواقف فهو خالف للنص وهو حكم لا دليل عليه سواء كان نصه فى الوقف نصاً

---

[1] ولما قال العلامۃ ابن البزاز رحمہ اللہ: شرط الواقف كنص الشارع مالم تخالف الشرع۔ (الفتاوى البزازية على هامش الهندية ج ۶ ص ۲۵۱ الباب الثانى فى نصب المتولى وما يمكه اولا ---- كتاب الوقف)
ومثلہٗ فى الدر المختار على صدر رد المحتار ج ۴ ص ۴۵۶ کتاب الوقف۔

او ظاهراً وهذا موافق لقول مشائخنا كغيرهم شرط الواقف كنص الشارع فيجب اتباعه۔ (رد المحتار ج۴ ص۴۹۵ کتاب الوقف، مطلب ما خالف شرط الواقف)[1]

قبرستان کے لیے موقوفہ زمین میں تصرف کرنا

سوال:۔ ایک شخص نے اپنی مملوکہ زمین قبرستان کے لیے وقف کر دی، واقف کے فوت ہونے کے ۳۵/۳۶ سال بعد اس کے بیٹے نے موقوفہ زمین میں کچھ یوں تصرف کیا کہ جسے چاہتا ہے میت دفن کرنے دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے روک دیتا ہے، اس کے علاوہ وقف شدہ زمین کے کچھ حصہ میں فصل بھی کاشت کرتا ہے، اب سوال یہ ہے کہ والد کی موقوفہ زمین میں بیٹے کا کسی قسم کا تصرف کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ صورتِ مذکورہ میں واقف کا بیٹا باپ کی وفات کے بعد اس موقوفہ زمین میں کسی قسم کے تصرف کرنے کا حق دار نہیں رہتا، اس لیے کہ ایک دفعہ وقف تام ہونے کے بعد زمین مالک کی ملک سے نکل جاتی ہے جس کے بعد واقف اور اس کے ورثاء کو تصرف کا کوئی حق نہیں رہتا۔

لما قال العلامة فخر الدين الزيلعي رحمه الله: وعند ابي يوسف يزول ملكه بالقول و عند محمد اذا ستسقى الناس عن السقاية وسكنوا الخان والرباط ودفنوا في المقبرة زال الملك الخ۔ (تبيين الحقائق ج۳ ص۳۳۱ کتاب الوقف)[2]

---

[1] قال العلامة ابن نجيم: شرط الواقف يجب اتباعه لقولهم شرط الواقف كنص الشارع۔ (الاشباه والنظائر ج۲ ص۲۲۸ کتاب الوقف)

وَمِثْلُهٗ فی مجموعة الفتاوی ج۲ ص۱۰۱ کتاب الوقف۔

[2] وقال فی الهندية: من جعل ارضه مقبرة لم يزل ملكه عن ذلك حتى يحكم به الحاكم عند ابي حنيفة وعند ابي يوسف يزول ملكه بالقول كما هو اصله ..... ودفنوا في المقبرة زال الملك ويكتفى بواحد ذكر في المبسوط ان الفتوى على قولهما في هذه المسائل وعليه الاجماع۔

(الفتاوى الهندية ج۲ ص۴۶۴ الباب الثانی عشر فی الرباطات والمقابر)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۵ ص۲۵۳ کتاب الوقف۔

جنازہ گاہ سے راستہ جدا کرنے کا حکم

سوال:- ایک شخص نے جنازہ گاہ کے لیے تین کنال زمین وقف کر دی اور وقف تام بھی ہو گیا ہے، لیکن اب اس وقف شدہ زمین میں راستہ کی اشد ضرورت ہے، تو کیا شریعت کی رُو سے اس سے راستہ جدا کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:- اگر مذکورہ زمین کو وقف کرنے کے بعد نماز جنازہ کے لیے استعمال کیا گیا اگرچہ ایک دفعہ ہی کیوں نہ ہو تو اس سے وقف اب وقف تام ہو گیا ہے اب اس کا استعمال راستہ وغیرہ کے لیے شرعاً جائز نہیں۔

لما قال العلامة التمرتاشی رحمه الله: فاذا تم ولزم (ای الوقف) لا یملك ولا یعار ولا یرهن (ای لا یقبل التملیك لغیره بالبیع)۔[1]

(تنویر الابصار علیٰ صدر رد المحتار ج۴ ص۳۷۲ کتاب الوقف)

وقف غیر تام کے استبدال کا حکم

سوال:- ایک شخص نے مسجد کے لیے زمین وقف کی ہے جبکہ اس کے قریب ہی ایک اور مسجد موجود ہے لیکن پھر بھی اس جگہ پر مسجد بنانے میں فائدہ ہے، لہٰذا اگر یہ شخص اس زمین کے بدلے جس پر ابھی تک مسجد نہیں بنائی گئی ہے کسی دوسری جگہ مسجد بنالے تو شرعاً درست ہوگا یا نہیں؟

الجواب:- مسجد کی زمین کے وقف تام ہونے کے لیے یہ شرط ہے کہ اس کا راستہ الگ کر کے عام لوگوں کو اس میں نماز پڑھنے کی اجازت دے کر اذان اور اقامت سے کم از کم ایک دفعہ نماز باجماعت ادا ہو جائے چونکہ صورتِ مذکورہ میں یہ اقدامات نہیں ہوئے ہیں، لہٰذا یہاں وقفِ تام نہ ہونے کی وجہ سے مالکِ زمین اس میں ہر قسم کا تصرف کر سکتا ہے، اور جب کسی زمین پر ایک دفعہ باقاعدہ شرعی مسجد بن جائے تو ایسی جگہ کو مسجد کے علاوہ دوسرے مقاصد کے لیے استعمال میں نہیں لائی جا سکتی۔

---

[1] قال العلامة برهان الدین المرغینانی رحمه الله: اذا صح الوقف لم تجز بیعه ولا تملیکه۔ (الهدایة ج۲ ص۶۴۰ کتاب الوقف)
ومثله فی بدائع الصنائع ج۶ ص۲۲۱ کتاب الوقف۔

لما قال العلامة ابن نجیمؒ : ومن بنی مسجداً لم یزل ملکہ عنہ حتی یفرزہ عن ملکہ بطریقہ ویأذن بالصلوٰۃ فیہ واذا صلی فیہ واحد زال ملکہ۔
(البحر الرائق ج ۵ ص۲۴۸ الوقف فصل فی احکام المسجد) لہ

وقف کے مملوکہ ہونے کا حکم

سوال:- کسی نے مسجد کے واسطے زمین وقف کردی اور اس پر مسجد بناکر اس میں نماز باجماعت بھی ادا کی گئی، کیا یہ موقوفہ زمین مسجد کے بانی کی ملکیت متصور ہوسکتی ہے یا نہیں ؟

الجواب:- مساجد اللہ تعالیٰ کی بندگی کے واسطے بنائی جاتی ہیں، اسکی زمین پر باقاعدہ مسجد بن جانے کے بعد وہ اللہ تعالیٰ کی ملکیت بن جاتی ہے، اس لیے مذکورہ موقوفہ زمین کسی کی ملکیت میں نہیں آسکتی۔

لما قال فی الھندیۃ : وعندھما حبس العین علی مِلکِ اللہِ تعالیٰ علی وجہ تعود منفعتہ الی العباد فیلزم ولا یباع ولا یوھب ولا یورث۔
(الفتاوی الھندیۃ ج ۲ ص۳۵۰ کتاب الوقف) ۲ہ

موقوفہ زمین میں فلش بنانے کا حکم

سوال:- مسجد کے احاطہ میں جو جگہ نماز کے لیے متعین نہ ہوتی ہو بلکہ چپلوں (جوتوں) اور

لہ لما قال العلامۃ المرغینانی رحمہ اللہ۔ واذا بُنی مسجداً لم یزل ملکہ عنہ حتی یفرزہ عن ملکہ بطریقہ ویأذن للناس بالصّلوٰۃ فیہ واذا صلّی فیہ واحد زال عن ملکہ۔ الخ۔ (الھدایۃ ج ۲ ص۶۴۴ کتاب الوقف)
وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج ۲ ص۴۵۴ الوقف، الباب الحادی عشر فی المسجد۔

۲ہ وقال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ : وعندھما حبسھا علی حکم ملک اللہ تعالیٰ وصرف منفعتھا علی من أحب وعلیہ الفتویٰ قولہ علی حکم ملک اللہ تعالیٰ قدر لفظ الحکم لیفید ان المراد لم یبق علی مِلک الواقف ولو انتقل اِلیٰ ملک غیرہ وقولہ وعلیہ الفتویٰ ای علی قولھما یلزمہ۔
(ردالمحتار ج ۴ ص۳۳۸ کتاب الوقف)
وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج ۵ ص۱۸۷ کتاب الوقف۔

استنجا خانوں وغیرہ کے لیے متعین نہ ہو اُس میں فلش (لیٹرین) بنانا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: مسجد کے احاطہ میں جو جگہ نماز کے لیے متعین نہ ہو بلکہ جُوتوں، استنجا خانوں اور غسلخانوں وغیرہ کے لیے مختص ہو تو اس میں فلش (لیٹرین) بنانا جائز ہے۔

لما قال العلامة شہاب الدین احمد رحمہ اللہ: لوجعل تحتہ حانوتا وجعلہ وقفاً علی المسجد قیل لا یستحب ذٰلک ولکنہ لو جعل فی الابتداء ھٰکذا صار مسجداً وقفاً علیہ ویجوز المسجد والوقف الذی تحتہٗ۔

(شلبی علی ھامش تبیین الحقائق ج۳ ص۳۳۰ کتاب الوقف) [۱]

موقوفہ زمین میں وراثت جاری نہ ہونے کا حکم

سوال: ایک شخص نے اپنی زمین کا کچھ حصہ اہل محلہ کی ضروریات کے لیے وقف کرکے ایک شخص کے حوالے کر دیا تھا، کیا واقف کی وفات کے بعد اس کے ورثاء یہ زمین واپس لے سکتے ہیں یا نہیں؟ جبکہ اہالیانِ محلہ کو اب بھی اس کی ضرورت ہے اور متعلقہ متولی بھی فوت ہو گیا ہے؟

الجواب: وقف تام ہونے کے بعد واقف یا متولی کی وفات سے وقف پر کوئی اثر نہیں پڑتا جب تک اہلِ محلہ کو اس کی ضرورت ہو تو واقف کے فیصلہ کی رعایت ہوگی، واضح ہو کہ موقوفہ زمین میں ارث جاری نہیں ہوتا۔

لما قال العلامة علاؤ الدین الحصکفی رحمہ اللہ: فلا یجوز لہٗ ابطالہ

---

[۱] لما قال العلامة ابن نجیم المصری رحمہ اللہ: وبما ذکرناہ علم انہٗ لو بنی بیتاً علی سطح المسجد لسکنی الامام فانہٗ لا یضر فی کونہ مسجداً لانہٗ من مصالح المسجد ...... اذا بنی مسجداً وبنی غرفة وھو فی یدہٖ فلہٗ ذٰلک وان کان حین بناہ خلی بینہ وبین الناس ثم جاء بعد ذٰلک یبنی لا یترکہ وفی جامع الفتاویٰ اذا قال عنیت ذٰلک فانہٗ لا یصدق۔

(البحر الرائق ج۵ ص۲۵۱ الوقف، فصل فی احکام المسجد)

وَمِثْلُہٗ فی تبیین الحقائق ج۳ ص۳۳۰ کتاب الوقف۔

ولا یورث عنه وعلیه الفتویٰ ابن الکمال وابن الشحنة۔
(الدر المختار علیٰ هامش رد المحتار ج۳ ص۳۹۲ کتاب الوقف) [1]

متروکہ جائیداد میں وقف پر اقرار کا حکم

سوال:۔ ایک شخص فوت ہوگیا اور کچھ جائیداد ترکہ میں رہ گئی، اس کے ورثاء میں ایک بیٹا یہ اقرار کرتا ہے کہ والد صاحب نے یہ زمین باقاعدہ وقف کی تھی جبکہ باقی ورثاء اس سے انکار کر رہے ہیں، اندریں حالات کیا تمام جائیداد وقف متصوّر ہوگی یا یہ مقر کے حصہ تک محدود رہے گی؟

الجواب:۔ مذکورہ صورت میں اقرار حجتِ قاصرہ بھی ہے اور دوسرے پر اقرار بھی، جوکہ صحیح نہیں اس لیے مقر کا اقرارِ وقف صرف اس کے حصہ تک محدود رہے گا اور دوسرے ورثاء پر اس کا اقرار حجت نہیں بن سکتا، وہی حصہ موقوف رہے گا جو مقر کے حصہ میں آئے۔

لما قال فی الهندیة: ولو اقرّ بالوقف الیٰ..... وان کان مع المقر وارث آخر یجحدُ ذلك کان نصیب الجاحد من هٰذه الارض للجاحد یفعل ما یشآء ونصیب المقرّ یکون وقفًا علیٰ ما اقرّ به۔ (الفتاویٰ الهندیة ج۲ ص۴۴۲ الوقف، الباب الثامن فی الاقرار) [2]

---

[1] وقال فی الهندیة: وکذٰلك اذا جعل داره فی ثغر مسکنا للغزاة او المرابطین ودافعها الیٰ وال یقوم علیها فلیس له ان یرجع فیها وان مات لم تکن میراثًا عنه وان لم یسکنها احد۔ (الفتاویٰ الهندیة ج۲ ص۴۶۶ الباب الثانی عشر فی الرباطات)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۵ ص۲۰۶ کتاب الوقف۔

[2] وقال العلامة عالم بن العلاء الانصاری رحمه الله: واما اذا کان ثمة وارث آخر فان اقر الآخر بجمیع ما اقر به هٰذا الوارث کان الجواب کما قلنا وان انکر الوقف کان نصیب المنکر ملکًا له یتصرف فیه بما شآء ونصیب المقر وقفٌ۔ (الفتاویٰ التاتارخانیة ج۵ ص۷۴۳ کتاب الوقف الاقرار بالوقف)

وَمِثْلُهٗ فی خلاصة الفتاویٰ ج۴ ص۴۲۰ کتاب الوقف، قبل الفصل الرابع فی المسجد۔

باب المساجد

(مساجد میں وقف کے احکام و مسائل)

وقف کی یادداشت (تحریر) لکھنے کا حکم

سوال:۔ ایک شخص مسجد کے لیے زمین کا ایک ٹکڑا وقف کرنا چاہتا ہے، اگر وہ بطورِ یادداشت یہ لکھے کہ میں نے زمین کا یہ ٹکڑا مسجد کے واسطے وقف کیا، تو ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔کسی واقعہ کا تحریر میں لانا دوام اور استحکام کی دلیل ہے، عرف میں بھی جس واقعہ کو ضبطِ تحریر میں لایا جائے یا سرکاری کاغذات میں اندراج کیا جائے تو وہ زیادہ قوی سمجھا جاتا ہے، اس لیے وقف کو یادداشت کے لیے لکھنا یا سرکاری کاغذات میں انتقال کرنا صرف جائز ہی نہیں بلکہ ایک مستحسن اقدام ہے تاکہ بعد میں کسی وارث کو انکار کی گنجائش نہ رہے۔ لما قال اللہ تبارك وتعالیٰ: إِذَا تَدَايَنتُم بِدَيْنٍ فَاكْتُبُوهُ۔ (سورۃ البقرۃ آیت ۲۸۲)

ولما قال العلامة حافظ عماد الدین رحمہ اللہ: ھذا ارشاد منه تعالیٰ لعباده المؤمنین اذا تعاملوا بمعاملات مؤجلة ان یکتبوھا لیکون ذلك احفظ لمقدارھا ومیقاتھا واضبط للشاھد فیھا وقد نبه علیٰ ھذا فی آخر الآیة۔

(تفسیر ابن کثیر ج۱ ص۳۵۸ سورۃ البقرۃ پ۳)

مسجد کے لیے موقوفہ زمین پر دوکانیں تعمیر کرنے کا حکم

سوال:۔ گاؤں کے چند معزز ین نے ایک پلاٹ تقریباً ۶ کنال برائے جامع مسجد وقف کیا، جس میں ایک جامع مسجد تعمیر کی گئی

لہ وقال العلامة اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ:۔ معاملہ کا لکھنا جمہور علماء کے نزدیک مستحب ہے۔ (بیان القرآن ج۱ ص۱۶۸ سورۃ البقرۃ آیت ۲۸۲)

وَمِثْلُهٗ فی تفسیر فتح القدیر ج۱ ص۳۰ سورۃ البقرۃ۔

مسجد کی تعمیر سے بچ جانے والی زمین بنجر ہے جسے لوگ عیدین کی نماز کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اب اُن معززین نے فیصلہ کیا ہے کہ اس بنجر زمین پر دوکانیں یا کچھ مکانات بنا دیئے جائیں اور ان سے حاصل ہونے والی آمدنی کو مسجد پر صرف کیا جائے۔ تو کیا شریعت کی رو سے یہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مذکورہ پلاٹ کے جس حصہ پر باقاعدہ مسجد بن گئی ہے خواہ اس میں مستقل چھت ڈالی گئی ہے یا عارضی چبوترہ بنا کر اس میں نماز پڑھی جارہی ہو یا ویسے ہی کھلی جگہ ہو ایسی جگہ میں دوکانیں بنانا یا مسجد کے علاوہ دوسرے مقاصد کے لیے اسے استعمال کرنا جائز نہیں، البتہ مسجد کے نام سے جو زمین وقف کی گئی ہے اور اس میں کچھ حصہ ویسے ہی غیر آباد چھوڑا گیا ہے اور تاحال اس پر آبادی نہیں ہوئی ہے تو وہ جگہ مسجد کے علاوہ مذکورہ مقاصد کے لیے استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

لما قال فی الهندیة: قیم المسجد لا یجوز له ان یبنی حوانیت فی المسجد او فی فنائه لان المسجد اذا جعل حانوتاً و مسکناً تسقط حرمته وهذا لا یجوز والفناء تبع المسجد فیکون حکمه حکم المسجد۔ (الفتاوی الهندیة ج۲ ص۴۶۲ کتاب الوقف۔ الفصل الثانی فی الوقف علی المسجد وتصرف القیم وغیره فی مال الوقف علیه)[1]

ہندوؤں کی متروکہ جائیداد پر مسجد بنانے کا حکم

سوال:۔ قیام پاکستان کے بعد یہاں پر ہندوؤں کی کچھ جائیدادیں رہ گئی ہیں جن پر کچھ لوگ قابض ہیں، بعض لوگوں کا تو قانونی قبضہ ہے اور بعض لوگ غیر قانونی طور پر محض قوت کے بل بوتے پر قابض ہیں، کیا ایسی متروکہ جائیداد پر مسجد بنانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ صورت مسئولہ میں حکومت نے قانونی طور پر جن قابضین کا حق تسلیم کرکے انہیں مالکانہ حقوق دیئے ہوں تو وہ جائز مالک متصور ہو کر ان کا وقف صحیح ہے

---

[1] وقال العلامة ابن الهمامؒ: قیم المسجد اذا اراد ان یبنی حوانیت فی المسجد او فی فنائه لا یجوز له ان یفعل لانه اذا جعل المسجد سکناً تسقط حرمة المسجد واما الفناء فلانه تبع للمسجد۔ (فتح القدیر ج۵ ص۴۴۶ کتاب الوقف۔ الفصل الاول فی المتولی) ومثله فی التاتارخانیة ج۵ ص۸۶۰ کتاب الوقف۔ الفصل الحادی والعشرون فی المساجد۔

لیکن جس جائیداد پر کسی کا غاصبانہ قبضہ ہو تو مغصوبہ جائیداد کے وقف کی عدم صحت کی وجہ سے اس پر بنائی ہوئی مسجد شرعی مسجد نہیں رہے گی الّا یہ کہ حکومت باقاعدہ اجازت دے دے۔

لما قال العلامة ابن نجیم رحمہ اللہ : من شرائطہ الملک وقت الوقف حتّٰی لو غصب ارضًا فوقفھا .... لا تکون وقفًا۔

(البحر الرائق ج ۵ ص ۱۸۸ کتاب الوقف) [1]

مسجد کی زمین سے مِلک کے زائل ہونے کا حکم

سوال :- مسجد کی زمین سے مالک کی مِلک کا ازالہ کب ہو جاتا ہے؟

الجواب :- مسجد کی زمین سے مالک کی ملک صرف نماز کی اجازت پر اسی مسجد میں یا انہی الفاظ کے معنی پر ملک زائل ہو جاتی ہے، اور یہی امام ابو یوسفؒ کا قول ہے اور وقفاً کے باب اور وقت میں اس کا قول راجح ہو جاتا ہے۔

وقال العلامۃ ابن نجیم رحمہ اللہ : وقال ابو یوسفؒ یزول مِلکہ بقولہ جعلتہ مسجداً لان التسلیم عندہ لیس بشرط لانہ اسقاط لملک العبد فیصیر خالصاً لِلّٰہِ تعالٰی بسقوط حق العبد وصار کالاعتاق۔

(البحر الرائق ج ۵ ص ۲۴۸ کتاب الوقف۔ فصل فی احکام المسجد) [2]

منہدم مسجد کی تبدیلی کا حکم

سوال :- ایک مسجد کسی وجہ سے شہید ہو گئی ہے، اب گاؤں والے یہ چاہتے ہیں کہ اسکے

---

[1] وقال فی الھندیۃ : (ومنھا) الملک وقت الوقف حتّٰی لو غصب ارضا فوقفھا .... لا تکون وقفًا۔ (الفتاوی الھندیۃ ج ۲ ص ۳۵۳ کتاب الوقف بطلب فی وقف الذی)

وَمِثْلُہٗ فی رد المحتار ج ۴ ص ۳۸۱ کتاب الوقف۔

[2] وقال العلامۃ طاھر بن عبد الرشید البخاریؒ : وعند ابی یوسفؒ یزول بمجرد قول الواقف ولا یجوز بیعہ ولو مات لا یورث۔ (خلاصۃ الفتاوی ج ۴ ص ۴۰ کتاب الوقف الاول)

وَمِثْلُہٗ فی بدائع الصنائع ج ۶ ص ۲۲۰ کتاب الوقف والصدقۃ۔

بدلے میں کسی دوسری جگہ مسجد تعمیر کرلی جائے اور اس مسجد کا ملبہ اور زمین وغیرہ فروخت کر دیا جائے، تو کیا شریعت کی رُو سے منہدم مسجد کا سامان اور جگہ وغیرہ بیچنا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ جو زمین مسجد کے لیے وقف ہو اور اس پر مسجد بن گئی ہو تو وہ قیامت تک مسجد ہی رہے گی اس کی تبدیلی کسی صورت میں بھی جائز نہیں۔

لما قال العلامة المرغيناني رح: واذ صح الوقف لم يجز بيعه ولا تمليكه۔

(الهداية ج ۲ ص ۶۴۰ كتاب الوقف) [۱]

ارضِ مغصوبہ پر مسجد بنانے کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے غیر مملوکہ زمین مسجد کے لیے وقف کی، لوگوں نے اس میں تقریباً ۸/۹ سال تک نمازیں بھی پڑھیں، ۸/۹ سال بعد زمین کے اصل مالک نے دعویٰ کیا کہ یہ زمین میری ہے اور میں نے اس کو مسجد کے لیے وقف نہیں کیا ہے، لوگوں نے کہا کہ آپ اس کے بدلہ میں دوسری جگہ لے لیں اور مسجد کو اپنی جگہ پر رہنے دیں لیکن وہ نہیں مانتا، تو اب شریعت کی رُو سے اس مسجد کا کیا حکم ہے ؟

الجواب:۔ وقف کے لیے باقاعدہ ملک تام ہونا شرط ہے، جہاں کہیں کسی غیر کی زمین کو بغیر اس کی اجازت کے مسجد کے طور پر استعمال کیا جائے تو وہ شرعی مسجد کے حکم میں نہیں، اس لیے مالک اگر چاہے تو وقف کر سکتا ہے ورنہ مغصوبہ زمین سے مسجد گرا کر زمین فارغ کرانا مالک کا حق ہے۔

لما في الهندية: (ومنها) الملك وقت الوقف حتى لو غصب ارضا فوقفها ثم اشتراها من مالكها ودفع الثمن اليه او صالح على مال دفعه اليه لا تكون وقفاً۔ (الفتاوى الهندية ج ۲ ص ۳۵۳ كتاب الوقف مطلب في وقف لازم) [۲]

---

[۱] وقال العلامة التمرتاشي رح: فاذا تم ولزم (اى الوقف) لا يملك ولا يعار ولا يرهن) اى لا يقبل التمليك لغيره بالبيع۔ (تنوير الابصار على هامش رد المحتار ج ۴ ص ۳۵۲ كتاب الوقف)

وَمِثْلُهٗ في بدائع الصنائع ج ۶ ص ۲۲۰ كتاب الوقف۔

[۲] وقال العلامة ابن نجيم رح: من شرائطه الملك وقت الوقف حتى لو غصب ارضا فوقفها......لا تكون وقفاً۔ (البحر الرائق ج ۵ ص ۱۸۸ كتاب الوقف)

وَمِثْلُهٗ في رد المحتار ج ۴ ص ۳۸۱ كتاب الوقف۔

موقوفہ زمین کو مسجد کے مصالح میں استعمال کرنے کا حکم

سوال:- ایک شخص نے مسجد کے لیے زمین وقف کی جس پر ابھی تک نماز نہیں پڑھی گئی ہے، کیا یہ زمین مسجد کے مصالح مثلاً دوکان وغیرہ کے لیے استعمال کر سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب:- جو زمین مسجد کیلئے وقف کی گئی ہو اور اس پر نماز بھی نہیں پڑھی گئی ہو تو اس کو مسجد کے مصالح پر صرف کرنا شریعت کی رُو سے جائز ہے۔

لما قال فی الھندیۃ: والاصح ما قال الامام ظھیر الدینؒ ان الوقف علی عمارۃ المسجد وعلی مصالح المسجد سواءٌ۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۵ ص۴۵۰ کتاب الوقف، الفصل الاول فی المتولی)[1]

مسجد کی زمین پر گھر بنانے کا حکم

سوال:- ایک شخص نے مسجد کے لیے کچھ زمین وقف کی، اور اس پر مسجد بھی بنادی گئی، لیکن اب یہ مسجد گاؤں کے لیے ناکافی ہے، کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اس مسجد کے بدلے دوسری جگہ جس میں مسجد کے متعلقہ تمام انتظامات وسہولیات ہوں، وقف کی جائے اور پرانی مسجد کی جگہ مکان بنالیا جائے، تو کیا شریعت کی رُو سے ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- جس زمین پر ایک مرتبہ مسجد بن گئی اور اس میں نماز بھی پڑھی گئی تو وہ شرعی مسجد کے حکم میں ہے اس کو کسی دوسرے مقاصد کے لیے استعمال کرنا جائز نہیں بلکہ اس کو اپنی اصلی حالت پر مسجد کی حیثیت سے باقی رکھا جائے گا۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ: یبقی مسجداً ابداً الی قیام الساعۃ وبہ یفتی۔ وقال ابن عابدینؒ فلا یعود میراثاً ولا یجوز نقلہ ونقل مالہ الی مسجد آخر سواء کانوا یصلون فیہ اولا وھو الفتوی۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۴ ص۳۵۸ کتاب الوقف، مطلب فیما لو خرب المسجد او غیرہ)[2]

---

[1] وقال العلامۃ ابن الھمامؒ: ان الوقف علی عمارۃ المسجد و مصالح المسجد سواء۔ (فتح القدیر ج۵ ص۴۵۰ کتاب الوقف) وَمِثْلُہٗ فی رد المحتار ج۳ ص۴۱۲ کتاب الوقف۔

[2] وقال العلامۃ ابوبکر الکاسانیؒ: واما الذی یرجع الی نفس الوقف فھو التابید وھو ان یکون مؤبداً حتی لو وقت لم یجز لانہ ازالۃ الملک لا الی حد۔ (بدائع الصنائع ج۶ ص۲۲۰ کتاب الوقف والصدقۃ، فصل واما شرائط الجواز) ــــ وَمِثْلُہٗ فی الھدایۃ ج۲ ص۶۳۹ کتاب الوقف۔

مسجد سے پرندوں کے گھونسلے اتارنے کا حکم

سوال: بعض اوقات پرندے مساجد میں اپنے لیے گھونسلے بناتے ہیں اور ان میں انڈے اور بچے وغیرہ بھی دیتے ہیں جس کی وجہ سے مساجد میں کافی گندگی پھیل جاتی ہے، تو کیا شریعت کی رُو سے ان کے گھونسلے اُتار کر باہر پھینکنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: چونکہ پرندوں کے گھونسلوں سے مساجد میں عموماً گندگی پھیلتی رہتی ہے نیز نمازیوں کو بھی اس سے تکلیف ہوتی ہے، اس لیے مساجد سے ایسے گھونسلوں کا اکھاڑنا مرخص ہے۔

لما قال فی الهندیة: ولو کان فی المسجد عش خطاف او خفاش یقذر المسجد لا بأس برمیه بما فیه من الفراخ۔ (الفتاوی الهندیة ج۵ ص۳۲۱ کتاب الکراهیة، الباب الخامس)[1]

مسجد میں ذکر بالجہر کرنے کا حکم

سوال: بعض لوگ جمعرات کی شب اکٹھے ہو کر مسجد میں ذکر بالجہر کرنے کے ساتھ ساتھ اُچھلتے اور کودتے ہیں جس کی وجہ سے نمازیوں کو کافی تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے، تو کیا ان لوگوں کا یہ عمل (ذکر بالجہر) شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب: مسجد مسلمانوں کی مشترکہ عبادت گاہ ہے، اس لیے اس میں ذکر کے نام پر مذکورہ طرز اور طریقہ پر اچھلنا کودنا اور ایک ہنگامہ کی سی صورت اختیار کرنا شریعت کی رُو سے ناجائز اور ممنوع ہے، البتہ اگر ذاکرین ایسا طریقہ اختیار کریں کہ جس سے نمازیوں وغیرہ کو تکلیف نہ ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: وفی الملتقیٰ وعن النبی صلی الله علیه وسلم انه کره رفع الصوت عند قرأة القرآن والجنازة فما ظنك به عند الغناء الذی یسمونه وجدا ومحبة فانه مکروه لا اصل له فی الدین

---

[1] وقال العلامة الحصکفیؒ: ولا بأس برمی عش خفاش وحمام لتنقیته۔
(الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۱ ص۶۶۳ کتاب الصلوٰة، مطلب فیمن سبقت ... الخ)
وَمِثْلُهٗ فی البزازیة علیٰ هامش الهندیة ج۶ ص۳۷۲ کتاب الکراهیة، الفصل التاسع فی المتفرقات۔

وزاد فی الجوھرۃ وما یفعلہ متصوفۃ فی زماننا حرام لایجوز القصد والجلوس إلیہ۔ (رد المحتار ج۶ ص۳۴۹ کتاب الحظر والاباحت۔ قبل فصل فی اللبس) ؎۱

مسجد کے جملہ امور میں تصرّف کرنے میں بانیٔ مسجد کو دوسروں پر فوقیت حاصل ہے

سوال:۔ ایک شخص نے موقوفہ زمین پر اپنے پیسوں سے مسجد بنائی، بعد میں کچھ لوگ باہر سے آکر اس مسجد کے قریب آباد ہوگئے، اب بانیٔ مسجد اور اہلِ محلہ میں اختلافات پیدا ہوگئے ہیں، دریافت طلب امر یہ ہے کہ مسجد کے جملہ امور میں تصرف کرنے کا زیادہ مستحق کون ہے؟ بانیٔ مسجد یا اہلِ محلہ؟

الجواب:۔ مسجد بنانے والا اہلِ محلہ کی نسبت مسجد کے تمام امور میں تصرف کرنے پر مقدم ہے کیونکہ بانی کو مسجد کی مرمت، بجلی، پانی کے اخراجات اور امام ومؤذن کے مقرر کرنے میں اہلِ محلہ پر سبقت حاصل ہے۔

لما قال العلامۃ ابراھیم الحلبی رحمہ اللہ: رجلٌ بنی مسجداً وجعلہ للہ فھو احق بمرمتہ وعمارتہ وبسط البواری والحصیر والقنادیل والاذان والاقامۃ والامامۃ فیہ ان کان اھلاً لذٰلک وان لم یکن فالرأی فی ذٰلک الیہ وکذا ولد البانی وعشیرتہ من بعدہ اولیٰ من غیرھم۔ (حلبی کبیری ص۶۱۵ فصل فی احکام المسجد) ؎۲

؎۱ وقال العلامۃ حموی رحمہ اللہ: واجمع العلماء سلفاً وخلفاً علیٰ استحباب ذکر اللہ تعالیٰ جماعۃ فی المساجد وغیرھا من غیر نکیر الا ان یشوش جھرھم بالذکر علیٰ نائم او مصلٍ او قاریٍ کما ھو مقرر فی کتب الفقہ۔

(عیون البصائر حاشیۃ الاشباہ والنظائر ج۴ ص۶۱ القول فی احکام المسجد)

وَمِثْلُہٗ فی التاتارخانیۃ ج۵ ص۲۲۴ کتاب السیر۔ الفصل الاول فی بیان صفۃ الجھاد۔

؎۲ وقال العلامۃ ابن نجیم المصری رحمہ اللہ: فیکون اولیٰ بولایۃ لمن اتخذ مسجداً یکون اولیٰ بعمارتہ ونصب المؤذن فیہ۔

(البحر الرائق ج۵ ص۲۲۶ کتاب الوقف)

وَمِثْلُہٗ فی الاشباہ والنظائر ج۲ ص۲۳۳ کتاب الوقف۔

غیر آباد مسجد کی زمین زراعت کے لیے استعمال کرنا جائز نہیں

سوال:۔ خدانخواستہ اگر کوئی مسجد ویران ہو جائے اور لوگ اس میں نمازیں پڑھنا چھوڑ دیں تو اس کی زمین زراعت کے لیے استعمال کرنا از روئے شریعت درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جس زمین پر ایک دفعہ شرعی مسجد بن جائے تو قیامت تک کے لیے وہ مسجد ہی رہتی ہے اس میں کسی قسم کی فصل کاشت کرنا یا کسی دوسرے دنیاوی کام کے لئے استعمال کرنا شرعاً ناجائز ہے اگرچہ ویران ہی ہو جائے۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: یبقٰی مسجداً ابداً الٰی یوم القیامۃ وبہ یفتٰی۔

(الدر المختار علیٰ ھامش رد المحتار ج۴ ص۳۵۸ الوقف۔ مطلب فیما لو خرب المسجد)

مسجد کے لیے موقوفہ مکانات میں سے تبلیغی حضرات کے لیے مکان وقف کرنے کا حکم

سوال:۔ ایک جامع مسجد بناتے وقت ابتداءً مسجد کے نیچے کچھ مکانات تعمیر کر کے کرائے پر دے دیئے گئے اور ان کی آمدنی مسجد کی ضروریات پر صرف ہو رہی ہے، اب مسجد کی موجودہ انتظامیہ نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ان مکانات میں سے ایک مکان تبلیغی حضرات کے لیے وقف کیا جائے تو کیا عند الشرع یہ وقف جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ صورت مسئولہ میں اگر ان واقفین نے مکانات کے متعلق کوئی تصریح نہ کی ہو بلکہ مطلقاً وقف کیا ہو تو متولی اور انتظامیہ مسجد کے اہلِ حل وعقد کے لیے ایسا کرنا جائز ہے، وہ اس مکان کو تبلیغی حضرات کی سکونت کے لیے استعمال کر سکتے ہیں ورنہ واقفین کی شرائط کی پابندی ضروری ہے۔

لما قال العلامۃ عالم بن العلاء الانصاریؒ: قال واذا اراد القیم ان یبنی

ؔ وقال العلامۃ الکاسانیؒ: واما الذی یرجع الٰی نفس الوقف فھو التابید وھو ان یکون مؤبداً حتٰی لو وقت لم یجز لانہ ازالۃ الملک لا الٰی حد۔

(بدائع الصنائع ج۶ ص۲۲۰ کتاب الوقف والصدقۃ۔ الفصل واما شرائط الجواز)

وَمِثْلُہٗ فی الھدایۃ ج۲ ص۶۳۹ کتاب الوقف۔

فیہا قریۃ لاکرتہا وحفاظہا فیحرز فیہا الغلۃ لحاجتہ الی ذلک کان لہ ان یفعل ذلک۔ .الفتاوی التاتارخانیۃ ج۵ ص۷۴۵ کتاب الوقف۔ الفصل السابع فی تصرف القیم۔ الخ[1]

مسجد کے لیے وقف شدہ گھڑی کسی کی ملکیت نہیں ہو سکتی

سوال: کسی جگہ پر فوج کے دو یونٹ اکٹھے قیام پذیر تھے، وہاں پر ایک مسجد بھی تھی جس کے لیے ان فوجیوں نے مشترکہ طور پر چندہ کر کے ایک گھڑی خرید کر وقف کی، کچھ مدت گزرنے کے بعد ایک یونٹ والے وہاں سے جانے لگے تو انہوں نے کہا کہ یہ وقف شدہ گھڑی ہم اپنے ساتھ لے جائیں گے، اب سوال یہ ہے کہ اس یونٹ والوں کا مذکورہ گھڑی کو اپنے ساتھ لے جانا شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب: صورت مذکورہ کے مطابق یہ گھڑی چونکہ مسجد کے لیے وقف کی گئی اور وقف تام ہونے کے بعد وہ کسی کی ملکیت نہیں رہی، لہٰذا اس موقوفہ گھڑی کو کسی بھی یونٹ والے اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتے۔

لما قال العلامۃ برہان الدین المرغینانیؒ: اذا صح الوقف لم یجز بیعہ ولا تملیکہ۔ (الہدایۃ ج۲ ص۶۴۰ کتاب الوقف)[2]

قبرستان کے لیے وقف شدہ زمین پر جنازہ گاہ بنانے کا حکم

سوال: ایک شخص نے قبرستان

---

[1] وقال العلامۃ فخر الدین الرازی الشہیر بقاضی خانؒ: وکذا لو کان الوقف خانا علی الفقراء واحتاج الی خادم یکسح الخان ویقوم ویفتح بابہ ویسدہ فیسلم بعض البیوت الی رجل اجرۃ لہ لیقوم بذلک کان لہ ذلک۔ (فتاوی قاضیخان علی ہامش الہندیۃ ج۳ ص۳۰۰ کتاب الوقف، باب الرجل یجعل دارہ مسجداً)

وَمِثْلُہٗ فی الہندیۃ ج۲ ص۴۶۱ کتاب الوقف۔ الفصل الثانی فی الوقف علی المسجد..... فی مال الوقف۔

[2] وقال العلامۃ التمرتاشیؒ: فاذا تم ولزم (ای الوقف) لایملک ولا یعار ولا یرہن (ای لا یقبل التملیک لغیرہ بالبیع۔ (تنویر الابصار علی صدر رد المحتار ج۴ ص۳۵۷ کتاب الوقف)

وَمِثْلُہٗ فی بدائع الصنائع ج۶ ص۲۲۱ کتاب الوقف۔ فصل واما الذی یرجع الی الموقوف فانواع۔

کے لیے زمین وقف کی، اب چونکہ قبرستان کے لیے جنازہ گاہ کی بھی اشد ضرورت ہے تو کیا واقف کی اجازت سے اس وقف شدہ زمین میں جنازہ گاہ بنانا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: فقہاء کرام نے تصریح فرمائی ہے کہ وقف میں واقف کی نیت معتبر ہوگی لہٰذا اس کے لیے سوائے معصیت کے ہر قسم کے تصرفات جائز ہیں، اور مذکورہ صورت میں جنازہ گاہ چونکہ ضروریاتِ مقبرہ میں سے ہے اور واقف کی اجازت بھی موجود ہے لہٰذا جنازہ گاہ بنانے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں۔

لما قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: فان شرائط الواقف معتبرة اذا لم تخالف الشرع وهو مالك فله ان یجعل ماله حیث شاء مالم یکن معصیة وله ان یخص صنفاً من الفقراء۔ (رد المحتار ج۴ ص۳۴۳ مطلب شرائط الوقف المعتبرة)[1]

مسجد کے لیے وقف شدہ زمین کی آمدن مسجد کے مصالح پر خرچ کرنا

سوال: کسی شخص نے اپنی زمین مسجد کیلئے وقف کرکے اُسے کرایہ پر دیدیا جس سے کافی آمدنی حاصل ہوئی، تو سوال یہ ہے کہ اس موقوفہ زمین کی آمدنی مسجد کے مصالح پر خرچ کرنا شریعت کی رُو سے جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: جو زمین مسجد کے لیے وقف کی گئی ہو اور اس سے آمدنی بھی حاصل ہوتی ہو تو متولی کے لیے اس آمدنی کو مسجد کے مصالح پر خرچ کرنا جائز ہے۔

لما فی الهندیة: مسجد له مستغلات واوقاف اراد المتولی ان یشتری من غلة الوقف للمسجد دهناً وحصیراً وحشیشاً ...... تفعل ما تری من مصلحة المسجد کان له ان یشتری للمسجد ماشاء وان لم یوسع۔ (الفتاوی الهندیة ج۲ ص۴۶۱ کتاب الوقف الفصل الثانی ..... فی مال الوقف)[2]

---

[1] وقال العلامة ابن نجیمؒ: شرط الواقف کنص الشارع یجب اتباعه لقولهم شرط الواقف کنص الشارع۔ (الاشباه والنظائر ج۲ ص۲۲۸ کتاب الوقف ـ ومثله فی تنقیح الحامدیة ج۱ ص۱۲۶ کتاب الوقف۔

[2] وقال العلامة ابن عابدینؒ: والذی یبدأ به ارتفاع الوقف ای من غلته عمارته شرط الواقف اولا ثم ما هو اقرب الی العمارة واعم للمصلحة کالامام للمسجد..... ثم السراج والبساط الی آخر المصالح۔ (رد المحتار ج۴ ص۳۶۷ کتاب الوقف)

وَمِثْلُهٗ فی الخانیة علی هامش الهندیة ج۳ ص۲۹۷ کتاب الوقف۔ باب الرجل یجعل داره مسجداً۔

مسجد کے لیے موقوفہ زمین کے درختوں کا حکم

سوال:- ایک شخص نے کچھ زمین مسجد کی تعمیر کے لیے وقف کی، مسجد کی دیوار سے ملحق ہی واقف کا گھر ہے، واقف نے وقف شدہ مسجد کے صحن میں اخروٹ کے درخت لگائے تھے، اب وہ کہہ رہا ہے کہ ان درختوں کے پھل پر صرف میرا ہی حق ہے جبکہ اہلِ محلہ اس کو اس سے منع کرتے ہیں اور اس کو پورے محلہ کا حق قرار دیتے ہیں، شرعاً اس پھل کا کیا حکم ہے؟

الجواب:- فقہاءِ کرام نے تصریح کی ہے کہ وقف میں واقف کے قول کو اعتبار دیا جائے گا، مذکورہ صورت میں واقف نے اگر وقف کرتے وقت تصریح کی ہو کہ میں نے اس درخت کو بھی وقف کیا تھا یا کچھ بھی نہ کہا ہو تو دونوں صورتوں میں درخت وقف ہوگا، البتہ اگر وقف کرتے وقت واقف نے اس درخت کا استثناء کیا ہو تو اس صورت میں واقف کے قول کا اعتبار کرکے درخت وقف شمار نہ ہوگا بلکہ واقف کی علیحدہ ملکیت متصور ہوگا۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: قال فی الاسعاف ویدخل فی وقف الارض مافیها من الشجر والبناء دون الزرع۔ (رد المحتار ج۳ ص۳۶۱ مطلب فی وقف المنقول تبعاً للعقار) [1]

پرانے قبرستان پر مسجد بنانے کا حکم

سوال:- ایک مسجد کے متصل بہت پرانا قبرستان ہے جس میں ۲۰ سال سے کسی بھی میت کو دفن نہیں کیا گیا، اب اہلِ محلہ مسجد میں توسیع کے خواہشمند ہیں اور قبرستان کا کچھ حصہ مسجد میں شامل کرنا چاہتے ہیں، تو کیا محلہ والوں کا یہ اقدام شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب:- مذکورہ قبرستان اگر موقوفہ ہو اور اموات کے اجسام ظنِ غالب میں خاک ہو چکے ہوں اور گاؤں والوں نے اس میں اموات کو دفنانا چھوڑ دیا ہو تو پھر اس قبرستان کو مسجد میں شامل کرنا قابلِ اعتراض نہیں۔

---

[1] وقال العلامة ابن نجیمؒ: والحاصل ان الوقف کالبیع لا یدخل فیها الزرع والثمر الا بالذکر۔ (البحر الرائق ج۵ ص۲۰۱ کتاب الوقف۔

وَمِثْلُہٗ فی خلاصۃ الفتاوٰی ج۴ ص۴۱۹ کتاب الوقف۔ الفصل الثالث۔

لما قال فی الھندیۃ : لو بلی المیت وصار ترابًا جاز دفن غیرہ فی قبرہ وزرعہ والبناء علیہ ۔ (الفتاوی الھندیۃ ج ۱ ص۱۶۷ الباب الحادی والعشرون فی الجنائز) لہ

مسجد کے متولّی کو معزول کرنے کا حکم

سوال :- کیا محلّہ والے یا حاکمِ وقت متولیٔ مسجد کو معزول کر سکتے ہیں یا نہیں ؟

الجواب :- متولیٔ مسجد اور اسی طرح امام مسجد کو بغیر خیانت کے کوئی بھی معزول نہیں کر سکتا البتہ اگر شرعی جرم ثابت ہو جائے تو متولّی اور امام مسجد کو اہلِ محلہ یا قاضی معزول کرنے کے مجاز ہیں ۔

لما قال فی الھندیۃ : ولو ان الواقف شرط الولایۃ لنفسہ وکان الواقف غیر مأمون علی الوقف فللقاضی ان ینزعھا من یدہ ۔

(الفتاوی الھندیۃ ج ۲ ص۴۰۹ کتاب الوقف، الباب الخامس فی ولایۃ الوقف) لہ

طریق عام کو مسجد میں شامل کرنے کا حکم

سوال :- ایک شخص نے مسجد کیلئے زمین وقف کی جو کہ طریق عام کے ساتھ متصل ہے، وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اب وہ مسجد نمازیوں کیلئے ناکافی ہوتی جا رہی ہے، اہل محلہ کا ارادہ ہے کہ اس عام راستہ سے زمین کا کچھ حصہ مسجد میں فراخی کے لیے شامل کر لیا جائے، تو کیا ایسا کرنا شرعًا درست ہے یا نہیں ؟

الجواب :- اگر راستہ کا کچھ حصّہ مسجد میں شامل کرنے سے راستہ تنگ نہ ہوتا ہو

لہ وقال العلامۃ ابن عابدینؒ : ولو بلی المیت وصار ترابًا جاز دفن غیرہ فی قبرہ وزرعہ والبناء علیہ ۔ (رد المحتار ج ۱ ص۶۵۹ کتاب الجنائز ۔

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج ۲ ص۱۶۱ الباب الحادی والعشرون فی الجنائز ۔ الفصل السادس ۔

۲ لہ ولما قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ : لایصح عزل صاحب وظیفۃ بلا جنحۃ اوعدم اھلیۃ ــــــ قال فی البحر واستفید من عدم عزل الناظر بلا جنحۃ عدمھا لصاحب وظیفۃ فی وقف بغیر جنحۃ وعدم اھلیۃ ــ

(رد المحتار ج ۴ ص۳۸۲ کتاب الوقف)

وَمِثْلُہٗ فی الھدایۃ ج ۳ ص۶۴۳ کتاب الوقف ۔

اور لوگوں کو آمدورفت میں تکلیف نہ ہوتی ہو تو ایسا کرنا شرعاً مرخص ہے ورنہ نہیں؟

لما قال العلامة فخر الدین عثمان الزیلعی رحمہ اللہ : اذا بنی قوم مسجداً واحتاجوا الی مکان لیتسع فادخلوا شیئاً من الطریق فی المسجد وکان ذلک لا یضر باصحاب الطریق جاز ذلک ۔ (تبیین الحقائق ج ۳ ص ۳۳۱ کتاب الوقف، فصل ومن بنی مسجداً الخ)[۱]

مسجد کی زمین پر ڈاکخانہ بنانے کا حکم

سوال :۔ ایک شخص نے مسجد کے لیے کچھ زمین وقف کی ہے اور وقف بھی تام ہوا ہے، اب حکومت اس مسجد کے ایک گونہ میں ڈاک خانہ بنانا چاہتی ہے جس کی آمدنی مسجد کو ملے گی لیکن ملکیت حکومت کی رہے گی، اب سوال یہ ہے کہ مسجد کے لیے وقف شدہ زمین حکومت کے اغراض ومقاصد کے لیے دینا شریعتِ مقدسہ کی رُو سے جائز ہے یا نہیں؟

الجواب :۔ جو زمین مسجد کے لیے ایک دفعہ وقف کی گئی ہو تو اس میں ماسوائے مسجد کے متعلقہ امور کے دیگر امور مثلاً دوکان یا ڈاکخانہ وغیرہ بنانا جائز نہیں کیونکہ واقف کی نیّت سے مخالفت لازم آتی ہے اور واقف کی نیّت کے خلاف کرنا شرعاً جائز نہیں ہے۔

لما قال العلامة الحصکفی رحمہ اللہ : ما خالف شرط الواقف فھو مخالف للنص والحکم بہ حکم بلا دلیل ۔ (الدر المختار علی ہامش رد المحتار ج ۳ ص ۴۹۵ کتاب الوقف)[۲]

---

[۱] لما قال العلامة شہاب الدین احمد شلبی رحمہ اللہ : طریق للعامة وھی واسعة فبنی فیہ اھل المحلة مسجداً للعامة ولا یضر ذلک بالطریق قالوا لا باس بہ وقوم بنوا مسجداً واحتاجوا الی مکان لیتسع المسجد فاخذوا من الطریق فادخلوہ فی المسجد اذا کان ذلک یضر باصحاب الطریق لا یجوز والا فلا باس بہ۔ (شلبی علی ہامش تبیین الحقائق ج ۳ ص ۳۳۱ کتاب الوقف) ۔ ومثلہ فی البحر الرائق ج ۵ ص ۲۵۶ کتاب الوقف۔

[۲] وقال العلامة ابن عابدین رحمہ اللہ : وما خالف شرط الواقف فھو مخالف للنص وھو حکم بلا دلیل ای لا دلیل علیہ سواء کان نصہ فی الوقف نصاً او ظاھراً وھذا موافق لقول مشائخنا کغیرھم شرط الواقف کنص الشارع فیجب اتباعہ کما صرح بہ فی شرح المجمع ۔

(رد المحتار ج ۳ ص ۴۴۳ کتاب الوقف)

ومثلہ فی الاشباہ والنظائر ج ۲ ص ۲۲۸ کتاب الوقف ۔

مسجد میں خیاطت کرنے کا حکم

سوال :- مسجد میں خیاطت کرنا (کپڑے سینا) شریعت کی رُو سے جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :- خیاطت کا تعلق چونکہ دنیاوی امور سے ہے اور مسجد میں دنیاوی امور سے اجتناب ضروری ہے، لہٰذا مسجد میں خیاطت (درزی کا کام) کرنا شرعاً مکروہ ہے البتہ اگر کوئی مسجد کی حفاظت کے واسطے مسجد میں کپڑوں کی سلائی کا کام کرتا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال الشیخ ابراھیم الحلبی رحمہ اللہ : والخیاطۃ فیہ تکرہ الا اذا کان لضرورۃ حفظہ عن الصبیان ونحوھم۔

(حلبی کبیری ص۶۱۱ کتاب الصلوٰۃ۔ فصل فی احکام المسجد)[1]

متولی مسجد اور اہل محلہ کی اجازت کے بغیر مسجد کی تعمیرات میں تصرف کرنا

سوال :- ایک شخص نے زمین خرید کر اس پر مسجد بنائی اور بعد میں وہ اس مسجد کا متولی مقرر ہوا ، اب دوسرے محلے کا ایک شخص اس مسجد کو دوبارہ تعمیر کرنا چاہتا ہے جبکہ متولی اس کی اجازت نہیں دے رہا ، تو کیا از روئے شرع متولی کا انکار جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :- صورتِ مسئولہ میں متولی مسجد اور اہلِ محلہ کی اجازت کے بغیر کسی دوسرے محلہ والے کو اس مسجد میں ھدماً و بناءً تصرف کرنا جائز نہیں، ایسے معاملات کے اختیارات صرف اہلِ محلہ اور متولی ہی کو حاصل ہو سکتے ہیں نہ کہ کسی غیر متعلقہ شخص کو۔

لما قال العلامۃ ابن نجیم المصری رحمہ اللہ : ارادوا نقض المسجد وبناؤہ وأحکم من الاول ان لم یکن البانی من اھل المحلۃ لیس لھم ذلک وان کان

---

[1] وقال العلامۃ حافظ الدین محمد بن محمد البزاز رحمہ اللہ : والخیاطۃ فیہ تکرہ الا اذا کان لحفظ المسجد عن الصبیان وخاط وکذا الکاتب۔

(البزازیۃ علی ھامش الھندیۃ ج۴ ص۸۲ کتاب الصلوٰۃ الفصل السادس والعشرون)

ومثلہ فی الاشباہ والنظائر ج۴ ص۵۶ القول فی احکام المسجد۔

من اهل المحلة لهم ذلك ۔ (البحر الرائق ج ۵ ص ۲۵۱ کتاب الوقف فصل فی احکام المسجد) [۱]

بانی مسجد کے لیے لوگوں کو مسجد سے منع کرنا ناجائز ہے

سوال :- ایک مسجد کے لیے کچھ زمین وقف تھی، کسی نے اس زمین پر اپنے خرچ سے مسجد بنائی اور مسجد کی آبادی میں کسی نے بھی اس سے تعاون نہیں کیا، اب اس بانی کے ساتھ اہلِ محلہ اور پیش امام کی ناراضگی پیدا ہوگئی ہے جبکہ بانی مسجد یہ چاہتا ہے کہ اہلِ محلہ اور پیش امام کو مسجد میں آنے جانے سے روک دے، تو کیا شریعت کی رُو سے یہ جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :- بشرط صدق وثبوت بانی مسجد کا پیش امام یا اہلِ محلہ کو مسجد سے منع کرنا شرعاً حرام ہے ۔

لما قال اللہ تبارک وتعالیٰ : وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسَاجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ ۔ (سورۃ البقرۃ آیت ۱۱۴) [۲]

ایک مسجد کا چندہ دوسری مسجد پر خرچ کرنے کا حکم

سوال :- ایک مسجد کا چندہ دوسری مسجد پر لگانا شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :- ایک مسجد کا چندہ دوسری مسجد پر لگانا اس وقت درست ہے جب اس مسجد کو اس کی ضرورت نہ ہو، لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اگر فی الحال اس چندہ کی مسجد کو ضرورت نہ ہو اور آئندہ ضرورت پیش آنے کا امکان ہو تو پھر بھی دوسری مسجد میں اس چندہ کا استعمال

---

[۱] وقال فی الهندیة : وفی الکبریٰ مسجد مبنی اراد رجل ان ینقضه ویبنیه ثانیاً احکم من البناء الاول لیس له ذلک لانه لا ولایة کذا فی المضمرات ۔
(الفتاوی الهندیة ج ۲ ص ۴۵۷ کتاب الوقف الباب الحادی عشر)
ومِثْلُهٗ فی البزازیة علی هامش الهندیة ج ۶ ص ۲۶۸ کتاب الوقف باب الرابع فی المسجد

[۲] وقال العلامة بیضاوی رحمه اللہ : عام لکل من خرب مسجداً او سعی فی تعطیل مکان مرشح للصلوٰة ۔ (تفسیر بیضاوی ج ۱ ص ۱۰۴ ۔ سورۃ البقرۃ)
ومِثْلُهٗ فی تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۱۵۶ سورۃ البقرۃ ۔

درست نہیں، تاہم اگر چندہ دہندگان اجازت دے دیں تو پھر کسی دوسری مسجد پر صرف کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: وعن الثانی ینقل الی مسجد آخر باذن القاضی..... حشیش المسجد وحصرہ مع الاستغناء عنهما وکذا الرباط والبئر اذا لم ینتفع بهما فیصرف فی وقف المسجد والرباط والبئر والحوض الی اقرب مسجد او رباط او حوض۔ (الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۳ ص۳۵۹ کتاب الوقف)[1]

مسجد کی چھت کی پرانی چادروں کا حکم

سوال:۔ ایک مسجد جو کہ ۱۹۰۵ء میں تعمیر کی گئی تھی اور اس کی چھت چادروں کی تھی بعد میں اسے شہید کرکے اس میں توسیع کی گئی اور اس کے ساتھ ہی اہل محلہ پیش امام کیلئے ایک مکان بھی تعمیر کرنا چاہتے ہیں، اب اگر اس مسجد کی پرانی چادروں کو پیش امام کے گھر میں استعمال کیا جائے تو شریعت کی رو سے جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر یہ چادریں مسجد کے کسی کام میں استعمال نہ ہوسکتی ہوں اور ان کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو تو ان کو فروخت کرنا یا امام صاحب کے گھر میں استعمال کرنا از روئے شریعت مرخص ہے بلکہ ان کو فروخت کرکے رقم مسجد کی تعمیر جدید میں خرچ کرنا بھی جائز ہے۔

لما قال العلامة عالم بن العلاء الانصاریؒ: سئل ابوبکر عن حشیش المسجد یخرج عن المسجد ایام الربیع؟ قال ان لم یکن له قیمة فلا بأس بطرحه خارج المسجد ولا بأس برفعه والانتفاع به۔ (فتاوی تاتارخانیة ج۵ ص۸۵۰ کتاب الوقف، الفصل الحادی والعشرون فی المساجد)[2]

---

[1] وقال العلامة عالم بن العلاء الانصاریؒ: سئل شمس الائمة الحلوانی عن مسجد او حوض خرب ولا یحتاج الیه لتفرق الناس هل للقاضی ان یصرف اوقافه الی مسجد آخر او حوض آخر؟ قال نعم۔ (الفتاوی التاتارخانیة ج۵ ص۸۴۷ کتاب الوقف ـــ ومثله فی الخانیة علی هامش الهندیة ج۳ ص۲۹۳۔

[2] وقال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ: حشیش المسجد اذا اخرج من المسجد ایام الربیع ان لم یکن له قیمة لا بأس بطرحه خارج المسجد ولا بأس بدفعه والانتفاع به۔ (خلاصة الفتاوی ج۴ ص۴۲۵ کتاب الوقف، الفصل الرابع)

ومثله فی الهندیة ج۲ ص۴۵۹ کتاب الوقف، الباب الحادی عشر۔

متولّیِ مسجد کی وفات کے بعد مسجد کے اختیارات کا حکم

سوال:۔ ایک آدمی کسی مسجد کا بانی تھا اور مسجد کے تمام اختیارات اس کو حاصل تھے، تو اس کی وفات کے بعد اس کے اختیارات اُس کی اولاد کو منتقل ہو سکتے ہیں؟

الجواب:۔ مسجد کے بانی اور متولی کو تمام تر اختیارات شرعاً حاصل ہوتے ہیں اور مسجد کے لیے مؤذن، امام وخطیب وغیرہ مقرر کرنا اسی کا حق ہوتا ہے، لہٰذا اس کی وفات کے بعد تمامتر اختیارات اس کی اولاد میں نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوں گے، وہ اپنی خوشی سے مسجد کے امور میں جائز اور مناسب تصرفات کرنے کی شرعاً مجاز ہے۔

لما قال العلامة ابن نجیم المصریؒ رحمہ اللہ: والبانی احق بالامامة والاذان وولدہ من بعدہ وعشیرتہ اولیٰ بذلك من غیرھم وفی المجرد عن ابی حنیفةؒ ان البانی اولیٰ بجمیع مصالح المسجد ونصب الامام والمؤذن اذا تأھل للامامة۔

(البحرالرائق ج۵ ص۲۴۹ کتاب الوقف) [۱]

مسجد کا پنکھا گھر میں استعمال کرنا جائز نہیں

سوال:۔ ایک شخص نے مسجد کے لیے پنکھا خریدا اور مسجد کے لیے وقف کیا، تو کیا مسجد کا پیش امام اس پنکھے کو اپنے گھر میں استعمال کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ کے مطابق اگر یہ پنکھا واقعتاً مسجد کے لیے وقف شدہ ہو تو مسجد کے پیش امام کے لیے اس پنکھے کا اپنے گھر میں استعمال شرعاً جائز نہیں، اگرچہ پیش امام کا وجود مصالح مسجد میں سے ہے تاہم اگر واقف نے علی الاطلاق نیت کی ہو تو پھر کوئی حرج نہیں۔

لما قال فی الھندیة: متولی المسجد لیس لہٗ ان یحمل سراج المسجد

---

[۱] وقال الشیخ ابراھیم الحلبی رحمہ اللہ: وکذا اولاد البانی وعشیرتہ من بعدہ اولیٰ من غیرھم۔ (حلبی کبیری ج ص۶۱۵ فصل فی احکام المسجد)

ومثلہٗ فی خلاصة الفتاوٰی ج۴ ص۴۲۱ کتاب الفصل، الباب الرابع۔

الیٰ بیتہٖ ولہٗ ان یحملہ من البیت اِلیٰ المسجد ۔

(الفتاوی الھندیۃ ج۲ ص۴۶۲ کتاب الوقف)[۱]

مسجد میں نکاح پڑھانے کا حکم | **سوال:**۔ بعض لوگ مسجد میں نکاح پڑھانے کو سنت سمجھتے ہیں، کیا واقعی مسجد میں نکاح پڑھانا سنت ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ نکاح پڑھانا خود ایک مسنون عمل ہے جو عبادت کا ایک شعبہ ہے اسلئے مسجد میں نکاح کے ایجاب وقبول کرانے میں شرعاً کوئی حرج نہیں، تاہم ایسے مواقع پر کوئی ایسی حرکت کرنا جو مسجد کے آداب کے منافی ہو سے اجتناب کرنا اشد ضروری ہے ۔

لما ورد فی الحدیث : عن عائشۃ رضی اللہ عنہا قالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اعلنوا ھٰذا النکاح واجعلوہ فی المساجد واضربوا علیہ بالدفوف۔

(مشکوٰۃ ج۲ ص۲۷۲ کتاب النکاح)[۲]

ذکر واذکار اور نماز میں مشغول لوگوں کو سلام کرنے کا حکم | **سوال:**۔ مسجد میں لوگ عموماً ذکر واذکار اور نماز میں مشغول ہوتے ہیں، تو ایسی عالت میں مسجد میں داخل ہونے والے کے لیے اُن پر سلام کہنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مسجد میں نماز کے انتظار میں بیٹھنے والا شخص بھی حکماً ذاکر ہے جیسا کہ روایت

---

[۱] وقال العلامۃ طاھر بن عبد الرشید البخاری رحمہ اللہ : متولی المسجد لیس لہٗ ان یحمل سراج المسجد اِلیٰ بیتہ ولہٗ ان یحمل من البیت الی المسجد۔

(خلاصۃ الفتاوی ج۴ ص۴۲۳ کتاب الوقف۔ الفصل الرابع)

وَمِثْلُہٗ فی التاتارخانیۃ ج۵ ص۸۵۱ کتاب الوقف۔ الفصل الحادی والعشرون ۔

[۲] وقال فی الھندیۃ : مباشرۃ عقد النکاح فی المساجد مُسْتَحَبٌّ ۔

(الفتاوی الھندیۃ ج۵ ص۳۲۱ کتاب الکراھیۃ۔ الباب الخامس)

وَمِثْلُہٗ فی رد المحتار ج۲ ص۲۸۴ کتاب النکاح۔

سے ثابت ہے، اس لیے یہ بھی ذاکر کے حکم میں ہو کر اس کو سلام کرنا جائز نہیں، تاہم اگر کوئی نماز کے بعد ویسے ہی فارغ بیٹھا ہو تو اسے سلام کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

لما ورد فی الحدیث: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من جلس مجلس ینتظر الصلوٰۃ فھو فی الصلوٰۃ۔ (ترمذی ج۱ ص۱۱۱ ابواب الجمعۃ) [1]

مسجد میں تھوکنے کا حکم

سوال:۔ سنا ہے کہ انسان کے منہ سے نکلنے والا تھوک پاک ہے، اس کے پاک ہونے کی صورت میں کیا مسجد میں تھوکنا از روئے شریعت جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مساجد اللہ تعالیٰ کا گھر اور مسلمانوں کی عبادت گاہ ہیں اس لیے ان کی عظمت اور عزت برقرار رکھنا ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے، ایسے کام جن میں حقارت کا معمولی سا شائبہ بھی ہو ان سے بھی مساجد کو پاک رکھا جائے۔ مسلمان کی تھوک اگرچہ بالاتفاق پاک ہے لیکن مسجد کی عظمتِ شان اور آداب کو مدنظر رکھتے ہوئے اس میں تھوکنا جائز نہیں۔

لما قال العلامۃ الشیخ ابراھیم الحلبی رحمہ اللہ:۔ ولا یبزق علی حیطان المسجد ولا علی ارضہ ولا علی البواری وکذ المخاط لکن یأخذہ بطرف ثوبہ ویدلک بعضہ ببعض۔ (کبیری ص۶۱۲ فصل فی احکام المسجد) [2]

مسجد کے لیے موقوفہ زمین پر پیش امام کا تصرف کرنا

سوال: مسجد کے ساتھ متصل زمین مسجد کے

---

[1] وقال فی الھندیۃ: ویکرہ السلام عند قرأۃ القرآن جھراً وکذا عند مذاکرۃ العلم وعند الاذان والاقامۃ والصحیح انہ لا یرد فی ھذہ المواضع ایضاً۔ (الفتاویٰ الھندیۃ ج۵ ص۳۲۵ کتاب الکراھیۃ۔ الباب السابع)
ومثلہ فی ردالمحتار ج۱ ص۴۵۶ باب ما یفسد الطلاق۔ مطلب المواضع التی یکرہ فیھا السلام۔

[2] لما ورد فی الحدیث: قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم البزاق فی المسجد خطیئۃ وکفارتھا دفنھا۔ (ابوداؤد ج۱ ص۶۸ باب کراھیۃ البزاق فی المسجد)
ومثلہ فی الھندیۃ ج۵ ص۳۲۱ کتاب الکراھیۃ۔ الباب الخامس۔

مصارف کے لیے وقف کی گئی تھی، اس زمین میں مسجد کا پیش امام اپنے لیے کھیتی باڑی کرتا رہا، کچھ عرصہ بعد پیش امام نے چپکے سے مسجد کی انتظامیہ یا کسی اور کو بتائے بغیر اس زمین کا سرکاری کاغذات میں انتقال اپنے نام کرالیا ہے، تو پیش امام کے اس اقدام کا شرعاً کیا حکم ہے؟ کیا یہ زمین پیش امام کی ملکیت ہوگی یا نہیں؟

الجواب: چونکہ مذکورہ زمین مسجد اور مسجد کے مصالح کے لیے وقف کی گئی ہے جس میں پیش امام کی شخصیت کا کوئی دخل نہیں، لہٰذا مسجد کے مصارف کے لیے جو چیز وقف ہو وہ مسجد ہی کا حق ہے اور پیش امام کا قبضہ اور اپنے نام انتقال کرانا شرعاً درست نہیں ہے، اس لیے پیش امام کا یہ اقدام خلافِ شرع ہو کر اس زمین کا مالک متصور نہ ہوگا۔

لما قال فی الهندية: ارض وقف علی مسجد صارت بحال لا تزرع فجعلها رجل حوضاً للعامة لا يجوز للمسلمين انتفاع عاد ذلك الحوض۔

(الفتاوی الهندية ج۲ ص۴۶۴ کتاب الوقف الفصل الثانی)

ایک مسجد کی موجودگی میں دوسری مسجد تعمیر کرنا

سوال: ایک وسیع و عریض مسجد کے باوجود بعض لوگ امام سے اختلاف کا بہانہ بنا کر دوسری مسجد تعمیر کرلیں تو کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے؟ جبکہ اس سے قوم میں بے اتفاقی کا احتمال بھی ہو۔

الجواب: ذاتی اغراض کی تکمیل کے لیے قوم میں بے اتفاقی اور اختلافات کا ذریعہ بننا بدقسمتی کی دلیل ہے۔ اگر امام سے اختلاف ذاتی وجوہات یا غیر شرعی امور کی وجہ سے ہو تو ایسے اختلافات کا شکار ہونا خود بھی گناہ ہے، پھر اس ایک گناہ کے ارتکاب کے بعد مسلمانوں میں بے اتفاقی کا موقع فراہم کرنا دوسرا بڑا جرم ہے۔ ایسی صورت میں دوسری مسجد بنانے کی ضرورت نہیں: تاہم اگر ان واقعات کی وجہ سے کوئی شخص زمین باقاعدہ وقف کر کے اس پر مسجد بنائے تو دوسری مسجد بھی مسجدِ شرعی رہے گی، اس کے ذاتی اغراض کا معاملہ اس کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہے۔ البتہ بوقتِ ضرورت یا باہمی اختلافات سے بچنے کے لیے دوسری مسجد بنانا نہ صرف جائز بلکہ مستحسن ہے۔

قال ابن نجیمؒ: واذا قسم المحلة المسجد وضربوا فيه حائطا ولكل منهم امام علی حدة ومؤذنهم واحد لا بأس به۔ (البحر الرائق ج۲ ص۳۵ باب ما يفسد الصلوٰة وما يكره فيها)

مسجد کے بعض حصّہ کو سڑک میں شامل کرنا

سوال:۔ ہمارے محلہ میں ایک مسجد ہے جو اپنے رقبہ کے لحاظ سے نمازیوں کی تعداد کے مقابلہ میں کافی وسیع ہے، اور مسجد کے متصل ایک سڑک بھی بن رہی ہے، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مسجد کا کچھ حصّہ اس سڑک میں شامل کردیا جائے تاکہ سڑک وسیع ہوکر لوگوں کے مفاد میں بہتر ثابت ہو۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ جس جگہ ایک دفعہ مسجد بن جائے تو پھر اس کا کچھ حصّہ افادۂ عام کے لیے سڑک میں شامل کیا جاسکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ جس جگہ ایک دفعہ مسجد بن جائے وہ قیامت تک مسجد ہی رہے گی، اسے کسی اور کام میں استعمال کرنا شرعاً جائز نہیں اگرچہ فوائد اس میں زائد ہوں، لہٰذا مسجد کا کوئی بھی حصّہ سڑک میں شامل کرنا جائز نہیں۔

قال الحصکفیؒ: (جعل شی) ای جعل البانی شیئاً (من الطریق مسجداً) لضیقه ولم یضر بالمارین (جاز) لانهما للمسلمین (کعکسه) ای کجواز عکسه وهو ما اذا جعل فی المسجد ممر لتعارف اهل الامصار فی الجوامع وجاز لکل احد ان یمر فیه حتی الکافر الا الجنب والحائض والدواب زیلعی (کما جاز جعل) الامام (الطریق مسجداً لا عکسه) لجواز الصلوٰة فی الطریق لا المرور فی المسجد۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المختار ج ۴ ص ۳۷۷ احکام المساجد، کتاب الوقف) [۱]

مساجد میں بلند آواز سے نعت خوانی اور تقریر کرنا

سوال:۔ مساجد میں بلند آواز سے نعت خوانی اور تقریر کرنا جیسا کہ آجکل جلسوں میں ہوتا ہے شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ مساجد میں بلند آواز سے تقریر کرنا اور ایسے ہی نعت خوانی کرنا اگر کسی نمازی کی نماز میں باعثِ تشویش نہ ہو تو جائز ہے، لیکن اگر کہیں نمازیوں کی نماز میں تشویش کا ذریعہ ہو تو مکروہ ہے۔

قال الحصکفیؒ: انشاد ضالة اوشعر الا ما فیه ذکر ورفع صوت بذکر الا للمتفقهة۔

---

[۱] وفی الهندیة ان ارادوا ان یجعلوا شیئاً من المسجد طریقاً للمسلمین فقد قیل لیس لهم ذٰلك وانه صحیح کذا فی محیط۔ (الفتاوٰی الهندیة ج ۲ ص ۴۵۷ کتاب الوقف)
وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج ۵ ص ۲۵۵ کتاب الوقف۔

قال ابن عابدینؒ تحت ھٰذا القول وفی حاشیۃ الحموی عن الامام الشعرانیؒ،
اجمع العلماء سلفاً وخلفاً علی استحباب ذکر الجماعۃ فی المساجد وغیرھا الاان یشوش
جھرھم علی نائم او مصل او قاری۔ الخ۔ (رد المحتار ج ا صـ۶۶۱ احکام المساجد، کتاب الصلوٰۃ) لـه

سرکاری زمین پر بغیر اجازت کے مسجد بنانا

سوال:۔ ایک مقام پر بعض لوگوں نے گورنمنٹ کی زمین پر جبراً قبضہ کرکے مسجد تعمیر کرلی جبکہ حکومت نے انہیں مسجد بنانے کی اجازت نہیں دی۔ اب حکومت اپنے نقشہ کے مطابق شہر کی تعمیر چاہتی ہے، دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا ایسی غصب شدہ زمین پر بنائی گئی مسجد مسجدِ شرعی کے حکم میں ہے؟ اور کیا حکومت اس کو منہدم کرکے اپنے مصرف میں لاسکتی ہے؟

الجواب:۔ مسجد کے لیے زمین وقف کرنے کے لیے واقف کا ملکِ تام ہونا شرط ہے، جبکہ یہ زمین حکومت کی ملکیت ہے، تو عوام کو حکومت کی اجازت کے بغیر مسجد بنانا جائز نہیں۔ کسی کی زمین پر جبراً قبضہ کرکے وہاں مسجد بنالی جائے تو وہ شرعی مسجد نہیں، اسلئے اگر حکومت ایسی مسجد کو منہدم کرکے اس جگہ کو کسی اور مصرف میں استعمال کرے تو جائز ہے تاہم اگر ضرر نہ ہو تو اسی جگہ مسجد کو باقی رکھنا بہتر ہے۔

قال ابن عابدینؒ: افاد ان الواقف لا بدّ ان یکون مالکًا له وقت الوقف ملکا باتا ولو بسبب وان لا یکون محجوراً عن التصرف حتی لو وقف الغاصب المغصوب لم یصح وان ملکه بعد بشراء او صلح ولو اجاز المالك وقف الفضولی جاز۔
(ردّ المحتار علی الدر المختار ج ۴ صـ۳۴۰ کتاب الوقف، مطلب قد یثبت الوقف بالضرورۃ) ۲ـه

لـه فی الصحیح البخاری عن السائب بن یزید قال: کنتُ قائمًا فی المسجد فحصبنی رجلٌ فنظرت الیه فاذا عمر بن الخطابؓ اذھب فأتنی بھذین فجئتُه بھما فقال ممن انتما او من این انتما قال من اھل الطائف قال لو کنتما من اھل البلد لاَوجعتکما ترفعان اصواتکما فی مسجد رسول الله صلی الله علیه وسلم۔ (الصحیح البخاری ج ا صـ۶۷ باب رفع الصوت فی المسجد)
وَمِثْلُهٗ فی الطحطاوی حاشیۃ مراقی الفلاح صـ۲۰۳ کتاب الصلوٰۃ۔

۲ـه قال ابن نجیمؒ: الخامس من شرائط الملك وقت الوقف حتی لو غصب ارضًا فوقفھا ثُمّ اشتراھا من مالکھا ودفع الثمن الیه اوصالح علی مال دفعه الیه لا تکون وقفًا۔
(البحر الرائق ج ۵ صـ۱۸۸ کتاب الوقف) وَمِثْلُهٗ فی الھندیۃ ج ۲ صـ۳۵۳ کتاب الوقف۔

مسجد کے مسبع ہونے کا حکم

سوال:۔ ایک مسجد جو کہ عوام کے تعاون سے تعمیر کی گئی ہے لیکن ڈیزائن اور نقشہ کے لحاظ سے مسبع ہے جبکہ عام مساجد کی تعمیر مربع اور مستطیل شکل میں ہوتی ہے اور فقہاءِ اُمت کے اقوال سے بھی اس کی فضیلت معلوم ہوتی ہے۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا مروجہ طریقہ کو چھوڑ کر جدید طریقہ سے مسجد بنانا جائز ہے؟ جبکہ اس مسجد کا ڈیزائن بعض غیر مسلم عبادت گاہوں سے بھی متشابہ ہے؟

الجواب:۔ مساجد مسلمانوں کی عبادت گاہ اور شعائر اللہ میں سے ہیں جن کا مقصد یادِ الٰہی اور صلوٰۃ واذکار ہیں، ان کی یہ حیثیت تب برقرار رہتی ہے جب یہ اسلامی مساجد کی ہیئت اور شکل وصورت کی طرح ہوں اور ان کو بعض غیر مسلم اقوام کی عبادت گاہوں کا ہم شکل بنانا جائز نہیں، تاہم اگر تشبّہ کی نیت کے بغیر محض جگہ کی تنگی کی وجہ سے ایسا نقشہ اختیار کیا گیا ہو تو پھر اس مسجد کی شرعی حیثیت پر یہ نقشہ اثر انداز نہیں ہوتا۔

وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ۔ الآیۃ (سورۃ هود، رکوع ۱۰)

عن ابن عمر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من تشبّہ بقوم فھو منھم۔ رواہ احمد وابوداؤد۔ (مشکوٰۃ ج۲ ص۳۷۵ کتاب اللباس) [۱]

مسجد میں گم شدہ چیزوں کے اعلان کا حکم

سوال:۔ لاؤڈ سپیکر سے استفادہ کی خاطر عموماً گم شدہ اور جلسوں کے اعلانات مساجد میں ہوتے رہتے ہیں، کیا از روئے شرع یہ امور جائز ہیں؟

الجواب:۔ مسجد عبادت گاہ ہے اس لیے جو چیز مسجد سے باہر گم ہو گئی ہو تو اس کا اعلان مسجد میں کرنا جائز نہیں البتہ جو چیز مسجد میں گم ہوئی ہو تو اس کا اعلان مسجد کے اندر بھی مرخص ہے۔ اسی طرح مسجد میں گم شدہ بچے کا اعلان کرنا انسانی جان کی عظمت کی وجہ سے جائز ہے۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ: یکرہ انشاد الضالۃ) قال السید احمد الطحطاوی فی حاشیۃ علی الدر المختار تحت قولہ وانشاد الضالۃ لقولہ علیہ السلام اذا رأیتم من ینشد الضالۃ فی المسجد فقولوا لا ردھا اللہ علیک قولہ الا مافیہ ذکر نحوہ الموعظۃ لانہ

---

[۱] ومثلہ فی ابی داؤد ج۲ ص۲۰۳ کتاب اللباس، باب القمیص

كان ينشد الشعر بين يديه صلى الله عليه وسلم وهو فى المسجد ويأمر حسانا بذلك۔
(الطحطاوی علی الدر المختار ج ۱ ص۲۷۸ مکروهات الصلوٰة۔فصل فی احکام المساجد) لـه

مسجد کی جائداد موقوفہ پر دعوٰی ارث

سوال:۔ ایک قطعہ اراضی اور مکان کسی شخص نے مسجد کی ضروریات کے لیے وقف کیا، امام کو مسجد کے مکان میں رہائش کی اجازت دی گئی، جب تک موصوف مسجد کے امام تھے تو ان سے کچھ تعرض نہیں کیا گیا لیکن موصوف کی رحلت کے بعد اس کے پسماندہ ورثاء مکان پر قبضہ جما کر مالکانہ حقوق کا دعوٰی کر رہے ہیں ـــ کیا مسجد کی موقوفہ جائداد پر کسی کے ارث کا دعوٰی درست ہے؟

الجواب:۔ اگر مکان اور زمین مسجد کی ضروریات کے لیے وقف ہوں تو امام صاحب کے پسماندہ ورثاء بطور وراثت اس پر قابض نہیں ہوسکتے، کیونکہ مسجد کے لیے وقف شدہ چیز کسی کی ملک نہیں ہوتی بلکہ وہ ہمیشہ مسجد کی ضروریات کے لیے ہی استعمال ہوگی۔

قال المرغینانیؒ: ومن اتخذ ارضه مسجداً لم يكن له ان يرجع فيه ولا يبيعه ولا يورث عنه لانه يحرز عن حق العباد وصار خالصاً لله تعالىٰ وهذا لان الاشياء كلها لله تعالىٰ۔ (الهداية ج ۲ ص۶۰۸ کتاب الوقف، فصل فی المسجد) ٢ـه

لـه لما قال العلامة محمد يوسف البنورى: واما انشاد الضالة فلها صورتان احدهما وهى اقبح واشنع بان يضل شىء خارج المسجد ثم ينشد فى المسجد لاجل اجتماع الناس فيه۔

والثانية ان يضل فى المسجد نفسه فينشده فيه وهذا يجوز اذا كان من غير لغط وشغب۔ (معارف السنن ج ۳ ص۳۱۳ باب ماجاء فى كراهية البيع والشراء۔۔۔۔والشعر فى المسجد)

وَمِثْلُهٗ فى ردالمحتار ج ۱ ص۶۶۰ مطلب فى افضل المساجد، كتاب الصلوٰة۔

٢ـه وفى الهندية: اما حكمه عندهما زوال العين عن ملكه الى الله تعالىٰ وعند ابى حنيفة رحمه الله تعالىٰ حكمه صيرورة العين محبوسة على ملكه بحيث لا تقبل النقل عن ملك الىٰ ملك والتصدق بالغلة المعدومة متى صح الوقف بان قال جعلت ارضى هذه صدقة موقوفة مؤبدة او اوصيت بها بعد موتى فانه يصح حتى لا يملك بيعه ولا يورث عنه لكن ينظر ان خرج من الثلث يجوز۔ (الفتاوى الهندية ج ۲ ص۳۵۲ الباب الاول فى تعريف الوقف، كتاب الوقف)

وَمِثْلُهٗ فى ردالمحتار ج ۴ ص۳۵۱، ۳۵۲ كتاب الوقف۔

مسجد میں کھانے پینے کا حکم

سوال:۔ مساجد اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے بنائی جاتی ہیں تو ان میں کھانا کھانے کا کیا حکم ہے؟

الجواب: مسجد میں کھانا پینا صرف معتکف کے لیے جائز ہے، البتہ غیر معتکف یا مقیم وغیرہ اگر کسی وجہ سے مسجد میں کھانا کھانا چاہتے ہیں تو بغیر نیت اعتکاف کے مکروہ ہے، لہٰذا مسجد میں کھانا کھاتے وقت اعتکاف کی نیت کر لی جائے۔ مسجد کے ساتھ متصل زمین یا کمرہ کو چھوڑ کر بلضد مسجد میں ہی کھانا کھانا اچھا نہیں۔

وفی الهندیة: ویکره النوم والاکل لغیر المعتکف واذا اراد ان یفعل ذٰلک ینبغی ان ینوی الاعتکاف فیدخل فیه ویذکر الله تعالیٰ بقدر ما نوی او یصلی ماشاء کذا فی السراجیة۔ (الفتاوی الهندیه ج۵ ص۳۲۱ کتاب الکراهیة۔ الباب الخامس فی آداب المسجد الخ)

مدرس کو مسجد کے فنڈ سے اُجرت دینا

سوال: مسجد میں بچوں کو پڑھانے والے استاد کو مسجد کے فنڈ سے اُجرت دینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مدرس کو مسجد کے لیے جمع شدہ فنڈ سے تنخواہ دینا جائز نہیں کیونکہ مدرس مسجد کے مصارف میں سے نہیں ہے، اس لیے مدرس کی تنخواہ کا کوئی اور انتظام کیا جائے۔ البتہ اگر جمع شدہ فنڈ مسجد کی ضروریات سے زائد ہو تو اس کو کسی دوسری مسجد کی ضروریات میں صرف کیا جا سکتا ہے جو اقرب الاقرب ہو۔

قال الحصکفیؒ: حشیش المسجد وحصره مع الاستغناء عنهما و(کذا الرباط والبئر اذا لم ینتفع بهما فیصرف وقف المسجد والرباط والبئر) والحوض (الی اقرب مسجد او رباط او بئر) وحوض (الیه)۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المختار ج۴ ص۳۵۹ کتاب الوقف)

تاہم اگر واقف نے مال دیتے وقت یہ نیت کی ہو کہ اس مال سے مسجد اور اس کے متعلق امام و مؤذن اور مدرس کو تنخواہ دی جائے تو اس صورت میں جائز ہے[۲]

---

[۱] قال قاضی خانؒ: ویباح للمعتکف الاکل والشرب فی معتکفه (ج۱ ص۲۳۲ باب الاعتکاف، قاضیخان علیٰ هامش فتاویٰ هندیة)۔ ومثله فی رد المحتار ج۱ ص۶۶۱ احکام المساجد۔

[۲] وفی الهندیة: واذا اراد ان یصرف شیئاً من ذٰلک الی امام المسجد والی مؤذن المسجد لیس له ذٰلک الا ان کان الواقف شرط ذٰلک فی الوقف۔

(الفتاوی الهندیة ج۲ ص۴۶۳ کتاب الوقف۔ الباب الحادی عشر فی المسجد۔ الفصل الثانی)

مسجد میں رہائش پذیر طلباء کا مسجد کی چیزوں کو استعمال کرنا

سوال:۔ مسجد میں رہائش پذیر طلباء جو کہ علم دین حاصل کر رہے ہوں کیا وہ مسجد کی اشیاء مثلاً بجلی، لکڑی، دری وغیرہم استعمال کر سکتے ہیں؟

الجواب:۔ مسجد کی موقوفہ اشیاء کا طلباء کو استعمال کرنا شرعاً جائز نہیں کیونکہ طلباء کرام مساجد کے مصالح سے متعلق نہیں، البتہ اگر واقف اس کی نیت کرے تو امام و مؤذن کی طرح ان کے لیے بھی استعمال جائز ہے۔

قال ابن عابدین رقوله اتحد الواقف والجهة) بان وقف وقفین علی المسجد احدهما علی العمارة والاٰخر الی امامه اومؤذنه والامام والمؤذن لایستقر لقلة المرسوم للحاکم الدین ان یصرف من فاضل وقف المصالح والعمارة الی الامام والمؤذن باستصواب اهل الاصلاح من اهل المحلة ۔ (ردالمحتار ج۳ ص۳۶ کتاب الوقف)[1]

عارضی مسجد شرعی مسجد کے حکم میں نہیں

سوال:۔ ہم ایک سرکاری کالونی میں رہائش پذیر ہیں جبکہ اس کالونی میں کوئی مسجد نہیں ہے اور حکومت نے ہم سے وعدہ کیا ہے کہ ہم نقشہ کے مطابق آپ کو مسجد کے لیے زمین دیں گے، کالونی میں دو دکانیں اور ان کے سامنے برآمدہ بھی ہے۔ کیا فی الحال عارضی طور پر ہم ان دوکانوں کی ہیئت کو بدل کر مسجد بنا سکتے ہیں؟ مثلاً ان کے درمیان میں محراب بنا لیا جائے جبکہ یہ دکانیں حکومت کی ملک ہیں۔ اور بعد میں جب حکومت کی طرف سے مسجد کے نام پر زمین الاٹ ہوگی تو اس الاٹ شدہ زمین پر مستقل طور پر مسجد بنائی جائے گی۔ کیا یہ دوکانیں جن میں عارضی طور پر مسجد بنائی گئی تھی بعد میں اس کو دوبارہ دکانوں کے کام میں استعمال کیا جا سکتا ہے؟

الجواب:۔ جس زمین پر عارضی طور پر مسجد بنائی جائے یا مغصوبہ زمین پر مسجد بنائی جائے تو یہ مسجدِ شرعی کے حکم میں نہیں، ضرورت ختم ہونے پر مالک اس زمین کو اپنی ذاتی ضروریات کے لیے استعمال کر سکتا ہے، چونکہ یہ دوکانیں بھی مالک کی اجازت کے بغیر مسجد کے لیے استعمال ہوئی ہیں

---

[1] وفی الهندية: واذا اراد ان یصرف شیئاً من ذلك الی امام المسجد اوالی مؤذن المسجد فلیس له ذلك الا ان کان الواقف شرط ذلك فی الوقف کذا فی الذخیرة۔ (الفتاوی الهندية ج۲ ص۴۶۳ کتاب الوقف) ۔ ومثله فی خلاصة الفتاوی ج۴ ص۴۲۶

اس لیے یہ مسجدِ شرعی کے حکم میں نہیں بلکہ بعد مالک یعنی حکومت اس کو اپنی ذاتی اغراض کے لیے استعمال کر سکتی ہے۔

قال ابن عابدینؒ: افادات الواقف لابدّ ان یکون مالکا له وقت الوقف ملکا باتا ولو بسبب فاسد وان لایکون محجورا عن التصرف حتی لو وقف الغاصب المغصوب لم یصح وان ملکه بعد بشراء او صلح ولو اجاز المالك وقف الفضولی جاز۔
(رد المحتار علی الدر المختار ج۴ ص۳۴۰ کتاب الوقف مطلب قد یثبت الوقف بالضرورة) [1]

معتکف کا مسجد میں ریح (ہوا) خارج کرنا

سوال:۔ رمضان المبارک میں اعتکاف کے دوران خروجِ ریح کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ بدبو پھیلنے کے سبب مسجد میں ہوا خارج کرنا مکروہ تحریمی ہے جس سے مسجد کو پاک رکھا جائے، چونکہ معتکف کے لیے مسجد میں سونے کی اجازت ہے اس لیے سونے کے ساتھ جو اس کے لوازمات ہیں وہ سب جائز ہیں تاہم بہتر نہیں۔

وفی الهندية: اختلف فی الذی یفسوا فی المسجد فلم یر بعضهم بأسا وبعضهم قالوا لایفسوا ویخرج اذا احتاج الیه وهو الاصح ولا بأس للمحدث ان یدخل المسجد فی اصح القولین ویکره النوم والاکل فیه لغیر المعتکف۔
(الفتاوی الهندية ج۵ ص۳۲۱ کتاب الکراهية الباب الخامس) [2]

---

[1] قال ابن نجیمؒ: الخامس من شرائطه الملك وقت الوقف حتی لو غصب ارضا فوقفها ثم اشتراها من مالکها ودفع الثمن الیه او صالح علی مال دفعه الیه لا تکون وقفا۔ (البحر الرائق ج ۵ ص۱۸۸ کتاب الوقف)
وَمِثْلُهٗ فی الهندية ج ۲ ص۳۵۳ کتاب الوقف)

[2] قال ابن عابدینؒ: وکذا لا یخرج فیه الریح من الدبر کما فی الاشباه واختلف فیه السلف فقیل لا بأس وقیل یخرج اذا احتاج الیه هو الاصح حموی عن شرح الجامع الصغیر للتمرتاشی۔ (ردّ المحتار علی الدر المختار جلد ۱ ص۴۸٦ احکام المساجد)
وَمِثْلُهٗ فی الاشباه والنظائر ج ۴ ص٦۲ کتاب الوقف۔

مسجد کا پانی گھر لے جانا

سوال:۔ بعض علاقوں میں مسجد کا پانی اکثر لوگ گھرلے جاتے ہیں، کیا مسجد کا پانی گھرلے جانا شرعاً جائز ہے؟

الجواب:۔ یہ پانی اگر صرف مسجد کے لیے وقف ہو تو پھر مسجد کی ضروریات تک محدود رہے گا، مسجد سے گھروں کو پانی لے جانا جائز نہیں، البتہ اگر واقف نے پانی وقف کرتے وقت اس کی اجازت دی ہو تو پھر کوئی حرج نہیں لیکن مسجد کی ضروریات کو مقدم رکھا جائے گا۔
اب اگر واقف نے کنواں مسجد اور دیگر ضروریات کے لیے تو وقف کیا ہے مگر پانی بجلی کی موٹر یا ڈیزل انجن وغیرہ کے ذریعے نکالا جاتا ہو تو اس میں بھی چندہ دہندگان کی نیت ضروری ہوگی۔

قال ابن نجیمؒ التوضی من السقایة اذا اتخذ ھا للشرب اختلف المشائخ ولو اتخذھا للتوضوء لایجوز الشرب منه بالاجماع۔ (البحر الرائق جلد ۵ ص۲۵۵ کتاب الوقف) [1]

مسجد کے فنڈ سے امام کو تنخواہ دینا

سوال:۔ ایک شخص نے کچھ زمین مسجد کے لیے وقف کی تھی جس میں اس نے یہ تعین کیا تھا کہ نصف زمین کو فروخت کرکے مسجد کی تعمیر پہ لگادی جائے اور نصف زمین مزارعت کے لیے ہے اور اس سے حاصل شدہ منافع امام کی تنخواہ میں صرف کیا جائے۔ اب جس مزارع کے پاس زمین ہے وہ نفع دینے سے انکاری ہے، ان حالات میں مسجد کے فنڈ سے امام کو تنخواہ دی جاسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ایسا فنڈ جو مسجد کی تعمیر کے لیے خاص ہو اس سے امام کو تنخواہ نہیں دی جاسکتی، اگر واقف اس کی نیت کرے تو اس صورت میں دینا جائز ہے، البتہ مسجد کی عام ضروریات کے لیے رکھے ہوئے چندہ سے امام کو تنخواہ دینا جائز ہے کیونکہ یہ بھی مسجد کی ضرورت ہے۔

قال ابن عابدینؒ (قوله اتحد الواقف والجهة) ان وقف وقفین علی المسجد احدهما علی العمارة والآخر الی امامه او مؤذنه والامام والمؤذن لا یستقر

---

[1] قال ابواللیث السمرقندیؒ: یبدأ بثمنه فی مسجد اخر فی موضع ماء لعمارة المسجد او فی الظرف للشرب لایجوز التوضی به الا اذا کان کثیرا وکذ الایجوز دفع الجرمن السقایة۔ (الفتاوی النوازل ص۲۴۳ کتاب الوقف)
ومثله فی الهندیة ج۲ ص۴۶۵ کتاب الوقف)

لقلة المرسوم للحاكم الدين وان يصرف من فاضل وقف المصالح والعمارة الى الامام والمؤذن باستصواب اهل الصلاح من اهل المحلة۔

(رد المحتار علی الدر المختار ج ۴ ص۳۶ کتاب الوقف مطلب فی نقل انقاض المسجد ونحوہ)[۱]

مسجد کے فنڈ سے امام کے لیے مکان بنانا

سوال:۔ ہمارے محلہ میں ایک مسجد ہے جس کے ساتھ متصل رقبہ مسجد کے لیے وقف ہے اس میں بعض اہلِ محلہ کا ارادہ ہے کہ امام صاحب کے لیے مکان تعمیر کرا لیا جائے، لیکن مکان کی تعمیر کے لیے مستقل چندہ نہیں کیا گیا بلکہ مسجد کے فنڈ سے ہی مکان کو تعمیر کرنے کا ارادہ کیا گیا ہے۔ کیا عند الشرع مسجد کے فنڈ سے امام صاحب کے لیے مکان تعمیر کیا جا سکتا ہے؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ میں مکان کی تعمیر مسجد کے فنڈ کے مصارف میں سے نہیں ہے البتہ اگر واقف اس کی نیت کرے کہ اس فنڈ سے امام مسجد کے لیے مکان بھی تعمیر کر لیا جائے تو پھر شرعاً جائز ہے۔

قال ابن عابدینؒ (قوله اتحد الواقف والجهة) بان وقف وقفین علی المسجد احدهما علی العمارة والاخر الی امامه او مؤذنه والامام والمؤذن لا یستقر لقلة المرسوم للحاکم الدین ان یصرف من فاضل وقف المصالح والعمارة الی الامام والمؤذن باستصواب اهل الصلاح من اهل المحلة۔ (رد المحتار علی الدر المختار ج۴ ص۳۶ کتاب الوقف)[۲]

---

[۱] قال طاهر بن عبد الرشیدؒ: ولو شرط الواقف فی الوقف الصرف الی امام المسجد وبیّن قدره یصرف الیه ان کان فقیراً وان کان غنیاً لا یحل له وکذا الوقف علی الفقهاء والمؤذنین۔
(خلاصة الفتاوی ج۴ ص۴۲۶ کتاب الوقف)
وَمِثْلُهٗ فی الفتاوی الهندیة ج۲ ص۴۶۳ الباب الحادی عشر فی المسجد والفصل الثانی فی الوقف علی المسجد۔

[۲] وفی الهندیة: واذا اراد ان یصرف شیئاً من ذلك الی امام المسجد او الی مؤذن المسجد فلیس له ذلك الا ان کان الواقف شرط ذلك فی الوقف کذا فی الذخیرة۔
(الفتاوی الهندیة ج۲ ص۴۶۳ کتاب الوقف۔ الباب الحادی عشر فی المسجد الفصل الثانی)
وَمِثْلُهٗ فی خلاصة الفتاوی ج۴ ص۴۲۶ کتاب الوقف۔

دو مسجدوں کا قریب قریب ہونا

سوال:۔ ہماری مسجد کے قریب تقریباً ۵ گز کے فاصلہ پر ایک چبوترہ ہے، ہمارے محلہ میں عقائد کے لحاظ سے بہت اختلاف ہے، اسی اختلاف کی وجہ سے لوگ ایک دوسرے کے پیچھے نماز کو جائز نہیں سمجھتے، ان حالات میں ہر فریق نے اپنے لیے الگ الگ مسجد بنائی ہے لیکن دونوں مساجد اتنی قریب ہیں کہ بسا اوقات ایک دوسرے کی تکبیرات اور قرأت سنی جاتی ہے۔ ان حالات میں دوسری مسجد کا قیام جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر اہل محلہ میں کسی مسئلہ میں اختلاف ہو جائے تو بہتر یہ ہے کہ آپس میں صلح کرلیں اور اختلاف کو رفع کر دیں، اور اگر اختلاف رفع نہ ہو سکے تو رفع فساد کے لیے ایک مسجد کو تقسیم کرنا شرعاً جائز ہے اس لیے قریب میں دوسری مسجد بنانا بطریق اولیٰ جائز ہے۔

قال ابن نجیمؒ: واذا قسم اهل المحلة المسجد وضربوا فیه حائطاً ولکلّ منهم امام علی حدة ومؤذنهم واحد لا بأس به۔

(البحر الرائق ج ۲ ص۳۵ باب ما یفسد الصلوٰة وما یکره فیها)[1]

مسجد میں آنے سے منع کرنا

سوال:۔ کسی کو مسجد میں آنے سے منع کرنے کا شرع میں کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ مسجد کسی کی ملک نہیں، یہ ایک عبادت گاہ ہے جس میں ہر ایک کو آنے کا حق حاصل ہے کہ اس میں نماز و تلاوت و ذکر کرے۔ اَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا۔ (سورة الجن آیت ۱۸) اس لیے مساجد میں آنے سے کسی کو منع کرنا گناہِ عظیم ہے، قرآنِ کریم میں مساجد میں آنے سے منع کرنے والوں کے لیے سخت وعید آئی ہے، ارشادِ ربانی ہے وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِىْ خَرَابِهَا (البقرة ۱۱۴) البتہ اگر مسجد تنگ ہو تو اپنی ضرورت کو ملحوظ رکھ کر دوسرے محلے والوں کو مسجد آنے سے روکا جا سکتا ہے۔

قال ابن عابدینؒ: قال فی القنیة وکذا لاهل المحلة ان یمنعوا من لیس منهم

---

[1] قال الحصکفیؒ: وجعل المسجدین واحدا وعکسه لصلوٰة۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المختار ج۱ ص۶۶۳ احکام المساجد)۔ وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج ۵ ص۳۲ کتاب الکراهیة۔

عن الصلوٰة فيه اذا ضاق بهم مسجد۔ (ردالمحتار ج ۱ ص۶۶۲ کتاب الصلوٰة)[1]

مسجد میں گوبر کا استعمال

سوال:۔ مسجد میں گوبر کا استعمال کیسا ہے؟ جیسا کہ بعض مساجد میں آگ جلانے یا مٹی میں خلط کرکے گارا بناکر استعمال کیا جاتا ہے؟

الجواب:۔ مسجد میں گوبر کا استعمال جائز نہیں، البتہ ضرورت اس سے مستثنیٰ ہے تاہم اگر گوبر کے علاوہ کسی متبادل چیز سے ضرورت پوری ہو سکتی ہو تو بہتر یہ ہے کہ اس متبادل چیز کو استعمال کیا جائے۔

قال ابن عابدینؒ:(ولا تطيينه بنجس) في الفتاوى الهندية يكره ان يطين المسجد بطين تد بل بماء نجس بخلاف السرقين اذا جعل فيه الطين لان في ذٰلك ضرورة وهو تحصيل غرض لا يحصل الا به كذا في السراجية۔

(ردالمحتار ج ۱ ص۶۵۶ احكام المساجد)[2]

ویران مسجد کا حکم

سوال:۔ ہمارے محلہ میں ایک پرانی مسجد ہے جو کسی وقت آباد تھی لیکن اب لوگ اس میں نماز نہیں پڑھتے، بعض لوگ اس میں مویشی بھی باندھتے ہیں، جبکہ کچھ لوگوں کا ارادہ ہے کہ اس پرانی اور ویران مسجد کو جنازہ گاہ میں تبدیل کیا جائے، کیا شرعاً ایسا کرنا جائز ہے؟

الجواب:۔ جب کسی مقام پر ایک دفعہ مسجد بنا دی جائے اور مستقلاً اس میں نماز بھی پڑھی گئی ہو تو اس کو ویران ہونے کے بعد کسی بھی دوسرے مقصد کے لیے استعمال کرنا جائز نہیں وہ قیامت تک مسجد ہی رہے گی، لہٰذا اس ویران مسجد کو جنازہ گاہ یا اصطبل میں بدلنے کی اجازت

---

[1] قال ابن نجیمؒ: وكذا لاهل المحلة ان يمنعوا من ليس منهم عن الصلوٰة فيه اذا ضاق بهم المسجد۔ (البحرالرائق ج ۵ ص۲۵۰ كتاب الوقف)
وَمِثْلُهٗ فی الهندية ج ۵ ص۳۲۲ كتاب الكراهية)

[2] قال ابن نجیمؒ: اذا نزح الماء النجس من البئر كره له ان يبل به الطين فيطين به المسجد على قول من اعتبر نجاسة الطين۔ (البحرالرائق ج ۲ ص۳۵ باب ما يفسد الصلوٰة)
وَمِثْلُهٗ في الهندية ج ۵ ص۳۱۷ كتاب الكراهية الباب الخامس في آداب المسجد۔

نہیں بلکہ اگر ہو سکے تو از سرِ نو اس مسجد کو تعمیر کر کے آباد کیا جائے۔

قال الحصکفیؒ ولو خرب ما حوله واستغنی عنه یبقی مسجداً عند الامام والثانی) ابداً الی قیام الساعة (وبه یفتی) حاوی القدسی۔

قال ابن عابدینؒ (عند الامام والثانی) فلا یعود میراثاً ولا یجوز نقله ونقل ماله الی مسجد اٰخر سواء کان یصلون فیه اولا وهو الفتوی حاوی القدسی واکثر المشائخ علیه مجتبی وهو الاوجه۔

(رد المحتار ج۴ ص۳۵۸ کتاب الوقف مطلب فیما لو خرب المسجد وغیرہ) [۱]

مسجدِ شرعی کا تبادلہ

سوال:- زید نے مسجد کے لیے ایک جگہ دی تھی اور باقاعدہ طور پر اہلِ محلہ نے وہاں مسجد تعمیر کر کے نماز شروع کر دی، اب یہ شخص کہتا ہے کہ یہ جگہ مجھے واپس کر دی جائے میں اس کے بدلے میں دوسری جگہ دیتا ہوں۔ کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے؟

الجواب:- جو جگہ ایک دفعہ مسجد کے لیے وقف کر دی گئی اور باقاعدہ طور پر وہاں مسجد بھی بنائی گئی اور نماز شروع ہو گئی تو ہمیشہ کے لیے مسجد ہی رہے گی، اب اس کو منہدم کر کے اس کے بدلے میں دوسری مسجد بنانا یا اس کی جگہ کو تبدیل کرنا شرعاً جائز نہیں۔

قال الحصکفیؒ ولو خرب ما حوله واستغنی عنه یبقی مسجداً عند الامام والثانی) ابداً الی قیام الساعة (وبه یفتی) حاوی القدسی۔

قال ابن عابدینؒ (عند الامام والثانی) فلا یعود میراثاً ولا یجوز نقله ونقل ماله الی مسجد اٰخر سواء کان یصلون فیه اولا وهو الفتوی حاوی القدسی واکثر المشائخ علیه مجتبی وهو الاوجه۔ (رد المحتار ج۴ ص۳۵۸ باب الوقف مطلب فیما لو خرب المسجد وغیرہ) [۲]

---

[۱] قال طاهر البخاریؒ: اذا خرب المسجد وفی الفتاوی اذا خربت القریة فیها المسجد وجعلت مزارع وخرب المسجد ولا یصلی فیه احد فلا بأس بان یاخذه صاحبه ویبیعه وهو قول محمدؒ وعن ابی یوسفؒ لا یعود الی ملک الباقی ولا الی ملک ورثته وهو مسجد ابداً۔ (خلاصة الفتاوی جلد۴ ص۴۲۲ کتاب الوقف، الفصل الرابع فی المسجد واوقافه) وَمِثْلُهٗ فی الهدایة ج۲ ص۶۴۵ کتاب الوقف فصل فی المسجد۔

[۲] وفی الخلاصة الفتاوی: اذا خرب المسجد وفی الفتاوی اذا خربت القریة التی فیها المسجد وجعلت مزارع وخرب المسجد ولا یصلی فیه احد فلا بأس بان یاخذه صاحبه ویبیعه وهو قول محمدؒ وعن ابی یوسفؒ لا یعود الی ملک الباقی ولا الی ملک ورثته وهو مسجد ابداً۔ (ج۴ ص۴۲۲ کتاب الوقف الفصل الرابع فی المسجد وغیرہ) وَمِثْلُهٗ فی الهدایة ج۲ ص۶۴۵ کتاب الوقف فصل فی المسجد۔

مسجد میں کسی کے لیے جگہ متعین کرنا

سوال:۔ بعض لوگ مسجد کے اندر اپنے رفقاء کے لیے بیٹھنے کی جگہ متعین کر دیتے ہیں اور اس جگہ پر چادر یا جائے نماز رکھ کر دوسروں کو وہاں بیٹھنے نہیں دیتے جبکہ ابھی تک وہ لوگ مسجد میں موجود ہی نہیں ہوتے۔ کیا اس طرح کسی کے لیے مسجد میں جگہ متعین کرنا شرعاً جائز ہے؟

الجواب:۔ مسجد میں غیر موجود لوگوں کے لیے جگہ روکنا خصوصاً جمعہ کے دن ایسا کرنے کو غیر مستحسن اور ناجائز سمجھا گیا ہے کیونکہ مسجد کسی کی ملک نہیں، یہ حق پہلے آنے والوں کا بنتا ہے، علاوہ ازیں بعد میں آنے والا شخص بیٹھے ہوئے لوگوں کی گردنوں یا کندھوں کے اوپر سے گذر کر جائے گا اور دوسرے مسلمانوں کی ایذا رسانی کا سبب بنے گا جو کہ شرعاً ممنوع ہے۔

عن ابی سعیدؓ وابی ھریرۃؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من اغتسل یوم الجمعۃ ولبس من احسن ثیابہ ومس من طیب ان کان عندہ ثم اتی الجمعۃ فلم یتخط اعناق الناس ثم ماکتب اللہ لہ ثم انصت اذا خرج امامہ حتی یفرغ من صلوتہ کانت کفارۃ لما بینھا وبین جمعۃ التی قبلھا۔ رواہ ابوداؤد (مشکوۃ ج ۱ ص ۱۲۲ باب التنظیف والتبکیر، الفصل الثانی) [1]

مسجد کے باغیچہ پر چھت ڈالنا

سوال:۔ مسجد کے ساتھ صحن میں ایک باغیچہ ہے بعض اہل محلہ کا ارادہ ہے کہ اس باغیچہ پر چھت ڈال دی جائے تاکہ طلباء کرام دینی علوم حاصل کر سکیں یا کسی اور مصالح میں اس کو استعمال کیا جا سکے، کیا عند الشرع ایسا کرنا جائز ہے؟

الجواب:۔ اگر مسجد کا یہ صحن مسجد کی حدود میں داخل ہو اور اس میں مستقل طور پر کسی وقت نماز

---

[1] حدثنا ھارون بن معروف نا بشر بن السری نا معاویۃ بن صالح عن الزاھریۃ قال کنا مع عبد اللہ بن بسر صاحب النبی صلی اللہ علیہ وسلم یوم الجمعۃ فجاء رجل یتخطی رقاب الناس فقال عبد اللہ بن بسر جاء رَجُلٌ یتخطی رقاب الناس یوم الجمعۃ والنبی صلی اللہ علیہ وسلم یخطب فقال لہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم اجلس فقد اذیت۔ (ابوداؤد ج ۱ ص ۱۵۹ باب تخطی رقاب الناس یوم الجمعۃ)

وَمِثْلُہٗ فی الجامع الترمذی ج ۱ ص ۶۷ باب فی کراھیۃ التخطی یوم الجمعۃ۔

پڑھ لی گئی ہو تو اب یہ قیامت تک مسجد ہی رہے گی اس کو کسی اور مصرف میں لانا عند الشرع جائز نہیں۔ تاہم چونکہ دینی تعلیم کا حصول مساجد کے مقاصد میں شمار ہوتا ہے اس لیے مسجد یا اس کے کسی کونے کو مدرسے کے طور پر استعمال کرنا مرخص ہے، لیکن دیگر مصالح کے لیے اس کا استعمال جائز نہیں ۔

لما روی ابو هریرۃ عن النبی قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول من جاء مسجدی لم یأت الا الخیر یتعلمه او یعلمه فهو بمنزلة المجاهد فی سبیل اللہ۔ الخ قال الملا علی القاری فیه دلالة علی جواز التدریس فی المسجد۔ (المرقاۃ شرح مشکوۃ جلد ۲ ص ۲۲۱ باب المساجد الفصل الثالث، کتاب الصلوۃ) [1]

متولی مسجد کا بغیر اذن چندہ دہندگان کے اُجرت لینا

سوال:- اہلِ محلہ نے اپنی مسجد کے لیے ایک متولی مقرر کیا ہے لیکن اس کے لیے اہلِ محلہ نے کوئی مشاہرہ مقرر نہیں کیا، تو کیا متولی بغیر اذنِ اہلِ محلہ مسجد کے فنڈ میں سے اپنی اُجرت لے سکتا ہے؟

الجواب:- چندہ کے اموال ایک امانت ہوتے ہیں اور یہ وقف عرفی ہے شرعی نہیں، لہٰذا ایسے امور کے لیے واقفین سے اس کی اجازت لینا ضروری ہے، بغیر اذن کے متولی کو مسجد کے فنڈ سے تنخواہ لینا جائز نہیں ہے۔

وفی الهندیة: لو وقف دراهم او مکیلا او ثیابا لم یجز وقیل فی موضع تعارفوا ذلك یعنی بالجواز قیل کیف الدراهم تقرض للفقراء ثم یقبضها او تدفع مضاربة و یتصدق بالربح والحنطة تقرض للفقراء یزرعون ثم تؤخذ منهم والثیاب الاکسیة تعطی للفقراء لیلبسوها عند حاجتهم ثم تؤخذ کذا فی الفتاوی العتابیة۔ (الفتاوی الهندیة ج ۲ ص ۳۶۲ کتاب الوقف، الباب الثانی فیما یجوز وقفه الخ)

فهو فی الشرع عند ابی حنیفة رحمه اللہ تعالیٰ حبس العین علی ملك الواقف والتصدق بالمنفعة علی الفقراء او علی وجه من وجوه الخیر بمنزلة العواری کذا فی الکافی فلا یکون

---

[1] وفی الهندیة: یجوز الدرس فی المسجد وان کان فیه استعمال اللبود والبواری المسبلة لاجل المسجد۔ (الفتاوی الهندیة ج ۵ ص ۳۲۱ الباب الخامس فی آداب المسجد)
وَمِثْلُهٗ فی امداد المفتیین المعروف بفتاوی دار العلوم دیوبند ج ۲ ص ۸۱۲۔

لازمًا وله ان یرجع و یبیع کذا فی المضمرات ولا یلزم الا بطریقین احدهما قضاء القاضی بلزومه والثانی ان یخرج مخرج الوصیة..... وعندهما حبس العین علی حکم ملک الله تعالیٰ علی وجه لتعود منفعته الی العباد فیلزم ولا یباع ولا یوهب ولا یورث کذا فی الهدایة الی العیون الیتیمة ان الفتوی علی قولهما کذا فی شرح الشیخ ابی المکارم للنقایة۔
(فتاوی هندیة ج۲ ص۳۵۰ کتاب الوقف، الباب الاول فی تعریفه الخ) ؎۱

مسجد میں ٹیپ ریکارڈر لانا

سوال:۔ بعض لوگ مساجد میں ٹیپ ریکارڈر لے آتے ہیں جس سے تقاریر اور تلاوت وغیرہ سنتے ہیں اور ریکارڈ کرتے ہیں، کیا ان کا یہ فعل شرعاً جائز ہے؟

الجواب:۔ ٹیپ ریکارڈ بذاتِ خود ایک آلہ ہے، اس کو اچھے اور برے دونوں کاموں میں استعمال کیا جاسکتا ہے، اگر اسے اچھے کاموں میں استعمال کیا جائے مثلاً تلاوتِ قرآن یا کسی کی تقریر ٹیپ کرنا، اگر اس نیت سے مسجد میں لایا جائے تو شرعاً اس میں کوئی گناہ نہیں، البتہ اگر اس ٹیپ ریکارڈ سے گانے سنے جائیں یا کسی اور گناہ کے کام کے لیے لایا جائے تو مسجد وخارج مسجد دونوں میں مطلقاً جائز نہیں۔

قال طاهر بن عبد الرشیدؒ: وفی الفتاوی استماع صوت الملاهی کالضرب بالقصب وغیره حرام لانه من الملاهی وقال علیه الصلوٰة والسلام استماع الملاهی معصیة والجلوس علیها فسوق والتلذذ بها من الکفر هذا علی وجه التحدید ولکن وجب علیه ان یجتهد حتی لا یسمع لما روی عن النبی صلی الله علیه وسلم انه ادخل اصبعه فی اذنه منذ ذکر اشعار العرب ان کان فیها ذکر الفسق کره هم بالمعصیة

؎۱ قال الحصکفی (حبس العین علی حکم) ملک (الواقف والتصدق بالمنفعة) ولو فی الجملة والاصح انه (عنده) جائز غیر لازم کالعاریة (وعندهما هو حبسها علی حکم) ملک الله تعالیٰ وصرف منفعتها علی من احب۔ (ردالمحتار ج۳ ص۳۵۷ کتاب الوقف)

قال المرغینانیؒ: لا یزول ملک الواقف الا ان یحکم به الحاکم او یعلقه بموته فیقول اذا مت فقد وقفت داری علی کذا وقال ابو یوسفؒ یزول ملکه بمجرد القول وقال محمدؒ لا یزول حتی یجعل للوقف۔ (الهدایة ص۶۳۷ ج۲ کتاب الوقف)

ان عزم علیہ الاثم۔ (خلاصۃ الفتاوی ج۴ ص۳۴۵ کتاب الکراھیۃ الفصل الثالث فیما یتعلق بالمعاصی)

بوقتِ ضرورت متولی کی اجازت کے بغیر مسجد تعمیر کرنا

سوال:۔ اگر مسجد کے گرجانے کا خوف ہو تو دوسرے محلہ میں سے کسی شخص کو بغیر اذن متولی یا اہلِ محلہ کے اس کو شہید کر کے نئی مسجد تعمیر کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ بسا اوقات ایسے بلا اجازت تصرفات سے بہت سی بے اعتدالیاں پیدا ہو جاتی ہیں جس سے مساجد کا انتظام بری طرح متاثر ہوتا ہے، ایسی مساجد میں جملہ تصرفات بانیٔ مسجد، متولی یا اہلِ محلہ کی اجازت پر موقوف رکھے جائیں، تاہم کسی متعنت اور اناڑی متولی کے جابرانہ رویہ کا اعتبار نہیں۔

قال العلامۃ ابن نجیمؒ: البانی اولی بنصب الامام والمؤذن وولد البانی وعشیرتہ اولی من غیرھم بنی مسجدا فی محلۃ تنازعہ بعض اھل المحلۃ فی العمارۃ فالبانی اولی مطلقاً۔ (الاشباہ والنظائر ج۲ ص۲۳۲ کتاب الوقف)

مسجد کے لیے باقاعدہ وقف سے ملکیت کا زائل ہونا

سوال:۔ ایک شخص نے کسی مسجد کے لیے زمین وقف کی ہے، اس زمین سے اس شخص کی ملکیت کب زائل ہوگی کیا وقف کے بعد اس کو مالکانہ تصرفات کا حق حاصل رہتا ہے؟

الجواب:۔ مسجد کے لیے زمین کا وقف باقاعدہ اجازت سے نماز باجماعت پڑھنے پر موقوف ہے لہٰذا ایک دفعہ نماز باجماعت پڑھنے سے اس کی ملکیت زائل ہو گئی، البتہ امام ابو یوسفؒ

---

[1] قال الحصکفیؒ: (و) کرہ (کل لھو) لقولہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کل لھو المسلم حرام الا ثلاثۃ ملاعبتہ اھلہ وتادیبہ لفرسہ ومناضلتہ بقوسہ (الدر المختار جلد۵ ص۲۵۳ کتاب الکراھیۃ فصل فی البیع)

وَمِثْلُہٗ فی الفتاوی الھندیہ ج۵ ص۳۵۱ کتاب الکراھیۃ۔

[2] قال طاہر بن عبدالرشیدؒ: رجل بنی مسجدا فی سکۃ فنازعہ بعض اھل السکۃ فی عمارتہ او نصب المؤذن والامام فالمختار ان البانی اولی وفی العمارۃ اولی بالاتفاق۔ (خلاصۃ الفتاوی ج۴ ص۴۲۱ کتاب الوقف، الفصل الرابع فی المسجد)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۵ ص۲۴۹ باب احکام المساجد، کتاب الوقف۔

کے نزدیک اس میں نماز پڑھنا بھی ضروری نہیں بلکہ صرف اس کے قول سے ملکیت زائل ہوجاتی ہے، باقاعدہ وقف کے بعد واقف کو مالکانہ تصرفات کا حق حاصل نہیں۔

قال الحصکفیؒ: (ویزول ملکہ عن المسجد والمصلی) بالفعل (بقولہ جعلتہ مسجداً) عند الثانی (وشرط محمد) والامام (الصلاۃ فیہ) بجماعۃ وقیل یکفی واحد وجعلہ فی الخانیۃ ظاهر الروایۃ۔ (الدر المختار ھامش رد المحتار ج۳ ص۳۶۹ کتاب الوقف)[۱]

عورتوں کا مسجد میں جانا

سوال:۔ ہمارے شہر برما میں ایک نئی مسجد تعمیر ہوئی ہے وہاں کے لوگ اس بات کی خواہش رکھتے ہیں کہ اگر شریعت میں عورتوں کو مسجد میں آنے کی اجازت ہے تو ایک جگہ متعین کرکے عورتوں کے لیے بھی مسجد بنا دی جائے جس میں عورتیں نماز پڑھیں اور وعظ و نصیحت کی مجالس میں شمولیت اختیار کرسکیں۔ ایسا کرنا اس دور میں جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ قرونِ اولیٰ میں اگرچہ عورتوں کو مساجد میں آنے کی اجازت تھی لیکن اس دور میں فتنہ و فساد کے عموم کی وجہ سے فقہاء نے انہیں مسجدوں میں جانے سے منع فرمایا ہے کیونکہ عورتوں کی مساجد میں حاضری کے اتنے فوائد نہیں جتنے نقصانات یقینی ہوتے ہیں، لہٰذا فسادِ زمانہ کی وجہ سے عورتوں کا مسجد میں آنا مستحسن نہیں۔

قال الحصکفیؒ: (ویکرہ حضورھن الجماعۃ) ولو لجمعۃ وعیدٍ ووعظٍ (مطلقاً) ولو عجوزاً لیلاً (علی المذهب) المفتی بہ لفساد الزمان۔ (الدر المختار علی ھامش رد المحتار جلد۱ ص۴۱۸ باب الامامۃ)[۲]

---

[۱] واذا بنی مسجداً لم یزل ملکہ عنہ حتی یفرزہ عن ملکہ بطریقۃ ویأذن للناس بالصلوٰۃ فیہ فاذا صلی فیہ واحد زال عن ابی حنیفۃؒ عن ملکہ وقال ابو یوسف یزول ملکہ بقولہ جعلتہ مسجداً۔ (الھدایۃ ج۲ ص۶۴۴ کتاب الوقف تصل فی المسجد)

وَمِثْلُہٗ فی خلاصۃ الفتاوٰی ج۴ ص۴۰۸ کتاب الوقف الفصل الاول)

[۲] قال طاھرؒ: اما اذا ام الرجل النساء فی مسجد بجماعۃ لیس معھن رجل لا باس بہ وفی غیر المسجد من البیوت ونحوھا یکرہ الا ان یکون معہ ذات رحم محرم وتخرج العجوز الی العید والجمعۃ وفی الفجر والعشاء دون الظهر والعصر والمغرب فلحال ان فی المغرب اختلاف الروایۃ وعندھما تخرج الی جمیع الصلوٰۃ ھذا جواب الاصل وقال فی الفتاوٰی لا تخرج العجائز فی زماننا الی الجماعات۔

(خلاصۃ الفتاوٰی ج۱ ص۱۵۵ کتاب الصلوٰۃ)

وَمِثْلُہٗ فی الاختیار لتعلیل المختار ج۱ ص۵۹ فصل فی الجماعۃ۔

مسجد کے متولی کو معزول کرنے کا حکم

سوال:۔ ایک مسجد کے متولی کو بعض لوگ معزول کرنا چاہتے ہیں لیکن اکثر لوگ اس کی معزولی کے اسباب نہ جاننے کی وجہ سے ایسی سرگرمیوں میں شرکت نہیں کرتے۔ کیا کسی متولی مسجد کو اہلِ محلہ یا حاکم معزول کرسکتا ہے اور وہ کون سی وجوہات ہیں جن کی وجہ سے متولی کو معزول کیا جاسکتا ہے؟

الجواب:۔ اہلِ محلہ یا حاکم نے جن امورِ شرعیہ کا لحاظ رکھتے ہوئے کسی کو متولی بنایا تھا اگر یہ متولی اُن امورِ شرعیہ کا لحاظ نہیں رکھتا بلکہ کہیں خیانت کا ارتکاب کرکے وقف کے اموال کو غیر شرعی طور سے استعمال کررہا ہو اور اسی طرح ایسے دوسرے امور کا ارتکاب کررہا ہو جس سے اہلِ محلہ تنگ ہوں تو امورِ فسقیہ کی وجہ سے اسے معزول کیا جاسکتا ہے۔ بلکہ اگر ایسے امور کا خود واقف بھی مرتکب ہو تو اسے بھی معزول کیا جاسکتا ہے۔

قال الحصکفیؒ: (جعل الواقف (الولایة لنفسه جاز) وکذا لو لم یشترط لاحد فالولایة له عند الثانی وھو ظاھر المذھب نھر خلافاً لما نقله المصنف ثم لوصیه ان کان والا فللحاکم فتاوی ابن نجیمؒ: قاری الھدایة وسیجیٔ (و ینزع وجوباً بزازیة ولو) الواقف ردرر فغیرہ بالاولیٰ (غیر مامون) او عاجزاً وظھر به فسق کشرب خمر ونحوہ فتح اوکان یصرف ماله فی الکیمیا نھر بحثاً (وان شرط عدم نزعه)

(الدر المختار علی ہامش رد المحتار ج۳ ص۳۸۴ کتاب الوقف)

مصالح مسجد کے لیے موقوفہ زمین کا حکم

سوال:۔ اکبر اور ریحان کے آباؤ اجداد نے مسجد میں پانی کی نکاسی کے لیے ایک رہٹ لگایا تھا اور اس رہٹ کے اخراجات کے لیے ۵ کنال اور تین مرلہ زمین بخشی تھی جس کا اندراج کاغذات میں موجود ہے۔ اب جبکہ مسجد میں بجلی کا پمپ بھی ہے اور لکڑی کے رہٹ کے بجائے لوہے کا رہٹ لگادیا گیا ہے، لہٰذا اس زمین سے جو اخراجات اس رہٹ کے پورے کیے جاتے تھے اب ان کی ضرورت نہیں رہی، اب اہلِ مسجد نے یہ ارادہ کیا ہے کہ یہ زمین جو پانی کی نکاسی

---

[1] وفی الھندیة: ولو ان الواقف شرط الولایة لنفسه وکان الواقف غیر مامون علی الوقف فللقاضی ان ینزعھا من یدہ کذا فی الھدایة۔ (ج۲ ص۴۰۹ کتاب الوقف)

ومثله فی الھدایة ج۲ ص۶۴۳ کتاب الوقف)

کے لیے وقف کی گئی تھی اس کو مسجد کے کسی اور مصرف میں لایا جائے، مثلاً اجارہ پر دے دی جائے یا جن کے قبضہ میں ہے اُن سے آدھا نفع لے کر مسجد کے مصالح میں خرچ کر دیا جائے، لیکن ریحان اور اکبر مسجد کی اس اراضی کو اپنے قبضہ سے نکالنے کو تیار نہیں اور کہتے ہیں کہ ہم صرف رہٹ کے ذمہ دار تھے جبکہ اب زمین اس سے مستغنی ہو گئی ہے لہٰذا یہ زمین اب ہماری ہے، اب ہم اسے اپنے مصرف میں خرچ کریں گے، کیا ان کا ایسا کرنا جائز ہے ؟

الجواب:۔ عرف کو دیکھنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ معاملہ وقف کا ہے لہٰذا جس نے اپنی زمین کی آمدنی مسجد کے لیے معین کر دی ہے تو یہ زمین بھی وقف سمجھی جائے گی اس لئے ریحان اور اکبر کو اس پر قبضہ کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں بلکہ اس کی آمدنی کو پمپ یا مصالح مسجد میں خرچ کیا جا سکتا ہے۔

ونظیرہ قال ابن نجیمؒ: اشتروا من غلۃ داری ھٰذہ کل شھر بعشرۃ دراھم خبزاً وفرقوہ علی المساکین صارت دار وقفاً۔ (البحرالرائق ج ۹ ص[1] کتاب الوقف)

مساجد کے لیے چندہ اکٹھا کرنے کا حکم

سوال:۔ مساجد کے لیے چندہ اکٹھا کرنے کا کیا حکم ہے، خصوصاً جب مسجد میں کیا جائے؟ اس دور میں مساجد میں عام طور پر چندہ مانگا جاتا ہے۔ اگر کسی محلہ والوں کو ایک عام اور کچی مسجد بنانے کی استطاعت ہو لیکن وہ پکی مسجد بنانے کے لیے چندہ کرتے ہیں، کیا ایسا کرنا جائز ہے ؟

الجواب:۔ مساجد کو تعمیر کرنا اصل کے لحاظ سے سلطانِ وقت کی ذمہ داری ہے۔

قال ابن عابدینؒ: فانہ یجب ان یتخذ الامام للمسلمین مسجداً من بیت المال ومن مالھم ان لم یکن لھم بیت مال کذا فی فتح القدیر۔ (ردالمحتار ج۳ ص۳۵۸ کتاب الوقف)

جبکہ اس دور میں عموماً سلاطین مساجد کی تعمیر کے لیے متوجہ نہیں ہوتے تو عوام کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ مساجد کی تعمیر کے لیے چندہ کریں، چاہے یہ چندہ مساجد میں کریں یا مساجد سے

---

[1] وفی الھندیۃ: رجل قال فی مرضہ اشتروا من غلۃ داری ھٰذہ کل شھر بعشرۃ دراھم خبزاً وفرقوا علی المساکین صارت الدار وقفاً۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۲ ص۳۵۹ کتاب الوقف، فصل فی الالفاظ التی یتم بھا الوقف)

وَمِثْلُہٗ فی ردالمحتار ج ۳ ص۳۵۹ کتاب الوقف)

باہر، اور بعض روایات سے اس کا ثبوت بھی ملتا ہے۔

عن جریرٍ قال کنا فی صدر النہار عند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فجاء قوم عراۃ مجتابی النمار او العباء متقلدی السیوف عامتہم من مضر بل کلھم من مضر فتمعّر وجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لما رای بھم من الفاقۃ فدخل ثم خرج فامر بلالاً فاذن واقام فصلی ثم خطب فقال یٰاَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ۔ (الیٰ آخر الآیۃ) اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلَیْکُمْ رَقِیْبًا۔ الآیۃ۔ (التی فی الحشر) اتَّقُوا اللّٰہَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ۔ تصدق رجل من دینارہ من درھمہ من ثوبہ من صاع برہ من صاع تمرۃ حتی قال ولو بشق تمرۃ الیٰ آخر۔

(مشکوٰۃ ج ۱ ص ۳۳ کتاب العلم) [1]

مسجد کے ہوتے ہوئے مندر میں نماز پڑھنا

سوال: ہمارے علاقے میں اکثر مہاجرین رہتے ہیں جب ہم ہندوستان سے ہجرت کرکے آئے تو اس علاقے میں کسی جگہ پر بھی کوئی مسجد نہیں تھی البتہ ہندوؤں کا ایک مندر تھا جس کو ہم لوگوں نے نماز کے لئے متعین کردیا اور کچھ عرصہ باقاعدہ اس میں نماز پڑھتے رہے، بعد میں گورنمنٹ سے منظوری لے کر ایک جگہ مسجد کے لئے متعین کرکے اس پر مسجد تعمیر کردی، لیکن بعض لوگ اب بھی اس مسجد کے ہوتے ہوئے مندر ہی میں نماز پڑھتے ہیں۔ تو کیا مسجد کے ہوتے ہوئے اس مندر میں نماز پڑھنی جائز ہے؟

الجواب: مذکورہ سوال میں مندر کی دو صورتیں سامنے آتی ہیں، اگر اس کو مستقل طور پر مسجد کی ہیئت میں بنا دیا گیا ہو اور اس کی پہلی شکل میں تبدیلی کردی گئی ہو تو اس کا حکم مسجد جیسا ہے، لہٰذا یہ مندر بھی مسجد میں شمار ہوگا۔ البتہ اگر مندر کی صورت تبدیل نہیں کی گئی ہو اور اس کو اپنی اصلی حالت میں رکھا گیا ہو اور نہ ہی اس کو مستقل مسجد بنانے کی نیت کی گئی ہو تو یہ مسجد کے حکم میں نہیں اور اس میں نماز پڑھنا تشبہ بالکفار کی وجہ سے مکروہ تحریمی ہے، تشبہ بالکفار کی حرمت پر بے شمار دلائل ہیں ــــ کما قال تعالیٰ: لَا تَرْکَنُوْٓا اِلَی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا

---

[1] وفی المسلم: عن جریر قال خطب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فحث علی الصدقۃ بمعنی حدیث جریر۔ (صحیح مسلم جلد ۲ ص ۳۴۱ کتاب العلم باب من سن سنۃ حسنۃ الخ)

فَتَمَسَّکُمُ النَّارُ ۔ قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من تشبہ بقوم فھو منھم ۔
(ابو داؤد ج ۲ ص ۵۵۹ کتاب اللباس، باب لبس الشھرۃ) [1]

قدیم مسجد کی جگہ نئی مسجد میں نماز پڑھنا

سوال :۔ ہمارے شہر میں ایک مسجد تقریباً ڈیڑھ سو سال پرانی ہے اور اس کی عمارت بھی بوسیدہ ہو چکی ہے جس کے گرنے کا خوف ہر وقت دامن گیر رہتا ہے، اگر کوئی شخص اس مسجد کو ترک کر کے دوسری نئی مسجد میں جو کہ قریب ہی تھوڑے سے فاصلے پر بنائی گئی ہے، نماز پڑھے تو شرعاً کیسا ہے؟ بعد میں اگر کسی شخص نے اس بوسیدہ مسجد کی عمارت کو شہید کر کے نئے سرے سے اس کی تعمیر کرائی ہے، اس صورت میں اس قدیم مسجد میں نماز پڑھنا افضل ہے یا جدید مسجد میں؟

الجواب :۔ کسی جگہ جب ایک دفعہ مسجد بن جائے تو وہ ہمیشہ مسجد ہی رہتی ہے لہٰذا قدیم مسجد جب نئے سرے سے بنائی گئی ہو تو اس کے حقوق مسجد قریب ہونے کی بہ نسبت دوسری مسجد کے زیادہ ہیں لہٰذا اس قدیم مسجد کو ہی آباد کیا جائے، بہر حال جدید مسجد میں بھی نماز پڑھنا جائز ہے لیکن بہتر نہیں ۔

قال ابن عابدینؒ ومسجد حیۃ وان نقل جمعہ افضل من الجامع وان کثر جمعہ ۔
(رد المحتار علی الدر المختار ج ۱ ص ۴۸۸ باب ما یفسد الصلوٰۃ) [2]

مسجد میں حوض بنانا

سوال :۔ ہمارے محلہ میں ایک مسجد ہے جس میں نمازیوں کی سہولت کے لیے ایک حوض بنانے کا ارادہ ہے، لیکن اگر حوض کو کامل طریقہ سے بنایا جائے تو مسجد کا کچھ حصہ اس حوض میں شامل ہو گا، اور مسجد اپنی وسعت کے لحاظ سے اتنی

---

[1] وعن ابن عمر قال قال رسول اللہ من تشبہ بقوم فھو منھم قال الملا علی القاری ای من تشبہ نفسہ بالکفار مثلاً فی اللباس وغیرہ ... فھو منھم ای فی الاثم۔ (مرقاۃ جلد ۸ ص ۲۵۵ کتاب اللباس الفصل الثانی)
وَمِثْلُہٗ فی جواھر الفقہ ج ۱ ص ۲۲۱ مساجد کی نئی تشکیل اور ان کے مقاصد

[2] وفی الخلاصۃ ان نسخہ القاضی للامام رجل یصلی فی الجامع لکثرۃ الجمع ولا یصلی فی مسجد حیہ فانہ یصلی فی مسجد منزلہ وان کان قومہ اقل وان لم یکن لمسجد منزلہ مؤذن ویصلی وان کان ھناک واحد ۔ (ج ۱ ص ۲۲۸ الفصل السادس والعشرون فی المسجد ینقل بہ)
وَمِثْلُہٗ فی الفتاوٰی الھندیۃ ج ۱ ص ۸۳ باب الامامۃ ۔

بڑی ہے کہ اس کا کچھ حصہ حوض میں شامل کرنے کی وجہ سے مسجد کے صفوف میں کچھ نقصان نہیں آتا۔ کیا ایسی صورت میں مسجد کے بعض حصے کو حوض میں شامل کیا جاسکتا ہے؟

الجواب:۔ مسجد جب ایک دفعہ مسجد بن جائے تو پھر اس کو کسی دوسرے مقصد کے لیے استعمال نہیں کیا جاسکتا، بلکہ تا قیامت تک مسجد ہی رہے گی، اس لیے مسجد کے کسی بھی حصے پر حوض بنانا جائز نہیں ہے۔

قال الحصکفیؒ: لانه مسجد الی عنان السماء وفی رد المحتار وکذا الی تحت الثریٰ۔

(الدر المختار علیٰ ہامش رد المحتار ج ۱ ص۴۸۵ کتاب الصلوٰۃ فی الکعبۃ)

علاوہ ازیں فقہاء کرام نے مسجد میں مضمضہ واستنشاق مکروہ لکھا ہے، اسلئے مسجد کے کسی حصہ میں حوض بنانے سے اس کراہیت کا ارتکاب بھی لازم آتا ہے۔

البتہ اگر مسجد بنانے کے ابتداء ہی میں کوئی جگہ حوض یا وضو کے لیے متعین کر دی جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

وفی الخلاصة ویکرہ التوضی والمضمضة فی المسجد الّا ان یکون فیه موضع اتخذ للوضوء ولا یصلّی فیه۔ (ج ۱ ص۲۲۹ الفصل السادس والعشرون ومایتصل به)[1]

دُکانوں پر مسجد بنانے کا حکم

سوال:۔ ہمارے علاقے میں ایک مسجد ہے جو چند دکانوں کے اوپر واقع ہے اور باقاعدہ اس میں اذان وجماعت بھی ہوتی ہے جبکہ یہ دوکانیں مالک کی مِلک میں ہیں۔ کیا ایسی مسجد میں نماز پڑھنا جائز ہے اور اس کو مسجد شرعی کا درجہ حاصل ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ دوکانوں کے اوپر مالک کی اجازت سے مسجد بنانے میں کوئی حرج نہیں، اس میں نماز بلا کراہیت جائز ہے، اگر مالک کی اجازت کے بغیر یہ مسجد بنائی گئی ہو تو اس میں نماز مکروہ ہے، البتہ یہ مسجد شرعی مسجد کے حکم میں نہیں بلکہ عُرفی مسجد کے حکم میں ہے، شرعی مسجد کا حکم اس پر

---

[1] قال ابن نجیمؒ، وفی الخلاصة وغیرها ویکرہ الوضوء والمضمضة فی المسجد الّا ان یکون موضع فیه اتخذ للوضوء ولا یصلی فیه۔ (البحر الرائق ج ۲ ص۳۴ فصل مما فرغ من بیان الکراهة فی الصلوٰۃ)

ومثلهٗ فی الهندیة ج ۱ ص۱۱۰ الفصل الثانی فیما یکرہ فی الصلوٰۃ وما لا یکرہ۔

اُس وقت ہوگا جب دو کانوں سے مالک کی ملکیت کو ختم کر کے مسجد کی ملکیت میں دیدی جائیں۔

قال ابن عابدینؒ: وفی القہستانی ولا بد من افرازہ ای تمیزہ عن ملکہ من جمیع الوجوہ فلو کان العلو مسجدا والسفل حوانیت او بالعکس لا یزول ملکہ لتعلق حق العبد بہ کما فی الکافی۔ (رد المحتار علی الدر المختار ج ۳ ص۳۷ کتاب الوقف) [۱]

مسجد کے متولّی کی شرعی حیثیت

سوال:۔ کیا تولیت مسجد میں ارث جاری ہو سکتا ہے اور متولی مسجد کی ذمہ داریاں کیا ہیں؟

الجواب:۔ متولی نسلاً بعد نسلٍ ہو سکتے ہیں بشرطیکہ بعد میں آنے والے کے اندر صلاحیت ہو امام و مؤذن اور مسجد کی دوسری ضروریات کا اہتمام کرنا متولّی کے فرائضِ منصبی ہیں۔

قال ابن نجیمؒ: البانی اولیٰ بنصب الامام والمؤذن وولد البانی وعشیرہ اولیٰ من غیرھم بنی مسجدا فی محلہ فنازعہ بعض اھل المحلۃ فی العمارتہ فالبانی اولیٰ مطلقاً۔

(الاشباہ والنظائر ج ۲ ص۳۳۲ کتاب الوقف) [۲]

کعبۃ اللہ کی ایسی تصاویر جن میں انسانوں کی تصاویر بھی ہوں مسجد میں آویزاں کرنا

سوال:۔ مسجد میں خانہ کعبہ کی ایسی تصاویر آویزاں کرنا جن میں کعبۃ اللہ کی تصویر کے علاوہ انسانی شکلیں بھی طواف کی ہیئت کو

---

[۱] من بنی مسجدًا لم یزل ملکہ عنہ حتّٰی یفرزہ عن ملکہ بطریقہ ویأذن بالصلوٰۃ فیہ فاذا صلّٰی فیہ واحد زال ملکہ۔ (البحر الرائق ج ۵ ص۲۴۸ کتاب الوقف)

وایضاً قال ابن نجیمؒ: وحاصلہ ان شرط کونہ مسجدًا ان یکون سفلہ وعلوہ مسجدًا لینقطع حق العبد عنہ لقولہ تعالٰی وَاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰہِ۔ (البحر الرائق ج ۵ ص۲۵۱ کتاب الوقف)

وَمِثْلُہٗ فی الہدایۃ ج ۲ ص۶۲۴ کتاب الوقف)

[۲] وفی الہندیۃ: قال فی الجامع الفصولین لو شرط الواقف ان یکون المتولّی من اولادہ واولاد اولادہ ھل للقاضی ان یولی غیرہ بلا خیانۃ لو ولاہ ھل یکون متولیاً قال الشیخ الاسلام برھان الدین فی فوائدہ لا کذا فی النھر الفائق۔

(الفتاوی الہندیۃ ج ۲ ص۴۱۲ کتاب الوقف)

(وَمِثْلُہٗ فی خلاصۃ الفتاوی ج ۴ ص۱۴۱ کتاب الوقف)

ظاہر کرتی ہوں کیا ایسی تصاویر مسجد میں آویزاں کرنا جائز ہیں ؟

الجواب :۔ کعبۃ اللہ ایک قابلِ احترام جگہ ہے اور ایسے ہی غیر ذی روح ہونے کی بنیاد پر اس کی تصویر مسجد میں آویزاں کرنا جائز ہے، البتہ کعبۃ اللہ کی ایسی تصویر آویزاں کرنا جس میں لوگوں کو طواف کرتے ہوئے دکھایا گیا ہو اور جس میں اشخاص کی معرفت ہوتی ہو شرعاً ناجائز ہے، پھر جائز نہ ہونے کے علاوہ ایسی تصاویر کو مسجد میں آویزاں کرنا یہ زیادت علی الاثم ہے لہٰذا اس سے اجتناب کرنا ضروری ہے جیسا کہ مسجد میں تصویریں نکالنا مسجد کی عظمت کے منافی ہے۔

عن عائشۃؓ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال اشد الناس عذاباً یوم القیامۃ الذین یضاھئون بخلق اللہ۔ متفقٌ علیہ (مشکوٰۃ ج۲ ص۳۸۵ باب التصاویر)

عن عبد اللہ بن مسعود قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول اشد الناس عذاباً عند اللہ المصورون۔ متفقٌ علیہ۔ (مشکوٰۃ ج۲ ص۳۸۵ باب التصاویر) [۱]

مسجد پر قبضہ کی شرعی حیثیت

سوال :۔ دو قوموں کا ایک قطعۂ زمین پر جھگڑا تھا ایک قوم نے دوسری قوم کی املاک پر حملہ کر کے جبراً قبضہ کر لیا اور تمام مکینوں کو وہاں سے نکلنے پر مجبور کر دیا، ان املاک میں مکان اور زمین کے علاوہ مساجد بھی ہیں اور ان مساجد پر بھی غاصبانہ طریقہ سے قبضہ کر لیا گیا ہے۔ اندریں صورت ایسی مساجد میں نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ قریہ مذکورہ میں جو مساجد ہیں وہ غصب سے پہلے کی بنی ہوئی ہیں جو کسی کی ملک نہیں اور غاصبین بھی مسلمان ہیں جن کے نزدیک بھی مساجد کا احترام ملحوظ ہے، ایسی مساجد میں نماز پڑھنے میں کوئی کراہیت نہیں اور ان مساجد پر اس قبضہ کا کوئی اعتبار نہیں بلکہ کسی کو

---

[۱] عن عائشۃ تقول دخل علیّ رسول اللہ ﷺ ... یا عائشۃؓ اشد الناس عذاباً عند اللہ یوم القیٰمۃ الذین یضاھئون بخلق اللہ۔

عن عبد اللہ بن مسعودؓ یقول قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اشد الناس عذاباً یوم القیٰمۃ المصورون۔ (مسلم ج۲ ص۲۰۱ باب تحریم تصویر صورۃ الحیوان وتحریم الخ)

مسجد سے منع کرنا ظلمِ عظیم کے مترادف ہے۔

وفی الہندیۃ: قال ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ اذا غصب ارضاً فبنی فیہا مسجداً اوحماماً اوحانوتاً فلا بأس بالصلوٰۃ فی المسجد۔ (ج ۵ ص ۳۲۰ کتاب الکراہیۃ) [1]

مسجد کی تعمیر کے وقت قبر کے درمیان میں آنے کا حکم

سوال:۔ ہمارے محلے میں ایک مسجد ہے جو کہ نمازیوں کی کثرت کی وجہ سے تنگ ہوگئی ہے، اس کے قریب ہی ایک خالی پلاٹ واقع ہے جبکہ مسجد اور پلاٹ کے درمیان ایک پختہ قبر ہے، اگر اس پلاٹ کو مسجد میں شامل کر دیا جائے تو قبر مسجد کے دروازہ پر آتی ہے جس سے مسجد کی زینت خراب ہوتی ہے، اگر اس دروازہ کو بند کیا جائے تو دوسری طرف دروازہ نکالنے پر حُسن قائم نہیں رہتا، اندریں صورت قبر کے ساتھ کیا کیا جائے؟

الجواب:۔ جب مسجد کی وسعت ناگزیر ہو تو قبر کے درمیان میں آنے کی صورت میں اگر قبر اتنی پرانی کہ اس میں انسانی اعضاء بوسیدہ ہوگئے ہوں تو اس صورت میں اس قبر کو بالکل منہدم کرکے مسجد کے ساتھ اس جگہ کو ملانے میں کوئی حرج نہیں، اور اگر قبر جدید ہو تو پھر قبر کے اردگرد تعین کے لیے دیوار بنا کر دوسرے حصہ میں مسجد بنائی جائے تاہم اس بات کا خیال رہے کہ مسجد کی وضع ایسی ہو کہ قبر کی طرف کہیں توجہ نہ رہے تاکہ قبر پرستی کا شبہ نہ رہے، ایسی حالت پر زینت کا مسئلہ اثر انداز نہیں ہوتا۔

لما قال العلامۃ فخر الدین الزیلعیؒ: ولو بلی المیت وصار تراباً جاز دفن غیرہ وزراعتہ والبناء علیہ۔ (تبیین الحقائق ج ۱ ص ۲۴۶ باب الجنائز)

قال الطحطاویؒ: وفی القہستانی عن جنائز المضمرات لا تکرہ الصلوٰۃ الیٰ

---

[1] قال فی الینابیع اذا غصب ارضاً فبنیٰ ہا مسجداً او حماماً فلا بأس بدخول المسجد للصلوٰۃ۔ (الجوہرۃ النیرۃ ج ۲ ص ۲۵ کتاب الوقف)

قال قاضیخانؒ: عن ابی یوسفؒ ذکرہ الناطفی رحمہ اللہ تعالیٰ فی الواقعات اذا بنی فی ارض الغصب مسجداً او حماماً او حانوتاً لا بأس بالصلوٰۃ فی المسجد۔

(الفتاویٰ قاضی خان علیٰ ہامش الہندیۃ ج ۱ ص ۶۶ فصل فی المسجد)

جهۃ القبر الا اذا کان بین یدیہ بحیث لو صلی صلوٰۃ خاشعین دفع بصرہ علیہ۔
(طحطاوی حاشیہ مراقی الفلاح ص ۱۶۱ مکروہات الصلوٰۃ) [1]

مسجد کی دوکان پر مدرسہ تعمیر کرنا

سوال:۔ مسجد کے غسلخانوں اور دوکانوں پر دینی علوم کا مدرسہ تعمیر کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مسجد کے غسل خانے اور دوکانیں اگرچہ مسجد کے لیے وقف ہیں لیکن احکام کے اعتبار سے من کل الوجوہ ایک ہیں، لہٰذا جب مسجد کو دینی علوم کے لیے استعمال کرنا جائز ہے تو ان مقامات پر مدرسہ تعمیر کرنا بدرجہ اولیٰ جائز ہوگا۔

وفی الخلاصۃ: اما المعلم الذی یُعلّم الصبیان باجر اذا جلس فی المسجد یعلّم الصبیان لضرورۃ الحر وغیرہ لا یکرہ۔ (ج ۱ ص ۲۲۹ کتاب الصلوٰۃ) [2]

مسجد میں رقص وسرود

سوال:۔ مسجد میں رقص وسرود کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ رقص وسرود از روئے شرع ناجائز اور حرام ہے مساجد تو درکنار کسی بھی مقام پر اس کا اہتمام اور اس میں شرکت عذاب الٰہی کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔

وفی الھندیۃ: قال رحمہ اللہ تعالیٰ السماع والقول والرقص الذی یفعلہ المتصوفۃ فی زماننا حرام لا یجوز القصد الیہ والجلوس علیہ۔
(الفتاویٰ الھندیۃ ج ۵ ص ۳۵۲ کتاب الکراھیۃ۔ الباب السابع عشر فی الغناء واللھو) [3]

---

[1] لما فی الھندیۃ: ولو بلی المیت وصار تراباً جاز دفن غیرہ فی قبرہ وزرعہ والبناء علیہ۔
(الفتاویٰ الھندیۃ ج ۱ ص ۱۶۷ کتاب الجنائز الفصل السادس فی القبر والدفن)
وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج ۲ ص ۱۹۵ کتاب الجنائز۔

[2] قال ابن نجیمؒ: لان المسجد ما بُنی الا لھا من صلوٰۃ واعتکاف وذکر شرعی وتعلیم علم وتعلمہ وقراءۃ قرآن۔ (البحر الرائق ج ۲ ص ۳۴) وَمِثْلُہٗ فی الفتاویٰ الھندیۃ ج ۱ ص ۱۱۰ کتاب الصلوٰۃ۔

[3] قال المرغینانیؒ: ان الملاھی کلھا حرام حتیٰ التغنی بضرب القضیب وکذا قول ابی حنیفہ
(الھدایۃ ج ۳ ص ۴۵۳ کتاب الکراھیۃ فصل الاکل والشرب)
وَمِثْلُہٗ فی الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۶ ص ۳۹۵ کتاب الکراھیۃ، فصل فی البیع۔

عیدگاہ پر مسجد بنانا

سوال:۔ ایک شخص نے عیدگاہ کے لیے زمین وقف کی، اب وہاں لوگ عید کی نماز پڑھتے ہیں۔ کیا شرعاً اس عیدگاہ کے رقبہ پر مسجد تعمیر کی جا سکتی ہے؟

الجواب:۔ اگر کوئی قطعہ زمین صرف عید کی نماز کے لیے وقف کیا گیا ہو تو بغیر اذن واقف کے اس پر مسجد تعمیر کرنا جائز نہیں، کیونکہ شریعت میں واقف کی شرائط کو ملحوظ رکھا جاتا ہے جب تک شریعت کے موافق ہوں۔ جب واقف اجازت دے دے تو اس تعمیر میں کوئی حرج نہیں البتہ اگر یہ قطعہ زمین قانونی وقف ہو شرعی وقف نہ ہو تو اس کی خرید و فروخت بھی جائز ہے۔

قال ابن نجیم المصری رحؒ۔ شرط الواقف یجب اتباعه لقولهم شرط الواقف کنص الشارع ای فی وجوب العمل به وفی المفهوم والدلالة کما بیناه فی شرح الکنز الا فی مسائل۔ (الاشباه والنظائر ج ۲ ص ۲۲۸ کتاب الوقف)[۱]

مسجد میں سوال کرنے کا حکم

سوال:۔ عموماً سائلین مساجد میں عوام کی حاضری کو غنیمت سمجھ کر سوال کرتے ہیں، ان کا یہ اقدام کیسا ہے اور ایسے سائلین کے ساتھ مالی تعاون کرنے کا شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ مسجد میں سوال کرنا مکروہ تحریمی ہے اور ان کو دینے میں دو قول ہیں، بعض علماء تو مطلق کراہیت کے قائل ہیں، اور بعض علماء فرماتے ہیں کہ اگر نمازیوں کی رعائیت رکھ کر سائل سوال کر رہا ہے تو اس کو دینا جائز ہے ورنہ مکروہ ہے۔

قال ابن عابدینؒ تحت هذا القول (ویحرم فیه السوال ویکره الاعطاء مطلقاً وقیل ان تخطی) ای هو الذی اقتصر علیه الشارح فی الحظر حیث قال فرع یکره اعطاء سائل المسجد الا اذا لم یتخط رقاب الناس فی المختار لان علیاً تصدق بخاتمه فی الصلوٰة فمدحه الله تعالیٰ

---

[۱] قال ابن عابدینؒ فان شرائط الواقف معتبرة اذا لم تخالف الشرع وهو مالک فله ان یجعل ماله حیث شاء مالم یکن معصیة وله ان یخص صنفا من الفقراء ولو کان الوضع فی کلهم قربة۔ (رد المحتار ج ۴ ص ۳۴۳ کتاب الوقف مطلب شرائط الواقف معتبرة ۔۔۔ الخ)

بقوله وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رَاكِعُوْنَ ٥ (رد المحتار ج ۱ ص ۶۵۹ فی افضل المساجد) [۱]

مساجد میں نمازی کی توجہ متاثر کرنے والی زینت کا حکم

سوال:۔ مساجد میں بطورِ آرائش و زیبائش ایسا نقش ونگار کرنا، طغرے یا خطوط لکھنا جو نمازی کے لیے نماز میں باعثِ تشویش وخلل اندازی ہوں۔ کیا اس طرح مسجد کی زیبائش کرنا جائز ہے؟

الجواب:۔ مسجد ایک عبادت گاہ ہے اور اس کی تعمیر فقط عبادت اور یادِ الٰہی کے لیے ہوتی ہے، اور اگر اس میں ایسے نقوش جو آجکل کی مروجہ تعمیرات میں ہیں بنا دیئے جائیں تو اس سے مسجد کی تعمیر کا مقصد فوت ہو جاتا ہے بلکہ جدید عمارات کی طرح یہ بھی ایک سیر و تفریح کا مقام بن جائیں گی، پھر اس میں نماز پڑھنے والے کا دھیان مکمل طور پہ نماز میں بھی نہیں ہو گا۔

لہٰذا مسجد کی اتنی زینت کر لی جائے جس سے مسجد خوبصورت اور صاف ستھری نظر آئے البتہ ضرورت سے زیادہ اموال خرچ کر کے مسجد کو مزین کرنا مکروہ ہے۔

قال الحصکفی: (ولا بأس بنقشه خلا محرابه) فانه یکره لانه یلهی المصلّی ویکره التکلّف بدقائق النقوش ونحوها خصوصًا فی جدار القبلة۔

(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۱ ص ۶۵۸ احکام المساجد) [۲]

مسجد کے درخت اور پھلوں کا حکم

سوال:۔ ہماری مسجد کے صحن میں پھلدار درخت ہیں۔ کیا شرعًا ان پھلوں کو اپنے استعمال میں لانے کی اجازت ہے یا ان کی قیمت سے مسجد کے مصارف پورے کئے جائیں؟

الجواب:۔ مسجد میں پھلدار درخت اگر وقف برائے مسجد ہوں تو ان کا کھانا جائز نہیں،

---

[۱] اعطاء سوال المسجد انه اذا کانوا لا یتخطون رقاب الناس ولا یمرون بین یدی المصلّین یسألون مالا بد لهم منه ولا یلحون فی السّوال فلا بأس ولا بالمطانة۔ (فتاوٰی غیاثیة ص ۲۱)

[۲] وفی الهندیة: اما المتولی یفعل من مال الوقف ما یرجع الی أحکام البناء دون ما یرجع الی النقش حتی لو فعل یضمن کذا فی الهدایة۔

(الفتاوٰی الهندیة ج ۱ ص ۱۰۹ الفصل الثانی فیما یکره فی الصلٰوة وما لا یکره)

وَمِثْلُهٗ فی الهدایة ج ۱ ص ۱۴۴ باب ما یفسد الصلوٰة وما یکره فیها۔

البتہ اگر واقف نے ابتداءً اس کی شرط رکھی ہو تو پھر جائز ہے، بہتر یہ ہے کہ مسجد کے پھل فروخت کر کے اس کی قیمت مسجد کے مصارف میں خرچ کی جائے۔

قال ابن نجیمؒ: وفی الحاوی وما غرس فی المساجد من الاشجار المثمرۃ ان غرس للسبیل وھو الوقف علی العامۃ کان لکل من دخل المسجد من المسلمین ان یأکل منھا وان غرس للمسجد لا یجوز صرفھا الا الی مصالح المسجد الاھم فالاھم کسائر الوقوف۔ (البحر الرائق ج۵ ص۲۰۵ کتاب الوقف)[۱]

امام کا مسجد کو ذاتی اغراض کے لیے استعمال کرنا

سوال: مسجد کا صحن یا برآمدہ جس میں باقاعدہ نماز باجماعت پڑھائی جاتی ہو، کسی وقت حالات کی وجہ سے کوئی دوسرا شخص یا امام مسجد اپنے ذاتی استعمال میں لاسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: مسجد کے برآمدہ یا صحن کو جب باقاعدہ مسجد کا حصہ قرار دیا جاچکا ہو تو ایک دفعہ مسجد بن جانے کے بعد وہ قیامت تک مسجد ہی رہے گی، اس کو اب کسی دوسرے امور میں استعمال کرنا شرعاً جائز نہیں۔ تاہم اگر یہ برآمدہ کہیں مسجد کے لیے وقف ہو لیکن نماز اس میں نہیں پڑھی گئی ہو تو ایسی صورت میں مسجد پر وقف ہو کر واقف کی اجازت یا متولی کی صوابدید پر امام کا اپنی ذاتی اغراض کے لیے استعمال کرنا جائز ہے۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: ولو خرب ما حولہ واستغنی عنہ یبقی مسجداً عند الامام والثانی) ابداً الی قیام الساعۃ (وبہ یفتی)۔ قال ابن عابدینؒ: (تحت قولہ عند الامام والثانی) فلا یعود میراثاً ولا یجوز نقلہ ونقل مالہ الی مسجد آخر سواء کان یصلون فیہ اولا وھو الفتوی حاوی القدسی

---

[۱] قال العلامۃ طاھر بن احمد بن عبد الرشید البخاریؒ: وسئل ابوبکر عمن وقف شجرۃ اصلھا والشجرۃ فیما ینتفع باوراقھا وثمرھا۔ قال فالوقف جائز وینتفع بثمرھا ولا یقطع اصلھا الا ان یفسد اغصانھا فان لم ینتفع باوراقھا وثمرھا فانھا تقطع وتصرف ثمنھا علی سبیلہ فان نبت ثانیا والا غرس مکانھا۔ (خلاصۃ الفتاوی ج۴ ص۴۱۹ کتاب الوقف۔ نوع منہ)
ومثلہ فی الفتاوی الھندیۃ ج۲ ص۴۷۷ کتاب الوقف۔

واکثر المشائخ علیہ مجتبیٰ وھو الاوجہ فتح۔ (رد المحتار ج۴ ص۳۵۸ مطلب فیما لو خرب المسجد)[1]

مسجد بنانے کے ارادہ سے وہ جگہ شرعی مسجد نہیں بنتی

سوال:- اہل محلہ نے ایک جگہ کا تعین کرکے مسجد بنانے کا ارادہ کیا اور پتھر وغیرہ بھی جمع کرلیے، بعض وجوہات کی وجہ سے اس جگہ مسجد بنانا موزوں نہیں سمجھا گیا، اب ایک دوسری جگہ مسجد بنانے کا ارادہ کیا گیا ہے، کیا یہ تبادلہ جائز ہے یا اُسی جگہ پر جہاں پہلے ارادہ کیا گیا تھا مسجد کے لیے کام شروع کیا جائے؟

الجواب:- صرف ارادہ کرنے سے یہ جگہ شرعی مسجد کا حکم نہیں رکھتی بلکہ مسجد کیلئے باقاعدہ وقف کے علاوہ نماز پڑھنی بھی ضروری ہے لہٰذا وقف تام نہ ہونے کی وجہ سے اس کی جگہ دوسرے مقام پر مسجد بنانا جائز ہے اور اس جگہ کو اپنی ذاتی اغراض کیلئے استعمال کرنا جائز ہے۔

قال المرغینانیؒ: واذا بنی مسجداً لم یزل ملکه عنه حتی یفرزه عن ملکه بطریقه ویاذن للناس بالصلوٰة فیه فاذا صلی فیه واحد زال عند ابی حنیفةؒ عن ملکه وقال ابو یوسفؒ یزول ملکه بقوله جعلته مسجداً۔ (الهدایة ج۲ ص۶۲۴ کتاب الوقف فصل فی المسجد)[2]

مسجد کی ضرورت سے زائد اشیاء کی فروخت کا حکم

سوال:- ایک پرانی مسجد کا کچھ سامان مثلاً شہتیر وغیرہ زائد از ضرورت پڑا ہے، اگر اسے فروخت نہ کیا جائے تو اس کے ضائع ہونے کا خطرہ ہے۔ کیا مسجد کے زائد سامان کو فروخت کرنا جائز ہے جبکہ اس کے نفع کو مسجد پر ہی خرچ کیا جائے؟

---

[1] قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ: وفی الفتاوی اذا خربت القریة التی فیها المسجد وجعلت مزارع وخرب المسجد ولا یصلی فیه احد فلا بأس بان یاخذه صاحبه ویبیعه وهو قول محمد وعن ابی یوسفؒ لا یعود الی ملك البانی ولا الی ملك ورثته وهو مسجد ابداً۔ (خلاصة الفتاوی ج۴ ص۴۲۴ کتاب الوقف الفصل الرابع فی المسجد واوقافها الخ)

ومثله فی الهدایة ج۲ ص۶۲۵ کتاب الوقف فصل فی المسجد۔

[2] قال طاهر بن عبد الرشیدؒ: ولو جعل داره مسجداً یجوز بالاجماع ولا یجوز مشاعاً وانما یجوز اذا سلمه والتسلیم ان یصلی فیه بجماعة باذان واقامة باذنه عند ابی حنیفةؒ ومحمدؒ۔

(خلاصة الفتاوی ج۴ ص۴۰۸ کتاب الوقف الفصل الاول)

الجواب:۔ مسجد کے اموال کی دو صورتیں ہیں، پہلی صورت یہ ہے کہ کوئی منقول چیز ہو یعنی جو مسجد کی جزئیت میں داخل نہ ہو، مثلاً دری وغیرہ۔ اگر اس کی ضرورت نہ رہے اور مالک موجود ہو یا مالک کے فوت ہونے کی صورت میں اسکے ورثاء موجود ہوں تو مالک یا ورثاء کی اجازت سے اس کی فروخت جائز ہے۔ اور اگر ان میں کوئی نہ ہو تو پھر اہلِ محلہ کے اتفاق یا قاضی و حاکم کی اجازت سے فروخت جائز ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ یہ چیزیں باقاعدہ مسجد کا حصہ بن جائیں اور علیحدہ کرنے میں مسجد کا نقصان ہو لیکن کہیں تعمیر کی نیت سے یہ چیزیں الگ کی گئی ہوں تو پھر اہلِ محلہ کے اتفاق یا قاضی کی اجازت سے ان کی فروخت جائز ہے۔

وفی الهندیة: ذکر ابو اللیث فی نوازله حصیر المسجد اذا صار خلقاً واستغنی اهل المسجد عنه وقد طرحه انسان ان کان الطارح حیا فهو له وان کان میتاً ولم یدع له وارثاً ارجوان لا بأس بان یدفع اهل المسجد الی فقیر و ینتفعوا به فی شراء حصیر آخر للمسجد والمختار انه لا یجوز لهم ان یفعلوا ذلك بغیر امر القاضی کذا فی محیط السرخسیؒ۔ (الفتاوی الهندیة ج ۲ ص۴۵۸ کتاب الوقف) [1]

مسجد کے چندہ کو کسی شرط سے معلق کرنا

سوال:۔ کیا مسجد کے چندہ کو کسی شرط کے ساتھ مشروط کر کے دیا جا سکتا ہے؟ مثلاً بصورتِ نیلام ایک شخص کہتا ہے کہ اگر میری بولی پوری نکلی تو میں ۹۰۰ روپے مسجد میں بطور چندہ دوں گا۔ اب اس کی بولی پوری نکل آتی ہے اور یہ ۹۰۰ روپے چندہ مسجد کے لئے دے دیتا ہے تو دوسرا شخص

---

[1] قال ابن عابدینؒ: (حشیش المسجد) ای الحشیش الذی یفرش بدل الحصر کما یفعل فی بعض البلاد کبلاد الصعید کما اخبرنی به بعضهم قال الزیلعی وعلی هذا حصیر المسجد وحشیشه اذا استغنی عنهما یرجع الی مالکه عند محمدؒ وعند ابی یوسفؒ ینقل الی مسجد آخر ۔۔۔۔۔ وصرح فی الخانیة بان الفتوی علی قول محمدؒ قال فی البحر وبه علم ان الفتوی علی قول محمدؒ فی آلات المسجد۔

(رد المحتار ج ۴ ص۳۵۹ کتاب الوقف مطلب فیما لو خرب المسجد)

ومثله فی البحر الرائق ج ۵ ص۲۵۲ کتاب الوقف۔

اس کی بولی پر بولی بولتا ہے تو یہ شخص چندہ دینے سے انکاری ہے اور واپسی کا مطالبہ کرتا ہے، تو کیا یہ شخص چندہ کی واپسی کا حقدار ہے یا نہیں؟

الجواب:- مسجد کا چندہ ایک صدقہ ہے جس سے مقصود رضاء الٰہی کا حصول ہے، اگر اس کو کسی شرط کے ساتھ معلق کر دیا جائے تو شرط باطل ہو کر صدقہ جائز ہو جاتا ہے بعد ازاں اس میں رجوع کا حق حاصل نہیں، لہٰذا یہ شخص متولی کے قبضہ کرنے کے بعد رجوع نہیں کر سکتا۔

وفی الهندیة: وما لا یبطل بالشروط الفاسدة ستة وعشرون) القرض والهبة والصدقة (ج ۴ ص ۳۹۶ کتاب الهبة) الصدقة بمنزلة الهبة فی المشاع وحاجتها الی القبض الا انه لا رجوع فی الصدقة۔ (الفتاوی الهندیة ج ۴ ص ۴۰۶ الباب الثانی عشر فی الصدقة)[۱]

مسجد کے نیچے دوکانیں بنانا

سوال:- سکھوں کے دور میں بازار کے اندر ایک خالی مقام کو مسلمانوں نے مسجد کے لیے متعین کیا اور اس پر نمازیں پڑھنے لگے، جب اس اراضی کی فروخت شروع ہوئی تو سکھ اس کو خریدنا چاہتے تھے لیکن مسلمانوں نے اس پر ایک کمرہ تعمیر کر لیا اور بعد میں اس پر دوسری منزل بنا دی اور باقاعدہ اس میں پنجگانہ نمازیں شروع کیں یہاں تک کہ جمعہ وعیدین بھی اس میں پڑھنے لگے۔ اب اس مسجد کے فنڈ میں کثرت کی وجہ سے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مسجد کے نچلے حصے دوکانیں بنا دی جائیں اور اوپر والا حصہ مستقل طور پر مسجد ہی رہے گا، جبکہ متولی کہہ رہا ہے کہ جس وقت ہم مسجد کی دوسری منزل بنا رہے تھے تو ہمارا خیال تھا کہ اگر ہمارے پاس گنجائش ہوگی تو ہم نچلے حصہ میں دوکانیں بنائیں گے۔ اندریں صورت مسجد کے نیچے دوکانیں بنانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- مذکورہ بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ قبہ مسلمانوں نے مشترکہ طور پر مسجد کے لیے متعین کیا ہے اور حکومتِ وقت کی طرف سے اس پر مسلسل خاموشی اختیار کرنا دلالۃً مسجد کی اجازت ہے۔ لہٰذا جب مسجد ایک دفعہ مسجد بن جائے تو اب اسے تبدیل نہیں کیا جا سکتا، اسلئے

---

[۱] قال الحصکفیؒ: (و) حکمها انها (لا تبطل بالشروط الفاسدة) فهبة عبد علی ان یعتقه تصح و یبطل الشرط۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۵ ص ۶۸۸ کتاب الهبة)

(والصدقة کالهبة) بجامع التبرع وحینئذ (لا تصح غیر مقبوضة ولا فی مشاع یقسم ولا رجوع فیها)۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۵ ص ۷۰۹ کتاب الهبة)

مسجد کے نچلے حصہ میں دوکانیں بنانا اگرچہ مسجد کے مصالح میں سے ہیں جائز نہیں۔ البتہ اگر کوئی ابتداً سے ہی نیچے دوکانیں بنائے اور اوپر مسجد بنائے اور وہ دوکانیں مصالح مسجد کے لیے ہوں تو یہ جائز ہے۔

وفی الھندیہ: قیم المسجد لایجوز لہ ان یبنی حوانیت فی حد المسجد او فی فنائہ لان المسجد اذا جعل حانوتاً اومسکناً تسقط حرمتہ وھذا لایجوز والفناء تبع المسجد فیکون حکمہ حکم المسجد کذا فی محیط السرخسی۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۲ ص۴۶۲ کتاب الوقف، الفصل الثانی الوقف فی المسجد) [1]

منبر کو محراب کی دائیں جانب رکھنا

سوال:۔ زمانۂ قدیم سے منبر عموماً محراب کے دائیں جانب رکھا جاتا تھا، موجودہ دور میں بعض مقامات پر ایسا نہیں ہوتا۔ کیا محراب کی دائیں طرف منبر کا ہونا ضروری ہے یا محض عرف کا فیصلہ ہے؟

الجواب:۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک زمانہ میں منبر مصلّی کے دائیں طرف ہوا کرتا تھا، لہٰذا سنت یہ ہے کہ منبر محراب و مصلّی کے دائیں جانب رکھا جائے۔

کان سنۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن یمین المحراب اذا استقبلت القبلۃ۔ (بذل المجھود ج۲ ص۱۷۸ باب موضع المنبر) [2]

مسجد کی آمدنی سے تجارت کا حکم

سوال:۔ کیا مسجد کی آمدنی سے تجارت کرنا جائز ہے؟

الجواب:۔ مسجد کا متولی مسجد کی بہتری کے لیے اپنی صوابدید پر مسجد کے چندہ میں تصرفات کرسکتا ہے، اگر خرید و فروخت میں مسجد کا فائدہ ہو تو متولی کو یہ حق حاصل ہے تاہم

---

[1] قال ابن نجیمؒ: فی المجتبیٰ لایجوز لقیم المسجد ان یبنی حوانیت فی حد المسجد او فنائہ۔ (البحرالرائق ج۵ ص۲۴۹ کتاب الوقف)

[2] وقال النوویؒ: فی مناسکہ ما لفظہ وفی احیاء علوم الدین انہ ای المصلّی یجعل عود المنبر حذا منکبہ الایمن ویستقبل الساریۃ التی الی جانبہا الصندوق وتکون الدائرۃ التی فی قبلۃ المسجد بین عینیہ فذلک موقف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ (وفاء الوفاء ج۱ ص۳۷۲ محراب المسجد النبوی ومتی)

چندہ دہندگان سے اجازت مستحسن ہے۔

وفی الهندیة: القیم اذا اشتری من غلة المسجد حانوتًا اودارًا ان یستغل ویباع عند الحاجة جاز ان کان له ولایة الشراء واذا جاز له ان یبیعه کذا فی السراجیة۔ (الفتاوی الهندیة ج ۲ ص ۴۶۲ کتاب الوقف) [1]

مسجد کے درخت کی ملکیت کا حکم

سوال:۔ مسجد کے صحن میں امام صاحب نے پھلدار درخت لگایا ہے۔ اب جبکہ وہ درخت تناور ہو کر قیمتی درختوں میں اس کا شمار ہوا ہے تو امام موصوف اس درخت کی ملکیت کا دعویٰ کرتا ہے۔ از روئے شریعت اس درخت کا مالک امام موصوف ہے یا مسجد؟

الجواب:۔ کاشت کرتے وقت جب ذاتی اغراض کی نیت نہیں کی ہو جیسا کہ عام مسلمانوں سے یہی توقع کی جاتی ہے، تو مسجد کی ملکیت شمار ہوگی۔

وفی الهندیة: سئل نجم الدین عن رجل غرس تالة فی مسجد فکبرت بعد سنین فاراد متولی المسجد ان یصرف هذه الشجرة الی عمارة بئر فی هذه السکة والغارس یقول هی لی فانی ما وقفتها علی المسجد قال الظاهر ان الغارس جعلها للمسجد فلا یجوز صرفها الی البئر ولا یجوز للغارس صرفها الی حاجة نفسه کذا فی محیط۔ (الفتاوی الهندیة ج ۲ ص ۴۷۷ کتاب الوقف) [2]

مساجد میں تعویذ فروشی کا حکم

سوال:۔ بعض لوگ مساجد میں مستقل طور پر تعویذ فروخت کرتے ہیں جس کے لیے نامحرم عورتیں بھی مساجد

---

[1] قال ابن نجیمؒ: قیم یبیع فناء المسجد لیتجر فیه القوم اویضع فیه سررًا اجرها لیتجر فیها الناس فلا بأس اذا کان لصلاح المسجد ویعذر المستاجر ان شاء الله تعالیٰ اذا لم یکن ممر العامة۔ (البحر الرائق ج ۵ ص ۲۴۹ کتاب الوقف)

وَمِثْلُهٗ فی خلاصة الفتاوی ج ۴ ص ۴۲۳ کتاب الوقف الفصل الرابع فی المسجد۔

[2] قال ابن نجیمؒ: وفی المحیط رجل غرس فی المسجد یکون للمسجد لانه بمنزلة البناء بالمسجد۔ (البحر الرائق ج ۵ ص ۲۰۴ کتاب الوقف)

وَمِثْلُهٗ فی الخلاصة ج ۴ ص ۴۲۰ کتاب الوقف الفصل الثالث فی صحة الوقف۔

کا رُخ کرتی ہیں، عین ممکن ہے کہ ان میں بعض عورتیں ایسی بھی ہوں جو طبعی بیماریوں کی وجہ سے مساجد میں داخل ہونے کی اہل نہیں ہوں۔ تو کیا مساجد میں تعویذ فروشی کرنا جائز ہے اور ایسی حالت میں شرعاً عورتوں کے لیے مسجد میں داخل ہونے کی گنجائش ہے؟

الجواب:۔ مسجد میں عورتوں کا فی نفسہٖ داخل ہونا جائز ہے لیکن فسادِ ازمنہ کی وجہ سے انہیں مسجد میں نماز پڑھنے سے منع کیا گیا ہے تو تعویذ کے لیے کس طرح اجازت دی جا سکتی ہے، خاص کر جبکہ ان میں بہت سی عورتیں ناپاکی کی حالت میں ہوں اور ناپاکی کی حالت میں مسجد میں داخل ہونا جائز نہیں۔ تاہم اگر پاک ہوں تو حدود کی رعایت رکھ کر تعویذ لے سکتی ہیں، لیکن مسجد میں تعویذ فروشی کا دھندہ مطلق جائز نہیں۔

قال ابن عابدینؒ: (و) یمنع حل (دخول مسجد) ای ولو مسجد مدرسۃ او دار لا یمنع اهلهما الناس من الصلوٰۃ فیه۔ (ردّ المحتار ج ۱ ص ۲۹۱ باب الحیض)[1]

مسجد کے ساتھ متصلہ کمروں میں سونے کا حکم

سوال:۔ مساجد کے ساتھ متصل جو کمرے ہوتے ہیں ان میں سونے کا شرعاً کیا حکم ہے؟ اور کیا ان کمروں اور مسجد کا حکم ایک ہی ہے؟

الجواب:۔ مسجد کے ساتھ متصلہ کمرے اگر ابتداء ہی سے مسجد سے باہر بنائے گئے ہوں تو ان میں سونا بلا کراہیت جائز ہے، البتہ اگر شروع ہی سے یہ کمرے مسجد میں شامل تھے بعد میں انہیں مسجد سے نکال کر کسی عذر کی بناء پر کمرے بنائے گئے ہوں تو ان کا حکم اور مسجد کا حکم ایک ہے، ان میں بلا ضرورت سونا مکروہ ہے۔

وفی الهندیة ویکره النوم والاکل فیه لغیر المعتکف واذا اراد ان یفعل ذٰلک

---

[1] وفی الهندیة (ومنها) انه یحرم علیهما وعلی الجنب الدخول فی المسجد سواء کان للجلوس او للعبور هٰکذا فی منیة المصلّی (الفتاویٰ الهندیة ج ۱ ص ۳۸ الفصل الرابع فی احکام الحیض)

رجل یبیع التعویذ فی المسجد الجامع ویکتب فی التعویذ التوراة والانجیل والفرقان ویاخذ علیه المال ویقول ادفع الی الهدایة لا یحل له ذٰلک۔ (الفتاویٰ الهندیة ج ۵ ص ۳۲۱ کتاب الکراهیة۔ الباب الخامس فی آداب المسجد)

ومِثلُهٗ فی البحر الرائق ج ۱ ص ۳۸ باب الحیض۔

ينبغي ان ينوي الاعتكاف فيدخل فيه ويذكر الله تعالى بقدر ما نوى او يصلي ثم يفعل ما شاء كذا في السراجية ولا بأس للغريب ولصاحب الدار ان ينام في المسجد في الصحيح من المذهب والاحسن ان يتورع فلا ينام كذا في خزانة الفتاوى۔

(الفتاوى الهندية ج ۵ ص ۳۲۱ كتاب الكراهية) [1]

۱۲۰

قبلہ کی تحقیق

سوال:۔ ہمارے ہاں تقریباً ایک سو بیس سال سے آباد ایک پرانی مسجد ہے، اب بوسیدہ ہونے کی بناء پر اس کو شہید کر کے اس کی از سرِ نو تعمیر کرنے کے لیے جب نئی بنیادیں رکھنے کا وقت آیا تو مستری نے کہا کہ میں قطب ستارہ کا ماہر ہوں اور قطب ستارہ کی رُو سے اس مسجد کی سمتِ قبلہ صحیح نہیں۔ اب اگر اس کی بنیادوں میں تبدیلی کی جائے تو اس میں کئی مفاسد شرعیہ ہیں، مثلاً مسجد کے بعض حصے کا راستہ میں شامل ہو جانا وغیرہ جو کہ شرعاً جائز نہیں۔ کیا ایسی صورت میں اس مستری پر اعتماد کر کے اس کی بنیادوں میں برائے تعیینِ سمتِ قبلہ تبدیلی کی جا سکتی ہے یا قدیمی حالت میں بدستور برقرار رکھی جائے؟

الجواب:۔ اس مسئلہ پر تمام فقہاء کا اتفاق ہے کہ استقبالِ قبلہ فرض ہے البتہ اس کی تفصیل میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ علماءِ احناف نے عوام کی آسانی کے لیے یہ حکم فرمایا کہ نمازی کا بحالتِ نماز مواجہت ما بین المغربین اگر ہو تو استقبالِ قبلہ ہو جاتا ہے۔ یعنی موسم سرما میں مغرب کا آخر وقت اور موسم گرما میں مغرب کا آخر وقت کے درمیان میں جو فاصلہ ہو، اگرچہ عینِ قبلہ سے قدرے انحراف ہی کیوں نہ پایا جائے

البتہ مستری کا یہ کہنا کہ میں قطبی ستارہ کا ماہر ہوں، یہ اس کا دعویٰ ہے، اگر وہ اپنے اس دعویٰ میں سچا ہو اور اس میں اُس کی شہرت ہو تو اس پر اعتماد کر لیا جائے ورنہ نہیں، بہرحال تحقیق پھر بھی ضروری ہے۔

قال ابن عابدینؒ: وقال في شرح زاد الفقير وفي بعض الكتب المعتمدة في استقبال القبلة الى الجهة اقاويل كثيرة واقربها الى الصواب قولان الاول ان ينظر

---

[1] قال القاضي خانؒ: وقيل لا بأس للغريب ان ينام في المسجد۔
(فتاوى قاضي خان على هامش الفتاوى الهندية ج ۱ ص ۶۶)
ومثله في ردّ المحتار على الدر المختار ج ۱ ص ۶۶۱ مكروهات الصلوٰة مطلب احكام المسجد۔

فی مغرب الصیف فی اطول ایامه ومغرب الشتاء فی اقصر ایامه فلیدع الثلثین فی الجانب الایمن والثلث فی الایسر والقبلة عند ذلك ولو لم یفعل ھکذا وصلی فیما بین المغربین یجوز واذا دفع خارجا منہا لا یجوز بالاتفاق ۔
(ردالمحتار علی الدرالمختار ج ۱ ص۴۳۳ مبحث فی استقبال القبلة)

قال ابن عابدینؒ : (قوله کالقطب) ھو اقوی الادلة وھو نجم صغیر فی بنات الصغری بین الفرقدین والجدی اذا جعله الواقف خلف اذنه الیمنی کان کان مستقبلا القبلة ۔ (ردالمحتار ج ۱ ص۴۳۳ مبحث فی استقبال القبلة) [1]

مسجد کی چھت پر بیت الخلاء بنانا

سوال : مسجد کے اوپر راستہ کی طرف اگر بیت الخلاء بنا دیا جائے تو کیا شرع میں اس کی گنجائش ہے ؟

الجواب : مسجد کی حدود میں بیت الخلاء بنانا شرعاً جائز نہیں، اگرچہ مسجد کی چھت پر ہی کیوں نہ ہو اور اس کا راستہ علیحدہ ہو۔ البتہ مسجد کے نیچے ابتداء سے واقف کی نیت سے بیت الخلاء وغسلخانہ بنانا جائز ہے ۔

قال الحصکفیؒ (وکرہ تحریما) (الوطء فوقه والبول والتغوط) لانه مسجد الی عنان السماء ۔ (الدرالمختار علی صدر ردالمحتار ج ۱ ص۶۵۶ احکام المسجد) [2]

---

[1] قال ابو اللیثؒ : وقبلة اھل خراسان ما بین مغیب الصیف ومغیب الشتاء قال ابو منصور قبلة ما وراء النہر ھو ان یترك الثلثین من یمین المصلی والثلث من یسارہ من المغربین ۔ (فتاوی نوازل ص۳۷ فصل فی شروط الصلوٰة)

وفی الطحطاوی اصابه جهتها (ای القبلة) فالمغرب قبلة لاھل المشرق بالعکس (ص۱۱۵ باب شروط الصلوٰة)

اما فی البحار فدلیل القبلة النجوم وقد روی عن عمر رضی اللہ عنه انه قال تعلموا من النجوم ما تهتدوا به الی القبلة اھ۔ وذلك کالقطب ۔ (طحاوی ص۱۲۱)

[2] قال ابن نجیم (والوطء فوقه والبول والتخلی) ای کرہ الوطء فوق المسجد وکذا البول والتغوط لان سطح المسجد له حکم المسجد ۔

(البحر الرائق ۔ باب ما یفسد الصلوٰة وما یکرہ فیها)

ومِثلُهٗ فی الفتاوی الهندیة ج ۱ ص۱۰۹ فصل فی غلق باب المسجد)

مسجد کے نیچے آتش خانہ بنانا

سوال: مسجد کے تہہ خانہ میں سردی کے موسم میں بوقتِ ضرورت آگ جلانے کے لیے جگہ بنانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: نفسِ مساجد میں آگ لے جانا یا جلانا بذاتِ خود ممنوع نہیں' البتہ مجوسیوں کی طرح معبدگاہ بنانا جائز نہیں۔ اگر یہ آگ مسجد کے مصالح کے لیے جلائی جائے مثلاً پانی گرم کرنے یا مسجد کے گرم کرنے کے لیے، جیسا کہ بعض ممالک میں ایسا ہوتا ہے کہ مسجد کے تہہ خانہ میں آگ جلائی جاتی ہے جس سے موسمِ سرما میں مسجد گرم ہوجاتی ہے۔ تو یہ جائز ہے۔

قال ابن عابدین: (واذا جعل تحته سردابا لمصالحه) ای المسجد (جاز) کمسجد القدس اذا کان السرداب والعلو موقوفاً لمصالح المسجد فهو کسرداب بیت المقدس هذا هو ظاهر الروایة وهناک روایات ضعیفة مذکورة فی الهدایة۔
(رد المحتار ج ۴ ص۳۵۸ کتاب الوقف، مطلب فی احکام المساجد)[1]

مسجد کے متصل غسل خانہ بنانا

سوال: ایک شخص نے مسجد کی دیوار کے متصل غسلخانہ بنایا ہے اور غسل خانہ کی چاردیواری میں سے ایک دیوار مسجد کی ہے، کیا شرعاً ایسا کرنا جائز ہے؟

الجواب: غسل خانہ کو مسجد کے اندر بنانا جائز نہیں' البتہ واقف مصالح مسجد کی رعایت کرتے ہوئے مسجد کے نیچے غسل خانہ اور بیت الخلاء بنا دیا جائے تو جائز ہے۔ بہر حال اگر کسی نے مسجد کے ساتھ متصل اپنی زمین میں غسل خانہ بنایا ہے اور مسجد کی دیوار کو بطور پردہ استعمال کیا ہے تو یہ جائز ہے اِس میں کوئی قباحت نہیں لیکن خلافِ اولیٰ ہے، اس بات کی رعایت ضرور رکھی جائے گی کہ اس سے مسجد کو نقصان نہ پہنچے اور کل کہیں محض پردہ کے استفادہ سے اس دیوار کی ملکیت کا دعوٰی نہ کرے۔

قال ابن عابدینؒ: لوجعل الواقف تحته بیتاً للخلاء هل یجوز کما فی مسجد

---

[1] وفی الهندیة: ومن جعل مسجداً تحته سرداب او فوقه بیت وجعل باب المسجد الی الطریق وعزله فله ان یبیعه وان مات یورث عنه ولوکان السرداب لمصالح المسجد جاز کما فی مسجد بیت المقدس کذا فی الهدایة۔
(الفتاوٰی الهندیة ج۲ ص۴۵۵ کتاب الوقف) ــــ ومثلهٗ فی الهدایة ج۲ ص۶۴۴ کتاب الوقف۔

محلة الشحم فی دمشق، لم اکرہ صریحًا نعم سیأتی متنا فی کتاب الوقف انہ لوجعل تحتہ سردابًا لمصالحہ جاز تامل۔ (ردالمحتار علی الدرالمختار ج ا ص۶۵۶ مکروہات الصلوٰۃ۔ مطلب احکام المسجد) ۱ھ

مسجد کی آمدنی کے لیے بینک میں کھاتہ کھولنا

سوال:۔ کیا امام یا خزانچی مسجد کا فنڈ اپنے نام پر بینک میں جمع کرا سکتا ہے؟ اور کیا اس فنڈ کو اپنے ذاتی اغراض کے لیے استعمال کر سکتا ہے؟

الجواب:۔ مسجد کا فنڈ خرچ ہونے سے پہلے وقف عرفی ہوتا ہے شرعی نہیں ہوتا۔ امام کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ چندہ دہندگان کی اجازت کے بغیر مسجد کا فنڈ بینک میں داخل کرائے یا اپنے ذاتی مفاد کے لیے استعمال کرے، البتہ اگر چندہ دہندگان اجازت دے دیں تو امام اسے ذاتی اغراض کے لیے استعمال کر سکتا ہے۔ اور بینک میں جمع کرنا بغیر اضطراری حالت کے اچھا نہیں، اگرچہ بغیر سود کے ہی کیوں نہ ہو۔

وفی الھندیۃ: لو وقف دراھم اومکیلا او ثیابا لم یجز وقیل فی موضع تعارفوا ذٰلک یفتی بالجواز قیل کیف قال الدراھم تقرض للفقراء یزرعون ثم تؤخذ منھم والثیاب والاکسیۃ تعطی للفقراء لیلبسوھا عند حاجتھم ثم تؤخذ کذا فی الفتاوی العتابیۃ۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۲ ص۳۶۲ کتاب الوقف)

قال الحصکفیؒ: (حبس العین علیٰ) حکم (ملک الواقف والتصدق بالمنفعۃ) ولو فی الجملۃ والاصح انہ (عندہ) جائز غیر لازم کالعاریۃ وعندھما ھو حبسھا علیٰ حکم ملک اللہ تعالیٰ وصرف منفعتھا علیٰ من احب ۱۔ (الدرالمختار علیٰ صدر ردالمحتار ج۴ ص۴۳۷ کتاب الوقف) ۲ھ

---

۱ و فی الھندیۃ ومن جعل مسجدًا تحتہ سرداب او فوقہ بیت وجعل باب المسجد الی الطریق وعزلہ فلہ ان یبیعہ وان مات یورث عنہ ولو کان السرداب لمصالح المسجد جاز کما فی مسجد بیت المقدس کذا فی الھدایۃ۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۲ ص۴۵۵ کتاب الوقف)

ومثلہٗ فی الھدایۃ ج۲ ص۶۴۴ کتاب الوقف۔ فصل فی وقف المسجد۔

۲ قال المرغینانیؒ: قال ابوحنیفۃؒ لایزول ملک الواقف عن الوقف الا ان یحکم بہ الحاکم او یعلقہ بموتہ فیقول اذامت فقد وقفت داری علیٰ کذا۔ وقال ابویوسفؒ یزول ملکہ بمجرد القول۔ وقال محمد لایزول حتی یجعل للوقف متولیًا ویسلمہ الیہ۔ (الھدایۃ ج۲ ص۶۱۴ کتاب الوقف)

مسجد پر وقف شدہ مال کو واپس لینا

سوال:- ایک شخص نے مسجد کی تعمیر کے لیے ایک ہزار روپے چندہ دیا، اور اس میں سے بعض رقم مسجد کی تعمیر میں خرچ ہو گئی ہے، جبکہ اس شخص کا اب یہ مطالبہ ہے کہ میں نے جو رقم مسجد کی تعمیر کے لیے دی تھی وہ مجھے واپس کی جائے میں اس رقم کو دوسری مسجد کی تعمیر کے لیے دیتا ہوں، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ شخص اپنی تمام رقم دوسری مسجد کی تعمیر میں نہیں دے گا بلکہ نصف رقم اپنی ذات کے لیے استعمال کرے گا۔ کیا اس شخص کو وقف کی رقم واپس لینا شرعاً جائز ہے؟

الجواب:- مساجد یا دینی مدارس میں جو چندہ دیا جاتا ہے وہ صدقہ ہوتا ہے اور صدقہ جب متصدق کے ملک میں داخل ہو جائے تو پھر اس میں رجوع کرنا درست نہیں۔

چونکہ فقہاء کی عبارات کی روشنی میں مسجد کے لیے تملیک درست ہے، تملیک کے بعد چندہ معطی کی ملک سے خارج متصور ہوتا ہے، لہٰذا دینی مدارس یا مساجد میں چندہ دینے کے بعد معطی کو حق رجوع حاصل نہیں۔

لما قال فی الهندیة۔ رجل اعطی درهمًا فی عمارة المسجد او نفقة المسجد او مصالح المسجد صحّ لانّه وان کان لایمکن تصحیحه وقفًا یمکن تصحیحه تملیکًا للمسجد فاثبات الملك للمسجد علی هٰذا الوجه صحیح قیّم بالقبض...... کما لو قال وقفتُ هٰذه المائة للمسجد یصح بطریق التملیك اذا سلمه للقیّم ۔(الفتاوی الهندیة ج۲ ص۴۶۰ کتاب الوقف، الفصل الثانی فی الوقف علی المسجد وتصرف القیم ---الخ)

وایضًا قال العلامة برهان الدین المرغینانیؒ: الصدقة کالهبة لاتصح الّا بالقبض ولارجوع فی الصدقة لان المقصود وهو الثواب وقد حصل۔

(الهدایة ج۳ ص۲۹۳ کتاب الهبة، فصل فی الصدقة)[1]

---

[1] لما قال الشیخ ظفر احمد العثمانیؒ: التملیك للمسجد صحیح قلت فی الحدیث دلیل لما قال علماؤنا من ان التملیك للمسجد صحیح فی الهندیة.... الخ (اعلاء السنن ج۱۳ ص۱۹۸ باب الوقف علی المصالح المسجد وحکم مایهدی الیه من الاموال۔)

لما قال العلامة ابوبکر بن علی الحدادالیمنی: الصدقة کالهبة لاتصح الّا بالقبض لانها تبرع کالهبة.....ولاتصح الرجوع فی الصدقة بعد القبض لانه قد کمل فیها الثواب من الله تعالٰی۔ (الجوهرة النیرة ج۲ ص۱۹ کتاب الهبة)

مسجد میں گندہ پانی داخل کرنا

سوال:۔ مسجد میں گندہ پانی داخل کرنا اور اسی طرح مسجد کی چار دیواری کا انتظام نہ کرنا از روئے شریعت جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مسجد کی چار دیواری تو مسجد کے فنڈ اور رقم سے بنائی جاتی ہے اور اگر مسجد کا فنڈ اتنا نہ ہو کہ اس سے مسجد کی چار دیواری تعمیر کی جا سکے اور اہلِ محلہ بھی باوجود قدرت رکھنے کے اس کا انتظام نہیں کرتے جس سے مسجد کی املاک کے تلف یا ضائع ہونے کا خطرہ ہو تو عند اللہ اہلِ محلہ گنہگار ہوں گے۔ البتہ مسجد میں گندہ پانی داخل کرنا یا اس میں گندے پانی کی نالی گذارنا عند الشرع جائز نہیں، کیونکہ مساجد کو پاک اور صاف ستھرا رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ قَوْلُهُ تَعَالٰی: طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْعَاكِفِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ۔ (سورۃ البقرۃ) [1]

مسجد کے ساتھ متصلہ زمین کو جبراً مسجد کے لیے لینا

سوال:۔ ہمارے علاقہ میں مسجد کے ساتھ متصل ایک قطعہ زمین ہے جو کہ حکومت کی ملکیت ہے اور جو مسجد کے تنگ ہونے کی وجہ سے مسجد کو درکار ہے جبکہ حکومت یہ زمین مسجد کو دینے سے انکاری ہے۔ کیا مسجد کی ضرورت کے پیشِ نظر جبراً یہ زمین مسجد میں شامل کی جا سکتی ہے؟

الجواب:۔ مسجد کے ساتھ متصلہ زمین کی دو صورتیں ہیں۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ یہ متصلہ زمین عام راستہ ہے یا مکان اور دوکان ہے، اگر راستہ ہو تو لوگوں کی مصلحت کو دیکھ کر اس کو مسجد میں شامل کر دیا جائے۔ البتہ اگر اس کو مسجد میں شامل کرنے سے لوگوں کو تکلیف ہو تو پھر ایسا کرنا جائز نہیں، اور مکان و دوکان کو مسجد میں شامل کرنے کے لیے قاضی کی طرف رجوع کیا جائے گا۔

وفی الهندية: قوم بنوا مسجدا واحتاجوا الی مکان یتسع المسجد واخذوا من الطریق وادخلوه فی المسجد ان کان یضر باصحاب الطریق لایجوز و ان کان

---

[1] قال ابن عابدین: (قوله وادخال نجاسة فیه) عبارة الاشباه وادخال نجاسة فیه یخاف منها التلویث اھ۔ ومفاده الجواز لو جافة لکن فی الفتاویٰ الهندية لا یدخل المسجد من علی بدنه نجاسة۔ (رد المحتار علی الدر المختار ج۱ ص۶۵۶، مطلب فی احکام المسجد)۔ ومثله فی قاضیخان علی هامش الهندية ج۱ ص۶۴ فصل فی المسجد۔

لا یضرّ بهم رجوعٌ ان لا یکون به بأس کذا فی المضمرات۔۔۔ ایضاًفیه: ارض وقف علیٰ مسجد والارض بجنب ذٰلك المسجد وارادوا ان یزیدوا فی المسجد شیئاً من الارض جاز لکن یرفعون الی القاضی لیاذن لهم ومستغل الوقف کالدار والحانوت علی هٰذا کذا فی الخلاصة۔ (الفتاوی الهندیة ج ۲ ص۴۵۶ کتاب الوقف)

تاہم اگر مسجد کے ساتھ متصلہ زمین ہو اور حکومت دینے سے انکار کرتی ہو تو مسجد کی ضروریات کو مدنظر رکھ کر جبراً قیمتاً حاصل کی جاسکتی ہے۔

ولوضاق المسجد علی الناس وبجنبه ارض لرجل توخذ ارضه بالقیمة کرها کذا فی فتاوی قاضی خان۔ (الفتاوی الهندیة ج ۲ ص۴۵۶ کتاب الوقف)[1]

کس برش کا استعمال مسجد میں جائز ہے؟

سوال:۔ آجکل جو صفائی کے برش رائج ہیں اُن میں اکثر خنزیر کے بال استعمال کیے جاتے ہیں، اور یہ برش کئی لوگ اپنے گھروں میں استعمال کرتے ہیں، اور بعض مساجد میں بھی دیکھا گیا ہے کہ صفائی کے لیے یہ برش استعمال کیے جاتے ہیں۔ کیا ایسے برش کا مسجد میں استعمال شرعاً جائز ہے؟

الجواب:۔ مساجد اللہ تعالیٰ کے گھر ہیں ان کو نجاست سے پاک رکھنا بہت ضروری ہے، چونکہ خنزیر کا ہر ہر جزء نجس العین ہے اس لیے اس سے کسی صورت میں بھی انتفاع جائز نہیں، لہٰذا ایسے برش جو نجاست سے مخلوط ہوں مساجد ان سے پاک رکھی جائیں۔ لیکن بلاتحقیق کسی چیز کے بارے میں نجس کا حکم صادر کرنا دانشمندی کا تقاضا نہیں۔

قَوْلُهٗ تَعَالٰی: طَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّائِفِيْنَ وَالْعَاكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ۔ (سورۃ البقرۃ)

قال العلامة فخر الدین: ولا یبزق فی المسجد لافوق البواری ولا تحت الحصیر لانا امرنا بتعظیم المسجد وصونه عن النجاسة فیاخذ النخامة

---

[1] قال الحصکفیؒ: (توخذ ارض) ودار وحانوت (بجنب مسجد ضاق علی الناس بالقیمة کرها)۔ (الدرالمختار علی صدر رد المحتار ج ۴ ص۳۷۹ کتاب الوقف)

ومثلهٗ فی البحرالرائق ج ۵ ص۲۵۶ کتاب الوقف۔

بشوبه ولا یلقیها فی المسجد۔ (فتاوی قاضیخان علی هامش الهندیة ج ۱ ص ۶۴ فصل فی المسجد)[1]

عوام کی ضرورت کے لیے مسجد کو مسمار کرنا

سوال:۔ ہمارے علاقہ میں عرصہ قدیم سے ایک مسجد آباد ہے جس میں گردونواح کے لوگ نماز پڑھتے ہیں، جبکہ یہ مسجد سڑک اور دوکانوں کے قریب واقع ہے۔ بعض دوکانداروں نے حکومت کو یہ درخواست دی ہے کہ اس مسجد کو مسمار کیا جائے کیونکہ اس مسجد کی وجہ سے ہمارے کاروبار میں فرق آتا ہے، کیونکہ یہ مسجد ہماری دوکانوں کے سامنے واقع ہے جس سے ہماری دوکانیں مخفی ہو جاتی ہیں۔ اندریں صورت کسی مسجد کو مسمار کرنا بوقت ضرورت جائز ہے؟

الجواب:۔ امت مسلمہ کا اس پر اجماع ہے کہ کسی مقام یا جگہ میں جب ایک دفعہ مسجد بن جائے تو قیامت تک یہ مسجد ہی رہے گی، اس کو مسمار کرنا یا کسی اور کام میں لانا شرعاً جائز نہیں، جن لوگوں نے اس کو مسمار کرانے کی درخواست دی ہے انہیں توبہ کرنی چاہیئے کسی مسلمان یا مومن سے ایسی درخواست کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

قال الحصکفیؒ: ولو خرب ماحوله واستغنی عنه یبقی مسجداً عند الامام (والثانی) ابداً الی قیام الساعة (وبه یفتی) حاوی القدسی۔

قال ابن عابدینؒ: (عند الامام والثانی) فلا یعود میراثاً ولا یجوز نقله ونقل ماله الی مسجد اٰخر سواء کان یصلون فیه اولا وهو الفتوی حاوی القدسی واکثر المشائخ علیه مجتبی وهو الاوجه۔ (رد المحتار ج ۴ ص ۳۵۸ باب الوقف، مطلب فیما لو خرب المسجد)[2]

---

[1] قال ابن عابدینؒ (قوله وادخال نجاسة فیه) عبارة الاشباه وادخال نجاسة فیه یخاف منها التلویث اھ۔ ومفادہ الجواز لو جافة لکن فی الفتاوی الهندیة لا یدخل المسجد من علی بدنه نجاسة۔
(رد المحتار علی الدر المختار ج ۱ ص ۶۵۶ مطلب احکام المسجد)
ومثله فی الفتاوی الهندیة ج ۱ ص ۱۱۰ فصل غلق المسجد۔

[2] قال طاهر بن عبد الرشیدؒ: اذا خرب المسجد وفی الفتاوی اذا خربت القریة التی فیها المسجد وجعلت مزارع وخرب المسجد ولا یصلی فیه احد فلا بأس بان یاخذه صاحبه ویبیعه وهو قول محمدؒ وعن ابی یوسفؒ لا یعود الی ملک البانی ولا الی ملک ورثته وهو مسجد ابداً۔ (خلاصة الفتاوی ج ۴ ص ۴۲۴ کتاب الوقف، الفصل الرابع فی المسجد)

مسجد کے لیے زمین دینے کا وعدہ کرنا

سوال: اگر ایک شخص کسی جذباتی فیصلہ کے تحت مسجد کے لیے زمین دینے کا وعدہ کرے لیکن بعدازاں اس وعدہ پر پابندی نہیں کرتا ہو۔ کیا اس پر زمین دینا ضروری ہے؟

الجواب: مسجد کے لیے زمین دینے کے وعدہ سے وقف تام نہیں ہوتا بلکہ وقف کے لیے یہ شرط ہے کہ پہلے زمین کو اپنی ملک سے خارج کر کے باقاعدہ عوام کو اس میں نماز پڑھنے کی اجازت دے، لہٰذا صرف وعدہ کی صورت میں وقف تام نہیں ہوا، تاہم وعدہ کی خلاف ورزی گناہ ہے۔

وفی الھندیۃ: من بنی المسجدا لم یزل ملکہ عنہ حتی یفرزہ عن ملکہ بطریقہ ویأذن بالصلوٰۃ فیہ اما الافراز فلانہ لایخلص اللہ تعالیٰ الا بہ کذا فی الھدایۃ۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۲ ص۴۵۴ کتاب الوقف)[۱]

مسجد میں چارپائی بچھا کر سونا

سوال: کیا مسجد میں سونا جائز ہے؟ جبکہ بعض لوگ مسجد میں چارپائی بچھا کر سوتے ہیں، ان کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے؟

الجواب: مسجد میں سونا بغیر شرعی عُذر کے مکروہ ہے، البتہ عذر شرعی ہو مثلاً معتکف ہو یا مسافر وغیرہ، تو اس کو مسجد میں سونا جائز ہے۔ اور جس طرح مسجد میں بغیر چارپائی کے سونا جائز ہے اسی طرح چارپائی بچھا کر بھی سونا جائز ہے۔

وفی الھندیۃ: ویکرہ النوم والاکل فیہ لغیر المعتکف واذا اراد ان یفعل ذٰلک ینبغی ان ینوی الاعتکاف فیدخل فیہ ویذکر اللہ تعالیٰ بقدر ما نوی اویصلی ثم یفعل ما شاء کذا فی السراجیۃ ولا بأس للغریب ولصاحب الدار ان ینام فی المسجد

---

[۱] قال برھان الدین المرغینانیؒ: واذا بُنِیَ مسجدًا لم یزل ملکہ عنہ حتی یفرزہ عن مِلکہ بطریقہ ویأذن للناس بالصلوٰۃ فیہ فاذا صلی فیہ واحد زال عند ابی حنیفہ (رحمہ اللہ) عن مِلکہ اما الافراز فلانہ لایخلص اللہ تعالیٰ الا بہ۔ (الھدایۃ ج۲ ص۶۲۴ کتاب الوقف، فصل فی المسجد)

وَمِثْلُہٗ فی کنز الدقائق علی ھامش البحر الرائق ج۵ ص۲۴۸ کتاب الوقف۔

فی الصحیح من المذھب والاحسن ان یتورع فلا ینام کذا فی خزانۃ الفتاوی۔
(الفتاوی الھندیۃ ج۵ ص۳۲۱ کتاب الکراھیۃ) [۱]

البتہ اگر کوئی غیر معذور آدمی بھی اعتکاف کی نیت سے مسجد میں سو جائے تو جائز ہے۔

مسجد کے لیے وقف شدہ زمین اور عرفی سیری کی شرعی حیثیت

سوال:۔ بعض مساجد کے ساتھ موقوفہ جائداد ہوتی ہے جس سے امام اور خطیب استفادہ کرتے رہتے ہیں، لیکن یہ زمین مستقل طور پر مسجد کے لیے وقف ہوتی ہے، ائمہ محض منصب امامت وخطابت کی وجہ سے اس سے استفادہ کے حقدار ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ بعض دوسری ایسی جائداد بھی ہوتی ہے جو کسی امام کو شخصی طور پر دی جاتی ہے تاہم اس میں امام کے موجودہ منصب امامت کا دخل بھی ضرور ہوتا ہے جو اس کے لیے ترجیح کا کام دیتا ہے۔

ان دونوں صورتوں میں کیا یہ جائدادیں امام قانونی طور پر اپنے نام کرا سکتا ہے؟ اور امام کی وفات کے بعد اگر اس کی اولاد امامت پر مامور نہ ہو پھر بھی اس کی حقدار ہو سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جہاں تک اول الذکر قسم کا تعلق ہے تو چونکہ یہ مسجد کے لیے موقوفہ جائداد ہے اس کا کسی شخص کی ذات سے کوئی تعلق نہیں، اس میں ارث جاری نہیں ہو سکتا، جو بھی منصب امامت پر فائز ہو وہ اس سے استفادہ کا حقدار ہوگا، اور جب اس ذمہ داری سے علیحدہ ہو جائے تو یہ شخص اس جائداد سے استفادہ کا حقدار نہیں رہتا، اس کی خرید وفروخت یا تقسیم کرنے کا اختیار اس کو حاصل نہیں۔

قال المرغینانیؒ: ومن اتخذ ارضہ مسجدًا لم یکن لہ ان یرجع فیہ ولا یبیعہ ولا یورث عنہ لانہ یحرز عن حق العباد وصار خالصًا للہ تعالیٰ وھذا لان الاشیاء کلھا للہ تعالیٰ۔ (الھدایۃ ج۲ ص۶۲۵ باب الوقف)

وفی الھندیۃ: واما حکمہ فعندھما زوال العین عن ملکہ الی اللہ تعالیٰ وعند

---

[۱] عن ابن عمرؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان اذا اعتکف طرح لہ فراشہ او یوضع لہ سریرًا وراء اسطوانۃ التوبۃ۔ (ابن ماجۃ ص۱۲۷ باب فی المعتکف یلزم مکانا من المسجد)
ومثلہٗ فی رد المحتار علی الدر المختار ج۱ ص۶۶۱ مکروھات الصلوٰۃ۔ مطلب احکام المسجد۔

ابی حنیفۃؒ حکمہ صیرورۃ العین محبوسۃ علیٰ ملکہ بحیث لاتقبل النقل۔۔۔۔۔۔ فانہ یصح حتیٰ لایملک بیعہ ولایورث عنہ لکن ینظران خرج من الثلث یجوز۔

(الھندیۃ ج ۲ ص ۳۵۲ کتاب الوقف) لـه

البتہ مؤخرالذکر جائداد کے بارے میں تذکرہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ موہوب لہ کی ملکیت ہے کیونکہ یہ اس کو ذاتی طور پر دی جاتی ہے، اس میں مسجد پر وقف کرنے کا کوئی اثر نہیں پایا جاتا اور محض امام وخطیب کے منصب کی تعظیم کی وجہ سے کوئی چیز دینے سے مسجد پر وقف نہیں سمجھا جاتا، لہٰذا اس صورت میں امام مسجد کو جملہ مالکانہ تصرفات کا حق حاصل ہے، جینِ حیات میں اس کی خرید وفروخت جائز ہے اور اس منصب سے معزول ہونے کے بعد بھی یہ جائداد اس کی رہے گی اور مرنے کے بعد اس کے ورثاء میں شرعی قاعدہ کے مطابق تقسیم ہوگی۔

غیر مسلم کے اموال کو جبراً مسجد پر خرچ کرنا

سوال:۔ ایک جگہ پر کسی مسجد کی تعمیر کیلئے روپوں اور مال کی ضرورت تھی، بعض لوگوں نے غیر مسلموں سے جبراً مال اور روپے وصول کرکے مسجد کی تعمیر میں خرچ کیے۔ کیا غیر مسلم کا مال جبراً وصول کرکے مسجد کی تعمیر میں استعمال کیا جاسکتا ہے؟

الجواب:۔ دارالاسلام میں غیر مسلموں کی کئی اقسام ہیں۔ ایک غیر مسلم وہ ہے جو مستامن یا ذمی ہے، معاملات کے احکام میں مسلمان و ذمی ومستامن آپس میں برابر ہیں، ان کے اموال کو جبراً وصول کرکے مسجد میں خرچ کرنا شرعاً جائز نہیں، کیونکہ یہ احکام کے لحاظ سے مسلمانوں مثل ہیں۔

البتہ جو حربی ہوں اور دارالاسلام میں بغیر امان کے داخل ہوئے ہوں اُن کا مال مالِ فئے

لـه قال ابن نجیمؒ: (قولہ ولایملک الوقف) باجماع الفقہاء کما نقلہ فی فتح القدیر ولقولہ علیہ السلام لعمر رضی اللہ عنہ تصدق باصلھا لاتباع ولاتورث ولانہ باللزوم خرج عن ملک الواقف وبلا ملک لایتمکن من البیع۔

(البحرالرائق ج ۵ ص ۲۰۵ کتاب الوقف)

قال المرغینانیؒ: واذا صح الوقف لم یجز بیعہ ولا تملیکہ الا ان یکون مشاعاً عند ابی یوسفؒ فیطلب الشریک القسمۃ فیصح مقاسمۃ۔ (الھدایۃ ج ۲ ص ۶۲۰ کتاب الوقف)

اور غنیمت ہے، ان کا مال مسجد کیلئے جبراً وصول کیا جا سکتا ہے۔

قال العلامة الحصکفیؒ: لا یمکن حربی مستامن فینا سنة وقیل له ان قمت سنة وضعنا علیك الجزیة فان مکث سنة فهو ذمی ولا جزیة علیه فی حول المکث الا ان یشترط اخذها منه فیه ویجری القصاص بینه وبین المسلم ویضمن المسلم قیمة خمره وخنزیره اذا اتلفه وتجب الدیة علیه اذا قتله خطاء ویجب کف الاذی عنه۔

قال ابن عابدینؒ: (قوله لا یمکن حربی مستامن) قید بالمستامن لانه لو دخل دارنا بلا امان کان وما معه فیئاً ولو قال دخلت بامان الا ان یثبت۔

(ردالمحتار ج ۴ ص۱۶۸ فصل فی استیمان الکافر۔ کتاب الجهاد)

تاہم حرام مال کو مسجد پر خرچ کرنا جائز نہیں۔

قال ابن عابدینؒ: تحت هذا القول (قوله ولو بماله الحلال) قال تاج الشریعة اما لو انفق فی ذلك مالاً خبیثاً ولا سببه الخبیث والطیب فیکره لان الله تعالیٰ لا یقبل الا الطیب فیکره تلویث بیته بما لا یقبله۔ (ردالمحتار علی الدر المختار جلد۱ ص۴۵۸ باب الامامة۔ مطلب کلمة لا بأس دلیل علی انه المستحب) [۱]

اور حرام مال سے بنائی ہوئی مساجد شرعی مساجد کے حکم میں سے نہیں ہیں، لہٰذا ایسی مساجد میں نماز پڑھنے سے اجتناب کیا جائے البتہ پڑھی گئی نمازوں کا اعادہ واجب نہیں۔

بوقتِ ضرورت وقف کا تبادلہ جائز ہے

سوال: مسجد کی کچھ دوکانیں ایسی جگہ واقع ہیں جو مسجد سے دور ہیں۔ کیا مسجد کے قرب و جوار میں واقع بعض دوکانوں سے ان کا تبادلہ جائز ہے؟ جبکہ قریب کی دوکانوں میں یہ احتمال بھی ہے کہ کبھی مسجد کی توسیع میں کام آسکیں گی؟

الجواب: مسجد کے لیے ایسے فائدہ کی توقع میں وقف کا استبدال اور مبادلہ جائز ہے

---

[۱] عن ابی هریرة قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم من تصدق بعدل تمرة من کسب طیب ولا یقبل الله الا الطیب فان الله یتقبلها بیمینه ثم یربیها لصاحبها کما یربی احدکم فلوه حتی تکون مثل الجبل۔ متفق علیه۔ (مشکوٰة ج۱ ص۱۶۷ باب فضل الصدقة)

ومثله فی البخاری ج۱ ص۱۸۹ کتاب الزکوٰة۔

لہٰذا ان دوکانوں کے تبادلہ میں کوئی حرج نہیں ۔

وفی الهندیة: مبادلة دار الوقف بدار اخری انما تجوز اذا کانت فی محلة واحدة تکون المحلة المملوکة خیراً من محلة الموقوفة وعلی عکسه لا یجوز ۔

(الفتاوی الهندیة ج ۲ ص ۴۰۲ کتاب الوقف ۔ الباب الرابع فیما یتعلق بالشرط فی الوقف) [1]

جدید قبرستان میں مسجد بنانا

سوال:۔ ایک قبرستان جس میں اب بھی مُردے دفنائے جاتے ہوں، کیا کسی محلہ میں مسجد کی ضرورت پڑنے پر قبرستان کو ہموار کر کے اس پر مسجد تعمیر کرنا جائز ہے؟

الجواب:۔ جس قبرستان میں مُردے فی الحال دفنائے جاتے ہوں اس کو مسجد کیلئے استعمال کرنا جائز نہیں، تاہم جو قبرستان پرانا ہو چکا ہو اور اس میں مُردوں کی لاشیں گل سڑ کر ان کے نشانات ختم ہو چکے ہوں تو اس کو ہموار کر کے اس پر مسجد بنانا جائز ہے، البتہ مملوکہ ہونے کی صورت میں مالک سے اجازت لینا ضروری ہے ۔

قال ابن عابدینؒ ۔ وقال الزیلعی ولو بلی المیّت وصار تراباً جاز دفن غیرہ فی قبرہ وزرعه والبناء علیه ۔ (رد المحتار ج ۲ ص ۲۳۳ مطلب فی دفن المیت، کتاب الجنائز) [2]

مندر سے مسجد بنانا

سوال:۔ تقسیم ہند کے وقت جو ہندو اور سکھ پاکستان سے چلے گئے تھے، اُن کے مندروں اور گوردواروں کو مسلمان مساجد میں تبدیل کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اگر کر سکتے ہیں تو کیا ان میں تغیر ضروری ہے؟

الجواب:۔ ہندوؤں اور سکھوں کے معابد (مندر اور گوردوارے) مساجد میں تبدیل کرنا

---

[1] قال ابن نجیمؒ ۔ وفی القنیة مبادلة دار الوقف بدار اخری انما یجوز اذا کانتا فی محلة واحدة او تکون المحلة المملوکة خیراً من المحلة الموقوفة وعلی عکسه لا یجوز ۔ (البحر الرائق ج ۵ ص ۲۲۳ کتاب الوقف)

وَمِثْلُہٗ فی رد المحتار علی الدر المختار ج ۴ ص ۳۸۶ کتاب الوقف، مطلب فی شرط الاستبدال ۔

[2] وفی الهندیة: ولو بلی المیت وصار تراباً جاز دفن غیرہ فی قبرہ وزرعه والبناء علیه ۔ (فتاوی هندیة ج ۱ ص ۱۶۷ ۔ الفصل السادس فی القبر والدفن والنقل من مکان الی آخر ۔

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج ۲ ص ۱۹۵ کتاب الجنائز ۔

شرعاً جائز ہیں بشرطیکہ ان کی عبادت کے نشانات مٹا دیئے جائیں اور اس میں تغیر کر دیا جائے، مثلاً ان کو قبلہ رو کرنا، اس میں محراب بنانا یا ان کو مستقل طور سے گرا کر از سر نو ان پر مسجد بنانا۔

عن طلق بن علی قال خرجنا وفداً الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فبایعناہ وصلینا معہ واخبرناہ ان بارضنا بیعۃً لنا فاستوھبناہ من فضل طھورہ فدعا بماءٍ فتوضاء وتمضمض ثم صبّہ لنا فی اداوۃ وامرنا فقال اخرجوا فاذا اتیتم ارضکم فاکسروا بیعتکم وانضحوا مکانہا بھذا الماء واتخذوھا مسجداً قلنا ان البلد بعید والحر شدید والماء ینشف فقال مُدّوہ من الماء فانہ لا یزیدہ الا طیباً۔ رواہ النسائی۔ (مشکوٰۃ جلد ۱ ص ۶۹ باب المساجد)

و فی حاشیتہ فاکسروا الخ غیروا محرابہا وحولوہ الی الکعبۃ وقیل حربوہ۔[۱]

مسجد میں آنے سے منع کرنا

سوال: بعض لوگوں نے مسجد کیلئے چندہ جمع کر کے مسجد تعمیر کرنے کا ارادہ کیا ہے، لیکن ایک شخص اس تعمیر سے روک رہا ہے اور غیر مہذب الفاظ کا استعمال کر رہا ہے، ایسے ہی ایک اور شخص مسجد کے راستہ کو بند کر رہا ہے جس سے مسجد ویران ہو رہی ہے اور اس سے مسجد میں آنے جانے والے نمازیوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ ایسے شخص کے بارے میں شریعتِ مطہرہ کا کیا حکم ہے؟

الجواب: مسجد کی تعمیر سے منع کرنا اور ایسے ہی مسجد کا راستہ بند کرنا از روئے شرع جائز نہیں، یہ ایک فاسقانہ کام ہے اور یہ شخص قابلِ تعزیر ہے۔ البتہ اگر یہ راستہ مسجد کا نہ ہو بلکہ اس کی اپنی ملکیت ہو تو پھر اس میں کوئی حرج نہیں ہے، اور اس کا استعمال مالک کی اجازت پر

---

[۱] عن ابیہ طلق بن علی قال خرجنا وفداً الی النبی ﷺ فبایعناہ وصلینا معہ واخبرناہ ان بارضنا بیعۃً لنا فاستوھبناہ من فضل طھورہ فدعا بماءٍ فتوضأ وتمضمض ثم صبّہ فی اداوۃ وامرنا فقال اخرجوا فاذا اتیتم ارضکم فاکسروا بیعتکم وانضحوا مکانہا بھذا الماء واتخذوھا مسجداً قلنا ان البلد بعیدٌ والحر شدیدٌ والماء ینشف فقال مُدّوہ من الماء فانہ لا یزیدہ الا طیباً فخرجنا حتی قدمنا بلدنا فکسرنا بیعتنا ثم نضحنا مکانہا فاتخذناھا مسجداً فنادینا فیہ بالاذان۔۔۔۔۔ الخ
(سنن النسائی ج ۱ ص ۱۱۳ باب اتخاذ البیع مساجد)

پر موقوف ہے ۔

قال اللہ تبارک وتعالیٰ :۔ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسَاجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِىْ خَرَابِهَا ۔ (الآیۃ)

قال اللہ تعالیٰ : اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (الآیۃ)

(مشکوٰۃ ج ۱ ص۶۹ باب المساجد ، الفصل الثانی)

مسجد کی اشیاء کو عاریۃً استعمال کرنا

سوال :۔ مسجد کی اشیاء کو عاریۃً کوئی شخص اپنے استعمال میں لاسکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ مسجد کی اشیاء وقف علی المسجد ہیں ان کو اپنی ذاتی اغراض کے لیے استعمال کرنا شرعاً جائز نہیں، البتہ اگر واقف اس کی نیت کرے تو گنجائش ہے۔

قال الحصکفیؒ : فاذا تم ولزم الوقف ولا یملک ولا یعار ولا یرھن۔

قال ابن عابدینؒ : ولا یعار ولا یرھن لاقتضائهما الملک ۔

(ردّ المحتار علی الدر المختار ج ۴ ص۳۵۱ کتاب الوقف ، مطلب فی شرط واقف الکتب الخ)[له]

مسجد کی زمین کا تبادلہ

سوال :۔ ہمارے والد صاحب نے ایک قطعۂ اراضی مسجد کے لیے وقف کیا تھا اور باقاعدہ اس کی حد بندی کی گئی تھی اور اس میں شکرانے کے نفل بھی پڑھے گئے تھے ، اب ہمارے والد صاحب فوت ہو چکے ہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ اس زمین کے بدلے دوسری زمین مسجد کے لیے متعین کر دیں اور اس قطعۂ اراضی کو اپنے مصرف میں استعمال کریں۔ کیا شرعاً ایسا کرنا جائز ہے ؟

الجواب :۔ جب کوئی شخص اپنی زندگی میں اپنی مملوکہ زمین وقف کر کے اپنے سے جدا کر دے تو اب اس زمین کے ساتھ اس کا مالکانہ تعلق ختم ہو گیا، یہی وجہ ہے کہ واقف کے

[له] قال فی الهندیة : ولا یحمل القیم سراج المسجد الی بیته ویحمل من بیته الی المسجد ولا بأس ان یترک سراج المسجد الی ثلث اللیل ولا یترک اکثر من ذلک الا اذا شرط الواقف ذلک او کان ذلک معتاداً ذلک الموضع ۔

(الفتاوی الهندیة ج ۲ ص۴۱۱ ، هل فی کره غلق باب المسجد)

ومثله فی خلاصة الفتاوی ج ۴ ص۴۲۳ کتاب الوقف ، للفصل الرابع فی المسجد۔

مرنے کے بعد اس موقوفہ زمین میں ورثاء کا حق وراثت ثابت نہیں اور اس کی بیع بھی جائز نہیں، جہاں تک استبدال کا تعلق ہے تو اس کی بھی چند صورتیں ہیں ۔

(۱) واقف اپنے لیے یا کسی وارث کے لیے استبدال کی شرط رکھے ۔

(۲) اور اگر شرط نہ رکھی ہو لیکن اس جگہ سے انتفاع کلیۃً ختم ہو چکا ہو تو اس صورت میں باذن القاضی یا حاکم کے استبدال اصح قول کے مطابق درست ہے ۔

چونکہ صورتِ مسئولہ میں دونوں وجود مفقود ہیں اس لیے مذکورہ زمین مسجد کی رہے گی اس کو دوسری کسی زمین میں تبدیل کرنا جائز نہیں ۔

لما قال العلامۃ ابن الھمامؒ : وقوله ولو شرط ان یستبدل بها ارضا اخریٰ تکون وقفاً مکانهٗ فهو جائز عند ابی یوسفؒ وهلال والخصاف وهو استحسان وکذا لو قال علی ان ابیعها واشتری بثمنها اخری مکانا ولکن لیس للقیم الاستبدال الا ان ینص له بذلك ..... ولو قید شرط الاستبدال للقیم بحیاة الواقف لیس له ان یستبدل بعد موته - وفی فتاوی قاضیخان قول هلال وابی یوسفؒ هو الصحیح ..... وکذا ارض الوقف اذا قل نزلها بحیث لا تحتمل الزراعة ولا تفضل غلتها عن مونتها ویکون صلاح الارض فی الاستبدال بارض اخری وفی نحو هٰذا عن الانصاری صحة الشرط لکن لا یبیعها الا باذن الحاکم وینبغی للحاکم اذا رفع الیه ولا منفعة فی الوقف ان یأذن فی بیعها اذا رأٰه انظر لاهل الوقف -

(فتح القدیر ج ۵ ص ۴۳۹ کتاب الوقف) [۱]

---

[۱] لما قال العلامۃ ابن عابدینؒ : اعلم ان الاستبدال علی ثلاثة - وجوهٍ الاول [۱]: ان یشرطه الواقف لنفسه او لغیره او لنفسه وغیره فالاستبدال فیه جائز علی الصحیح وقیل اتفاقاً والثانی [۲]: ان لا یشرطه سواء شرط عدمه او سکت لکن صار بحیث لا ینتفع به بالکلیة بان لا یحصل منه شئ اصلاً او لا یفی بمؤنة فهو ایضاً جائز علی الاصح اذا کان باذن القاضی ورأیه المصلحة فیه - والثالث [۳]: ان لا یشرطه ایضاً ولکن فیه نفع فی الجملة وبدله خیر منه ریعا ونفعا وهٰذا لا یجوز استبداله علی الاصح المختار -

(رد المحتار ج ۴ ص ۳۸۴ کتاب الوقف - مطلب فی استبدال الوقف وشروطه)

وَمِثْلُهٗ فی امداد المفتین الشهیر بفتاوی دار العلوم دیوبند ج ۲ ص ۷۶۹ -

مساجد میں سکول کھولنا

سوال:۔ آجکل حکومت کی طرف سے مسجد مکتب سکول کے نام سے مساجد میں پرائمری سکول کھولے جارہے ہیں، اساتذۂ کرام مساجد میں کرسیاں لگا کر عام پرائمری سکولوں کی طرح بے اعتدالیاں کرتے ہیں۔ کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے؟ جبکہ اس سے مسجد کا تقدس بھی پامال ہوتا ہے اور مسجد کی حالت ایک عام حجرہ اور بیٹھک جیسی ہو جاتی ہے؟

الجواب:۔ مذکورہ حالات کی روشنی میں عموماً یہ دیکھا گیا ہے کہ اس سے مسجد کا تقدس اور عظمت باقی نہیں رہتا جس سے اس خدشے کو مزید تقویت ملتی ہے کہ یہ کہیں خیر خواہی کے لبادہ میں شعائر اللہ کی توہین کا منظم پروگرام تو نہیں؟ اس لیے تعلیم کا یہ سلسلہ کسی دوسری جگہ پر جاری رکھنا چاہئیے، مساجد کو نماز، ذکر اللہ اور قرآن وحدیث کی تعلیم تک محدود رکھیں۔

لما قال الشیخ احمد الحمویؒ: فی شرح الجامع الصغیر للتمرتاشی ولا یجوز تعلیم الصبیان القرآن فی المسجد للمروی جنبوا صبیانکم المساجد انتھٰی۔ وھو صریح فی عدم الجواز سواء کان بأجرۃ ام لا۔ (الاشباہ والنظائر ج ۴ ص۵۶ القول فی احکام المسجد)[1]

مسجد کی تعمیر میں قادیانیوں کی شرکت

سوال:۔ کسی مسجد کی تعمیر کے لیے ایک قادیانی نے دو ہزار اینٹیں دیں، کیا از روئے شریعت یہ اینٹیں مسجد میں استعمال کی جا سکتی ہیں؟

الجواب:۔ قادیانی اگرچہ اپنے آپ کو مسلمان اور اہلِ قبلہ کہتے ہیں، لیکن عقیدۂ ختم نبوت کے انکار اور دیگر بہت سی ضروریاتِ دین میں تاویل کرنے کی وجہ سے مرتد کے زُمرہ میں داخل ہیں، اس صورت میں ان کا ہبہ موقوف رہے گا اور اگر یہ اسلام قبول کرلیں تو وہ ہبہ نافذ ہوگا، اور اگر اپنے ارتداد پر بدستور قائم رہیں تو بوجہ مرتد ہونے کے ان کا ہبہ باطل ہے۔

---

[1] قال ابن عابدینؒ: لما اخرجہ المنذری: مرفوعاً جنبوا مساجدکم صبیانکم ومجانینکم وبیعکم وشراءکم ورفع اصواتکم الی اخرہ۔
(ردّ المحتار ج ۱ ص۶۵۶ احکام المسجد)
ومثلہ فی الھندیۃ ج ۵ ص۳۲۱ کتاب الکراھیۃ۔ الباب الخامس فی آداب المسجد۔

قال ابن نجیمؒ : توقف مبایعته وعتقه وهبته فان امن نفذ و ان هلك بطل ۔ (البحر الرائق ج ۵ ص۱۳۳ باب المرتد) [1]

قادیانیوں کے اموال قبول کرنے سے ایک دوسرا نقصان یہ بھی ہے کہ ان کے کفر کے بارے میں پوری اُمتِ مسلمہ کا جو عقیدہ ہے وہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا، اس لیے ان کا ہدیہ کسی صورت میں قبول نہ کیا جائے۔

مسجد کے لیے موقوفہ زمین کی فروخت

سوال:۔ کیا مسجد کی منتظمہ کمیٹی کو یہ حق حاصل ہے کہ مسجد کے لیے موقوفہ زمین کو فروخت کر دے یا اجارہ پر دے یا اُسے کسی اور مصرف کے لیے استعمال میں لائے؟

الجواب:۔ مسجد کے لیے موقوفہ زمین کو فروخت کرنا شرعاً جائز نہیں، البتہ زمین کے تبادلہ کا جواز کتبِ فقہ سے ثابت ہے، یہ تبادلہ بھی اُس صورت میں جائز ہے کہ جس میں مسجد کا فائدہ ہو، اسی طرح مسجد کے نفع کی خاطر اس کو اجارہ پر دینا بھی جائز ہے۔

وفی الهندیة: مبادلة دار الوقف بدار اخری انما تجوز اذا کانتا فی محلة واحدة تکون المحلة المملوکة خیراً من محلة الموقوفة وعلی عکسه لا یجوز۔ (الفتاوی الهندیة ج ۲ ص۴۰۱ کتاب الوقف، الباب الرابع فیما یتعلق بالشرط فی الوقف) [2]

---

[1] قال الحصکفیؒ: یتوقف منه عند الامام وینفذ عندهما کل ما کان مبادلة مال بمال اوعقد تبرع (کالمبایعة) والصرف والسلم والعتق والتدبیر والکتابة والهبة۔
(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۳ ص۲۵۰ باب المرتد، قریب من مطلب المعصیة تبقی بعد الردة)
وَمِثْلُهٗ فی الجوهرة النیرة ج ۲ ص۳۷۹ کتاب السیر۔

[2] قال ابن عابدین: قال وفی القنیة مبادلة دار الوقف بدار اخری انما یجوز اذا کانتا فی محلة واحدة او محلة الاخری خیراً وبالعکس لا یجوز وان کانت المملوکة اکثر مساحة وقیمة أجرة لاحتمال خرابها فی ادون المحلتین لدنائتها وقلة الرغبة فیها۔ (رد المحتار علی الدر المختار ج ۴ ص۳۸۶ کتاب الوقف مطلب فی شروط الاستبدال)
وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج ۵ ص۲۲۳ کتاب الوقف۔

جس مسجد کی زمین کا باقاعدہ وقف نہ ہو تو وہ شرعی مسجد نہیں

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ انگلینڈ میں مکانات کی دو قسمیں ہیں، ایک فری ہولڈ اور دوسرا لیس فری ہولڈ۔ قسم اول میں زمین اور عمارت مالک مکان کی ملکیت ہوتی ہے، اور قسم ثانی میں صرف مکان پر مالک کی ملکیت کا حق ہوتا ہے جبکہ زمین اجارہ کی ہوتی ہے، لیکن یہ فرق بھی صرف امتیازی ہوتا ہے۔ دونوں قسموں کی صورت میں حکومت کو مکمل اختیار حاصل ہے، کیونکہ ان دونوں قسموں کے لیے حکومت کی طرف سے ایک میعاد مقرر ہوتی ہے۔ اگر مقررہ مدت سے قبل حکومت کو اس زمین کی ضرورت پڑ جائے تو حکومت اس مقررہ مدت کو منسوخ کر کے اس زمین کو اپنے مصرف میں لا سکتی ہے، اس میں کسی شخص کو بھی حکومت کے فیصلے کو چیلنج کرنے کا حق حاصل نہیں ہوتا۔

آیا ایسی زمین جس پر مالک کو مکمل اختیار حاصل نہیں اگر اس پر مسجد تعمیر کر لی جائے اور باقاعدہ اس میں اذان اور جماعت بھی ہوتی ہو، لیکن جب اس زمین کو جس پر مسجد واقع ہے ضرورت پڑنے کی وجہ سے حکومت اسے اپنے مصرف میں لانے کا ارادہ کرے اور اس کے مالک کو اپنی جانب سے اس عمارت کا عوض دے دے، تو کیا ایسی زمین پر مسجد تعمیر کرنا مسجد شرعی کے حکم میں ہوگی؟ اور آیا اس کی خرید و فروخت اور اس میں تغیر و تبدل جائز ہے؟ اور اس شہید کر کے کسی اور مصرف میں خرچ کرنا کیسا ہے؟

الجواب: اہل علم کی تحقیق کے مطابق مسجد شرعی کے لیے زمین اور مکان دونوں کا وقف مؤبد ہونا شرط ہے، جبکہ یہ شرط یہاں متحقق نہیں۔ اور اہل علم کے نزدیک مسجد کے معاملہ میں اگر کوئی ایسی شرط لگا دی جائے جس سے وقف مؤبد میں فرق آ رہا ہو تو وہ شرط باطل ہے اور وقف مطلق اور مؤبد ہوگی۔

قال ابن عابدینؒ: تحت هذا القول (قوله ولا ذکر معه اشتراط بیعه الخ) فی الخصاف لو قال علی ان لی اخراجها من الوقف الی غیره او علی ان اهبها واتصدق بثمنها او علی ان اهبها لمن شئت او علی ان ارهنها متی بدا لی واخرجها عن الوقف بطل الوقف ثم ذکر ان هذا فی غیر المسجد اما المسجد لو اشترط ابطاله او بیعه صح وبطل المشروط۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۳ ص ۳۴۲ کتاب الوقف قبل مطلب فی وقف المرتد والکافر)

جس ملک میں خود مالک کو کسی زمین یا مکان پر ملکِ مؤبد حاصل نہیں اور اُس کو اس زمین میں تصرف من کل الوجوہ حاصل نہیں تو وہ کس طرح وقف مؤبد کر سکتا ہے اور کس طرح اس مسجد کو مسجدِ شرعی کا حکم دیا جا سکتا ہے؟ اس لیے یہ شرعی مسجد نہیں ہوگی۔

قال ابن عابدینؒ : افاد ان الواقف لابد ان یکون مالکه وقت الوقف ملکاً باتا ولو بسبب فاسدٍ وان لا یکون محجوراً عن التصرف حتی لو وقف المغصوب لم یصح وان ملکه بعد بشراءٍ او صلح ولو اجاز المالك وقف فضولی جاز۔
(رد المحتار علی الدر المختار ج ۴ ص ۳۴۰ کتاب الوقف، مطلب قد یثبت الوقف بالضرورۃ) [۱]

مسجد کسی کی ملکیت نہیں ہوتی

سوال:۔ ایک شخص نے کسی محلہ میں مسجد بنوائی اور لوگوں کو اس میں نماز پڑھنے کی عام اجازت دیدی، کچھ مدت کے بعد اُس نے یہ دعویٰ کیا کہ یہ مسجد میری ملکیت ہے لہٰذا اس میں تمام تصرف میرا ہی چلے گا۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا مسجد کسی شخص کی ملکیت میں آسکتی ہے یا نہیں؟ اگرچہ اس نے خود ہی یہ مسجد تعمیر کرائی ہو؟

الجواب:۔ جب مسجد ایک دفعہ مسجد بن جائے اور اس میں لوگوں کو نماز کے لیے باقاعدہ اذنِ عام ہو تو پھر یہ کسی کی ملکیت نہیں رہتی، البتہ بانی کو تولیت کا حق حاصل ہے۔

قال الحصکفیؒ : اراد اهل المحلة نقض المسجد و بنائه احکم من الاول ان البانی من اهل المحلة لهم ذلك الا لا۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۴، ص ۳۵۷، کتاب الوقف، احکام المساجد) [۲]

---

[۱] قال ابن نجیمؒ : من شرائط الملك وقت الوقف حتی لو غصب ارضاً فوقفها ثم اشتراها من مالكها ودفع الثمن الیه اوصالح علی مال دفعه الیه لا تکون وقفا۔ (البحر الرائق ج ۵ ص ۱۸۸ کتاب الوقف)
وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج ۲ ص ۳۵۳ کتاب الوقف۔

[۲] قال طاهر بن عبد الرشیدؒ : رجل بنی مسجدا فی سکة فنازعه بعض اهل السکة فی عمارته او نصب المؤذن والامام فالمختار ان البانی اولیٰ و فی العمارۃ اولیٰ باتفاق۔
(خلاصة الفتاوی ج ۴ ص ۴۲۱ الفصل الرابع فی المسجد و اوقافه الخ)
وَمِثْلُهٗ فی الاشباہ والنظائر ج ۲ ص ۲۳۲ کتاب الوقف۔

مسجد کے فنڈ سے معاوضہ دینا

سوال:- ہمارے محلہ میں مسجد کے محراب کے ساتھ کچھ دوکانیں تھیں، جب مسجد کو شہید کر کے از سرِ نو تعمیر کرنے کا ارادہ کیا گیا تو یہ دوکانیں بھی منہدم ہوگئیں، حکومت نے دوکانداروں کی درخواست پر اس کے متبادل جگہ ان کو دے دی، اب اُن کا مطالبہ یہ ہے کہ جتنے دن ہمارے کاروبار میں فرق آیا ہے اس کا معاوضہ دیا جائے، ہر دوکاندار تقریباً پانچ ہزار روپے کا طالب ہے اس طرح کل رقم تقریباً بیس ہزار روپے بنتی ہے، جبکہ مسجد کے پاس فنڈ بھی کافی مقدار میں موجود ہے۔ کیا دوکانداروں کے مطالبہ پر اُن کو یہ معاوضہ مسجد کے فنڈ سے دینا جائز ہے؟

الجواب:- صورتِ مذکورہ میں دوکانداروں کا یہ مطالبہ کہ تعمیرِ مسجد کی وجہ سے جتنے دن ہمارا کاروبار متاثر ہوا ہے اس کا معاوضہ ہمیں دیا جائے، غیر شرعی ہے۔ کیونکہ مالک مکان پر کاروبار کے متاثر ہونے کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی تاہم ان ایام کا کرایہ دوکانداروں سے وصول نہیں کیا جا سکتا اِس لیے ایسا غیر شرعی خرچہ مسجد کے فنڈ سے ادا نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم اگر شر و فساد کا خطرہ ہو تو دفع شر کیلئے کچھ رقم دینا مرخص ہے لیکن دوکانداروں کے لیے اس کی وصولی ناجائز اور حرام ہے۔

قال ابن عابدینؒ: الثالث اخذ المال یسوی امرہ عند السلطان دفعاً للضرر اوجلبًا للنفع وھو حرام علی الاخذ۔ (ردالمحتار علی الدر المختار ج۴ ص۳۰۳، کتاب ادب القاضی، مطلب فی الکلام علی الرشوۃ والھدیۃ) [۱]

مسجد کی خرید و فروخت کا عدمِ جواز

سوال:- قیامِ پاکستان کے وقت جب ہندو اور سکھ پاکستان سے کوچ کر کے ہندوستان چلے گئے تو اپنے بہت سے مکانات، زمینیں اور جائداد چھوڑ گئے، مہاجرین کی ایک جماعت نے ایک جگہ کا انتخاب کر کے باقاعدہ ڈپٹی کمشنر سے اجازت لیکر اور نقشہ منظور کرا کر مسجد تعمیر کی بعد ازاں جب حکومت متروکہ زمین کی قیمت وصول کرنے لگی تو حکومت نے اس جگہ کی قیمت وصول

---

[۱] قال ابن نجیمؒ: ومنھا اذا دفع الرشوۃ یسوّی امرہ عند السلطان حل لہ الدفع ولا یحل للاخذ ان یأخُذَ۔ (البحر الرائق ج۶ ص۲۶۲ کتاب ادب القاضی)
وَمِثْلُہٗ فی فتح القدیر علی الھدایۃ ج۶ ص۳۵۹ کتاب ادب القاضی۔

کرنے سے پہلے ہی مسجد اپنی تحویل میں لے لی اور تقریباً اٹھارہ سال تک اپنی تحویل میں رکھا اور مسجد کے لیے موقوفہ دوکانوں کی آمدنی بھی حکومت وصول کرتی رہی، اب جبکہ حکومت نے اس سے اپنا قبضہ اٹھا لیا ہے تو حکومت اس مسجد کی جگہ کی قیمت کا مطالبہ کرتی ہے، حالانکہ ہم نے یہ مسجد حکومت کی اجازت سے ہی بنائی تھی۔ اندریں صورت کیا اب مسجد کی قیمت ادا کرنا ضروری ہے؟ اور کیا یہ مسجد شرعی مسجد کے حکم میں ہے یا نہیں؟

الجواب: مستفتی کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مسجد حکومت کی اجازت سے تعمیر کی گئی۔ لہٰذا اگر کسی سرکاری جگہ پر قیمت کی ادائیگی کے بغیر حکومت کی اجازت سے مسجد تعمیر کی جائے تو اس سے وہ جگہ مسجدِ شرعی بن جاتی ہے، کیونکہ مساجد کا اہتمام کرنا اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے۔

قال ابن عابدینؒ: فانہ یجب ان یتخذ الامام للمسلمین مسجداً من بیت المال او من مالھم ان لم یکن لھم بیت المال۔ (رد المحتار علی الدر المختار ج ۴ ص ۳۳۹، کتاب الوقف، مطلب لو وقف علی الاغنیاء وحدھم لم یجز)

اور حکومت کا نقشہ کی منظوری دینا باقاعدہ اجازت کے مترادف ہے، اب باقاعدہ مسجد بن جانے کے بعد اس کی خرید و فروخت جائز نہیں۔

قال المرغینانیؒ: ومن اتخذ ارضہ مسجداً لم یکن لہٗ ان یرجع فیہ ولا یبیعہ ولا یورث عنہ لانہ یحرز عن حق العباد وصار خالصاً للہ تعالیٰ وھذا لان الاشیاء کلھا للہ تعالیٰ۔ (الھدایۃ ج ۲ ص ۶۴۴ باب الوقف۔ فصل فی وقف المسجد) [۱]

---

[۱] وفی الھندیۃ: اما حکمہ عندھما زوال العین عن ملکہ الی اللہ تعالیٰ وعند ابی حنیفۃؒ حکمہ صیرورۃ العین محبوسۃ عن ملکہ بحیث لا تقبل النقل عن ملک الی ملک والتصدق بالغلۃ المعدومۃ متیٰ صح الوقف بان قال جعلت ارضی ھذہ صدقۃ موقوفۃ مؤبدۃ او اوصیت بھا بعد موتی فانہ یصح حتیٰ لا یملک بیعہ ولا یورث عنہ لکن ینظر ان خرج من الثلث یجوز۔
(الفتاوی الھندیۃ ج ۲ ص ۳۵۲ کتاب الوقف)
ومثلہٗ فی البحر الرائق ج ۵ ص ۱۹۱ کتاب الوقف۔

عیدگاہ میں کھیل کود اور اسے راستہ بنانے کا حکم

سوال:- ہمارے گاؤں میں ایک مسئلہ بڑی شدت اختیار کر گیا ہے وہ یہ کہ گاؤں کی وقف عیدگاہ ہے، محلے کے بچے جوتوں سمیت اس میں کھیلتے رہتے ہیں اس عیدگاہ کے دو دروازے ہیں، ایک دروازہ گاؤں کی طرف اور دوسرا سڑک کی طرف کھلتا ہے گاؤں کی طرف کھلنے والے دروازے کو لوگ عیدگاہ سے گذرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں جس میں بعض اوقات حیض اور نفاس والی خواتین بھی گذرتی ہیں۔ اب ایک صاحب نے عیدگاہ کی حرمت برقرار رکھنے کے لیے اس کے ایک دروازے کو بند کر دیا ہے مگر گاؤں کے لوگ خصوصاً عیدگاہ کے قرب وجوار میں رہنے والے اس صاحب کو ایسا کرنے سے منع کرتے ہیں اور اس پر سخت ناراض بھی ہیں۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ عیدگاہ کو گذرگاہ بنانا، اس میں چلنا پھرنا اور کھیلنا کودنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ نیز عیدگاہ مسجد شرعی کے حکم میں ہے یا نہیں؟

الجواب:- عیدگاہ اور جنازہ گاہ کا مسجد شرعی کے حکم میں ہونا اگرچہ مختلف فیہ ہے مگر راجح مذہب یہ ہے کہ عیدگاہ مسجد شرعی کے حکم میں ہے۔

كما قال العلامة قاضي خانؒ: مسجد اتخذ لصلاة الجنازة اولصلوة العيد هل يكون له حكم المسجد اختلف المشائخ فيه قال بعضهم يكون مسجد حتى لومات الواقف لا يورث۔ (فتاویٰ قاضی خان علیٰ ہامش الہندیہ ج ٣ ص٢٩٠ کتاب الوقف)

وقال العلامة ابن عابدينؒ: المتخذ لصلوة الجنازة العيد فهومسجد في جواز الاقتداء وان انفصل الصفوف رفقا بالناس لا في حق غيره به يفتى نهاية۔اھ وعبارة النهاية والمختار للفتوىٰ انه مسجد في حق جواز الاقتداء..... فان الباقي لم يعده لذلك فينبغي ان لايجوز..... وما صححه تاج الشريعة ان مصلى العيد له حكم المساجد وتمامه في الشرنبلالية۔ (ردالمحتار ج ١ ص٦٤٢ کتاب الوقف)

وفي احسن الفتاوىٰ: جمیع احکام میں عیدگاہ کا بحکم مسجد ہونا مختلف فیہ ہے، شامیہ سے جمیع احکام میں بحکم مسجد ہونے کی ترجیح معلوم ہوتی ہے۔ (احسن الفتاویٰ ج ٦ ص٤٢٨ کتاب الوقف)

اس لیے عیدگاہ میں ہر وہ عمل جو اس کی بے حرمتی اور بے احترامی کی طرف مفضی ہونا جائز و حرام ہے، مثلاً عیدگاہ میں راستہ بنانا اور اس میں ہر قسم کے لوگوں (حائضہ، نفساء، جنب وغیرہ) کا گذرنا، اس کو کھیل کود کا میدان بنانا، اس کی بے حرمتی کرنا وغیرہ۔

کما قال العلامۃ ابن نجیمؒ : وقال بعضھم لہ حکم المسجد حال اداء الصلوٰۃ لا غیر وھو والجنانۃ سواءٌ ویجتنب ھٰذا المکان عما یجتنب المسجد احتیاطاً۔
(البحر الرائق ج ۵ ص ۲۴۸ کتاب الوقف)

وفی کفایت المفتی : عیدگاہ کے احاطے کے اندر کارخانہ کھولنا جس میں ہر قسم کے آدمی کام کرتے ہوں جائز نہیں ہے۔ (کفایت المفتی جلد ۷ ص ۱۱۴)

وفی امداد المفتیین : نیز احتیاطاً تعظیم وحرمت میں بھی فقہاء نے اس کو مثل مسجد قرار دیا ہے اور زراعت اس کے خلاف ہے۔ (فتاوٰی دار العلوم دیوبند جلد ۲ ص ۸۱۵)

وفی احسن الفتاوٰی : عیدگاہ کا احترام بہر کیف واجب ہے، اگرچہ اس کے مسجد ہونے میں اختلاف ہے مگر بے حرمتی سے حفاظت بہر حال ضروری ہے لہٰذا امور مسئولہ (کھیل کود، دعوت وغیرہ کا انتظام کرنا) کی اجازت نہیں۔ (احسن الفتاوٰی جلد ۶ ص ۴۲۸ کتاب الوقف)

اور عیدگاہ میں یہ امور اس لیے بھی جائز نہیں کہ واقف نے اس زمین کو ان امورِ مذکورہ کیلئے وقف نہیں کیا ہے بلکہ اس کا وقف صرف اور صرف عیدگاہ تک محدود ہے اور واقف کی نیت کا اعتبار کرنا ضروری ہے۔ شامی میں ہے : نیۃ الواقف کنص الشارع۔
(رد المحتار ج ۴ ص ۴۳۳ کتاب الوقف)

اور پھر جب عیدگاہ کے ساتھ دوسرا متبادل راستہ موجود ہو تو پھر بھی اس میں راستہ بنانا مسجد میں راستہ بنانے کے مترادف ہے جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع کرتے ہوئے ارشاد فرمایا : لا تجعلوا المساجد ممراً (الحدیث) کہ مسجد کو راستہ مت بناؤ۔

اس لیے شریعت کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے عیدگاہ کی حفاظت کرنا ضروری ہے، تاکہ اس کو راستہ نہ بنایا جا سکے، اور مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ اس شخص کے ساتھ تعاون کریں جو اس کی حفاظت کرتا ہو، عیدگاہ کو کھیل کود کا میدان یا راستہ بنانے سے منع کرنے والے پر کسی کو بھی اعتراض کرنے کا شرعاً حق حاصل نہیں، اس جگہ کو صرف عیدین کی نماز یا دیگر دینی تقریبات کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے، اس کے علاوہ اس کو بطور راستہ، کھیل کے میدان اور دیگر خلافِ شرع امور میں استعمال کرنا جائز نہیں۔

واللہ اعلم وعلمہ اتم

جنوبی افریقہ کی قدیم مساجد و مدارس وغیرہ کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین مندرجہ ذیل سوالوں کے اندر کہ:

(۱) جنوبی افریقہ ایک ایسا ملک ہے کہ جہاں کبھی بھی اسلامی حکومت قائم نہیں ہوئی ہے، حقیقت میں یہ ملک غیر آباد تھا۔ سب سے پہلے ہالینڈ کی ڈچ قوم جا و اسے تین سو سال پہلے یہاں آئی تھی۔ اور یہی ڈچ قوم قریبًا ڈیڑھ سو ملائی مسلمان، جو کہ سیاسی قیدی تھے، اپنے ساتھ لائی تھی، پھر انگریز آئے اور انہوں نے ہندوستان سے ہندوستانیوں کو کام کاج کے واسطے بلایا، جب ان ہندوستانیوں کا وقت پورا ہو گیا تو بعض واپس ہندوستان چلے گئے اور اکثر یہاں پر ہی مقیم ہو گئے جن میں سے کچھ تو تجارت، کچھ مزدوری اور کچھ زراعت میں مشغول ہو گئے۔ اس ملک میں سفید فام قوم ۳۵ لاکھ، حبشی نژاد ۱۵ لاکھ، ایشیائی قوم ۵ لاکھ، خالص حبشی ایک کروڑ بیس لاکھ اور مسلمان تقریبًا ایک لاکھ ہوں گے۔ اور حکومت اس ملک پر سفید فام عیسائی قوم کی ہے، مسلمان نماز اذان، قربانی اور حج وغیرہ ادا کرنے میں آزاد ہیں، مسلمانوں کی مسجدیں اور مدرسے آباد ہیں، اب حکومت نے نسلی امتیاز کا قانون بنایا ہے جس کی بنیاد رنگ پر ہے مذہب پر نہیں۔ اس قانون کی وجہ سے ہر قوم کو الگ الگ جگہوں پر آباد کیا جاتا ہے، اب جو علاقے سفید فاموں کے لیے مخصوص کئے گئے ہیں وہاں سے ہندوستانیوں کو نکالا جا رہا ہے اور ان کے مکانوں اور زمینوں کی معمولی قیمت دے کر زبردستی ان کو بے دخل کیا جا رہا ہے ــــ اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ ملک دار الحرب ہے یا نہیں؟ اور اگر دار الحرب ہے تو پھر مسلمانوں کو یہاں پر رہنا جائز ہے یا ہجرت کر کے چلے جانا چاہیئے؟

(۲) جو علاقے سفید فام قوم کے لیے مقرر ہو چکے ہیں ان علاقوں کے اندر جو مسجدیں آ گئی ہیں ان کو فروخت کر کے قیمت لینا جائز ہے یا نہیں؟ یا ان کو ویسے ہی چھوڑ دینا چاہیئے، جبکہ آج ان کی قیمت کئی لاکھ پونڈ سے بھی زیادہ ہے، اور جب ان علاقوں میں مسلمان ہی نہ رہیں گے تو یہ مسجدیں بھی غیر آباد اور شہید ہو جائیں گی۔ اب آپ سے التجا ہے کہ یہ ملک کیا ہے، اور جو مسجدیں سفید فاموں کے علاقے اندر آ گئی ہیں اُن کے

واسطے مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیئے؟ شریعتِ مقدسہ کی روشنی میں اس مسئلہ کا حل مطلوب ہے؟

الجواب: محترم! آپ کے سوالات کے جوابات شریعتِ مطہرہ کی روشنی میں حسب ذیل ہیں:۔

(۱) عباراتِ فقہیہ پر نظر ڈالنے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ آپ کا ملک یعنی جنوبی افریقہ آپ کے واسطے نہ دارالحرب ہے کہ جس سے ہجرت لازم ہو جائے اور نہ مکمل دارالاسلام ہے، بلکہ دارالامن اور دارِعہد اگر اس کو کہا جائے تو بجا ہے۔ اس بارے میں فقہاء کرام کی چند عبارات ملاحظہ ہوں:۔

(ا) فتاوٰی عالمگیری میں ہے: اعلم ان دار الحرب تصیر دار الاسلام بشرط واحد وھو اظہار حکم الاسلام فیھا قال محمدؒ فی الزیادات انما تصیر دار الاسلام دار الحرب عند ابی حنیفۃؒ بشروط ثلاثۃ احدھا اجراء احکام الکفار علی سبیل الاشتھار وان لا یحکم فیھا بحکم الاسلام والثانی ان تکون متصلۃ بدار الحرب لا یتخلل بینھما بلد من بلاد الاسلام والثالث ان لا یبقی فیھا مؤمن ولا ذمی آمنًا بامانہ الاول الذی کان ثابتًا قبل استیلاء الکفار للمسلم باسلامہ وللذمی لعقد الذمۃ۔ وقال ابو یوسفؒ بشرط واحد لا غیر وھو اظہار احکام الکفر وھو القیاس۔ (ج۲ ص۲۳۶)

(ب) خزانۃ المفتین میں ہے: دار الاسلام لا تصیر دار الحرب الا باجراء احکام الشرک فیھا وان یکون متصلًا بدار الحرب لا یکون بینھا وبین دار الحرب مصر آخر للمسلمین وان لا یبقی فیھا مسلم وذمی بالامان الاول فما لم توجد ھذہ الشرائط لا تصیر دار الحرب وقالا اذا اجروا فیھا احکام الشرک فانھا تصیر دار الحرب سواء کانت متصلۃ بدار الحرب اولم تکن بقی فیھا مسلم او ذمی آمنا بالامان الاول اولم یبق۔

(ج) اور فتاوٰی بزازیہ میں ہے: قال السید الامام والبلاد التی فی ایدی الکفرۃ الیوم لا شک انھا بلاد الاسلام بعد اتصالھا ببلاد دار الحرب ولم فیھا احکام الکفر بل القضاۃ مسلمون اما البلاد والتی

علیها قال مسلم جهتهم فیجوز فیها اقامة الجمع والاعیاد واخذ الخراج وتقلید القضاة وتزویج الایامیٰ والا دار مل لا یتلاء المسلم علیه اما البلاد والتی علیها ولاة کفار فیجوز فیها ایضًا اقامة الجمع والاعیاد والقاضی قاضٍ بتراضی المسلمین الخ - وذکر الحلوائی انه انما لقیل دار الحرب باجراء احکام الکفر وان لا یحکم فیها بحکم من احکام الاسلام وان یتصل بدار الحرب وان لا یبقیٰ فیها مسلم ولا ذمی آمنًا بالاول فاذا وجدت الشرائط کلّها صارت دار الحرب وعند تعارض الدلائل والشرائط یبقیٰ ما کان اویترجح جانب الاسلام احتیاطًا - انتهی ملخصًا -

(د) اور *شرح زیادات للعتابی* میں ہے: دار الاسلام انما لقیل دار الحرب بثلاث شرائط احدها اجراء احکام الکفّار علی سبیل الاشتهار، والثانی ان تکون متا بدار الحرب ای متصلة لا یتخلل بینهما بلدة من بلاد المسلمین والثالث ان لا یبقیٰ فیها مسلم او ذمّی آمنًا بالامان الاول فشرط هٰذه الشرائط لا یکون علمًا علی تمام القهر والاستیلاء اذا دار الاسلام یحتاط لاثباطها وعندهما یصیر دار الاسلام دار الحرب باجراء احکام الکفر فیها - انتهیٰ

(ه) اور *طحطاوی حاشیہ درمختار* میں ہے: قوله باجراء احکام الشرك ای علی الاشتهار وان لا یحکم فیها بحکم اهل الاسلام هندیة - وظاهره انه لو اجریت احکام المسلمین و احکام اهل الشرك لا تکون دار الحرب - انتهیٰ

ان مجموعہ عبارات اور ان کے امثال سے ظاہر ہوتا ہے کہ دارالاسلام کے دارالحرب ہونے میں شرط یہ ہے کہ احکام کفر علیٰ سبیل الاشتہار جاری ہوں اور احکام اسلام بالکلیہ موقوف کر دیئے جائیں اور شعائر اسلام وضروریاتِ دین میں کفار مداخلت کرنے لگیں، اور یہ شرط اتفاقی ہے۔ اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے اس کے سوا اور بھی دو شرطیں زائد کیں، ایک یہ کہ اس بلاد میں اور دارالحرب میں کوئی بتدہ مملکتِ اہلِ اسلام کا باقی نہ رہے، دوسرے یہ کہ امانِ اول مرتفع ہو جاوے اور بامانِ کفار اقامت کی نوبت آتی ہو، اور دارالحرب سے دارالسلام ہونے میں ایک شرط ہے، اور وہ ہے اظہار حکم اسلام۔

اس ساری تفصیل کی روشنی میں جب جنوبی افریقہ کے ملک پر نظر ڈالی جاتی ہے تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ وہ شرائط مذکورہ کی رو سے دارالحرب نہیں ہے، اور یہ اس وجہ سے کہ وہاں شعائر اسلام میں ہنوز حکام کی طرف سے مداخلت و ممانعت نہیں ہے، جیساکہ آپ کے سوال سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت سفید فام عیسائی قوم کی ہے اور مسلمان جو کہ تقریباً ایک لاکھ ہیں۔ اذان، نماز، قربانی اور حج وغیرہ شعائر اسلام میں آزاد ہیں، اس لیے اس ملک کو نہ تو دارالحرب کہہ سکتے ہیں اور نہ دارالسلام کہہ سکتے ہیں کیونکہ سلطنت اور حکومت مسلمانوں کی نہیں ہے، اور نہ پہلے کبھی اس ملک پر اسلامی حکومت قائم ہوئی ہے، جیسا کہ آپ کے سوال سے بھی ظاہر ہے کہ اس ملک پر اسلامی حکومت کبھی قائم نہیں ہوئی بلکہ یہ ملک غیر آباد تھا، اور سب سے پہلے ایک ڈچ کافر قوم کی حکومت قائم ہوئی، پھر انگریزوں کی حکومت آئی اور اب سفید فام عیسائیوں کی حکومت ہے۔ غرضیکہ احکام مسلمین اور احکام شرک دونوں اس میں جاری ہیں، لہٰذا جانب اسلام کو ترجیح دے کر دارالسلام بھی نہیں کہا جا سکتا، البتہ ایک درمیانی صورت ہے کہ اس کو دارالامن اور دار عہد کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ یا تو آپ کا سفید فام حکومت سے باقاعدہ معاہدہ ہوا ہوگا اور اگر باقاعدہ معاہدہ نہ ہوا ہو تو آپ کے ملک کے حالات پر نظر ڈالنے سے عملاً معاہدہ معلوم ہوتا ہے جس کے ماتحت آپ امن و سکون سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اور آپ اپنے تصفیہ طلب معاملات ان کی عدالتوں میں لے جاتے ہیں اور جانی و مالی امور میں ان سے مدد طلب کرتے ہیں، اور دیگر معاملات میں بھی ان کی طرف رجوع کرتے ہیں جن میں فریقین معاہدہ ایک دوسرے کی طرف رجوع کرتے ہیں اور یہ بھی ظاہر ہے کہ آپ نے یہ معاہدہ توڑا ابھی نہیں ہے کیونکہ آپ نے کوئی قومی تحریک شروع نہیں کی جس کی وجہ سے توڑ پھوڑ، مار پیٹ اور سول نافرمانی وغیرہ قسم کی چیزوں تک نوبت پہنچ گئی ہو، اس لیے عہد بھی قائم ہے اور امن بھی، پس آپ کا ملک (جنوبی افریقہ) دارالامن اور دار عہد ہے۔ ھٰذا ما ظھرلی وان لم یشرح بہ القلب و لم تطمئن بہ النفس فان للمقال فیہ مجالاً، واللہ اعلم

(۲) جو مسجدیں سفید فاموں کے علاقے کے اندر آگئی ہیں مجبوراً آپ ان کا عوض لے سکتے ہیں، ان کو فروخت کر کے قیمت لینا اور اس سے اپنے علاقے میں مسجد تعمیر کرنا درست

ہے۔ چند عبارتیں کتبِ فقہ کی اس مدعیٰ کے اثبات کے لیے درج کی جاتی ہیں:

وفی الخانیۃ: رباط بعید استغنیٰ عنہ المارۃ وبجنبہ رباط اٰخر قال السید الامام ابو شجاع: تصرف غلتہ الی الرباط الثانی کالمسجد اذا خرب واستغنیٰ عنہ اھل القریۃ نرفع ذٰلک الی القاضی فباع الخشب وصرف الثمن الی مسجد آخر جاز۔

وفی فتاوی النسفی: سئل شیخ الاسلام عن اھل القریۃ رحلوا وتداعیٰ مسجدھا الی الخراب وبعض المتغلبۃ لیستولون علیٰ خشبہ وینقلونہ الی دورھم ھل الواحد من اھل المحلۃ ان یبیع الخشب بامر القاضی ویمسک الثمن لیصرفہ الی بعض المساجد او الی ھٰذا المسجد قال نعم۔ اھ (شامی ج ۳ ص ۵۱۴)

اس فتویٰ کی تائید میں علامہ شامیؒ نے یہ دلیل بیان کی ہے: فان المسجد اوغیرہ من رباط او حوضٍ اذا لم ینقل یاخذ انقاضہ اللصوص والمتغلبون کما ھو مشاھد۔

ہاں اگر ان کے ساتھ اس بات کا سمجھوتہ ہو کہ وہ مسلمانوں کے شعائرِ دین کو اپنے حال پر ہی رہنے دیں گے اور انہیں ڈھا کر ویران و برباد نہ کریں گے تو اس صورت میں اصل حکم یہ ہے کہ ان مساجد کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے گا اور ان کو فروخت نہیں کیا جائے گا، جیسا کہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ فرماتے ہیں: انہٗ لایعود الی ملک مالک ابدًا کذا فی المضمرات۔ (فتاویٰ عالمگیری ج ۲ ص ۴۴۵)

فقط واللہ اعلم

كتاب
الحدود
والتعزيرات

ادرءُوا الحدود عن المسلمين ما استطعتم

کتاب الحدود والتعزیرات

(حدود اور تعزیرات کے احکام و مسائل)

حدود جاری کرنا حکام کا حق ہے

سوال:۔ کسی مجرم کو کوڑوں یا قصاص کی سزا دینے کا استحقاق صرف حاکم کو ہے یا عوامی جرگہ بھی جاری کرسکتا ہے؟

الجواب:۔ حدود جاری کرنا حکام اور ان کی طرف سے مقرر شدہ قضاۃ وغیرہ کا حق ہے کسی اور کو حدود جاری کرنے کا اختیار نہیں ہے۔

وفی الھندیۃ: ورکنہ (الحد) اقامۃ الامام او نائبہ فی الاقامۃ۔

(الفتاوی الھندیۃ ج۲ ص۱۴۳ کتاب الحدود) [1]

کوڑے کی ساخت کے بارے میں وضاحت

سوال:۔ اسلامی قانون میں حدود اور تعزیرات میں جو کوڑے لگائے جاتے ہیں، اس کوڑے کی ساخت کے بارے میں وضاحت فرمائیں کہ وہ کس طرح کا ہونا چاہیئے اور کس چیز سے بنا ہوا ہونا چاہیئے اور اس کی لمبائی چوڑائی کا کیا اعتبار ہے؟

الجواب:۔ حدود و تعزیرات میں استعمال ہونے والے کوڑے کی ساخت متوسط ہونا ضروری ہے خواہ کسی بھی چیز سے بنا ہوا ہو، تاہم اگر لکڑی کا ہو تو نرم سی چھڑی ہونی چاہیئے حدود و تعزیرات میں لاٹھی کا استعمال جائز نہیں۔

قال العلامۃ ابن نجیم المصریؒ: (بسوط لا ثمرۃ لہ متوسطا) ای لا عقدۃ لہ لان

---

[1] وقال الامام علاؤالدین ابی بکر بن مسعود الکاسانیؒ: واما شرائط جواز اقامتہا فمنہا مایعم الحدود کلہا ومنہا مایخص البعض دون البعض اما الذی یعم الحدود کلہا فہو الامامۃ وھو ان یکون المقیم للحد ھو الامام او من ولاہ الامام وھذا عندنا۔ (بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ج۷ ص۵۷ کتاب الحدود)

ومثلہ فی کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعۃ ج۵ ص۲۴۹ کتاب الحدود۔

عليا في الله عنه لما اراد أن يقيم الحد كسر ثمرته والمتوسط بين المبرح وهو الجارح وغير المؤلم لافضاء الاول الى الهلاك وخلو الثاني عن المقصود وهو الانزجار كذا في الهداية وحاصله انه المؤلم غير الجارح۔

(البحر الرائق جلد ۵ ص ۹ كتاب الحدود) [1]

زنا کا جرم ثابت ہو جانے پر حد جاری کرنے کا حکم

سوال:۔ ایک بالغ لڑکے نے بالغ لڑکی کے ساتھ زنا کیا تو کیا ان دونوں پر حد جاری کی جائے گی یا نہیں جبکہ آجکل ملک میں اسلامی حکومت بھی نہیں ہے، اگر وہ دونوں آئندہ اور ماقبل تمام گناہوں سے توبہ کر لیں تو کیا ان سے حد ساقط ہو سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اسلامی قانون میں زنا کی سزا محصن (شادی شدہ) مرد و عورت کو زنا ثابت ہونے پر رجم (سنگسار) کرنا ہے اور غیر محصن کے لیے سو کوڑوں کی سزا ہے۔

قال العلامة برهان الدين المرغيناني رحؒ: واذا وجب الحدود كان الزاني محصنا رجمه بالحجارة حتى يموت اه وان لم يكن محصنا وكان حرا فحده مائة جلدة۔ (الهداية ج۲ ص۵۰۱ كتاب الحدود)

تاہم اسلامی حکومت نہ ہونے کی وجہ سے حدود کا کوئی معقول انتظام نہیں ہے اسلئے اگر زناکار مرد اور عورت توبہ کر لیں تو امید کی جا سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کا یہ گناہ معاف کر دے گا علامہ عبدالحی لکھنوی رحمہ اللہ نے اس توبہ کا طریقہ کچھ یوں بیان کیا ہے کہ "اچھی طرح وضو کر کے دو رکعت نماز نفل خشوع و خضوع سے پڑھے پھر نہایت آہ و زاری سے آنسو بہا کر عاجزی ظاہر کر کے جیسے کوئی مجرم غلام اپنے آقا سے قصور معاف کراتا ہے دعائے مغفرت کرے

---

[1] قال الزيلعيؒ: بسوط لا ثمرة له متوسطاً أن يضرب بسوط لاعقدة له ضرباً متوسطاً......
وعن علي رضي الله عنه انه كسر ثمرته ولو لم يكسر الثمرة بعد كل ضربة يضرب بتين......
والضرب المتوسط هو المؤيد غير الجارح لان الجارح يفضي الى التلف او يبقى في جسده أثر يشينه ولهذا يكسر عقدته وغير المؤيد لا يفيد والواجب التاديب دون الهلاك۔ (تبيين الحقائق ج۳ ص۱۷۰ كتاب الحدود)

اور دل میں اس گناہ سے ندامت رکھے اور یہ قصد کرے کہ آئندہ ایسی حرکت کبھی نہ کروں گا اللہ اس کے گناہ معاف کر دے گا، اور اس عورت کے حق میں بھی دعائے مغفرت کرے اور اگر ابتداء میں وہ عورت راضی نہ تھی تو اُس سے بھی عفو قصور کرالے تاکہ وہ حشر میں دامنگیر نہ ہو۔ واللہ اعلم۔ (مجموعۃ الفتاوٰی ج ۳ ص ۳۵۷ کتاب الحدود) ۱

نابالغہ سے زنا بالجبر کا حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علماء دین اس بارے میں کہ ایک عاقل بالغ لڑکے نے نابالغ لڑکی سے زبردستی زنا کیا اور جرم ثابت بھی ہوگیا تو اس نابالغ لڑکی پر حد جاری ہوگی یا نہیں؟

الجواب:- اگر کوئی عاقل بالغ لڑکا ایسی نابالغ لڑکی سے زنا کرے جس کے مثل کے ساتھ جماع کیا جاسکتا ہو اور قاضی کے ہاں اس کا ثبوت بھی ہوجائے تو لڑکے پر حد لگائی جائے گی اور لڑکی پر بوجہ عدم بلوغ کے کوئی حد نہ ہوگی۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: (ولا) حد (بزنی غیر مکلف بمکلفۃ مطلقاً) لا علیہ ولا علیہا (وفی عکسہ حد) فقط۔ (الدر المختار علیٰ ھامش رد المحتار ج ۳ ص ۱۵۶،۱۵۷ الباب الوطء الذی یوجب الحد والذی لا یوجبہ) ۲

حقیقی بیٹی سے زنا کرنے کی سزا

سوال:- ایک شخص نے اپنی بیٹی کے ساتھ زنا کیا جس کے نتیجہ میں وہ حاملہ ہوگئی اور وہ ناجائز بچے کی ماں بن گئی اور اس نے بلا جبر و اکراہ بچے کو اپنے سگے باپ کی طرف منسوب کیا اور

---

۱ قال العلامۃ ابو البرکات عبد اللہ بن احمد بن محمود النسفیؒ: فان کان محصنا رجمہ فی فضاء حتی یموت ام ولو غیر محصن جلدہ مائۃ۔ (کنز الدقائق ص ۱۸۱ کتاب الحدود)
وَمِثْلُہٗ فی الہندیۃ ج ۲ ص ۱۴۵،۱۴۶ الباب الثالث فی کیفیۃ الحد واقامتہٗ۔

۲ قال العلامۃ فخر الدین عثمان بن علی الزیلعیؒ: (قولہ وبزنا صبی او مجنون بمکلفۃ بخلاف عکسہ) أی لا یجب الحد اذا زنی الصبی او المجنون بامرأۃ مکلفۃ وھی البالغۃ العاقلۃ بخلاف العکس وھو ما اذا زنی البالغ العاقل بصبیۃ او مجنونۃ حیث یجب الحد علی الرجل۔ (تبیین الحقائق ج ۲ ص ۱۸۳ باب الوطء الذی یوجب الحد والذی لا یوجبہ)
وَمِثْلُہٗ فی الہندیۃ ج ۲ ص ۱۴۹ الباب الرابع فی الوطء الذی یوجب الحد والذی لا یوجبہ۔

باپ نے بھی بلاجبر و اکراہ بیٹی سے زنا کرنے کو تسلیم کر لیا، شریعتِ مقدسہ میں ان دونوں کے بارے میں کیا حکم ہے ؟

الجواب:۔ زنا کو اسلام میں ایک انتہائی قبیح فعل کہا گیا ہے، کسی بھی عورت کے ساتھ زنا کرنا قطعی حرام ہے اور بیٹی تو محرمات میں سے ہے اس کے ساتھ زنا کرنا تو اور بھی زیادہ سخت جرم ہے اور زنا کو حلال سمجھنا موجبِ کفر ہے، برادری کے لوگ ایسے شخص کے ساتھ قطع تعلق کریں اور حکومتِ وقت اس پر حدِ زنا جاری کرے ۔

قال العلامة ابن نجیمؒ : من استحل ما حرمه الله تعالیٰ علی وجه الظن لا یکفر وانما یکفر اذا اعتقد الحرام حلالا ۔ (البحر الرائق ج ۵ ص ۱۲۶ باب المرتد)[1]

پاکدامن عورت پر زنا کی تہمت لگانے کی سزا

سوال:۔ اگر کوئی شخص کسی پاکدامن اور عفیفہ عورت پر زنا کی تہمت لگائے اور گواہ پیش نہ کر سکے تو اس کی شرعاً کیا سزا ہے ؟

الجواب:۔ جو شخص کسی آزاد مسلمان مکلف اور پاکدامن عورت پر زنا کی تہمت لگائے اور پھر چار گواہ پیش نہ کر سکے تو دار الاسلام میں ایسے شخص کو اسّی ۸۰ کوڑے لگائے جائیں گے، اور شریعت میں اس کو حدِ قذف کہا جاتا ہے بشرطیکہ قاذف (تہمتِ زنا لگانے والا) آزاد ہو اس لیے کہ غلام کو آدھی سزا دی جائے گی یعنی چالیس ۴۰ کوڑے لگائے جائیں گے، البتہ اسلامی حکومت نہ ہونے کی صورت میں قاذف توبہ کرے اور مقذوف سے معافی مانگے ۔

لما فی الھندیة : اذا قذف الرجل رجلاً محصناً او امرأة محصنة بصریح الزنی بان قال زنیت او یا زانی وطالب المقذوف بالحد حده الحاکم ثمانین سوطاً ان کان القاذف حراً وان کان عبداً حده اربعین سوطاً کذا فی النقایة لقدیة (الفتاوی الهندیة ج ۲ ص ۱۶۰ الباب السابع فی حد القذف)[2]

---

[1] قال العلامة ابن عابدینؒ : من استحل ما حرمه الله تعالیٰ علی وجه الظن لا یکفر وانما یکفر اذا اعتقد الحرام حلالا ۔ (رد المحتار ج ۳ ص ۱۵۴ باب المرتد)

[2] قال العلامة برهان الدین المرغینانیؒ: واذا قذف الرجل رجلاً محصناً او امرأة محصنة بصریح الزنا وطالب المقذوف بالحد حده الحاکم ثمانین سوطا ان کان حراً لقوله تعالیٰ: وَالَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ الیٰ ان قال فاجلدوهم ثمانین جلدة والمراد الرمی بالزنا بالاجماع وان کان القاذف عبداً جلد اربعین سوطاً ۔ (الهدایة ج ۲ ص ۵۲۹ کتاب الحدود، باب حد القذف)

قابلِ تعزیر سرقہ کی مقدار

سوال:- قابلِ تعزیر سرقہ کا نصاب تو دس درہم ہے لیکن آجکل کی کرنسی کے حساب سے یہ نصاب کتنا بنتا ہے؟

الجواب:- "اوزانِ شرعیہ" نامی کتاب میں لکھا ہے کہ ایک درہم ساڑھے تین ماشہ کا ہوتا ہے تو اس اعتبار سے دس درہم یا پینتیس ۳۵ ماشے چاندی یا اس کی مالیت نصاب سرقہ بنتا ہے اور یہ بات تو مسلّم ہے کہ مقدار حدِ سرقہ دس درہم ہے، لہٰذا موجودہ کرنسی کے اعتبار سے جتنی قیمت ۳۵ ماشے چاندی کی بنتی ہو سرقہ لازم ہو گا۔

وفی الهندیة: أقل النصاب فی السرقة عشرة دراهم مضروبة بوزن سبعة جیاد کذا فی العنایة۔ (الفتاوٰی الهندیه جلد ۲ ص۱۷۰ کتاب السرقة) [1]

سارق کے ہاتھ کو دوبارہ جوڑنے کا حکم

سوال:- اگر سارق کا ہاتھ بطورِ حد کاٹ دیا جائے تو اجراء حد کے بعد اس کو دوبارہ جوڑنا شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب:- سارق کو سرقہ کے جرم میں صرف سزا دینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اصل مقصد اس کو ایک ہاتھ سے محروم کرنا ہے تاکہ وہ آئندہ کے لیے یہ کام نہ کرسکے اور اسے دیکھنے والے عبرت حاصل کریں، اس لیے سارق کے کٹے ہوئے ہاتھ کو دوبارہ جوڑنا شرعاً درست نہیں ہے۔

وفی الهندیة: وتقطع یمین السارق من الزند وتحسم وثمن الذیت وکلفة الحسم علی السارق عندنا۔ (الفتاوٰی الهندیة ج۲ ص۱۸۲ الباب الثانی فیما یقطع فیه وما لا یقطع۔ الفصل الثالث) [2]

---

[1] قال العلامة الحصکفی رحمه الله: (هی) الخ (عشرة دراهم) الخ (جیاداو مقدارها)
(الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۳ ص۱۹۲ کتاب السرقة)
وَمِثْلُهٗ فی کنز الدقائق ص۱۷۰ کتاب السرقة۔

[2] قال العلامة ابو البرکات النسفی رحمه الله: وتقطع یمین السارق من الزند وتحسم۔
(کنز الدقائق ص۱۹۵ کتاب الحدود، باب حد السرقة)
وَمِثْلُهٗ فی الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۳ ص۲۰۶ باب کیفیة القطع اثباته۔

مزارات سے قیمتی اشیاء چُرانے کا حکم

سوال :- آجکل کچھ لوگ اولیاء اللہ کے مزارات پر عموماً قیمتی غلاف چڑھاتے ہیں اس کے علاوہ مزارات پر روپے پیسے اور قیمتی چیزیں بھی رکھی جاتی ہیں، اگر کوئی شخص ان اشیاء کو چُرا لے تو اس پر حدِ سرقہ جاری کی جائے گی یا نہیں؟

الجواب :- اگرچہ ان اشیاء کو چوری کرنا جائز تو نہیں تاہم ان اشیاء کو چُرانے سے حدِ سرقہ واجب نہیں ہوتی اور ان اشیاء کا وہی مالک ہوگا جس نے مزار پر رکھی ہوں۔

وفی الهندية : ولو سرق من القبر دراهم اودنانیر أو شيئًا غیر الکفن لم یقطع بالاجماع اختلف مشائخنا رحمهم الله تعالیٰ فیما اذا کان القبر فی بیتٍ مقفل الاصح انه لایقطع سواء نبش الکفن اوسرق مالاً آخر من ذٰلك البیت وکذا اذا سرق الکفن من تابوت فی القافلة لایقطع فی الاصح کذا فی الکافی۔ (الفتاویٰ الهندیة ج۲ ص۱۷۸ الباب الثانی فیما یقطع فیه ومالایقطع فیه)[1]

رہزن کو قتل کرنے کا حکم

سوال :- کیا راہزن، ڈاکو اور ہر وہ آدمی جس کا فساد ظاہر اور عام ہو تو اس کو صرف حاکمِ وقت یا قاضی تعزیرًا اور سیاستہً قتل کرسکتے ہیں یا عوام الناس بھی دفعِ فساد کے لیے اس کو قتل کرنے میں مختار ہیں؟

الجواب :- اگرچہ دفعِ فساد کے لیے حاکمِ وقت اور قاضی کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس قسم کے آدمی کو قتل کردے، تاہم اگر عوام رہزن کو دورانِ واردات قتل کردیں تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

قال العلامة الحصکفیؒ : (وعلیٰ هٰذا) القیاس (المکابر بالظلم وقطاع الطریق

---

[1] قال العلامة علاؤ الدین الحصکفی رحمه الله : (ونبش) لقبور (ولوکان القبر فی بیت مقفل فی الاصح) (او) کان (الثوب غیر الکفن) وکذا لوسرقه من بیت فیه قبر او میت لتأوّله بزیارة القبر أو التجهیز۔
(الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۳ ص۲۰۰ کتاب السرقة۔ مطلب فی ضمان الساعی)
ومثله فی بدائع الصنائع فی ترتیب احکام الشرائع ج۷ ص۶۹ کتاب السرقة۔

وصاحب المکس وجمیع الظلمۃ اھ) وافتی الناصحی بوجوب قتل کل مؤذ وفی ردالمحتار ج۳ ص۱۸۰ لعل الوجوب بالنظر للامام ونوابہ والاباحۃ بالنظر لغیرھم۔
(الدرالمختار علیٰ ہامش ردالمحتار ج۳ ص۱۸۰ مطلب ویکون التعزیر بالقتل) لہ

مفسد کو سزا دینے کا حکم

سوال:۔ اگر کوئی شخص لوگوں میں فساد پیدا کرتا ہو تو اس کے ساتھ شرعاً کیا سلوک کیا جائے گا؟

الجواب:۔ حاکمِ وقت کو چاہیئے کہ وہ ہر ممکن طریقے سے ایسے شخص کو روکے اور اس کو تعزیراً سزا بھی دے، اور عوام الناس کو بھی چاہیئے کہ وہ اس کے ساتھ ترکِ موالات کریں حتیٰ کہ وہ اپنے اس فعلِ بد سے باز آجائے۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: (وعلیٰ ھٰذا) القیاس المکابر بالظلم وقطاع الطریق وصاحب المکس وجمیع الظلمۃ بادنیٰ شئ لہ قیمۃ۔ (الدرالمختار علیٰ ہامش ردالمحتار جلد۳، ص۱۸۰، ۱۸۱ مطلب یکون التعزیر بالقتل) ۲ہ

چارپائے کے ساتھ بدفعلی پر تعزیر کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے بکری کے ساتھ بدفعلی کا ارتکاب کیا تو اس کے لیے شرعاً کیا حکم ہے، جبکہ اس کا یہ جرم گواہوں کے ذریعہ ثابت بھی ہو چکا ہے؟

الجواب:۔ بشرطِ صدق وثبوت جانور سے وطی (بدفعلی) کرنے والے پر تعزیر ہے جو قاضی اور حاکم کی صوابدید پر موقوف ہے تاہم کوڑوں کی سزا کی صورت میں چالیس سے کم کوڑے لگائے جائیں گے، کوڑوں کے علاوہ بھی تعزیر ہو سکتی ہے بشرطیکہ یہ تعزیر

لہ قال العلامۃ ابن نجیم المصریؒ: وعلیٰ ھٰذا القیاس المکابرۃ بالظلم وقطاع الطریق ...... فیباح قتل الکل ویثاب قاتلھم۔ (البحرالرائق ج۵ ص۴۲ باب حدالقذف، فصل فی التعزیر)
وَمِثْلُہٗ فی الفتاویٰ الھندیۃ ج۲ ص۱۶۷ الباب السابع فی حدالقذف والتعزیر، فصل فی التعزیر۔

لہ قال العلامۃ ابن نجیم المصریؒ: وعلیٰ ھٰذا القیاس المکابرۃ بالظلم وقطاع الطریق وجمیع الظلمۃ بادنیٰ شئ لہٗ قیمۃ وجمیع الکبائر والاعونۃ والظلمۃ والسعاۃ فیباح قتل الکل ویثاب قاتلھم۔
(البحرالرائق ج۵ ص۴۲ باب حدالقذف، فصل فی التعزیر)
وَمِثْلُہٗ فی الفتاویٰ الھندیۃ ج۲ ص۱۶۷ الباب السابع فی حدالقذف والتعزیر، فصل فی التعزیر۔

جان ضائع ہونے تک نہ پہنچے، البتہ جانور کو ذبح کرکے جلا دیا جائے، تاوان وطی کرنے والے کے ذمہ ہے۔

قال العلامة طاھر بن عبد الرشید البخاریؒ: وفی شرح الطحاوی رجل وطی بھیمة یعزر فان کانت البھیمة له تذبح ولا توکل، وعن عمرؓ انه امر بالبھیمة حتی احرقت بالنار۔ وفی الفتاوی الصغری فی الذی یوکل یذبح ویوکل عند ابی حنیفةؒ ولا یحرق وعند ابی یوسفؒ لا یوکل ویحرق بالنار الخ

(خلاصة الفتاوی ج۴ ص۴۴۵، ۴۴۶ کتاب الحدود، الفصل الثانی فی الزنا) [۱]

بیوی کو وطی فی الدبر کے لیے مجبور کرنے کا حکم

سوال:۔ ایک عورت کا دعویٰ ہے کہ اس کا خاوند اس کو وطی فی الدبر کے لیے مجبور کرتا ہے تو اس شخص کی سزا شرعاً کیا ہے؟ نیز اس عورت کے والدین اُسے اپنے گھر لے جانے کے حقدار ہیں یا نہیں؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ میں عورت اور اس کے اولیاء کیلئے ضروری ہے کہ وہ اپنے خاوند کو اس قبیح فعل سے روکیں ورنہ ارتکاب کی صورت میں حاکم اس کو تعزیراً سزا دے اور عادی ہونے کی صورت میں حاکم وقت اُس کو قتل بھی کرسکتا ہے۔

قال العلامة الحصکفیؒ: أو (بوطأ دبر) وقالا ان فعل فی الاجانب حد وان فی عبدہ وامته اوزوجته فلا حد اجماعاً بل یعزر قال فی الدرر الاحراق بالنار۔

(الدر المختار علیٰ ھامش رد المحتار ج۳ ص۱۵۵ باب التعزیر مطلب فیمن وطی۔۔۔) [۲]

---

[۱] قال العلامة الحصکفیؒ: (و) لا یحد بوطأ (بھیمة) بل یعزر وتذبح ثم تحرق ویکرہ الانتفاع بھا میتة ومیتة مجتبیٰ وفی النھر الظاھر انه یطالب ندباً لقولھم تضمن بالقیمة۔

(الدر المختار علیٰ ھامش رد المحتار ج۳ ص۱۵۵ مطلب فی وطی الدابة)

وَمِثْلُهٗ فی تبیین الحقائق ج۳ ص۱۸۱ باب الوطء الذی یوجب الحد والذی لا یوجبه۔

[۲] قال العلامة برھان الدین المرغینانیؒ: ومن اتی امرأة فی الموضع المکروہ اوعمل عمل قوم لوط فلا حد علیه عند ابی حنیفةؒ ویعزر وقال فی الجامع الصغیر ویودع فی السجن وقالا ھو کالزنا فیحد۔ (الھدایة ج۲ ص۵۱۶ باب الوطی الذی یوجب الحد والذی لا یوجبه)

وَمِثْلُهٗ فی الھندیة ج۲ ص۱۵۰ الباب الرابع فی الوطء الذی یوجب الحد والذی لا یوجبه۔

جادوگر کی سزا کا حکم

سوال:۔ اگر کوئی کسی پر جادو وغیرہ کرتا ہو اور اس کا یہ فعل گواہی سے ثابت ہو جائے تو شرعاً اس کو کس قسم کی سزا دی جائے گی؟

الجواب:۔ جادوگر چونکہ مفسد فی الارض ہے اس لئے اگر جادوگر جادو کرتے ہوئے پکڑا جائے اور وہ خود بھی اس کا اقرار کرلے یا گواہی سے اس کا جادو کرنا ثابت ہو جائے تو قاضی یا حاکمِ وقت اس کو قتل کرسکتا ہے تاہم اگر وہ گرفتاری سے پہلے صدقِ دل سے توبہ کرلے تو اس کی توبہ مقبول ہوگی اور اس کے بعد اُسے قتل نہیں کیا جائے گا۔

قال العلامة علاؤ الدین الطرابلسیؒ: قال فی النوازل الخناق والساحر یقتلان اذا اقرا لانهما ساعیان فی الارض بالفساد فان تابا ان کان قبل الظهور بهما قبلت توبتهما وبعد ما اخذا لا ویقتلان کما قطاع الطریق۔ (معین الحکام ص۲۲۹)[1]

فاسق سے ترکِ موالات کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دی ہیں، طلاق کے بعد علماء نے اسے بتایا کہ اب بغیر حلالۂ شرعی کے یہ عورت آپ کے لیے جائز نہیں لیکن اس کے باوجود اس نے بدستور مطلقہ کو اپنے پاس رکھا ہوا ہے، تو ایسے اعلانیہ فاسق اور فاجر کا شرعاً کیا حکم ہے؟ کیا اس کو اور اُس کے والد کو مسجد میں آنے سے منع کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اپنی مطلقہ غلیظہ بیوی کے ساتھ بغیر حلالۂ شرعی کے ازدواجی تعلقات قائم رکھنا صریح زنا ہے ایسا شخص مستحق سزا ہے مگر خود اُسے یا اس کے والد کو مسجد سے یا نماز باجماعت سے منع نہیں کیا جاسکتا، تاہم اس کے رشتہ داروں اور دیگر مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ اس کا سوشل بائیکاٹ (ترکِ موالات) کریں۔

ونهی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم المسلمین عن کلامنا الخ وامّا انا فکنت اشب القوم واجلدهم فکنت اخرج فاشهد الصلوٰة واطوف فی الاسواق ولا یکلمنی احد وآتی رسول اللہ صلی اللہ

---

[1] قال العلامة ابن عابدینؒ: قال ابو حنیفةؒ الساحر اذا اقر بسحره اُثبت یقتل ولا یستتاب منه الخ۔ (ردّ المحتار ج۳ ص۲۹۵ قوله والکافر بسبب اعتقاد السحر۔ باب المرتد)
ومثلهٗ فی تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق للزیلعیؒ ج۳ ص۲۹۲ باب المرتدین۔

علیہ وسلم فاسلم علیہ وھو فی مجلسہ بعد الصلوٰۃ الخ

(الصحیح المسلم ج ۲ ص ۳۶۱ باب حدیث توبۃ کعب بن مالکؓ) [۱]

اغلام بازی کی سزا

سوال:- جناب مفتی صاحب! اغلام بازی (مرد کا مرد سے منہ کالا کرنے) کی شرعی سزا کیا ہے؟

الجواب:- اغلام بازی ایک قبیح وخبیث فعل ہے، شریعت نے اس کے لیے کوئی باضابطہ سزا تو مقرر نہیں کی، البتہ اس قبیح فعل کی سزا کو حاکم کی صوابدید کے موافق رکھا ہے وہ چاہے تو اس فعل کے مرتکب کو جلا کر ختم کردے یا کسی بلند مقام سے اُلٹا (سر کے بل) گرا کر اوپر سے پتھر برسانے کا حکم دے یہاں تک کہ وہ مر جائے یا اس پر دیوار گرانے کا حکم دے یا سخت سزا دے کر قید کر دے یہاں تک کہ توبہ کر لے یا قید میں مر جائے۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: ولا یحد بوطء دبر وقالا ان فعل فی الاجانب حد وان فی عبدہ اوامتہ او زوجتہ فلاحد اجماعاً بل یعذر قال فی الدرر بنحو الاحراق بالنار وھدم الجدار والتنکیس من محل مرتفع باتباع الاحجار۔

(الدر المختار علیٰ ہامش رد المحتار ج ۳ ص ۱۶۱ کتاب الحدود) [۲]

مردہ عورت سے وطی کرنا موجب تعزیر ہے

سوال:- اگر کوئی شخص کسی مردہ عورت سے وطی (زنا) کرے

---

[۱] قال المفتی علاؤ الدین الطرابلسی الحنفیؒ: والتعزیر لایختص بفعل معین ولا قول معین فقد عزر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بالھجر وذلک فی حق الثلاثۃ الذین ذکرھم اللہ تعالیٰ فی القرآن العظیم فھجروا خمسین یوماً لا یکلمھم احدٌ وقصتھم مشھورۃ فی الصحاح۔ (معین الحکام ص ۲۳۱ باب التعزیر)

ومثلہٗ فی شرح الصحیح المسلم للنواوی ج ۲ ص ۳۶۳ باب حدیث توبۃ کعب بن مالک

[۲] لما قال المفتی محمد شفیعؒ: اس قبیح فعل کے لیے کسی معین حد کے مقرر کرنے میں تو فقہاء کا اختلاف ہے جس کی تفصیل کتب فقہ میں موجود ہے تاہم اس کے لیے شدید سے شدید سزائیں منقول ہیں۔ مثلاً آگ میں جلا دینا، دیوار گرا کر کچل دینا، اونچی جگہ سے پھینک کر سنگسار کر دینا، تلوار سے قتل کر دینا وغیرہ۔

(معارف القرآن ج ۲ ص ۳۴۰ سورۃ النساء)

تو کیا وہ حد کا مستحق ہے یا تعزیر کا ؟

الجواب:۔ مردہ عورت کے ساتھ زنا کرنے والے پر حد زنا لازم نہیں آتی تاہم وہ مستحق تعزیر ضرور ہے۔

وفی الھندیۃ : رجل زنی بامرأۃ میتۃ اختلفوا فیہ قال اھل المدینۃ حد وقال اھل البصرۃ یعزر ولا یحد وقال ابو اللیث رحمہ اللہ تعالیٰ وبہ ناخذ۔

(الفتاوی الھندیۃ ج ۲ ص ۱۵۰ الباب الرابع فی الوطء الذی یوجب الحد والذی لا یوجبہ)[۱]

والدین کی بے ادبی کرنے والے کی سزا

سوال :۔ ایک شخص اپنے والد سے ہمیشہ بُری طرح پیش آتا ہے اور اس کو گالیاں بھی دیتا ہے، اس کے علاوہ وہ بسا اوقات والد کو ایسی بے رحمی سے مارتا ہے کہ وہ شدید زخمی ہو جاتا ہے، ایسے شخص کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے ؟

الجواب :۔ والدین کو مارنے یا گالی گلوچ کرنے پر شرعاً کوئی حد مقرر نہیں بلکہ اس کی سزا حاکم وقت اور قاضی کی صوابدید پر ہے کہ وہ جرم کی نوعیت کے مطابق سزا تجویز کرے، اگر کوڑے مارنے کی سزا تجویز کرے تو یہ سزا انتالیس ۳۹ کوڑوں سے زیادہ اور تین ۳ سے کم نہ ہو، یا پھر اس کو جیل میں اس وقت تک ڈال دیا جائے جب تک کہ وہ اپنے جرم سے توبہ نہ کرے۔

قال العلامۃ علاؤ الدین الحصکفیؒ : ومن یتھم بالقتل والسرقۃ وضرب الناس اجسہ واخلدہ فی السجن حتی یتوب۔ (الدر المختار علی ھامش رد المحتار جلد ۳ ص ۱۸۸ مطلب فی تعزیر المتھم)[۲]

---

[۱] قال العلامۃ طاہر بن عبد الرشید البخاریؒ : وفی الفتاوی رجل زنی بامرأۃ میتۃ لا حد علیہ ولکن یعزر۔ (خلاصۃ الفتاوی ج ۴ ص ۴۴۵ کتاب الحدود۔ الفصل الثانی فی الزنا)

وَمِثْلُہٗ فی فتاوی قاضیخان ج ۴ ص ۴۰۶ کتاب الحدود۔

[۲] وفی الھندیۃ : من یتھم بالقتل والسرقۃ وضرب الناس یحبس الناس ویخلد فی السجن الی أن تظھر التوبۃ۔ (الفتاوی الھندیۃ ج ۲ ص ۱۶۹ الباب السابع فی حد القذف والتعزیر فصل فی التعزیر)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج ۶ ص ۴۲ کتاب الحدود، فصل فی التعزیر۔

نابالغ قاتل کو تعزیراً سزا دینا

سوال:۔ کیا حکومت کسی نابالغ قاتل کو تعزیر کے طور پر قتل کر سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جن جرائم عظیمہ میں حد اور قصاص عوارض خارجہ کی وجہ سے ساقط ہوں تو اس میں حسب مصلحت تعزیراً سزا دینا جائز ہے چاہے تعزیر سزائے موت تک پہنچ جائے خواہ مجرم نابالغ ہی کیوں نہ ہو۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: رأیت فی الصارم المسلول للحافظ ابن تیمیةؒ ان من اصول الحنفیة أن مالا قتل فیه عندهم مثل القتل بالمثقل والجماع فی غیر القبل اذا تکرر فللامام أن یقتل فاعله الخ ویسمونه القتل سیاسة وفیه ایضاً۔ ومن ذلك ما سیذکره المصنف من ان للامام قتل السارق سیاسة أی ان تکرر منه وفیه وان الحد لا یجب علی الصبی والتعزیر شرع علیه۔

(رد المحتار ج۳ ص۱۷۷ باب التعزیر، قوله ویکون التعزیر بالقتل)

شاگرد کو سزا اور تعزیر دینے کا حکم

سوال:۔ دینی مدارس اور سکولوں میں طلباء کو کسی شرارت پر یا سبق یاد نہ کرنے کی وجہ سے بطور تنبیہ اور تادیب کے سزا دی جاتی ہے، تو کیا استاد شاگرد کو شرعاً سزا دے سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ استاد شاگرد کو تعزیر دینے کا حق رکھتا ہے اگرچہ وہ بالغ ہی کیوں نہ ہو کیونکہ نابالغ ہونے کی صورت میں تو معلم اسکے اولیاء کی طرف سے تادیب کا مالک بنا دیا گیا ہے اور بالغ نے خود معلم کو تعزیر کا اختیار دیا، لیکن یہ احتیاط ہے کہ سزا ایسی نہ ہو کہ اس سے طالب علم بدنی یا ذہنی طور پر مفلوج ہو جائے۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: (قوله وفی القنیه الخ) وفیها عن الروضة ولو أمر غیره بضرب عبده حل للمأمور ضربه بخلاف الحر فهذا تنصیص علی عدم جواز الضرب ولد الآمر بأمره بخلاف المعلم لان المأمور یضربه نیابة عن الاب بمصلحة والمعلم یضربه بحکم الملك بتملیك ابیه بمصلحة الولد اھ وهذا اذا لم یکن الضرب فاحشاً۔ (رد المحتار جلد۳ ص۱۸۹ باب التعزیر) [1]

---

[1] قال العلامة ابن نجیمؒ: ولو أمر غیره بضرب عبده حل للمأمور ضربه بخلاف الحر قال رضی الله عنه فهذا تنصیص علی عدم جواز ضرب ولد الآمر بأمره بخلاف المعلم لان المأمور یضربه نیابة عن الاب لمصلحة والمعلم یضربه بحکم الملك بتملیك ابیه لمصلحة الولد اھ۔ (البحر الرائق ج۵ ص۴۹ فصل فی التعزیر)

بیوی کو بدفعلی کی بناء پر قتل کرنا

سوال :- اگر کسی شخص کو پختہ یقین ہو کہ اس کی بیوی بدکردار (زانیہ) ہے اور اسی وجہ سے وہ اُسے قتل کر دے تو اس شخص کا یہ انتہائی اقدام درست ہے یا نہیں ؟

الجواب :- اگر شوہر دورانِ زنا بیوی کو قتل کر دے تو مجرم نہ ہوگا، بصورتِ دیگر بیوی کو قتل کرنا قابلِ مواخذہ جرم ہے۔

وفی الهندیة : وان طاوعته المرأة حَلَّ لَهُ قتلها ایضاً کذا فی النهایة وفیها ایضاً ج۲ ص۱۶۷ ۔ قالوا الکل مسلم اقامة التعزیر حال مباشرة المعصیة واما بعد المباشرة فلیس ذٰلك لغیر الحاکم ۔ (الفتاوٰی الهندیة ج۲ ص۱۶۷ الباب السابع فی حد القذف والتعزیر، فصل فی التعزیر) [1]

جنگل سے جانور چوری ہونے کی صورت میں حد کا حکم

سوال :- ہمارے گاؤں کے قریب ایک جنگل ہے جس کو ہم بیلہ کہتے ہیں، گاؤں کے لوگ اپنے مال مویشی اس میں چرنے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں جبکہ وہ جگہ غیر محفوظ ہے، اب اگر کوئی شخص اس بیلہ سے کسی کے مویشی چرا کر لے جائے تو اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا یا نہیں ؟

الجواب :- قطع ید کی سزا کے لیے یہ ضروری ہے کہ چوری کسی ایسے مقام سے ہوئی ہو جو محفوظ ہے، اور اگر چوری کسی غیر محفوظ جگہ سے ہو جائے تو سرقہ کی شرائط پوری نہ ہونے کی وجہ سے مجرم سے حد ساقط ہو گی تاہم وہ تعزیر سے

---

[1] قال العلامة ابن نجیم المصریؒ : سئل الهندوانی عن رجل وجد رجلاً مع امرأة ایحل له قتله قال ان کان یعلم انه ینزجر بالصیاح والضرب بما دون السلاح لا وان کان یعلم انه لا ینزجر الا بالقتل حَلَّ له القتل وان طاوعته المرأة حَلَّ له قتلها ۔ ایضاً وفی المنیة رأی رجلاً مع امرأته وهو یزنی بها أو مع محرمه وهما مطاوعتان قتل الرجل والمرأة جمیعاً ۔ (البحر الرائق ج۵ ص۴۲) ایضاً قالوا الکل مسلم اقامته حال مباشرة المعصیة واما بعد الفراغ منها فلیس ذٰلك لغیر الحاکم ۔ (البحر الرائق ج۵ ص۴۲ باب حد القذف فصل فی التعزیر)
وَمِثْلُهُ فی شرح النقایة ج۲ ص۳۹۷ فصل فی التعزیر ۔

نہیں بیچ سکتا ۔

لما قال العلامۃ ابن البزازؒ: ومنها ان یکون المال الماخوذ محرزاً اما بالمکان للحفظ کالدور والدکان الخ (البزازیۃ علی ھامش الھندیۃ ج ۶ ص۴۳۱ کتاب السرقۃ) لہ

سکول، کالج میں طلباء کو جرمانے کا حکم

سوال :۔ عصرِ حاضر میں سکولوں اور کالجوں کی انتظامیہ کا ایک دستور ہے کہ جب کوئی طالب علم غیر حاضری کرتا ہے یا کسی اور جرم کا مرتکب ہوتا ہے تو اساتذہ یا ادارے کا سربراہ اس سے مالی جرمانہ وصول کرتے ہیں جو کہ اصلاً ان کے والدین سے وصول کیا جاتا ہے، تو کیا شرعاً یہ جرمانہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب :۔ طالب علم کا مدرسہ وغیرہ سے انتظامیہ کی اجازت کے بغیر کثرت سے غیر حاضر رہنا یا دیگر کسی اخلاقی جرم کا ارتکاب کرنا اگرچہ موجبِ سزا ہے مگر یہ سزا جسمانی حد تک محدود ہونی چاہیئے مالی جرمانہ شرعاً صحیح نہیں، اور دوسری بات یہ ہے کہ جرم تو طالب علم کرے اور سزا کے طور پر مالی جرمانہ اس کے والدین ادا کریں، یہ بات مناسب نہیں۔

لما قال العلامۃ اشرف علی التھانوی رحمہ اللہ: تعزیر مالی یعنی جرمانہ تو حنفیہ کے نزدیک جائز نہیں اور حدیث لا یحل مال امرئ مسلم الا بطیب نفس منہ اس کی مؤید بھی ہے، پس جرمانہ کے طور پر تو لینا درست نہ ہوگا۔ (امداد الفتاویٰ ج ۲ ص۵۴۳ کتاب الحدود، حکم جرمانہ بغیر حاضری طالب علم) ۲ـہ

لہ وفی الھندیۃ: وھی فی الشرع اخذ العاقل البالغ نصابا محرزا ...... علی وجہ الخفیۃ۔ (الفتاویٰ الھندیۃ ج ۲ ص۱۷۰ کتاب السرقۃ)

وَمِثْلُہٗ فی الھدایۃ ج ۲ ص۲۳۱ کتاب السرقۃ۔

۲ـہ قال المفتی محمود الحسنؒ: (الجواب) مالی جرمانہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جائز نہیں منسوخ ہے اگر لیا گیا ہو تو اسکی واپسی لازم ہے ۔ (فتاویٰ محمودیہ ج ۵ ص۱۸۴ کتاب الحدود)

وَمِثْلُہٗ فی کفایت المفتی ج ۲ ص۱۶۵ کتاب الحدود۔

فصل کو نقصان پہنچانے پر جرمانہ کا حکم

سوال:۔ اگر کسی کا جانور دوسرے کے کھیت میں چلا جائے اور فصل کو نقصان پہنچائے تو شرعاً جانور کے مالک کو کیا سزا دی جاسکتی ہے؟

الجواب:۔ اگر جانور کے ساتھ مالک خود موجود ہو اور اس کی موجودگی میں وہ جانور دوسرے کے کھیت میں جاکر فصل کا نقصان کرے تو شرعاً صرف نقصان کے مطابق رقم وصول کرنا درست ہے اس سے زیادہ لینا جائز نہیں۔ تاہم اگر جانور کے ساتھ کوئی بھی نہ ہو اور وہ فصل کا نقصان کرے تو اس صورت میں جرمانہ لینا ناجائز ہے۔

لما قال الشیخ اشرف علی تھانویؒ: (الجواب) اگر جانور کے ساتھ کوئی نہ ہو اس صورت میں تو یہ جرمانہ ناجائز ہے اور اگر کوئی ساتھ ہو تو جتنا نقصان ہوا ہے اتنا وصول کرنا درست ہے مگر وہ کھیت والے کا حق ہے۔

(امداد الفتاویٰ ج۲ ص۵۴۳ کتاب الحدود) [1]

حفاظت کی نیت سے مال اٹھانے پر سزا کا حکم

سوال:۔ ایک آدمی نے دوسرے پر مال چوری کرنے کا دعویٰ کیا مگر مدعیٰ علیہ (جس پر چوری کا دعویٰ کیا گیا ہے) کہتا ہے کہ میں نے اس شخص کا مال چوری کی نیت سے نہیں بلکہ حفاظت کی نیت سے اٹھایا ہے اور میں نے اس شخص کو اطلاع بھی دی ہے، تو کیا اس شخص پر چوری کی سزا نافذ ہوگی یا نہیں؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص پر چوری کا دعویٰ کیا گیا ہے اس نے وہ مال کسی غیر محفوظ مقام سے اٹھایا ہے جس کی موصوف نے مال کے مالک کو اطلاع

---

[1] قال العلامة قاضی خان رحمہ اللہ: ولو انه قال لصاحب الدابة ان دابتك فی الزرع ولم يقل اخرجها فاخرجها صاحبها فافسدت شيئاً فی اخراجها كان ضامناً.....

ولو ان دابة رجل انفلتت ليلاً او نهاراً من غير ارسال فافسدت زرع انسان لا يجب الضمان علیٰ صاحبها لان فعل العجماء هدر۔

(الخانية علیٰ هامش الهندية ج۳ ص۴۵۷ باب جناية البهائم)

وَمِثْلُهٗ فی شرح المجلة ج۱ ص۲۵۹ کتاب الجناية۔

بھی دی ہے اور دوسری طرف ملزم مال کو بطور امانت لینے کا بھی مدعی ہے، اس لیے ان حالات کے پیشِ نظر ملزم کو چوری کی سزا نہیں دی جائے گی (یعنی اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا) تاہم اگر مدعی گواہانِ شرعی سے اس بات کو ثابت کر دے کہ یہ مال محفوظ مقام میں تھا تو پھر اس صورت میں اثباتِ جرم کے تحت مجرم کو چوری کی سزا دی جائے گی۔

قال العلامة الحصکفیؒ : ویقطع لو سرق من السطح نصاباً لانه حرز شرح وهبانیه او من المسجد اراد به کل مکان لیس بحرز فعم الطریق والصحراء و رب المتاع عنده ای بحیث یراه ولو الحافظ نائماً فی الاصح۔

(الدر المختار علی هامش رد المحتار ج ۳ ص ۲۲۲ کتاب السرقة)[۱]

جیوان سے بدفعلی کی سزا

سوال:۔ اگر کوئی شخص کسی حیوان سے بدفعلی کرتے پکڑا جائے اور اس کے اس فعلِ بد پر گواہ بھی موجود ہوں تو شریعتِ مقدسہ میں ایسے شخص کی کیا سزا ہے؟

الجواب:۔ کسی حیوان سے بدفعلی کرنا اگرچہ شرعاً حرام اور غیر فطری فعل ہے لیکن شریعتِ مقدسہ میں ایسے شخص کے لیے کوئی مقررشدہ سزا نہیں ہے البتہ اس فعلِ بد کے مرتکب شخص کو تعزیراً سزا دی جاسکتی ہے جو حاکمِ وقت یا قاضی کی صوابدید پر منحصر ہے وہ جتنی مناسب سمجھے ایسے مجرم کو سزا دے سکتا ہے۔

قال العلامة ابن عابدین رحمه الله : تحت قوله (ولا عند وطء بهيمة) وفی القنیة مر فی اجناس الناطفی فرج البهيمة کفیها لا غسل فیه بغیر انزال ویعزر وتذبح البهيمة وتحرق علی وجه الاستحباب

---

[۱] قال العلامة وهبة الزحیلی : الاصل فی اشتراط هذا الشرط المتفق علیه قوله علیه السلام "لا قطع فی ثمرة ولا کثر حتی یؤویه الجرین فاذا اواه الجرین ففیه القطع" وفی روایة فاذا اواه المراح او الجرین والحرز لغة : الموضع الذی یحرز فیه الشیء وشرعاً هو ما نصب عادةً لحفظ اموال الناس کالدار والحانوت والخیمة والشخص الخ۔ (الفقه الاسلامی وادلته ج ۶ ص ۱۰۷ الفصل الثالث فی حد السرقة)

ولا یحرم اکل لحمها به ۔ (رد المحتار ج ۱ ص۱۲۲ باب الغسل) لـه

بجلی چوری کرنے پر سزا

سوال:۔ اگر کوئی شخص بجلی چوری کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا جائے اور گواہان کے ذریعہ جرم ثابت ہو جائے تو کیا اس شخص کا ہاتھ کاٹا جائے گا یا نہیں ؟

الجواب:۔ کسی جرم کی سزا کے لیے یہ ضروری ہے کہ اسکی جملہ شرائط پوری کی پوری پائی جائیں، اگر ان میں سے کوئی شرط بھی مفقود ہو تو سزا جاری نہیں ہوگی ۔ چوری کی سزا کے معاملہ میں یہ ضروری ہے کہ مال محفوظ جگہ سے اٹھایا جائے تب سزا نافذ ہوگی ورنہ نہیں۔ صورت مسئولہ میں چونکہ بجلی مال ہونے کے باوجود غیر محفوظ ہے اسلئے حد نافذ نہ ہوگی تاہم تعزیراً سزا ضرور ملنی چاہیئے ۔

قال العلامة الحصکفیؒ : ویقطع لو سرق من السطح نصاباً لانه حرز شرح وهبانیة او من المسجد اراد به کل مکان لیس بحرز فعم الطریق والصحراء ورب المتاع عنده ای بحیث یراه ولو الحافظ نائماً فی الاصح ۔ (الدر المختار علیٰ هامش رد المحتار ج ۳ ص۲۲۲ کتاب السرقة) ۲ـه

لـه قال الشیخ علامة شمس الحق افغانی رحمه الله : واطئ البهیمة یعزر فان کانت البهیمة للواطی ففی شرح الطحاوی وحدود الاصل تذبح ولا تؤکل ۔ وفی فتاوی الصغریٰ انها تؤکل وافتی ابو سعید بهٰذا وقال صدر الشهید الاعتماد علیٰ روایة شرح الطحاوی ۔ (معین القضاة والمفتیین ص۹۴ مادة ۵۴۴)

وَمِثْلُهٗ فی الفقه الاسلامی وادلته ج ۶ ص۶۶ کتاب الحدود ۔

۲ـه قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ : ومنها ان یکون الماخوذ منه محرزاً وانما یصیر المکان حرزاً باحد الامرین اما ان یکون مُعدّاً لحفظ الاموال کالدور والدکاکین والخانات والاخبیة والفساطیط او بالحافظ حتی لو سرق شیئاً من الصحراء وله حافظ بات سرق شیئاً من تحت رأسه وهو نائم فی الصحراء او فی المسجد یقطع ولو کان المال موضوعا بین یدیه اختلف المشائخ. قال الامام سرخسیؒ انهٗ محرز ۔ (خلاصة الفتاوی ج ۴ ص۳۴۷ کتاب السرقة)

وَمِثْلُهٗ فی الفتاوی التاتارخانیة ج ۵ ص۱۶۸ کتاب السرقة ۔

بیماری کی حالت میں حد جاری کرنے کا حکم

سوال:۔ اگر کسی شخص پر زنا کا جرم بطریقۂ شرعی ثابت ہو جائے اور وہ دل کا مریض بھی ہو، اب اگر اس پر حد جاری کی جائے تو وہ ہلاک ہو جائے گا، تو اس صورت میں شرعاً کیا کیا جائے، حد جاری کی جائے گی یا نہیں؟

الجواب: اگر حدود کا مجرم کسی ایسی خطرناک بیماری میں مبتلا ہو کہ حد جاری کرنے کی صورت میں اس کے ہلاک ہونے کا خطرہ ہو تو مرض کے ختم ہونے تک حد کو موقوف کر کے مجرم کو جیل ہی میں رکھا جائے گا۔

قال العلامة الحصکفیؒ: تقطع یمین السارق من زنده وتحسم الا فی حر وبرد شدیدین فلا تقطع لان الحد زاجر لا متلف ویحبس لیتوسط الامر۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: (قوله الا فی حر وبرد شدیدین) والا فی حال مرض مفتاح وتیره فی البنایة بالمرض الشدید افاده عن الحموی۔

[رد المحتار ج ۳ ص۲۲۶ کتاب السرقة باب کیفیة القطع واثباته][1]

---

[1] قال العلامة عالم بن العلاء الانصاریؒ: وشرط اصحابنا لقطع الید الیمنی ان تکون الید الیسریٰ والرجل الیمنی صحیحتین حتیٰ انه اذا کانت یده الیسریٰ بحیث لا ینتفع بها لا تقطع یده الیمنی وکذلک اذا کانت الید الیسریٰ صحیحة الا ان الرجل الیمنی مقطوعة او هی شلاء او بها عرج یمنع المشی علیها تقطع الیمنی۔

[الفتاوی التاتارخانیة ج ۵ ص۱۱ کتاب السرقة الفصل الاول فی بیانها]

وَمِثْلُهٗ فی فتح القدیر ج ص۱۵۶ کتاب السرقة، فصل فی کیفیة قطع واثباته۔

زنا بالرضا اور زنا بالجبر میں تفریق کی تحقیق

سوال :- کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زنا جو حرام قطعی ہے، اس کی قطعی حرمت کے پیشِ نظر صوبائی اسمبلی میں بعض اسلام پسند ممبروں نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ چونکہ ہمارا یہ ملک ایک اسلامی ملک ہے اس لیے شادی شدہ مرد اور عورت دونوں کو قرآنی ہدایت کے مطابق زنا کی پاداش میں سنگسار کرنا چاہیئے اور غیر شادی شدہ زانی مرد و عورت کو سَو سَو دُروں کی سزا دینی چاہیئے اور دونوں قسم کے مجرمین کو سزا دینے میں نرمی یا رعایت سے کام نہیں لینا چاہیئے ۔ مگر بجائے اس کے کہ یہ جائز اور اسلامی مطالبہ منظور کیا جاتا حکومت کی اکثریتی پارٹی نے زنا کو دو حصوں (زنا بالرضا اور زنا بالجبر) میں تقسیم کرکے زنا بالرضا کو جائز قرار دیا۔ اب غور طلب بات یہ ہے کہ ایک طرف تو حکومتی سطح پر قرآنِ کریم کی نصوصِ قطعیہ کی صریح خلاف ورزی کرکے ایک حرام فعل کو قانون کی مدد سے جائز قرار دیا گیا، اور دوسری طرف اسلام کے عمومی حکمِ حرمت سے زنا بالرضا کو مستثنیٰ کرکے زنا بالاختیار اور زنا بالجبر کے درمیان حکم کے لحاظ سے تفریق کر دی گئی ہے۔ تو کیا شرعی طور پر طے شدہ ایک حرام فعل کو جائز کرنے کا اختیار کسی شخص یا ادارہ کو حاصل ہو سکتا ہے؟ اگر نہیں تو اسلامی شریعت کی رُو سے اس کا کیا حکم ہے؟ اور کیا زنا کے بارے میں قرآنِ کریم کی مقرر کردہ سزاؤں سے زنا بالرضا مستثنیٰ ہو سکتا ہے؟ اس مسئلہ کو قرآن و حدیث اور فقہاءِ امت کے فیصلوں کی روشنی میں واضح فرمائیں؟

الجواب :- سوال کے مضمون پر غور کرنے سے حسبِ ذیل تین امور پر روشنی پڑتی ہے :

(۱) قانونی سزا کے بارے میں اسلامی شریعت زنا بالرضا اور زنا بالجبر کے درمیان تفریق کی قائل ہے؟

(۲) اگر قائل نہیں تو پھر کیا کسی با اختیار ادارہ اور برسرِ اقتدار جماعت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ شریعت کی قانونی سزاؤں سے زنا بالاختیار کو مستثنیٰ کر سکے؟

(۳) حرام قطعی کو جائز کرنے اور حلال سمجھنے والا آدمی مسلمان رہ سکتا ہے یا نہیں؟

ذیل کی سطور میں تینوں اجزاء کے احکام کتاب اللہ، سنتِ رسولؐ اور فقہاءِ اسلام کے قطعی فیصلوں کی روشنی میں پیش کیے جاتے ہیں :-

(جواب جزء ۱) زنا کے لیے اسلامی شریعت میں جو سزا مقرر کی گئی ہے اس میں شریعت نے زنا کی دونوں قسموں کے مابین فرق اور امتیاز کو ملحوظ نہیں رکھا ہے نہ وہ اس طرح کی کسی

تفریق کی قائل ہے۔ اسی طرح کتاب و سنت کے واضح احکام کی روشنی میں فقہاء اسلام بھی اس بات پر متفق ہیں کہ زنا کی دونوں قسموں میں زنا کرنے والے مرد پر قانونی سزا نافذ کی جائے گی، البتہ عورت زنا بالجبر کی صورت میں قانونی سزا سے مستثنیٰ ہوگی اگرچہ اختیاری زنا کی صورت میں وہ بھی مرد کی طرح سزا کی مستحق رہے گی اور مرد کی طرح اس پر بھی حد شرعی قائم ہوگی۔ ذیل میں مذکورہ بالا دعویٰ کا تفصیلی ثبوت قرآن و حدیث اور فقہاء اسلام کے فیصلوں کی روشنی میں پیش کیا جاتا ہے۔

زنا قرآن کی نظر میں قرآنِ کریم نے زنا کے لیے جو قانونی سزائیں تجویز کی ہیں ان میں کہیں بھی یہ ذکر نہیں ہے کہ یہ سزائیں جبری زنا کے لیے ہیں اور اختیاری زنا میں ان کا نفاذ نہیں کیا جائے گا بلکہ قرآنِ کریم میں جہاں بھی یہ سزائیں بیان کی گئی ہیں وہاں مطلق زنا کا ذکر کیا گیا ہے اور زنا بالجبر کا نام تک نہیں لیا گیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ زنا خواہ بالجبر ہو یا بالرضا قرآنی قانون کی نظر میں یکساں طور پر جرم ہیں، اور دونوں قسم کے زنا میں یہ قانونی سزائیں نافذ کی جائیں گی۔ اختیاری اور جبری زنا کا یہ فرق اگر مغربی اور عیسائی شریعت میں ہو تو ہو مگر اسلامی شریعت اس فرق سے قطعی طور پر نا آشنا اور یقینی طور پر نا بلد ہے اب ذیل میں وہ قرآنی آیات پیش کی جاتی ہیں جن میں زنا کے لیے قانونی احکام بیان کئے گئے ہیں:۔

زنا ایک قبیح فعل ہے وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَا إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَسَاءَ سَبِيلًا ○ (بنی اسرائیل)۔ "زنا کے قریب بھی نہ جاؤ کہ یہ ایک قبیح فعل اور برا راستہ ہے"۔

اس آیت میں مطلق زنا کا ذکر کیا گیا ہے، خاص زنا بالرضاء یا زنا بالجبر کا کوئی ذکر موجود نہیں ہے بلکہ مطلق زنا کو فاحشہ (قبیح فعل) کہہ کر مسلمانوں کو اس کے قریب جانے سے روکا گیا ہے جس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی نظر میں مطلق زنا فاحشہ اور قبیح فعل ہے اور معاشرے کو اس سے پاک رکھنا انتہائی ضروری ہے ـــــ اس بارے میں جو لوگ اس قسم کے قبیح افعال کو معاشرے میں فروغ دینے کے خواہشمند ہوتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ یہ بے حیائی لوگوں میں پھیل جائے قرآنِ کریم نے صریح لفظوں میں یہ اعلان کیا ہے کہ:۔

إِنَّ الَّذِينَ يُحِبُّونَ أَنْ تَشِيعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِينَ آمَنُوا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ○ (النور ع۱۹) "جو لوگ مسلمانوں اور مسلم معاشرے میں بیحیائی اور قبیح افعال کو فروغ دے کر پھیلانا چاہتے ہیں ان کے لیے دردناک عذاب ہے دنیا اور آخرت میں اور اللہ ہی

خوب جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ہو۔

ان دونوں آیتوں سے یہ معلوم ہوا کہ مسلمان کی یہ شان نہیں کہ وہ خود زنا جیسے قبیح فعل میں اپنے آپ کو ملوث کرے یا دوسرے مسلمانوں میں اس بے حیائی کے پھیلنے کی ادنیٰ سے ادنیٰ خواہش ظاہر کرے۔

زنا کے چور دروازے اسلام نے مسلم معاشرے میں زنا اور حرام کاری کے مکمل انسداد کے لیے یہاں تک انتظام کیا ہے کہ جو امور اس قبیح فعل کے لیے مبادی اور ذرائع کی حیثیت رکھتے ہیں اور جو اس کے لیے بمنزلہ چور دروازہ کے ہیں قرآن کریم نے قفل لگا کر ان کو ہمیشہ کے لیے بند کر دیا ہے اور صریح طور پر انہیں ممنوع قرار دیا ہے۔ چنانچہ "سداً للباب" اس نے مردوں اور عورتوں دونوں پر ایسی پابندیاں عائد کر دی ہیں کہ جن پر عمل کرنے سے مسلم معاشرے میں زنا وقوع پذیر ہو ہی نہیں سکتا۔ اس سلسلہ میں قرآن کریم نے سب سے پہلے عورتوں پر یہ پابندی عائد کی ہے کہ وہ اجنبی اور غیر محرم مردوں کے سامنے بے پردہ ہو کر نہ آئیں اور نہ ہی دورِ جاہلیت کے "تبرج" کی نقالی کرتی پھریں، ارشادِ قرآنی ہے:۔

وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى وَاَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَاٰتِيْنَ الزَّكٰوةَ وَاَطِعْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ (الاحزاب ۳۳) "یعنی اپنے گھروں میں عزت اور وقار کے ساتھ رہو اور دورِ جاہلیت کے تبرج کی نقالی نہ کرتی پھرو، نمازیں قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو اور اللہ و رسول کی فرمانبردار رہو۔"

لیکن بعض اوقات گھروں سے نکلنے کی بھی ضرورت پیش آتی رہتی ہے تو اس کے لیے یہ حکم دیا گیا ہے کہ بے پردہ ہو کر نہ نکلیں بلکہ بڑی بڑی چادریں وغیرہ اپنے اوپر ڈال کر رکھیں تاکہ ایک طرف آپ کی زینت اور حسن و جمال دوسروں کے لیے باعثِ فتنہ نہ بنے اور دوسری طرف آپ کے متعلق یہ معلوم کیا جا سکے کہ یہ شریف اور باحیاء عورتیں ہیں جو شریف اور معزز گھرانوں سے تعلق رکھتی ہیں، تو بد طینت لوگ آپ سے چھیڑ چھاڑ کرنے کی جرأت نہ کر سکیں گے اور نہ کوئی بدقماش آپ کو اذیت پہنچا سکے گا۔ ارشادِ قرآنی ہے:۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ۭ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ۭ (الاحزاب ۵۹) "اے پیغمبر حکم دیجیے اپنی بیویوں اور بیٹیوں کو، اور مسلمانوں کی تمام عورتوں کو کہ گھروں سے نکلنے وقت اپنے

اوپر بڑی بڑی چادریں وغیرہ ڈال کر نکلیں اس سے بآسانی ان کی پہچان ہوسکے گی اور انہیں کوئی اذیت نہیں پہنچائی جائے گی۔"

ایک دوسرے مقام پر پوری سوسائٹی کو جس میں مرد اور عورت سبھی شامل ہیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ حجاب شرعی کے بغیر ایک دوسرے سے آزادانہ اختلاط نہ کرو، نہ ایک دوسرے کو شہوت کی نگاہ سے دیکھو بلکہ دونوں فریق "غضِ بصر" پر عمل کرتے رہو، اس سے آپ کی عفت محفوظ رہ سکتی ہے، اور زنا جیسے قبیح فعل میں ملوث ہونے سے بھی آپ بچ سکتے ہیں ارشاد قرآنی ہے:۔

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَ يَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ....وَ قُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ - (سورۃ النور ۳۰، ۳۱) "اور مومن مردوں کو بھی یہ حکم کیجئے اور عورتوں کو بھی کہ وہ اپنی اپنی نگاہوں کو نیچے رکھ کر شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور بجز اپنے شوہروں اور محارم کے عورتیں اپنی زینت کو دوسروں کے سامنے نہ کھولیں۔"

اس آیتِ مبارکہ میں مردوں اور عورتوں دونوں کو یہ حکم کیا گیا ہے کہ ایک دوسرے کو شہوت کی نگاہ سے ہرگز نہ دیکھیں، اور زنا سے اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں لیکن "غضِ بصر" پر "حفاظت" کو مقدم کرکے اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ایک دوسرے کو شہوت کی نگاہ سے دیکھنا زنا جیسے قبیح فعل میں ملوث ہونے کا قوی ذریعہ ہے لہٰذا ایک دوسرے کو دیکھا بھی نہ جائے تاکہ زنا میں ملوث ہونے کی نوبت ہی پیش نہ آئے۔ اور یہ ہر شخص جانتا ہے کہ یہ تمام کاروائیاں انسداد زنا کے لیے تدابیر کی حیثیت رکھتی ہیں، اب اگر اسلام کی نظر میں صرف زنا بالجبر ہی ممنوع ہوتا اور اختیاری زنا ممنوع نہ ہوتا تو "غضِ بصر" کا حکم صرف مردوں ہی کو دیا جاتا تاکہ ان کے دلوں میں نظرِ شہوت سے، اجنبی عورتوں کی طرف ناجائز میلان پیدا ہوکر کسی وقت ان سے جبراً زنا کے مرتکب نہ ہوں عورتیں ہرگز اس حکم کے تحت نہ آجاتیں، کیونکہ ان کی طرف سے جبر بالزنا کا سرے سے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ آیت ہذا میں فریقین یعنی مرد و عورت دونوں کو یکساں طور پر "غضِ بصر" کا حکم دیا گیا ہے، اس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی نظر میں زنا بالاختیار بھی اسی طرح ایک سنگین جرم ہے جس طرح زنا بالجبر سنگین جرم ہے اور چونکہ وہ مرد و عورت دونوں کی باہمی نظر بازی سے

پیدا ہوتا ہے اس لیے دونوں کو "غضِ بصر" کا حکم دے کر زنا بالاختیار کے اس چور دروازے کو ہمیشہ کے لیے بند کر دیا گیا۔

قانونی سزائیں قرآن کریم میں زنا کے لیے جو قانونی سزائیں بیان کی گئی ہیں ان میں بھی زنا بالاختیار اور زنا بالجبر کے درمیان کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا، بلکہ غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سزائیں دونوں قسم کے زنا کے لیے مقرر کی گئی ہیں اور زنا بالاختیار ان سے مستثنیٰ نہیں ہے، ارشادِ ربانی ہے:۔

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۖ وَلَا تَأْخُذْكُم بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۖ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَائِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ ۝ (النور ع ۱) "بدکاری کرنے والی عورت اور مرد دونوں میں سے ہر ایک کو مارو سو سو دُرّے اور نہ آوے تم کو ان پر ترس اللہ کے حکم کے نافذ کرنے میں اگر تم یقین رکھتے ہو خدا پر اور پچھلے دن پر، اور دیکھیں ان کی یہ سزا کچھ لوگ مسلمانوں میں سے"۔

اس آیت میں کوڑوں کی جو سزا بیان کی گئی ہے آپ دیکھتے ہیں کہ وہ زانی مرد اور زانیہ عورت دونوں کے لیے بیان کی گئی ہے بلکہ زانیہ عورت کو زانی مرد پر مقدم کر کے اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ عورت اس سزا کی زیادہ مستحق ہے، حالانکہ زنا بالجبر کی صورت میں پوری ملت اس پر متفق ہے کہ عورت نہ سزا کی مستحق ہے اور نہ اس پر کسی قسم کی حد جاری کی جا سکتی ہے بلکہ اس میں سزا کا مستحق صرف (زانی) مرد ہو گا اور اُسی پر کوڑوں یا رجم کی سزا نافذ کی جائے گی۔ پس معلوم ہوا کہ اس آیت میں جو سزا بیان کی گئی ہے وہ اختیاری زنا کی سزا ہے نہ کہ جبری زنا کی، لیکن الفاظ کے عموم میں چونکہ دونوں قسم کے زنا داخل ہیں اس لیے مرد کی سزا تو دونوں قسم کے زنا میں بحال رہے گی، اور عورت جبری زنا میں چونکہ مجرم نہیں ہوتی اس لیے وہ اس صورت میں سزا کی بھی مستحق نہ ہو گی۔ چنانچہ روایات میں آگے اس کی تصریح آتی ہے۔ اب قرآن کریم کی اس تصریح اور واضح فیصلے کے بعد بھی اگر کوئی شخص یا ادارہ اس حکم سے زنا بالاختیار کو مستثنیٰ قرار دیتا ہے تو اُس کے متعلق بجز اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ وہ دیدہ دانستہ یا نادانستہ طور پر قرآن کریم کے صریح فیصلے میں تحریف کرنا چاہتا ہے۔

عہدِ نبوّت میں یہ قانونی سزائیں زنا کے بارے میں قرآن کریم کے بعد جب ہم حدیثِ رسولؐ کی طرف رجوع کرتے ہیں تو وہاں بھی صاف طور پر عہدِ نبویؐ کے ایسے صریح فیصلے ملتے ہیں جن میں زنا بالاختیار کی صورت میں مرد اور عورت دونوں پر یہ قانونی سزائیں جاری کی گئی ہیں۔ اور اس بات کے لیے عہدِ نبویؐ میں کوئی ایک مثال بھی ایسی پیش نہیں کی جاسکتی ہے جس سے یہ معلوم ہوسکے کہ کبھی زنا بالاختیار کی صورت میں ثبوتِ جرم کے بعد مرد یا عورت پر قانونی سزا نافذ نہ کی گئی ہو، بلکہ عہدِ نبوت کی پوری تاریخ گواہ ہے کہ زنا بالاختیار میں زانیہ عورت اور زانی مرد دونوں پر کوڑوں کی سزا بھی اعلانیہ طور پر جاری کی گئی ہے اور سنگساری کی سزا بھی۔

رجم کی سزا چنانچہ مشہور صحابی حضرت ماعزؓ کو زنا کے جرم میں سنگسار کیا گیا حالانکہ وہ زنا اختیاری تھا نہ کہ جبری۔ حضرت ماعزؓ کی سنگساری کے ہولناک واقعہ کے بعد حضرت غامدیہؓ کو بھی حضرت ماعزؓ کی طرح سنگسار کیا گیا تھا، حالانکہ حضرت غامدیہؓ کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان کے ساتھ کسی نے جبراً زنا کیا تھا ورنہ انہیں ہرگز سنگسار نہ کیا جاتا بلکہ اس شخص کو سنگسار کیا جاتا جس نے اُن سے زنا بالجبر کیا تھا۔ کیونکہ زنا بالجبر کی صورت میں عورت قانون کی نظر میں مجرم نہیں ہے نہ وہ سزا کی مستحق ہے۔

کوڑوں کی سزا اس کے علاوہ کوڑوں کی سزائیں بھی عہدِ نبوت میں مردوں اور عورتوں دونوں کو یکساں طور پر دی گئی ہیں، حالانکہ عورت پر جبری زنا کی صورت میں کوڑوں کی سزا بھی جاری نہیں کی جاسکتی۔ ذیل میں ایک دو واقعات ایسے ذکر کیے جاتے ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں اختیاری زنا میں مرد و عورت دونوں پر یہ قانونی سزائیں جاری کی گئی ہیں۔

زنا کا جُرم قابلِ راضی نامہ نہیں ہے عن ابی ہریرۃؓ ان رجلین اختصما الی النبیؐ فقال احدھما ان ابنی کان علی ھذا فزنی بامرأتہ فاخبرونی ان علی ابنی الرجم فافتدیت منہ بمائۃ شاۃ وبجاریۃ لی ثم انی سئالت اھل العلم فاخبرونی ان علی ابنی جلد مائۃ وانما الرجم علی امرأتہ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اما والذی نفسی بیدہ لاقضین بینکما بکتاب اللہ تعالی اما غنمک وجاریتک فرد علیک وجلد ابنہ مائۃ وامر انیس الاسلمیؐ ان یأتی امرأۃ الا

فان اعترفت فارجمها فاعترفت فرجمها - (ابو داؤد ج ۲ صلا۱) "حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ دو آدمی اپنا ایک مقدمہ لے کر حضور اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے، ان میں سے ایک نے کہا کہ میرا بیٹا اس شخص کے پاس مزدوری کرتا تھا پس اس نے اس کی بیوی سے زنا کیا، لوگوں نے مجھے بتایا کہ آپ کے بیٹے کی سزا سنگساری ہے، میں نے اس کے بدلے میں اس شخص کو سو بکریاں اور ایک جاریہ دے دی، پھر میں نے اہلِ علم سے پوچھا تو انہوں نے مجھے بتایا کہ تمہارے بیٹے کی سزا سو کوڑے ہے اور سنگساری اس شخص کی بیوی کی سزا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اس خدا کی قسم! جس کے قبضہ میں میری جان ہے میں آپ دونوں کے درمیان اللہ کی کتاب کے موافق فیصلہ کروں گا اور وہ یہ ہے کہ تمہاری بکریاں اور جاریہ تمہیں واپس کی جائیں گی اور سزا کے طور پر تیرے بیٹے کو سنو درّے لگیں گے۔ اور انیس اسلمیؓ کو آپؐ نے فرمایا کہ جاؤ اس کی بیوی کے پاس اور معاملہ کی تحقیق کرو، اگر اس نے زنا کا اقرار کر لیا تو اس کو رجم کرو، چنانچہ اس نے اعترافِ جرم کر لیا اور رجم کی سزا اس پر جاری کی گئی۔

اس حدیث میں زنا کا جو واقعہ بیان کیا گیا ہے اس کے متعلق یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ جبری زنا کا واقعہ تھا کیونکہ یہ گھر کے ایک مزدور کا گھر کی مالکہ کے ساتھ زنا کا واقعہ ہے اور اس میں جبر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آخر اس مزدور کی کیا مجال تھی کہ وہ گھر کی مالکہ کے ساتھ جبراً زنا کرے۔ اس کے علاوہ اگر یہ زنا جبری ہوتا تو عورت پر رجم اور سنگساری کی سزا جاری نہ کی جاتی، کیونکہ جبری زنا میں عورت سرے سے مجرم ہی نہیں تو اس پر سزا جاری کرنے کے کیا معنیٰ؟ اور سزا بھی وہ جو سخت ترین سزا ہے؟ کیا یہ انصاف ہے کہ عورت باوجود مجبور ہونے کے سنگساری جیسی سنگین سزا جاری کی جائے اور مرد باوجود مجرم ہونے کے کوڑوں کی سزا کا مستحق گردانا جائے حاشا وکلا۔

تو معلوم ہوا کہ یہ زنا اختیاری تھا نہ کہ جبری، نیز اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جرم زنا اسلامی شریعت میں قابلِ راضی نامہ نہیں ہے، ورنہ اگر یہ جرم قابلِ راضی نامہ ہوتا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس واقعہ میں متاثرہ فریقین میں ہونے والے راضی نامہ کو ناقابلِ اعتبار قرار دے کر فسخ نہ فرماتے اور اس کے ہوتے ہوئے زانیہ عورت اور زانی مرد پر سزا جاری نہ فرماتے۔

ایک اور واقعہ عن ابن عمرؓ انہ، قال ان الیھود جاء والی رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم فذکروا لہٗ ان رجلاً منھم وامرأۃ زنیا فقال لھم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما تجدون فی التوراۃ فی شان الزنا فقالوا نفضحھم ویجلدون فقال عبد اللہ بن سلامؓ کذبتم ان فیھا الرجم فأتوا بالتوراۃ فنشروھا فجعل احدھم یدہٗ علیٰ اٰیۃ الرجم ثم جعل یقرأ ما قبلھا وما بعدھا۔ فقال لہٗ عبد اللہ ابن سلام ارفع یدک فرفعھا فاذا فیھا اٰیۃ الرجم فقالوا صدق یا محمد فیھا اٰیۃ الرجم فامر بھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرجما۔ قال عبد اللہ بن عمرؓ فرأیت الرجل یحنی علیٰ امرأۃ یقیھا الحجارۃ انتھیٰ (سنن ابی داؤد جلد ۲ ص ۲۶۱)

(ترجمہ) حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ یہود نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر یہ واقعہ بیان کیا کہ ہم میں سے ایک مرد اور ایک عورت نے زنا کیا ہے، آپؐ نے فرمایا کہ زنا کے بارے میں تمہاری تورات میں کیا حکم ہے؟ انہوں نے کہا کہ ہم زنا کرنے والوں کو ذلیل و رسوا کرتے ہیں اور ان پر کوڑے بھی لگائے جاتے ہیں، عبد اللہ بن سلامؓ نے کہا تم جھوٹ بولتے ہو، تورات میں تو زنا کی سزا رجم ہے، انہوں نے تورات کو لاکر کھولا تو ان میں سے ہی ایک شخص نے آیتِ رجم پر ہاتھ رکھ کر آگے پیچھے کی آیتیں پڑھنا شروع کر دیں تو عبد اللہ بن سلامؓ نے کہا کہ ہاتھ اٹھاؤ اس نے جب ہاتھ اٹھایا تو نیچے آیتِ رجم موجود تھی، اس پر انہوں نے کہا کہ عبد اللہ واقعی تم سچے ہو تورات میں آیتِ رجم موجود ہے۔ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے (زانی اور مزنیہ) کے بارہ میں رجم کا حکم فرمایا اور وہ دونوں سنگسار کر دیئے گئے۔ حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں میں نے دیکھا کہ وہ مرد عورت پر جھکتے ہوئے پتھروں سے اس کو بچا رہا تھا۔"

اس حدیث میں یہودیوں کے جس سنگسار شدہ مرد اور عورت کا ذکر کیا گیا ہے اُن کی باہمی محبت کا یہ عالم تھا کہ عین سنگساری کے دوران بھی زانی مرد زانیہ عورت پر جھک کر آخر دم تک پتھروں سے اُسے بچانے کی کوشش کرتا رہا، کیا کوئی ذی ہوش انسان یہ خیال تک دل میں لا سکتا ہے کہ یہاں مرد نے عورت کے ساتھ جو زنا کیا تھا وہ اختیاری نہیں بلکہ زنا بالجبر تھا؟ حالانکہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ زنا بالجبر کی صورت میں عورت قانون کی نظر میں اصلاً مجرم نہیں نہ وہ سزا کی مستحق ہے، پھر اس پر سنگساری جیسی سنگین سزا جاری کر کے یہ دوہرا ظلم کیوں کیا گیا؟

زنا بالجبر کی صورت میں عورت قانون کی نظر میں مجرم نہیں ہے

ذیل میں ہم ایک حدیث پیش کرتے ہیں جس سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ زنا بالجبر کی

صورت میں عورت قانون کی نظر میں مجرم نہیں ہے نہ اس پر زنا کی حد جاری کی جاسکتی ہے۔

عن وائل ابن حجر قال استکرھت امرأۃ علی عھد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فدرأ عنھا الحد واقامہ علی الذی اصابھا۔ (جامع الترمذی بحوالہ مشکوٰۃ ج۲ ص ـــ)

(ترجمہ) "وائل ابن حجرؓ کا بیان ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک عورت سے جبراً زنا کیا گیا تو آپؐ نے عورت سے حد ساقط کر کے اسے معاف فرما دیا اور زنا کرنے والے مرد پر حد قائم کر دی۔"

وعنہ ان امرأۃ خرجت علی عھد النبی صلی اللہ علیہ وسلم ترید الصلوٰۃ فتلقاھا رجل فتجللھا فقضی حاجتہ منھا فصاحت وانطلق ومرت عصابۃ من المھاجرین فقالت ان ذٰلک رجل فعل بی کذا وکذا فاخذوا الرجل فاتوا بہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال لھا اذھبی فقد غفر اللہ لک وقال للرجل الذی وقع علیھا ارجموہ۔

(جامع الترمذی بحوالہ مشکوٰۃ ج۲ ص ۳۱۱، ۳۱۲)

(ترجمہ) یہ بھی وائل ابن حجرؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک عورت گھر سے نماز کے ارادہ سے نکلی، راستہ میں اسے ایک شخص ملا جس نے اسے پکڑ کر زبردستی اس سے زنا کیا، اس پر عورت نے شور مچانا شروع کر دیا جس سے گھبرا کر زنا کرنے والا شخص بھاگ گیا، اتنے میں مہاجرین کی ایک جماعت پہنچ گئی، عورت نے انہیں بتایا کہ فلاں آدمی نے مجھ سے جبراً زنا کیا ہے، انہوں نے اس آدمی کو پکڑ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیا (اور عورت بھی اس کے ہمراہ تھی) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت سے فرمایا کہ جاؤ خدا نے تجھے معاف کیا ہے اور زانی مرد کے بارے میں رجم کا حکم فرمایا۔ (چنانچہ وہ آپؐ کے حکم سے رجم کر دیا گیا)۔"

اس حدیث کو اوپر والی روایتوں کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو مجموعہ روایات حدیثیہ اور نصوص قرآنیہ سے ۲ دو باتیں صاف طور پر معلوم ہوتی ہیں۔ ایک ۱ یہ کہ زنا بالجبر کی صورت میں عورت اسلامی قانون کی نظر میں مجرم نہیں ہے نہ اس پر قانونی سزا جاری کی جاسکتی ہے، دوسری ۲ یہ کہ قرآن و حدیث میں زنا کے لیے جو قانونی سزائیں بیان کی گئی ہیں یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں زنا کے واقعات میں جن لوگوں پر یہ قانونی سزائیں جاری کی گئی ہیں اُن میں سے اکثر و بیشتر واقعات زنا اختیاری سے متعلق تھے نہ کہ زنا بالجبر سے متعلق، ورنہ پھر عورت پر مرد کی طرح ہرگز یہ قانونی سزائیں جاری نہ کی جاتیں ـــــ بہرحال قرآن و حدیث کی رُو سے اس حقیقت میں ذرہ برابر کوئی

نفا نہیں ہے کہ اسلامی شریعت نے زنا کے لیے جو قانونی سزائیں مقرر کر رکھی ہیں، ان میں زنا بالاختیار اور زنا بالجبر میں کوئی فرق تسلیم نہیں کیا گیا ہے، نہ ہی اسلامی شریعت نے ان قانونی سزاؤں سے زنا بالاختیار کو مستثنیٰ کیا ہے، بلکہ زنا کی یہ دونوں قسمیں اسلام کی نظر میں یکساں جرم ہیں اور مرتکب جرم سزا کا مستوجب ہے۔ بلکہ حق یہ ہے کہ یہ اسلام کی قانونی سزائیں دراصل زنا بالرضا ہی کے لیے مقرر کی گئی ہیں، کیونکہ ان قانونی سزاؤں سے اصل مقصد یہ ہے کہ معاشرہ کثرت زنا سے محفوظ رہے۔ اور ظاہر ہے کہ معاشرے میں جو زنا کثیر الوقوع ہے یا ہو سکتا ہے وہ زنا بالجبر نہیں وہ زنا بالرضا ہے اور اسی کے انسداد کے لیے اسلام نے یہ سزائیں مقرر کی ہیں۔ تو اگر اس (زنا بالرضا) کو ان سزاؤں سے مستثنیٰ کر دیا جائے تو قانون کا اصل مقصد ہی فوت ہو جائے گا، پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ آجکل کے مغرب سے متاثر بعض مسلم دانشور آخر کس معقول دلیل کی بناء پر زنا بالرضاء کو اسلامی قانون سے مستثنیٰ کر رہے ہیں؟

"کیا اس میں یہ راز پوشیدہ تو نہیں کہ یہ حضرات اپنے اس ملک میں زناکاری کے کاروبار میں قانون کے ذریعہ سے توسیع کرنا چاہتے ہیں؟ اور اس ملک میں یورپین تہذیب کی جڑوں کو زیادہ سے زیادہ مضبوط کر رہے ہیں؟ یا اس ملک میں پہلے سے جو عیاشی و فحاشی کا خطرناک رجحان پایا جاتا ہے اسے یہ حضرات مزید تقویت اور ترقی دینا چاہتے ہیں؟" (اللّٰھم اھدنا وایاھم صراطك المستقیم، آمین)

(جواب جزء ۲) اب دوسرے سوال کا جواب سن لیجئے۔ یہ بات مسلمات شریعت میں سے ہے اور امت مسلمہ کے ہاں طے شدہ ہے کہ جو حکم قرآن و حدیث میں منصوص طریقہ سے بیان کیا گیا ہو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک عہد میں اس پر اسلامی معاشرے میں عملدرآمد بھی رہا ہو، نیز کتاب و سنت سے اس حکم کا کسی مخصوص زمانے کے لیے ہونا یا کسی جزوی مصلحت پر مبنی ہونا بھی معلوم نہ ہو تو ایسے حکم میں تمام امت اور پوری ملت بھی مل کر قیامت تک ادنیٰ سے ادنیٰ ترمیم اور تغیر و تبدیل نہیں کر سکتی۔ ایسی کوئی بھی ترمیم ایک طرف آسمانی شریعت میں بندوں کی طرف سے ایک تحریف ہے اور دوسری طرف ان کی جانب سے ایک مکمل تشریع ہے اور آسمانی شریعتوں میں امتیں تحریف کی مجاز نہیں ہیں اور نہ مستقل تشریع کا حق رکھتی ہیں مشرکین مکہ نے اس قسم کی ترمیموں اور تبدیلیوں کا مطالبہ جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کر کے یہ کہا کہ ائت بقرآن غیر ھٰذا او بدلہ "ہمیں کوئی دوسرا قرآن لے آؤ یا اسمیں

ہماری منشاء کے مطابق کوئی تبدیلی کرو، اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس مطالبہ کے جواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تنبیہ ملی، قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِنْ تِلْقَاءِ نَفْسِي إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ (سورۃ) (ترجمہ) "ان سے یہ کہہ دو کہ مجھے یہ حق ہرگز حاصل نہیں ہے کہ میں اپنی طرف سے خدا کے اس قانون میں کوئی ترمیم یا تبدیلی کرسکوں، میرا حق صرف اس قانون کی حرف بہ حرف پابندی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے بذریعہ وحی بھیجا جا رہا ہے"۔ جب خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے قوانین اور احکام میں اپنی طرف سے کوئی ترمیم یا تبدیلی کرنے کے مجاز نہیں تو دوسرے لوگوں کو ایسی ترمیم اور تبدیلی کی اجازت کیسے مل سکتی ہے؟

قرآن کریم نے اس حقیقت سے بھی پردہ کشائی کی ہے کہ جو لوگ اپنی خود ساختہ قانون سازی کے ذریعہ سے خدائی احکام میں تبدیلی کرتے ہیں پھر لوگوں کو یہ باور کراتے ہیں کہ ہمارا بنایا ہوا یہ قانون بھی اسلامی قانون کا حصہ اور مسلمانوں کے لیے قابل عمل ہے، ایسے لوگ خدا کی نظر میں بڑے مبغوض اور عذاب عظیم کے مستحق ہیں، ارشاد ربانی ہے:۔

فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَٰذَا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا فَوَيْلٌ لَهُمْ مِمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَهُمْ مِمَّا يَكْسِبُونَ (بقرہ)

(ترجمہ) "وہ لوگ سخت عذاب میں مبتلا ہوں گے جو اپنے ہاتھوں سے کوئی کتاب (قانون) لکھ لیتے ہیں، پھر لوگوں سے یہ کہتے پھرتے ہیں کہ یہ بھی خدا کا قانون ہے (ایسا وہ اس لیے کرتے ہیں) کہ اس سے اپنے لیے دنیا کا قلیل منافع حاصل کریں، یہ لوگ ایسی قانون سازی کی وجہ سے بھی مبتلائے عذاب ہوں گے اور جو منافع ان کو اس سے حاصل ہوگا اس کی وجہ سے بھی ہلاکت نصیب ہوگی"۔

بہر حال قرآن کریم نے متعدد مقامات پر غیر مبہم الفاظ میں اس حقیقت کا اعلان کیا ہے کہ شرعی قوانین اور منصوصی احکام میں پوری نوع انسانی کے افراد مل کر بھی کوئی ترمیم یا تبدیلی نہیں کر نہیں کر سکتے کیونکہ اس کی نوعیت مستقل تشریع (شریعت سازی) کی ہے اور تشریع کا حق اللہ کے سوا کسی اور کو حاصل نہیں ہے، البتہ غیر منصوصی مسائل اور معاملات میں ثبوت احکام کیلئے منصوصات شرعیہ سے اجتہاد کے ذریعہ سے احکام اخذ کر کے مستنبط کیے جا سکتے ہیں، مگر تشریع کا مجاز کوئی بھی فرد بشر نہیں ہو سکتا — اور جب یہ ثابت ہوا کہ کوئی بھی فرد بشر شرعی قوانین اور منصوصی احکام میں کوئی تغیر اور ترمیم نہیں کر سکتا تو یہ بھی ثابت ہو گیا کہ زنا جیسے قبیح جرم کی اسلامی شریعت نے جو قانونی سزائیں مقرر کی ہے اُن سے کوئی بھی با اقتدار جماعت یا ادارہ زنا بالاختیار کو

مستثنیٰ کرنے کا حق نہیں رکھتا۔

(جواب جز ۳) رہا تیسرا سوال کہ حرام قطعی کو جائز کرنے اور حلال سمجھنے والا آدمی مسلمان رہ سکتا ہے یا نہیں؟ تو اس کے جواب میں اپنی طرف سے کچھ کہنے کی بجائے بہتر یہی ہے کہ قرآن و حدیث نے اس کے متعلق جو فیصلہ کیا ہے اُسی کو پیش کر دوں، نیز فقہاء اسلام نے قرآن و حدیث کی روشنی میں ایسے لوگوں کے حق میں جو احکام صادر کئے ہیں انہیں کو بیان کر دوں۔

قرآن کریم اور تحلیل حرام یہ بات ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہے اور پوری ملتِ اسلامیہ اس پر متفق ہے کہ کائناتِ عالم کا واحد مالک اور بلا شرکتِ غیرے حقیقی حاکم اور حکمران صرف اللہ رب العالمین ہے، کائنات کا ذرہ ذرہ اس کی خاص ملکیت ہے اور سب کا اصل حاکم وہ ہے۔ جب تمام کائنات کا خالق و مالک وہی ہے تو تمام کا حاکم بھی وہی رہے گا اور تمام کائنات میں حکم اور قانون بھی اُسی کا چلے گا۔ الا لہ الخلق والامر تبارک اللہ رب العالمین۔ "یہ حقیقت ہے کہ پیدائش بھی خاص اسی کی ہے اور حکم بھی اسی کا چلے گا، اللہ بڑا بابرکت اور تمام جہانوں کا مالک ہے"۔ ان الحکم الا للہ امر اَنْ لَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ۔ "حکم نہیں ہے مگر اللہ کے لیے، اُسی نے تمہیں یہ حکم دیا ہے کہ اُس کے سوا کسی دوسرے کی اطاعت و پرستش نہ کرو"۔ وَلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا۔ "وہ اپنے حکم اور فیصلے میں اپنے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا"۔

قانون کی اس بنیادی دفعہ کے تحت اشیاء کی تحریم اور تحلیل دونوں کا حق اور اختیار صرف خالقِ اشیاء کو حاصل ہے مخلوق کو قطعاً اس کا حق حاصل نہیں ہے، اس بارہ میں قرآن کریم کا فیصلہ انتہائی صاف اور واضح ہے۔ اُس نے جس طرح تحریم حلال (خدا کی حلال کردہ اشیاء کو حرام جاننے کی قطعی ممانعت) ممانعت کر رکھی ہے اور فرمایا ہے کہ: لا تحرموا طیبات ما احل اللہ لکم وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ۔ "وہ پاکیزہ چیزیں حرام نہ سمجھو جو خدا نے تمہارے لئے حلال کر رکھی ہیں اور خدا کی مقرر کردہ حدود سے تجاوز نہ کرو خدا حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا"۔ اور فرمایا ہے کہ: لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ۔ "کیوں حرام کرتے ہو اپنے اوپر وہ چیزیں جو خدا نے تمہارے لیے حلال کر دی ہیں"۔ قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًۢا بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّحَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ۔ "تحقیق بڑے خسارہ میں پڑ گئے وہ لوگ جنہوں نے علم کے بغیر حماقت اور نادانی سے اپنی اولاد کو قتل کیا ہے اور

خدا نے ان کو جو حلال رزق دیا ہے اُسے خدا پر جھوٹ باندھ کر حرام سمجھ رکھا ہے"۔ بعینہٖ اسی طرح قرآن کریم نے تحلیلِ حرام (خدا کی حرام کردہ اشیاء کو حلال جاننے) کی بھی قطعی طور پر ممانعت کر رکھی ہے، ارشادِ ربانی ہے، وَلَا تَقُولُوا لِمَا تَصِفُ أَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هَٰذَا حَلَالٌ وَهَٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوا عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ۔ "یعنی مت کہو ان چیزوں کو جنہیں تمہاری زبانیں جھوٹ کے طور پر بیان کرتی ہیں کہ یہ حلال ہیں اور یہ حرام ہیں، اس کا انجام خدا پر جھوٹ باندھنا ہے"۔ لَا تُحِلُّوا شَعَائِرَ اللَّهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ۔ "شعائر اللہ، اشہر حرام اور قربانی کے جانوروں کی ہتک وحرمت کو حلال نہ سمجھو"۔ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ۔ "یہ لوگ خدا کی حرام کردہ چیزوں کو حرام نہیں سمجھتے ہیں اور نہ دینِ حق کو قبول کرتے ہیں"۔

ان آیات میں صریح طور پر اس حقیقت کا اظہار کیا گیا ہے کہ تحریم اور تحلیل کا حق بجز اللہ تعالیٰ کے بالذات کسی کو بھی حاصل نہیں ہے، یہ حقیقت بھی قرآن کریم سے واضح ہے کہ جو چیزیں آسمانی شریعتوں کی رُو سے قطعی طور پر حرام کی گئی ہیں، انہیں جب بھی کسی نے حلال سمجھنا شروع کیا آسمانی شریعتوں سے اس کا تعلق بحال نہیں رہا ہے بلکہ منقطع ہو چکا ہے۔ انسانی تاریخ کے ہر دور میں حضرات انبیاء علیہم السلام نے کفر اور عالمِ اسلام کے مابین حدِ فاصل مقرر کی ہے کہ خدا کی حرام کردہ چیزوں کو دل سے حرام سمجھنے اور اس کی حلال کردہ اشیاء کو دل سے حلال جاننے کا مضبوط اعتقاد رکھا جائے، اس اعتقاد کے بغیر کوئی شخص نہ مؤمن سمجھا گیا ہے نہ مسلم۔ مثال کے طور پر شرک ہی کو لیجئے، اس کو انسانی تاریخ کے ہر دور میں آسمانی شریعتوں کی رُو سے حرمتِ قطعی کی حیثیت حاصل رہی ہے اور جب بھی کسی نے اس کو جائز اور حلال سمجھا ہے تمام آسمانی شریعتوں نے اسے اپنے دائرہ سے خارج تسلیم کیا ہے اور اس کا تعلق ہر آسمانی شریعت سے ہمیشہ کے لیے منقطع ہو چکا ہے۔

حدیثِ رسولؐ اور تحلیل وتحریم | قرآنِ کریم کے بعد جب ہم حدیثِ رسولؐ کی طرف رجوع کرتے ہیں تو وہاں بھی تحلیل وتحریم کے بارے میں وہی فیصلہ ملتا ہے جو قرآن کریم نے اس بارے میں کیا ہے۔ یعنی سنتِ رسولؐ کا فیصلہ بھی یہ ہے کہ جس نے خدا کی حرام کردہ اشیاء کو حلال سمجھا یا اس کی حلال کردہ اشیاء کو حرام جانا اس کا اسلامی شریعت سے تعلق بحال نہیں رہے گا بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے منقطع رہے گا۔

علماء اور مشائخ کے بارے میں اہلِ کتاب کا عقیدہ | قرآن مجید میں یہودی عوام

اور عیسائیوں کے متعلق یہ آیا ہے کہ انہوں نے اپنے علماء اور مشائخ کو خدا کے سوا اپنے لیے معبود بنا رکھا تھا، ارشاد ربانی ہے: اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (سورۃ آیت ـ) جب یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی تو اہلِ کتاب میں سے ایک یہودی عالم "عدی ابن حاتمؓ" جو مشرف بہ اسلام ہو چکا تھا اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ حضور، ہم نے تو کسی عالم یا درویش کو خدا نہیں کہا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اما کانوا اذا احلوا لهم شيئًا استحلوه واذا حرموا عليهم شيئًا حرموه؟ قال نعم، قال هو ذلك۔ اوکما قال (ترمذی) "کیا وہ ایسے نہیں تھے کہ جب ان کے علماء اور مشائخ ان کے لیے کوئی چیز حلال کرتے تو وہ اسے حلال سمجھتے اور جب کوئی چیز ان پر حرام کرتے تو وہ اسے حرام سمجھتے؟ عدی ابن حاتمؓ نے کہا کہ ایسے تو تھے ہی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہی تو ان کا شرک تھا۔"

حاصل یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عدی ابن حاتمؓ سے فرمایا کہ خدائی شریعت سے سند حاصل کئے بغیر جب یہود کے علماء اور مشائخ عوام پر کوئی چیز حرام کرتے تو کیا عوام اُسے حرام نہیں سمجھتے تھے؟ اسی طرح اگر خدائی شریعت سے دلیل حاصل کئے بغیر کسی چیز کو ان کیلئے حلال کرتے تو یہودی عوام اسے حلال نہیں سمجھتے تھے؟ اس کے جواب میں عدی ابن حاتمؓ نے کہا کہ ایسا تو تھا ہی؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہی تو بے سند تحلیل و تحریم تھی جس کی وجہ سے وہ شرک میں مبتلا ہوئے تھے۔

اس حدیث سے یہ بات صاف طور پر معلوم ہوئی کہ جو بھی شخص یا ادارہ اور جماعت خدا کی حرام کردہ اشیاء کو حلال سمجھے گا یا اس کی حلال کردہ اشیاء کو حرام سمجھے گا اسلام کے ساتھ اس کا تعلق ختم ہو جائے گا۔

<u>فقہاء اسلام کا فیصلہ</u> قرآن و حدیث کے ان واضح احکامات کی روشنی میں فقہاء اسلام نے بھی اس بارے میں وہی فیصلہ کیا ہے جو قرآن و حدیث کے منشاء سے زیادہ قریب ہے۔ علامہ تفتازانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مشہور کتاب "شرح العقائد" میں لکھا ہے کہ استحلال المعصية كفر اذا ثبت كونها معصية بدليل قطعي "گناہ کو حلال سمجھنا کفر ہے بشرطیکہ اس کا گناہ ہونا دلیلِ قطعی سے ثابت ہو"۔ آگے چل کر مزید فرماتے ہیں:۔

وعلى هذا تفرع ما ذكر في الفتاوى من انه اذا اعتقد الحرام حلالًا فان كانت

حرمتہ لعینہ وقد ثبت بدلیل قطعی یکفر والا فلا بان تکون حرمتہ لغیرہ اوثبت بدلیل ظنی۔ وبعضہ لم یفرق بین الحرام لعینہ ولغیرہ وقال من استحل حراماً وقد علم فی دین النبی صلی اللہ علیہ وسلم تحریمہ کنکاح المحارم کافر۔

(بحوالہ شامی ج ۲ ص ۳۱۵، ص ۳۱۶)

(ترجمہ) اسی قاعدے پر وہ مسئلہ مبنی ہے جو کتب فتاویٰ میں ذکر ہے کہ جب کوئی شخص حرام کو حلال جانے تو اگر وہ حرام لذاتہ ہو اور اس کی حرمت دلیلِ قطعی سے ثابت ہو تو یہ شخص کافر ہوگا، اور اگر اس کی حرمت لغیرہ ہو یا وہ دلیلِ قطعی سے ثابت نہ ہوئی ہو تو کافر نہ ہوگا، اور بعض علماء نے حرام لعینہ اور لغیرہ میں کوئی فرق نہیں کیا ہے بلکہ مطلقاً یہ کہا ہے کہ دونوں کا مستحل کافر ہوگا بشرطیکہ دینِ نبویؐ میں اس کی حرمت کا ثبوت معلوم ہو جیسے نکاحِ محارم"۔

علامہ ابن عابدینؒ نے مندرجہ بالا دونوں مذاہب پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ:۔

وحاصلہ ان مشروط الکفر علی القول الاول شیئان قطعیۃ الدلیل وکونہ حراماً لعینہ وعلی الثانی یشترط الشرط الاول فقط وقد علمت ترجیحہ۔ اھ

(ترجمہ) "اس اختلاف کا حاصل یہ ہوا کہ کفر کی شرط بنا بر قول اوّل دو چیزیں ہیں۔ ایک دلیل کا قطعی ہونا اور دوسرے اس کا حرام لعینہ ہونا۔ اور بنا بر قول ثانی کفر کے لیے شرط صرف یہ ہے کہ حرمت کی دلیل قطعی ہو اور بس! اس قول کا راجح ہونا معلوم ہے"۔

اسی کے قریب قریب وہ مضمون ہے جو تفتازانیؒ نے "شرح العقائد العضدیہ" میں ذکر کیا ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں:۔

واستحلال المحرمات کفر ولا بد من التقیید بکون تحریمہ مجمعاً علیہ دون تکون حرمتہ من ضروریات الدین، وبدون القید الثانی ان کان الاجماع مستنداً الی الظن لا یثبت ایضاً وکذا ان کان مستنداً الی دلیل قطعی ولم یکن مشتہراً بحیث یکون من ضروریات الدین۔

(شرح العقائد العضدیۃ ص ۱۰۵)

(ترجمہ) "محرمات کو حلال سمجھنا کفر ہے بشرطیکہ ان کی حرمت اتفاقی ہو، نیز ان کی حرمت ضروریاتِ دین میں سے ہو، اور اگر ان کی حرمت اتفاقی نہ ہو بلکہ اختلافی ہو تو کفر ثابت اصلاً نہ ہوگا اور اگر ان کی

حرمت ضروریاتِ دین میں سے نہ ہو مگر اتفاقی ہو تو اگر یہ اجماع مبنی بر ظن ہو تو پھر بھی کفر ثابت نہ ہوگا، اسی طرح اگر وہ مبنی بر دلیل قطعی ہو مگر دین میں اس کی حرمت اس قدر مشہور نہ ہو چکی ہو کہ ضروریاتِ دین میں شمار ہوتے کے قایل ہو تو اس وقت بھی کفر ثابت نہ ہوگا۔

مندرجہ بالا تصریحات کا ماحصل فقہاء اسلام کی مذکورہ بالا تصریحات سے جو امور بطور ماحصل ثابت ہوتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں :-

(۱) کسی چیز کی حرمت اگر قطعی ہو اور لذاتہ بھی ہو، نیز دینِ نبویؐ میں اس کی حرمت اس قدر مشہور ہوئی ہو کہ وہ ضروریاتِ دین میں شمار ہوتی ہو، تو ایسی حرام چیز کو حلال سمجھنا بالاجماع کفر ہے اور کسی کو اس میں اختلاف نہیں ہے۔

(۲) لیکن اگر اس کی حرمت قطعی تو ہو مگر لذاتہ نہ ہو یا لذاتہ بھی ہو مگر ضروریاتِ دین میں سے نہ ہو تو ایسی چیز کو حلال سمجھنے والے آدمی کا کفر مختلف فیہ ہے، جن لوگوں کے نزدیک کفر کے لیے حرمت کا قطعی ہونا فقط کافی ہے، لذاتہ ہونا اور ضروریاتِ دین میں سے ہونا ان کے نزدیک شرط نہیں ہے ان کے نزدیک تو کافر ہے کیونکہ حرمت کی قطعیت دونوں صورتوں میں موجود ہے۔ اور جن کے نزدیک کفر کے لیے حرمت کی قطعیت اور اس کا لذاتہ ہونا دونوں ضروری ہیں، ان کے نزدیک پہلی صورت میں کفر نہیں ہے کیونکہ اس میں صرف حرمت کی قطعیت ہے، اور لذاتہ حرمت نہیں ہے، اور دوسری صورت میں کفر ہے کیونکہ اس میں حرمتِ قطعیہ کے ساتھ اس کا لذاتہ ہونا بھی موجود ہے، اور جن لوگوں کے نزدیک کفر کے لیے یہ ضروری ہے کہ حرمت مشہور اور ضروریاتِ دین میں سے ہو ان کے نزدیک ۲ میں کفر اصلاً نہیں ہے کیونکہ یہ حرمت ضروریاتِ دین میں سے نہیں ہے۔

فقہاء کی ان تصریحات کی روشنی میں جب ہم زنا کی حرمت پر غور کرتے ہیں تو وہ حرمتِ قطعی بھی ہے اور لذاتہ بھی اور اس قدر مشہور بھی ہو چکی ہے کہ ضروریاتِ دین میں شمار ہو چکی ہے لہٰذا اس کو حلال سمجھنا بالاجماع موجبِ کفر ہوگا ـــــ اس اجماعی فیصلہ کے تحت آپ خود غور فرمائیں کہ جو لوگ محرماتِ شرعیہ کو حلال سمجھ رہے ہیں قرآن وحدیث اور فقہاء اسلام کے ان واضح فیصلوں کی روشنی میں ان کا انجام کیا ہوگا؟

ہم اور تکفیر لیکن ہم بذاتِ خود کسی شخص یا ادارہ پر کفر کا فتویٰ دینے سے اس بناء پر معذور اور قاصر ہیں کہ فتویٰ تکفیر کے لیے ضروری ہے کہ مفتی کو اس بات کے متعلق یقینی علم

حاصل ہو کہ جس شخص یا ادارہ پر وہ کفر کا فتویٰ دے رہا ہے اس کے دل میں قطعیات اور ضروریات دین سے قطعی طور پر انکار پایا جاتا ہے اور یہ علم ہم میں سے کسی کو حاصل نہیں ہے اور نہ حاصل ہو سکتا ہے، اس کے بغیر کفر کا فتویٰ دینا ہرگز جائز نہیں ہے۔ لہٰذا ہم ان ممبرانِ اسمبلی کے حق میں اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ ان کو راہِ راست اور راہِ حق پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے جنہوں نے زنا بالاختیار کو شرعی سزاؤں سے مستثنیٰ قرار دینے کا غلط اقدام کیا ہے، اور ان سے یہ اپیل کرتے ہیں کہ خدارا اپنے اس فیصلہ پر جلد از جلد نظرثانی فرما کر خدا و رسولؐ کی ناراضگی اور دنیا و آخرت کی رسوائی کا خطرہ مول نہ لیں۔ امید ہے جملہ ممبرانِ اسمبلی ہماری اس اپیل کو صدا بصحرا ثابت نہ ہونے دیں گے۔ اَللّٰھُمَّ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ ۝ (آمین)

قرائن اور شہرت کی وجہ سے عدالت کا کسی کو سزا دینا

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء کرام و مفتیانِ عظام ذیل کے مسئلہ کے بارے میں کہ یہاں ہمارے گاؤں میں ایک پندرہ سالہ لڑکے نے ایک شخص پر یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس نے اسلحہ کی نوک پر زبردستی میرے ساتھ بدفعلی کی ہے، لڑکے نے اس واقعہ کی تھانہ میں رپورٹ بھی درج کرائی ہے اور معاملہ عدالت میں زیر سماعت ہے، ملزم اس فعلِ بد سے انکاری ہے جبکہ لڑکے کے پاس اس دعویٰ کے اثبات کے لیے کوئی گواہ بھی نہیں البتہ میڈیکل رپورٹ لڑکے کے دعویٰ کی تصدیق کرتی ہے اور مذکورہ شخص اس عملِ بد کی وجہ سے مشہور و معروف اور کافی بدنام ہے۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا عدالت اس شخص کو اس فعلِ بد میں شہرت اور میڈیکل رپورٹ کی بناء پر سزا دینے کا اختیار رکھتی ہے یا نہیں؟

الجواب: کسی جرم کے اثبات کے لیے محض دعویٰ کرنا کافی نہیں جب تک شریعت کے مطابق شہادت موجود نہ ہو، البتہ قرائن اور شہرت کی وجہ سے جب قاضی (جج) کو اس شخص کے متہم بالفعل ہونے کا یقین ہو جائے تو پھر محض سیاستہً سزا دینے کا اختیار رکھتا ہے۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ کے مطابق اگر میڈیکل رپورٹ اور اس فعلِ بد میں مذکورہ شخص کی شہرت کے بارے میں عدالت کو اطمینان ہو جائے کہ اس نے مدعی کے ساتھ بدفعلی کی ہے تو عدالت اسے تعزیراً سزا دے سکتی ہے، اور اس قسم کے واقعات میں عدالت اطمینان کر لینے کے بعد مجرم کو سیاستہً

سزا دینے کا اختیار رکھتی ہے۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ: ومن یتهم بالقتل والسرقة وضرب الناس احبسه واخلده فی السجن حتی یتوب لأن شر هذا علی الناس وشر الاول علی الناس۔
(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۴ ص۷۶ کتاب الحدود، باب التعزیر، مطلب فی تعزیر المتهم) [۱]

---

[۱] لما قال العلامۃ ظفر احمد العثمانیؒ: (الجواب) محض عورت کے کہنے سے مرد پر بہاستہ تعزیر نہیں ہوسکتی بلکہ اگر قاضی کی رائے میں قرائن اخر سے وہ متہم کے درجہ میں ہو جائے تو تعزیراً کچھ سزا دی جاسکتی ہے، مگر قاضی آجکل کہاں؟ البتہ بعض قوموں میں پنچایت کا زور ہوتا ہے، تو پنچایت اس بارہ میں بمنزلہ قاضی کے ہے اگر وہ مسائلِ شرعیہ سے باخبر ہوں یا کسی عالم سے پوچھ کر عمل کرتے ہوں۔ واللہ اعلم
(امداد الاحکام ج ۳ ص۱۲۸ کتاب الحدود)

كتاب
الاشربة

كل مسكر خمر
وكل مسكر حرام

کتاب الاشربۃ

(اشربہ (نشہ آور اشیاء) کے احکام و مسائل)

نسوار کی شکل میں تمباکو کے استعمال کا حکم

سوال:۔ نسوار کا استعمال جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ نسوار چونکہ تمباکو سے ہی بنتی ہے لہٰذا اس کا استعمال تمباکو کی طرح فی نفسہٖ مباح اور جائز ہے کیونکہ اس میں نہ نشہ ہے اور نہ مستی ہے۔

قال العلامة ابن عابدينؒ: فانه لم يثبت اسكاره ولا تفتيره ولا اضراره بل ثبت له منافع فهو داخل تحت قاعدة الاصل فى الاشياء الاباحة وان فرض اضراره للبعض لايلزم منه تحريمه على كل واحد۔ (رد المحتار ج۵ ص۲۹۶ كتاب الاشربة)

البتہ نسوار کی بدبو کی وجہ سے مسجد میں نمازیوں کو تکلیف ہوتی ہے نیز اس میں اسراف اور تبذیر کے علاوہ طبی نقطہ نگاہ سے بھی مضرِ صحت ہے اس لیے اس کا ترک کرنا ہی بہتر ہے۔

قال العلامة ابن عابدينؒ: اذا شرب الماء وغيره من المباحات بلهوٍ و طرب على هيئة الفسقة حرامٌ۔ (رد المحتار ج۵ ص۲۹۲ كتاب الاشربة)[1]

گنے کے رس سے کشید کی گئی شراب حرام ہے

سوال:۔ جو شراب گنے کے رس سے بنائی گئی ہو اُس کا شرعاً کیا حکم ہے؟

---

[1] قال الشيخ محمد الكامل الطرابلسيؒ: وقد حقق المتاخرون من اهل مذهبنا الحنفية انه ليس بحرامٍ وانما فى تعاطيه الكراهية وقد قدمنا ان احسن ماقيل فيه قول الامير رحمه الله فاختلف فيه الدخان والورع تركه۔

{ الفتاوى الكاملية ص۲۸۶ كتاب الحظر والاباحة
مطلب فى حكم شرب الدخان فى مجلس قراءة القرآن }

الجواب:۔ انگور اور کھجور سے بنائی گئی شراب تو بالاتفاق حرام ہے، ان دو چیزوں کے علاوہ جن اشیاء سے شراب بنائی جاتی ہے تو ایسی شراب امام محمد رحمہ اللہ کے مفتیٰ بہ قول کے مطابق حرام ہے کیونکہ یہ نشہ آور شراب ہے، ظاہر حدیث سے ہر مسکر شراب کی حرمت معلوم ہوتی ہے۔

لما اخرجہ الامام مسلمؒ: کل مسکر حرام۔ (الصحیح المسلم ج۲ باب بیان ان کل مسکر حرام ص۱۶۷)

قال العلامۃ الحصکفیؒ: والکل حرام عند محمدؒ وبہ یفتی۔ (الدرالمختار علیٰ ہامش ردالمحتار ج۵ ص۲۹۲ کتاب الاشربۃ) [1]

اضطراری حالت میں افیون کا استعمال جائز ہے

سوال:۔ ایک شخص افیون کھانے کا عادی ہے حتیٰ کہ زندگی افیون کھانے میں گذر گئی، اب بوڑھا ہو گیا ہے، ایسے آدمی کا افیون کھانا اور اس کو کھلانا یا اس بارے میں اس سے تعاون کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر یہ شخص افیون کھانے کا ایسا عادی ہے کہ افیون چھڑانے کی صورت میں اس کی موت واقع ہونے کا خدشہ ہو تو افیون کھانا اس کے لیے جائز ہے اور اس کی اعانت کرنا بھی جائز ہے، اور اگر ایسی حالت نہیں تو کھانا اور کھلانا دونوں طرح ناجائز ہے بشرطیکہ ایسا شخص تدریجاً افیون چھوڑنے کی کوشش اپنے اوپر لازم کرلے ورنہ سخت گنہگار رہو گا۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ: سئل ابن حجرؒ عن ابتلیٰ بأکل نحو الافیون وصار ان لم یأکل منہ هلك اجاب ان علم ذٰلك قطعاً حل لہ بل وجب لاضطرارہ الیٰ ابقاء روحہ کالمیتۃ للمضطر ویجب علیہ التدریج فی تنقیصہ شیئاً فشیئاً۔ (ردالمحتار ج۵ ص۳۰۸ کتاب الاشربۃ) [2]

---

[1] قال العلامۃ الزیلعی رحمہ اللہ: کل شراب اسکر فهو حرام۔ رواہ البخاری
(تبیین الحقائق ج۶ ص۴۷ کتاب الاشربۃ)
وَمِثْلُہٗ فی الهدایۃ ج۴ ص۴۹۸ کتاب الاشربۃ۔

[2] قال العلامۃ الجصاص الرازیؒ: فاقتضیٰ ذٰلك وجود الاباحۃ بوجود الضرورۃ فی کل حال وجدت الضرورۃ فیها۔ (الاحکام القرآن ج۱ ص۱۲۶ باب ذکر الضرورۃ المبیحۃ لاکل المیتۃ)

الکحل ملی خوشبو کے استعمال کا حکم

سوال:- یورپی ممالک سے درآمد شدہ خوشبویات (پرفیومز) میں الکحل شامل ہوتی ہے، تو کیا بدن اور کپڑوں پر ان کی اسپرے کرنا جائز ہے یا نہیں؟ نیز ایسی حالت میں نماز پڑھی جا سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:- جن خوشبویات (پرفیومز) میں الکحل ملی ہوتی ہے اگر یہ الکحل انگور یا کھجور کی ہو تو بالاتفاق ایسی خوشبو کا استعمال ناجائز ہے کیونکہ خوشبو میں الکحل کا استعمال بلاضرورت ہے اور بلا عذر شرعی شراب کا استعمال خواہ کم ہو یا زیادہ حرام ہے۔

قال العلامة الحصکفیؒ: وحرم الانتفاع بها ولو لسقی دواب او لطین او قطر للتلمی او فی دواء او دهن او طعام او غیر ذلك۔ (الدر المختار علی هامش رد المحتار ج ۵ ص ۲۸۹ کتاب الاشربة)

اگر یہ الکحل انگور اور کھجور کے علاوہ کسی اور چیز سے بنی ہو تو امام محمدؒ کے نزدیک یہ بھی حرام ہے، اگرچہ متقدمین علماء نے امام محمد رحمہ اللہ کے قول کو مفتی بہ قرار دیا ہے لیکن متاخرین محققین نے عموم بلویٰ کی وجہ سے امام ابوحنیفہؒ کے قول کو توسع کی خاطر قابلِ عمل قرار دیا ہے کہ انگور اور کھجور کے علاوہ دوسرے الکحل ملے پرفیومز کا استعمال حرام نہیں۔

قال العلامة محمد تقی العثمانی: ان معظم الکحول التی تستعمل الیوم فی الادویة والعطور وغیرها لاتتخذ من العنب او التمر انما تتخذ من الحبوب او القشور او البترول وغیره کما ذکرنا فی باب بیع الخمر من کتاب البیوع وحینئذٍ هناك فسحة فی الاخذ بقول ابی حنیفةؒ عند عموم البلویٰ۔

{تکملة فتح الملهم ج ۳ ص ۶۰۸ کتاب الاشربة حکم الکحول المسکرة}

تاہم اگر استعمال نہ کیا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔

منشیات ہر قسم کی ممنوع ہیں

سوال:- ایک شخص افیون، بھنگ، چرس کے استعمال کا عادی ہے اور ان اشیاء کے استعمال سے اس شخص پر

کوئی برا اثر مرتب نہیں ہوتا، اگر یہ شخص ان چیزوں کو استعمال کرتا رہے اور ترک نہ کرے تو کیا شرعاً اس کے لیے گنجائش ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ان اشیاء کی حرمت کے بارے میں فقہاء کرام نے تصریح کی ہے۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: ویحرم اکل البنج والحشیشة والافیون لانہ مفسد للعقل ویصد عن ذکر اللّٰہ وعن الصلوٰة۔ (رد المحتار ج ۵ ص ۲۹۴ کتاب الاشربة)

لہٰذا ان کا استعمال حرام ہے، ان مضر اشیاء کے استعمال کی اجازت نہ عادی کو ہے نہ غیر عادی کو، بلکہ عادی پر واجب ہے کہ ان کے استعمال میں آہستہ آہستہ کمی کرتا جائے تاکہ ایک وقت آئے اور جان چھوٹ جائے۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: ویجب علیہ التدریج فی تنقیصہ شیئاً فشیئاً۔ (رد المحتار ج ۵ ص ۲۰۸ کتاب الاشربة)[1]

نیگونہ پودے کی جڑوں کے شربت کی تحقیق

سوال: فیجی آئرلینڈ میں نیسگونہ (NAGONA) نامی ایک پودا پایا جاتا ہے جس کی جڑیں خشک کرکے اس میں پانی ملا کر لوگ پیتے ہیں جس سے مندرجہ ذیل اثرات مرتب ہوتے ہیں: (۱) پینے کے بعد آدمی خاموش رہتا ہے (۲) زیادہ استعمال کرنے سے جوان بوڑھا نظر آتا ہے (۳) زیادہ استعمال سے جسم پر سفید لکیریں نکل آتی ہیں۔ (۴) ہاتھ سخت اور بدن خشک ہو جاتا ہے (۵) بدن میں سستی اور کمزوری پیدا ہو جاتی ہے (۶) اکثر ممالک میں اس کو نشہ آور سمجھ کر اس کے استعمال پر پابندی لگا دی گئی ہے۔ اس پودے کے استعمال کا شرعی حکم کیا ہے؟

الجواب:۔ سوال میں ذکر کردہ مضر اثرات کی وجہ سے نیگونہ (NAGONA) پودے کی جڑوں کا شربت استعمال کرنا ناجائز ہے، اس لیے کہ بدن پر اس کے بُرے اثرات پڑتے ہیں جبکہ یہ نشہ آور بھی ہے، شریعتِ مقدسہ نے کسی بھی مضر صحت و بدن چیز کے استعمال سے

---

[1] قال العلامة ابوبکر بن الحداد الیمنیؒ: ولا یجوز اکل البنج والحشیشة والافیون وذلك کلہ حرام۔ (الجوهرة النیرة ج ۲ ص ۲۷ کتاب الاشربة)

ومثلہ فی فتاوی الکاملیة ص ۲۷ کتاب الاشربة۔

منع کیا ہے، جیسے زہر میں نشہ تو نہیں مگر پاک ہے لیکن اس کا استعمال حرام ہے۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: کالسم القاتل فانہ حرام مع انہ طاھر۔

(رد المحتار ج۵ ص۲۹۳ کتاب الاشربۃ)

اور اس پودے (زنیگونہ) میں تو نشہ بھی ہے لہٰذا اس کا استعمال حرام ہے، اگرچہ اس پودے کا ذکر فقہ کی کتابوں میں نہیں ملتا لیکن اس کے نظائر موجود ہیں۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: وھکذا یقال فی غیرہ من الاشیاء الجامدۃ المضرۃ فی العقل او غیرہ یحرم تناول القدر المضر دون القلیل۔ اگر نشہ آور کم ہو یا زیادہ حرام ہے۔ وقال محمدؒ ما اسکر کثیرہ فقلیلہ حرام۔

(رد المحتار ج۵ ص۲۹۳ کتاب الاشربۃ)[1]

بطور دوائی شراب کے استعمال کا حکم

سوال:۔ ایک قریب المرگ مریض جس پر ہر قسم کا علاج آزمایا گیا لیکن کارگر نہ ہوا، اس کے لیے ڈاکٹر نے آخری علاج کے طور پر شراب تجویز کی ہے، کیا ایسے مریض کے لیے بقدر ضرورت شراب پینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر کسی مسلمان ڈاکٹر کو تجربات سے یہ یقین حاصل ہو جائے کہ شراب سے مریض کو شفاء مل جائے گی تو ضرورتاً اس کا پینا جائز ہے بشرطیکہ شراب کے علاوہ دوسری دوا نہ ہو اسلیئے کہ حالتِ اضطرار میں حرام چیز کا استعمال بقدر ضرورت جائز ہے۔

لما فی الھندیۃ: ولو ان مریضاً اشار الیہ الطبیب بشرب الخمر روی عن جماعۃ ائمۃ بلخ انہ ینظر ان کان یعلم یقیناً انہ یصح حل لہ التناول۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۵ ص۳۵۵ الباب الثامن عشر فی التداوی والمعالجات)[2]

---

[1] قال العلامة الزیلعیؒ: وعن ابن عمر انہ علیہ الصلوٰۃ والسلام قال ما اسکر کثیرہ فقلیلہ حرام۔ (تبیین الحقائق ج۶ ص۴۷ کتاب الاشربۃ)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۸ ص۲۱۹ کتاب الاشربۃ

[2] قال العلامة الکاسانیؒ: انہ یحرم شرب قلیلھا وکثیرھا الا عند الضرورۃ۔

(بدائع الصنائع ج۵ ص۱۱۲ کتاب الاشربۃ)

وَمِثْلُہٗ فی ردّ المحتار ج۴ ص۲۱۵ کتاب الاشربۃ۔

بطورِ دوا شراب کے خارجی استعمال کا حکم

سوال:۔ ایک شخص کی قوتِ سامعہ خراب ہے، ڈاکٹروں نے بطور علاج شراب کے چند قطرے خارجی طور پر استعمال کرنے کی تجویز دی ہے، کیا یہ طریقہ علاج شرعاً جائز ہے؟

الجواب:۔ متقدمین فقہاء کے نزدیک شراب کا داخلی و خارجی استعمال اور اس سے نفع لینا حرام ہے۔

قال العلامة المرغيناني رحمه الله: ويكره الاحتقان بالخمر واقطارها في الاحليل لانه الانتفاع بالمحرم۔ (الهداية ج۴ ص۵۰۰ كتاب الاشربة)

لیکن متاخرین نے جب بطور تداوی کے شراب کے داخلی استعمال کی اجازت دی ہے تو خارجی استعمال کے مرخص ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

لما في الهندية: يجوز للعليل شرب الدم والبول واكل الميتة للتداوي اذا اخبره طبيب مسلم ان شفاءه فيه ولم يجد من المباح ما يقوم مقامه۔
(الفتاوى الهندية ج۵ ص۳۵۵ الباب الثامن عشر في التداوي والمعالجات)[1]

الکحل ملی ادویات کے استعمال کا حکم

سوال:۔ جن دوائیوں میں الکحل کی آمیزش ہوتی ہے اُن کا استعمال ڈاکٹر کے تجویز کردہ نسخہ کے مطابق جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ انگریزی ادویات کے استعمال کے بارے میں متاخرین فقہاء کرام کا قول یہ ہے کہ اگر ان ادویات میں شراب یا کسی اور حرام شے کا اختلاط یقینی یا ظنِ غالب کے طور پر معلوم ہو تو ان کا استعمال شرعاً جائز ہے جبکہ اس میں شفاء کا امکان ہو، اگر ان دوائیوں میں الکحل کا صرف احتمال (شک) ہو تو پھر ایسی دوائیوں کے استعمال کرنے میں مزید گنجائش نکلتی ہے۔

قال العلامة ابن عابدين رحمه الله: ففي النهاية عن الذخيرة يجوز ان

---

[1] قال العلامة ابن عابدين رحمه الله: اما اذا علم وليس له دواء غيره يجوز۔
(رد المحتار ج۵ ص۲۱۵ باب المتفرقات، مطلب في التداوي)
ومثله في البحر الرائق ج۸ ص۲۱۹ كتاب الاشربة۔

علم فیہ شفاء ولم یعلم دواء اٰخر۔ (رد المحتار ج ۱ ص ۱۴۰ مطلب فی التداوی فی المحرم) لہ

افیون بطور دوائی استعمال کرنے کا حکم

سوال:۔ بطور دوائی افیون کا کھانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جس طرح دیگر حرام اشیاء کا بوقتِ ضرورت بطور دوائی استعمال جائز ہے اسی طرح افیون کا استعمال بھی دوائی کے طور پر جائز ہے بشرطیکہ حدِ سکر کو نہ پہنچے۔

لما قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللّٰہ: من غاب عقلہ بالبنج والافیون یقع طلاقہ اذا استعملہ للھو وادخال الافات قصداً لکونہ معصیۃ وان کان للتداوی فلا لعدمھا۔ کذا فی فتح القدیر وھو صریح فی حرمۃ البنج والافیون لا للدواء۔ (رد المحتار ج ۵ ص ۲۹۴ کتاب الاشربۃ) ۲ہ

سیون اَپ اور کوکا کولا پینے کا حکم

سوال:۔ سیون اپ اور کوکا کولا مشروبات کے بارے میں سنا ہے کہ ان میں الکحل ملا ہوتا ہے اس لحاظ سے ان مشروبات کا پینا جائز ہے یا نہیں

الجواب:۔ سیون اپ اور کوکا کولا کے بارے میں تحقیق سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ ان میں الکحل کی ملاوٹ نہیں ہوتی، صرف شک کی بناء پر یہ بات کی گئی ہے، ایسے شک سے کسی چیز کی حرمت ثابت نہیں ہوتی، البتہ محض شک کی بناء پر اگر کوئی احتیاطاً مذکورہ مشروبات نہ پئے تو ٹھیک ہے لیکن ان کا پینا حرام نہیں۔

لما قال العلامۃ سلیم رستم بازؒ: وھذا بناء علی ان الشک یورث الاحتیاط دون الحرمۃ لان الیقین لا یزول بالشک۔ (شرح المجلۃ الاحکام، المادۃ ص ۴ ص ۲۰) ۳ہ

لہ و ۲ہ لما فی الھندیۃ: یجوز للعلیل شرب الدم والبول واکل المیتۃ للتداوی اذا اخبرہ طبیب مسلم ان شفاءہ فیہ ولم یجد من المباح مایقوم مقامہ۔ (الفتاوی الھندیہ ج ۵ ص ۳۵۵ الباب الثامن عشر فی التداوی والمعالجات)

ومثلہ فی البحر الرائق ج ۸ ص ۲۱۹ کتاب الاشربۃ۔

۳ہ قال العلامۃ الشیخ الزرقاءؒ: ومعناھا ان ما کان ثابتاً متیقناً لا یرتفع بمجرد طرو الشک علیہ لان الامر الیقینی لا یعقل ان یزیلہ ماھو اضعف منہ بل ما کان مثلہ او اقوی۔ (شرح القواعد الفقہیہ ص ۳۷ القاعدۃ الثالثۃ الیقین لا یزول بالشک)

فتاویٰ رشیدیہ کی ایک عبارت پر پیدا ہونے والے سوال کا جواب

سوال :۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ فقیہ الزمان حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ نے فتاویٰ رشیدیہ میں حقہ کشی کو مباح قرار دیا ہے۔ تو کیا ان کے اس قول کا فقہ حنفی میں کچھ ثبوت ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو حدیث شریف کے ان الفاظ کل دخان حرام کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ فقہ حنفی کی روشنی میں اس مسئلہ کی وضاحت فرمائیں۔

الجواب :۔ ذوی العقول اہلِ اسلام پر مخفی نہ ہو کہ حقہ کشی کا حدوث سن ایک ہزار ہجری (۱۰۰۰ھ) کے بعد ہوا ہے اور اس وقت سے لے کر آج تک علماء مذاہب اربعہ کے اس کے بارے میں نظریات رہے ہیں، بعض نے حرمت کا حکم دیا ہے، بعض کراہتِ تحریمیہ کی طرف مائل ہیں اور بعض دوسرے کراہتِ تنزیہیہ کے قائل ہیں اور بعض نے اباحتِ مطلقہ کا حکم لگایا ہے۔

اس مسئلہ کی پوری وضاحت عبارات مع مالہا وما علیہا کو حضرت مولانا عبدالحی صاحب لکھنویؒ نے اپنے ایک رسالہ "ترویح الجنان بتشریح حکم شرب الدخان" میں کی ہے۔ مزید معلومات کے لیے اس کا مطالعہ کرنا ضروری اور انتہائی مفید ہے اور پوری تشفی کی امید اس کے ساتھ وابستہ ہے۔ پھر بھی آپ کے سوال کے حوالے سے یہاں چند ضروری باتوں کی وضاحت کی جاتی ہے :۔

علامہ شامی رحمہ اللہ اس کے بارہ میں لکھتے ہیں : اضطربت آراء العلماء فیہ فبعضھم قال بکراھتہ وبعضھم قال بحرمتہ وبعضھم باباحتہ وافردوہ بالتالیف وفی شرح الوھبانیۃ الشرنبلالیؒ ؎

ویمنع من بیع الدخان وشربہ
وشاربہ فی الصوم لاشک یفطر

وللعلامۃ الشیخ علی الاجھوری رسالۃ نقل فیھا انہ افتی بحلہ من یعتمد علیہ من ائمۃ المذاھب الاربعۃ قلت والف فی حلہ سیدنا العارف عبدالغنی النابلسی الحنفیؒ رسالۃ سماھا الصلح بین الاخوان فی اباحۃ شرب الدخان واقامۃ الطامۃ الکبریٰ علی القائل بالحرمۃ اوبالکراھۃ فانھما حکمان

شرعیان لا بد لہما للبعض لا یلزم منہ تحریمہ علی کل احد۔ انتہی ۔ یہ تمام عبارات "شامی ج۵ کتاب الاشربۃ" میں موجود ہیں۔

اور عبد الغنی نابلسیؒ "حدیقۃ ندیہ شرح طریقہ محمدیہ" میں لکھتے ہیں: من البدع العادیۃ استعمال التتن والقہوۃ۔ انتہی

اور شیخ عبد الخالق زجاجی زبیدی حنفیؒ اپنے بعض فتاوٰی میں لکھتے ہیں: قد تکلم العلماء المتاخرون فی ذلک لانہ لم یکن فی القرون السابقۃ فمن مفرط فی ذمہ حتی جزم بالحرمۃ ومن مفرط فی مدحہ ومنہم من توسط وقال انہ مکروہ تحریمًا وھذا اعندی احسن الاقوال واعدلہا اذ لا قاطع بتحریمہ ولیس کل موذ ومنتن حرامًا والا لکان اکل الثوم والبصل والفحل والکراث حرامًا ھذا کلہ فی شرب دخانہ واما اکلہ وشمہ فہو مکروہ تنزیہًا عندی لانہا دون شرب دخانہ۔ انتہی ملخصًا۔
(یہ عبارات مجموعۃ الفتاوٰی ج۲ ص۹۶ سے نقل کی گئی ہیں)

اب معلوم یہ کرنا ہے کہ علماء کے اس اختلاف کا منشا کیا ہے؟ تو ہمارے نزدیک اس اختلاف کا منشا وہی ہے جس کو حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے پیش کیا ہے، آپ فرماتے ہیں کہ:-
"یہ حقہ قریب تین سو برس ہوئے کہ کفار نے نکالا ہے، پھر سب لوگوں میں شائع ہوا، اور اصل میں یہ ایک دوا ہے، بعض امراض کو نافع بھی ہے اور کثرت اس کی مضر ہے جیسا کہ کتب طب سے معلوم ہوتا ہے۔ اب پینے والوں کی مختلف غرضیں ہیں، مختلف مزاج ہیں، مختلف طور ہیں اور مختلف خیال اور مختلف عادتیں ہیں۔ کوئی مرض کے لیے پیتا ہے، کوئی شوقیہ پیتا ہے، کسی کو کچھ نافع ہے کسی کو مضر ہے، کوئی پی کر منہ صاف کرتا ہے، کوئی سڑا لیتا ہے، کوئی احتیاط سے پیتا ہے، کوئی بے احتیاطی سے، کوئی برا سمجھ کر پیتا ہے، کوئی اچھا جان کر پیتا ہے، یہاں تک کہ بعض روزہ میں پیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ روزہ نہیں ٹوٹتا، کوئی بہت کثرت سے پیتا ہے، کوئی کبھی کبھی پی لیتا ہے، بعض کو اگر ایک گھنٹہ نہ ملے بے چین ہوجاتے ہیں، بعض کو کئی کئی روز تک خیال نہیں ہوتا۔ پھر تمباکو میں بھی بعض اقسام بہت تیز اور مضر ہیں، بعض کم درجے میں ہیں، کسی میں کو زیادہ ہے کسی میں کم ہے، کسی میں نوبت نشہ یا فتور کی ہے کسی میں نہیں، کوئی ایسی چیز کے ساتھ مرکب ہے جس سے اس کی خباثت کم ہوجاتی ہے کوئی نہیں ہے۔ اسی طرح حقہ اور نیچہ میں بھی، بعض نیچہ کے کپڑے پاک ہوتے ہیں کسی کے ناپاک، اور کسی کے مشتبہ، کوئی پیچوان ہے اس میں اثر قلیل آتا ہے، کسی میں زیادہ آتا ہے۔ کوئی

جلد جلد تازہ کیا جاتا ہے، کوئی کئی کئی دن تک سڑتا رہتا ہے، کوئی عام ہے کہ سب کا منہ لگتا ہے جیسے نکیوں کے حقے، کوئی خاص ہے۔ غرض نہ سب پینے والے برابر، نہ سب تمباکو ایک طرح کے، نہ سب حقہ و نیچہ ایک طرح کے، سب متفاوت اور مختلف، ہر ایک کا حکم الگ ہوا۔ پس اگر کسی نے ضرورتِ شدیدہ میں کسی مرض وشواد کے علاج کے لیے احتیاط سے بطور دوا کے کبھی کبھی ایک آدھ بار پی لیا تو چنداں جرم نہیں ہے، اور جو بعد ازالۂ مرض بغیر ضرورت کے شوقیہ پیوے جیسا آجکل شائع ہے کہ یہی محفل کی زیب و زینت ہو گئی ہے اور اسی کی خاطر و تواضع رہ گئی اس کے نہ ملنے کی شکائتیں ہوتی ہیں کہ فلانے نے حقہ تک بھی نہیں پلایا اور زبان سے چلاتے ہیں بُرا کہتے ہوں اور شاید دل میں بھی بُرا جانتے ہوں مگر ظاہر میں بے باکانہ اس کو پیتے ہیں اور ذرا بھی محجوب و منقبض نہیں ہوتے، اور آخر میں مضر بھی ہوتا ہے اور منہ میں برابر بدبو آتی ہے، اور ہر دم منہ میں گھسا رہتا ہے اور حواس میں بھی کدورت آجاتی ہے اور تشبہ اہلِ نار کے ساتھ ہے کہ منہ اور ناک میں سے دھواں نکلتا ہے، اور خود دھواں اور آگ بھی آلہ عذاب کا ہے، اس کے ساتھ متلبس رہتے ہیں، اس طور اس کا عادی ہو جانا بسبب اجتماع ان امور کے بیشک بُرا اور سخت مکروہ ہے، پھر امور مذکورہ سابق کے تفاوت سے کراہت میں بھی تفاوت ہو گا۔ اور بعض پینے والے جو بداحتیاط ہیں اور سڑے ہوئے حقے اور ناپاک نیچے، تیز تمباکو پیتے پیتے نشہ ہو جاتا ہے اور شراب کی سی مدہوشی ہوتی ہے، اس کی حرمت میں کوئی شبہ نہیں۔ حاصل یہ کہ کوئی حقہ زیادہ مکروہ کوئی کم مکروہ، کوئی حرام، کوئی ضرورت شدیدہ میں بطور دوا کے ایک آدھ بار مباح۔ اس تقریر پر درمیان اقوال علماء و فقہاء کے جو اس کی اباحت، کراہت و حرمت میں مختلف ہیں، تطبیق بھی ممکن ہے، پس جیسا موقعہ کسی نے دیکھا ہو گا ویسا کہدیا ہو گا۔ بہر حال پینے والا اس کا اکثر حالتوں میں نہ کل حالتوں میں، گناہ سے خالی نہیں۔" انتہیٰ

حضرت تھانوی رح کی اس تقریر سے اختلافِ علماء و فقہاء کا منشاء اور ان کے اقوال کی تطبیق پر روشنی پڑ گئی۔ دلائل کے اعتبار سے جب علماء و فقہاء کے اختلاف پر نظر ڈالی جاتی ہے تو بعد تنقیح دلائل طرفین یہ واضح ہوتا ہے کہ حرمت کا قول تو لایعبا بہ ہے کیونکہ حرمت قطعی دلیل تحریم پر موقوف ہوتی ہے۔ جن علماء نے حرمت کا حکم دیا ہے انہوں نے کوئی قطعی دلیل اس پر قائم نہیں کی ہے بلکہ ان کے تمام ظنی دلائل بھی مخدوش ہیں، جیسا کہ مولانا عبدالحی صاحب رحمہ اللہ نے "ترویح الجنان" میں اس کی وضاحت کر دی ہے۔ اور قول اباحت بلا کراہت بھی خدشات سے خالی نہیں ہے البتہ قول کراہت قابلِ اعتبار

ہو۔ اور بالفرض اگر اس کی حرمت ثابت ہو جائے تو پھر بھی اس کے مختلف فیہ ہونے میں شک نہیں ہے جیساکہ عباراتِ سابق سے معلوم ہوا کہ علماء کی ایک جماعت نے اس کی حرمت سے انکار کیا ہے اور انہوں نے کراہت یا اباحت کا فتویٰ دیا ہے اور کراہت میں بھی بعض نے تحریمی کا قول کیا ہے اور بعض نے تنزیہی کا۔ علامہ ابو السعودؒ کے نزدیک کراہت تنزیہی ہے اور کراہتِ تنزیہی اباحت کے ساتھ جمع ہو سکتی ہے۔ علامہ شامیؒ لکھتے ہیں: قال ابو السعود فتکون الکراھۃ تنزیھیۃ والمکروہ تنزیھا یجامع الاباحۃ۔ اگر حضرت گنگوہیؒ نے جن کو حضرت مولانا شاہ انور شاہ کشمیریؒ نے فقیہ النفس کا موزوں خطاب عطا فرمایا تھا، اس کی اباحت کا قول کر کے فتویٰ دے دیا تو کون سے گناہ کا ارتکاب کیا۔ ہو سکتا ہے کہ فقیہ النفس حضرت گنگوہیؒ نے ان علماء و فقہاء کے اقوال و آراء اور دلائل کو ترجیح دی ہو جو اس کی اباحت کے قائل ہیں۔ اور خود حضرت گنگوہیؒ بھی بہت بڑے درجے کے عالم ہیں اور تمام علوم اسلامیہ میں منصبِ امامت اُن کو حاصل تھا مگر جو خصوصی مناسبت آپ کو فقہ اور حدیث سے تھی اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ علوم آپؒ کی سرشت میں داخل ہو چکے تھے، وہ مشکل مسائل جن کے حل کرنے میں علماء عصر حیران و پریشان رہتے تھے حضرت گنگوہیؒ ان کو چٹکیوں میں حل فرما دیتے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ حضرتؒ نے اپنی تحقیق کی ہو اور ان کی تحقیق میں اس کی اباحت کسی درجہ میں ثابت ہو چکی ہو۔ اس کے علاوہ اگر انہوں نے اباحت کا قول کر کے فتویٰ دیا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ کسی وقت اور حالت اور موقعہ میں بھی یہ کراہت کے درجہ تک نہ پہنچے گی، نیز اگر کوئی اس کی اباحت کا قائل ہو جائے تو یہ کفر تو نہیں، کیونکہ اس کی اباحت، کراہت اور حرمت میں اختلاف تو ہے۔ اور "شرح عقائد نسفی" اور اسی طرح "فتاویٰ بزازیہ" میں یہ مسئلہ مصرح ہے کہ حرام مختلف فیہ کے محلل کو کافر کہنا ہرگز جائز نہیں ہے۔ اور کل دخان حرام یہ حدیث کے الفاظ نہیں ہیں بلکہ اصل حدیث اس طرح وارد ہے: کل مسکر خمر و کل مسکر حرام۔ (رواہ مسلم) یا یہ حدیث ہے، نھی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم عن کل مسکر و مفتر۔ (رواہ احمد عن ام سلمۃؓ) جب یہ "کل دخان حرام" حدیث کے الفاظ ہی نہیں ہیں تو ان پر بحث کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ مسئلہ فی نفسہٖ بقدر ضرورت واضح ہو گیا۔

فقط واللّٰہ اعلم

كتاب
القصاص
والدية

بسم اللہ الرحمن الرحیم
ولکم فی القصاص حیوۃ یاولی الالباب لعلکم تتقون
۹۹ ۱۲
ولکم فی القصاص حیوۃ یاولی الالباب
لعلکم تتقون ۝

کتاب القصاص والدیۃ

(قصاص اور دیت کے احکام ومسائل)

قاتل کو معاف کردینے کے بعد قصاص کا مطالبہ کرنا جائز نہیں

سوال :- ایک شخص نے دوسرے آدمی پر قتلِ عمد کا دعویٰ دائر کیا، اب اگر مقتول کے ورثاء گواہوں کے سامنے قاتل کو معاف کردیں تو بعد میں کسی وجہ سے دوبارہ قصاص کا مطالبہ کرسکتے ہیں یا نہیں ؟

الجواب :- ورثاء کا قاتل کو باقاعدہ معاف کردینے کے بعد حقِ قصاص ساقط ہوجاتا ہے اور مقتول کے ورثاء کو دوبارہ مطالبۂ قصاص کا حق باقی نہیں رہتا، بلکہ کسی ایک وارث کے معاف کردینے سے بھی بقیہ ورثاء کو قصاص لینے کا حق نہیں رہتا۔

وفی الهندیۃ : ومن عفا عن ورثۃ المقتول فلا سبیل الی القصاص۔

(الفتاوٰی الهندیۃ ج۶ ص۲۲ الباب السادس فی الصلح والعفو) [1]

صلح ہوجانے کے بعد عدالت کا قاتل کو سزا دینا

سوال :- ایک آدمی مثلاً زید نے کسی کو عمداً قتل کیا جس کا مقدمہ عدالت میں زیرِ سماعت تھا کہ مقتول کے ورثاء نے دیت لے کر مقدمہ کی پیروی چھوڑ دی جس کی وجہ سے زید پھانسی کی سزا سے بچ گیا لیکن عدالت نے اس کو عمر قید کی سزا سنادی ہے کیا یہ سزا شرعاً جائز ہے؟

الجواب :- قتلِ عمد میں قصاص لینا ورثاء کا شرعی حق ہے جبکہ ورثاء قاتل کو معاف بھی کرسکتے ہیں اور دیت لے کر صلح بھی کرسکتے ہیں، صورتِ مسئولہ کے مطابق ورثاء

---

[1] قال العلامۃ الجصاص الرازی رحمہ اللہ :- قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم العمد قود الا ان یعفو ولی المقتول ۔ (الاحکام القرآن ج۱ ص۱۵۱ بحث تنازع اهل العلم فی معنی قولہ تعالیٰ : فمن عفی لہ من اخیہ شیءٌ ۔ الآیۃ)

ومثلہٗ فی بدائع الصنائع ج۷ ص۲۴۶ بیان ما یسقط القصاص بعد وجوبہ ، کتاب الجنایات۔

نے جب دیت لے کر قاتل کو معاف کر دیا تو حکومت کو مزید سزا دینے کا کوئی حق نہیں، اس لیے اب عدالت کا اسے عمر قید کی سزا سنانا مروجہ قانونی سزا تو ہو سکتی ہے شرعی نہیں۔

لما قال اللہ تعالیٰ : فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ وَأَدَاءٌ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ ...... فَمَنِ اعْتَدَىٰ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَلَهُ عَذَابٌ أَلِيمٌ ٥ (سورۃ البقرۃ آیت ۱۷۸)

قال العلامۃ المرغینانیؒ : انہا نزلت فی الصلح ۔ (الھدایۃ ج۳ ص۲۴۶ کتاب الصلح)[1]

بدلِ صلح صرف قاتل پر ہے

سوال :۔ ایک آدمی کے باپ کو کسی نے قتل کیا ہے بیٹا اب صلح کرنا چاہتا ہے تو کیا قاتل کے ورثاء دیت ادا کرنے کے پابند ہیں یا نہیں؟

الجواب :۔ صلح کی صورت میں بدل صرف قاتل پر واجب ہے دیگر رشتہ دار صرف بطور احسان تعاون کر سکتے ہیں۔

کما فی الھندیۃ : وکل أرش وجب بالصلح فھو فی مال القاتل ۔

(الفتاویٰ الھندیۃ ج۶ ص۲۴ کتاب الصلح)[2]

قتل بالسبب کی دیت کا حکم

سوال :۔ ایک عورت نے اپنے خاوند کی روٹی میں زہر ملایا لیکن اتفاق سے وہ روٹی کسی دوسرے شخص نے کھالی جس کی وجہ سے اس کی موت واقع ہو گئی، جب عورت کو پتہ چلا تو وہ اپنے آشنا کے ساتھ بھاگ گئی، پکڑے جانے پر سسر نے اس عورت کو قتل کر دیا، زہریلی روٹی کھانے سے مرنے والے کے ورثاء اب اس عورت کے ورثاء سے دیت طلب کرتے ہیں، جب کہ اس واقعہ کو کافی عرصہ گذر چکا ہے، اس مسئلہ کا شرعی حکم کیا ہے؟

---

[1] قال العلامۃ الجصاص الرازیؒ : من قتل بعد اخذ الدیۃ فعلیہ لقتل لایقبل منہ الدیۃ ۔ (الاحکام القرآن ج۱ ص۱۵۱ بحث تنازع اھل العلم فی معنی قولہ فمن عفی لہ من اخیہ شیء)

[2] قال العلامۃ ابوبکر الجصاص الرازیؒ : دلالۃ الدیۃ ظاھرۃ علی ان الصلح دم العمد وسقوط القود بعفو بعض الاولیاء یوجب الدیۃ فی مال الجانی ۔

(الاحکام القرآن للجصاص ج۱ ص۱۵۸ بحث تنازع اھل العلم الخ)

وَمِثْلُهُ فی بدائع الصنائع ج۷ ص۲۵۵ بیان من تجب علیہ الدیۃ، کتاب الجنایات ۔

الجواب :۔ زہریلی روٹی کھانے سے موت کا واقع ہونا قتل بالسبب ہے، صورتِ مسئولہ میں جس عورت نے روٹی میں زہر ملایا ہے اس کے عاقلہ پر دیت واجب ہے اور عورت پر کفارہ نہیں، اگرچہ عورت مرگئی ہے لیکن اس کے عاقلہ تو موجود ہیں اُن سے دیت وصول کر کے مقتول کے ورثاء کو دی جائے گی۔

قال العلامة ابن عابدینؒ : لو زلق بماء صبه رجل فوقع فی البئر فا لضمان علی الصّاب۔ (رد المحتار ج ۵ ص۳۴۲ کتاب الجنایات) [1]

مریض کو دوائی کھلانے سے موت واقع ہونے پر دیت کا حکم

سوال :۔ ایک آدمی نے کسی مریض کو کوئی ایسی دوائی کھلا دی جس سے اس کی موت واقع ہوگئی، تو کیا دوائی کھلانے والے پر دیت یا ضمان ہے یا نہیں؟

الجواب :۔ اگر مریض کو دوائی کسی ماہر و تجربہ کار ڈاکٹر یا حکیم کے تجویز کردہ نسخہ کے مطابق کھلانے سے اس کی موت واقع ہو جائے تو کوئی دیت وضمان نہیں، اور اگر دوائی کھلانے والا نہ ڈاکٹر ہے اور نہ ڈاکٹر یا حکیم کے تجویز کردہ نسخہ کے مطابق دوائی کھلائی یا تجویز کردہ نسخہ کی مقدار سے زیادہ کھلا دی جس سے مریض کی موت واقع ہوگئی تو اب کھلانے والا ضامن ہے اس پر دیت اور کفّارہ دونوں واجب ہوں گے۔

لما ورد فی الحدیث :قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من تطیب ولا یعلم منہ طب فھو ضامن۔ (ابو داؤد ج ۲ ص۲۸۲ کتاب الدیات) [2]

---

[1] قال العلامة الزیلعیؒ : موجب القتل بسبب الدیة علی العاقلة الا الکفارة۔
(تبیین الحقائق ج ۶ ص۱۰۲ کتاب الجنایات)

وَمِثلُہٗ فی الھدایة ج ۴ ص۵۶۱ کتاب الجنایات۔

[2] قال العلامة خلیل احمد السھارنفوریؒ : قال الخطابی لا اعلم خلافاً ان المعالج اذا تعدی فتلف المریض ضمن ای الدیة ـــــــ وفیہ ایضاً :لاضمان علی حجام ولا ختان ولا متطیب بشرطین احدھما ان یکونوا ذوی حذق وبصارة فی صناعتھم فان لم یکن کذٰلک لم یحل لہ مباشرة القطع۔ (حاشیة بذل المجھود ج ۱۸ ص۱۰ کتاب الدیات)

مقتول کی دیت کے مستحقین

سوال:۔ ایکسیڈنٹ میں ہلاک ہونے والے کے لیے گاڑی کے ڈرائیور کی طرف سے بطور تاوان ملنے والی رقم میت کی بیوہ کو دی جائے گی یا اس کے بھائیوں کو؟ جبکہ بیوہ کسی دوسری جگہ نکاح کرنا چاہتی ہے۔

الجواب:۔ ایکسیڈنٹ کی صورت میں ہلاک ہونے والے کی دیت ڈرائیور اور اس کے عاقلہ پر واجب ہے اور یہ دیت میت کے ورثاء میں شرعی قاعدہ کے مطابق تقسیم ہوگی۔ مذکورہ صورت میں میت کی بیوہ بھی اس کی وارث ہے اگرچہ وہ کسی اور سے نکاح کرلے۔

قال العلامة برهان الدين المرغينانيؒ: ان القصاص حق جميع الورثة وكذا الدية۔ (الهداية ج۴ ص۵۷۲ كتاب القصاص فى ما دون النفس) [۱]

نیند کی حالت میں ماں کے نیچے دب کر بچہ مر جائے تو کفّارہ اور دیت کا حکم

سوال: بچہ ماں کے پہلو میں سویا ہوا تھا کہ اچانک ماں کے نیچے دب کر مر گیا، اب والدہ کے لیے دیت اور کفارہ کا شرعی حکم کیا ہے؟

الجواب:۔ ایسی حالت میں بچے کا مر جانا جاری مجری خطا کی قسم میں آتا ہے جس میں عاقلہ پر دیت اور قاتل پر کفّارہ لازم ہوتا ہے۔ آجکل عاقلہ سے دیت کی وصولی اسلامی قانون کے اجراء نہ ہونے کی وجہ سے مشکل ہے، اس لیے مذکورہ صورت میں ماں فراغت ذمہ کے لیے کفّارہ ادا کرے گی، نیز بچہ مرتے وقت اگر کسی جائیداد کا مالک ہو تو ماں اس قتل کی وجہ سے بچے کی جائیداد سے محروم ہوگی۔

لما قال الله تبارك وتعالىٰ: وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ۔ (سورة النساء آيت ۹۲)

قال العلامة علاؤالدين الحصكفي رحمه الله: والرابع ما جرى مجراه مجرى الخطاء كنائم انقلب على رجل فقتله لانه معذور كالمخطئ وموجبه الكفارة

---

[۱] قال العلامة ابن نجيم المصري رحمه الله: والورثة فى ذٰلك كلهم سواء۔ (البحر الرائق ج۸ ص۳۱۰ فصل فى الصلح على المال)
وَمِثْلُهٗ فى التفسيرات احمدية ص۱۹۶۔

الدّیۃ علی العاقلۃ۔ (الدرالمختار علیٰ ھامش ردالمحتار ج۵ ص۳۴۲ کتاب الجنایات)[1]

نیند کی حالت میں ماں کے پہلو میں دب کر بچّہ کے مرنے پر پیدا ہونے والے اشکال کا جواب

سوال:۔ نیند کی حالت میں بچہ ماں کے پہلو میں دب کر مر جائے تو وجوبِ دیت اور کفّارہ پر آپ یہ دلیل دیتے ہیں کہ کنائم انقلب علیٰ رجل فقتلہ، کیا یہ قتلِ خطاء یا اس کا قائم مقام ہو سکتا ہے؟ کیا بیداری اور نیند میں فرق نہیں ہے؟ اگر فرق نہیں تو اس حدیث کا کیا مطلب ہے؟ رفع القلم عن ثلث النائم حتیٰ استیقظ۔ آپ کی دلیل کنائم انقلب میں لفظ ام موجود نہیں، نیز آیتِ کریمہ وَلَا تضارّ والدۃ بِوَلَدِھَا اگرچہ رضاعت کے بارے میں ہے لیکن اعتبار عمومِ الفاظ کا ہے، آپ نے اسقاطِ حمل کی دلیل بھی دی ہے لیکن اس میں عورت کا ارادہ ہوتا ہے جبکہ نیند میں ایسا نہیں ہوتا، روزہ کی حالت میں مرد کو احتلام ہو جائے تو روزے کا کفّارہ یا قضا نہیں اس لیے کہ روزہ دار مجبور ہے۔ از راہ کرم میرے ان اشکالات کی وضاحت فرمائیں؟

الجواب:۔ (۱) رفع القلم عن ثلث کا مطلب یہ ہے کہ آخرت میں پکڑ نہ ہوگی، یہ مطلب نہیں کہ دنیا میں اگر کوئی غلطی ہو جائے تو اس کا ضمان نہ ہوگا ورنہ قتلِ خطاء میں وجوبِ دیت پر، نماز میں ترکِ واجب پر سجدۂ سہو، مجنون اور بچہ اگر کسی کا مال ضائع کر دے تو اس پر وجوبِ ضمان کا حکم کیونکر لگتا، بچہ اور مجنون اگر کسی کے ساتھ مل کر کسی کو قتل کریں تو اُن کے عاقلہ پر دیت ہے۔

قال العلامۃ ابو بکر الکاسانیؒ: فتجب الدیۃ ثم ما یجب علی الصبی والمجنون والخاطئ تتحملہ العاقلۃ۔ (بدائع الصنائع ج۷ ص۲۳۶ کتاب الجنایات)

---

[1] قال العلامۃ الکاسانی رحمہ اللہ: النائم ینقلب علی انسان فیقتلہ فھٰذا القتل فی معنی القتل الخطاء من کل وجہ لوجودہ لا عن قصد لانہ مات بثقلہ فترتب علیہ احکامہ من وجوب الکفارۃ والدیۃ وحرمان المیراث۔

(بدائع الصنائع ج۷ ص۲۷۱ کتاب الجنایات)

وَمِثْلُہٗ فی الھدایۃ ج۴ ص۵۶۱ کتاب الجنایات۔

(۲) فقہاء نے جو مثال دی ہے کنائم انقلب علیٰ رجلٍ یہ عام قاعدہ ہے اس میں ماں باپ، بہن بھائی وغیرہ سب داخل ہیں، اس سے مراد شخص کلی ہے ماں باپ وغیرہ اس کے افراد ہیں، اس سے ماں کو مستثنیٰ کر کے اوروں کو داخل کرنا غلط ہے۔

(۳) ماں پر وجوبِ دیت اور کفارہ اس کو ضرر دینا نہیں جیسا کہ آپ سمجھے ہیں، اس طرح تو باپ کے بارے میں بھی حکم ہے کہ بچے کی وجہ سے اس کو تکلیف نہ دو۔ ولا مولود له بولده لیکن باپ اگر بیٹے کو قتل کر دے تو اس پر دیت واجب ہے، نیز دیت کا مطلب یہ ہے کہ عورت اگر بچے کو دودھ دینے سے بالکل معذور ہو تو خاوند اس کو ضرر نہ دے، یہاں عورت بالکل مجبور ہے لیکن نیند میں اگر ماں کے نیچے بچہ دب کر مر جائے تو اس میں اس کی بے احتیاطی کا دخل ضرور ہے، اس لیے علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ فرماتے ہیں: فان النائم لیس من اهل القصد اصلاً وانما وجبت الكفارة لترك التحرز عن نومه موضع یتوهم قاتلاً والكفارة فی قتل الخطاء انما یجب لترك التحرز۔ (رد المحتار ج ۵ ص ۳۴۲ فصل فیما یوجب القود وما لا یوجبه)۔

(۴) چونکہ اسقاطِ حمل نہ قتلِ عمد ہے نہ شبہ عمد اور نہ فعل سببی ہے لعدم التوریث اسقاطِ حمل کے لیے دوائی کھانا اور ماں کا بچے کے ساتھ سونا اختیاری ہے لیکن قتل دونوں صورتوں میں غیر اختیاری ہے۔[۱]

روپے کی شکل میں دیت کی مقدار

سوال: قتلِ خطا کی دیت آجکل رائج کرنسی کے حساب سے کتنے روپے بنتی ہے؟

الجواب: قتلِ خطا کی دیت سو اونٹ یا ایک ہزار دینار یا دس ہزار درہم ہے۔

کما فی الهندیة: ومن العین الف دینار ومن الورق عشرة الاف درهم۔ (الفتاوی الهندیة ج ۶ ص ۵۸۵ کتاب الدیات)۔

ایک درہم تقریباً ساڑھے تین ماشے چاندی کے برابر ہوتا ہے۔ (اوزانِ شرعیہ از مفتی محمد شفیع ص ۱۵)

---

[۱] قال العلامة الزیلعیؒ: کنائم انقلب علیٰ رجل بیان لما اجری مجری الخطاء لان هذا لیس بخطاء حقیقة لعدم قصد النائم الی شیء حتی یصیر مخطاء لمقصود ولما وجد فعله حقیقة وجب علیه ما اتلفه کفعل الطفل۔ (تبیین الحقائق ج ۵ ص ۱۰۱ کتاب الجنایات)

اس حساب سے چاندی کی مقدار ۳۶ سیر ۷ چھٹانک ایک تولہ ۸ ماشے بنتی ہے، اس مقدار چاندی کی مارکیٹ ریٹ میں جو قیمت بنتی ہے وہ قتلِ خطا کی دیت ہوگی۔ [1]

دوش (کاندھے) کی ہڈی توڑنے پر حکومتِ عدل کا حکم

سوال:- ایک شخص کو تین آدمیوں نے خوب مارا جس کی وجہ سے اس کی دوش (کاندھے) کی ہڈی ٹوٹ گئی، مضروب نے ان آدمیوں پر دعویٰ کیا کہ مجھے ضمان دیا جائے، شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب:- صورتِ مسئولہ میں جس مضروب کے کاندھے کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے اس کے لیے تینوں ضاربین (مارنے والے) ضامن ہیں، مساوات کی رعایت ممکن نہ ہونے کی وجہ سے اس میں حکومتِ عدل ہے یعنی مضروب جب علاج معالجہ کرانے کے بعد اچھا ہوجائے تو اس کے علاج معالجہ (یعنی ڈاکٹر کی فیس، ادویات وغیرہ) کا جتنا خرچہ بنتا ہو وہ ان تینوں ضاربین سے مضروب کو دلایا جائے گا۔

قال العلامة ابو بکر الکاسانیؒ: فنقول فی کسر العظام کلہا حکومت عدل الا للسن۔ (بدائع الصنائع ج ۸ ص ۳۲۸ فصل یجب فیہ أرش غیر مقدر) [2]

صلح کے بعد اگر زخمی مرجائے تو دیت کا حکم

سوال:- دو فریقین میں لڑائی کے بعد صلح ہوگئی، مضروب کے ورثاء نے کہا کہ چونکہ مضروب اس لڑائی میں زخمی ہوا تھا لہٰذا اس کی موت اسی زخم کی وجہ سے واقع ہوئی ہے۔ اور واقعی وہ اسی زخم کی وجہ سے فوت ہوا ہے، اب سوال یہ ہے کہ زخمی کرنے والے

---

[1] قال العلامة ابو بکر الجصاص الرازیؒ: فمن الدراہم عشرۃ آلاف درھم ومن الدنانیر الف دینار۔ (الاحکام القرآن ج ۲ ص ۲۳۳)

وَمِثْلُہٗ فی بدائع الصنائع ج ۷ ص ۲۵۴ فصل فی وجوب الدیۃ والکلام فیہا۔

[2] قال العلامۃ ابن نجیمؒ: ولا قصاص فی عظم لقولہ علیہ الصلوٰۃ والسلام لاقصاص فی العظم وقال عمر وابن مسعودؓ لاقصاص فی عظم الا فی السن۔

(البحر الرائق ج ۸ ص ۳۶ باب القصاص فی ما دون النفس)

وَمِثْلُہٗ فی الدر المختار علی ھامش رد المحتار ج ۵ ص ۳۵۴ باب القود فی ما دون النفس۔

شرعاً دیت ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ اگر یہ صلح اور معافی صرف جنایت اور زخم کی ہے اور زخمی اسی جنایت سے پیدا ہونے والے اثرات سے خاموش رہے اور اس زخم کی وجہ سے اس کی موت واقع ہو جائے تو زخمی کرنے والے اور جانی پر دیت لازم ہے اور اگر صلح زخم اور اس سے پیدا ہونے والے اثرات کے بارے میں ہو تو اس کے (صلح کے) بعد اگر زخمی مر جائے تو زخم لگانے والے پر کوئی دیت نہیں ۔

لما قال الامام المرغینانیؒ : ومن قطع ید رجل فعفا المقطوعۃ یدہ عن القطع ثم مات من ذٰلک فعلی القاطع الدیۃ فی مالہ وان عفا عن القطع وما یحدث منہ ثم مات من ذٰلک فھو عفو عن النفس ۔ (الھدایۃ ج ۴ ص ۵۲۶ کتاب الجنایات) [1]

رشتۂ ولادت سے صرف قصاص ساقط ہوتا ہے

سوال :۔ نیند کی حالت میں ماں سے اگر بچہ ہلاک ہو جائے تو عند البعض ماں پر کفارہ نہیں، اس لیے کہ الدر المختار میں ہے : والقتل الموجب للقود اوللکفارۃ وان سقطا بحرمۃ الابوۃ علی ما مر ۔ (ج ۵ ص ۴۸۹ کتاب الفرائض) یعنی ایسا قتل جو موجب کفارہ یا قصاص ہو تو رشتہ ولادت سے دونوں ساقط ہو جاتے ہیں ۔ مہربانی فرما کر الدر المختار کی اس عبارت کی وضاحت فرمائی جائے ؟

الجواب :۔ ماں سے اگر نیند کی حالت میں بچہ ہلاک ہو جائے تو موجب کفارہ و دیت ہے کیونکہ یہ قتل خطاء ہے ۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ : والرابع ماجریٰ مجراہ مجری الخطاء کنائم انقلب علی رجل فقتلہ لانہ معذور کالمخطئ وموجبہ ای موجب ھٰذا النوع من الفعل وما جریٰ مجراہ الکفارۃ والدیۃ علی العاقلۃ ۔ (الدر المختار علیٰ ہامش رد المحتار ج ۵ ص ۳۴۲ کتاب الجنایات)

---

[1] قال العلامۃ التمرتاشیؒ : ومن قطع فعفا عن قطعہ فمات منہ ضمن قاطعہ الدیۃ ولو عفا عن الجنایۃ او عن القطع وما یحدث منہ فھو عفو عن النفس ۔
(تنویر الابصار علیٰ ھامش رد المحتار ج ۵ ص ۳۶۱ فصل فی الفعلین)
ومثلہ فی تبیین الحقائق ج ۶ ص ۱۱۸ فصل ومن قطع ید رجل ۔

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ دیت اور کفارہ دونوں کا وجوب ہے۔

الدرالمختار کی مذکورہ بالا جس عبارت سے عدم قصاص اور کفارہ معلوم ہوتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ رشتہ ولادت سے صرف قصاص ساقط ہوتا ہے کفارہ ساقط نہیں ہوتا، اس لیے کہ علیٰ ما مرّ سے مراد کتاب الجنایات کی طرف اشارہ ہے اور کتاب الجنایات سے صرف سقوطِ قصاص معلوم ہوتا ہے اور دیت اور کفارہ کا وجوب، کتاب الفرائض کی عبارت سہوِ کاتب ہے، وجوبِ کفارہ کی تائید "درمختار" کی مندرجہ ذیل عبارت سے بھی ہوتی ہے۔

قال العلامة الحصكفي رحمه الله: شربت دواء تسقطه عمداً فان كان الولد حياً فمات فعليها الدية و الكفارة (رد المحتار ج۵ ص۳۷۹ فصل فی الجنین، کتاب الجنایات) حالانکہ یہ نہ قتلِ عمد ہے اور نہ شبہ عمد۔ قتلِ خطاء اور شبہ عمد کے حکم میں فرق نہیں ہے۔[1]

جسم کی کسی ہڈی کو توڑنے پر حکومتِ عدل ہوگی

سوال: ایک بچے کو ٹرک پر جیپ نے ٹکر ماری جس سے اس کے پاؤں کی ہڈی ٹوٹ گئی اور بدن پر زخم بھی آئے، بچہ ہسپتال میں زیرِ علاج ہے، تو کیا ڈرائیور پر تاوان ہے یا نہیں؟

الجواب: جس جنایت میں قصاص نہ ہو اور مقرر دیت بھی نہ ہو تو وہاں پر حکومتِ عدل ہوتی ہے یعنی حاکم، قاضی یا تجربہ کار ڈاکٹر متاثرہ حصے کے ٹھیک ہونے کے بعد علاج معالجہ پر ہونے والے اخراجات کا حساب لگا کر زخمی کرنے والے سے وصول کرکے زخمی کو دلوائے جائیں گے۔ بدن کے کسی بھی حصّے کی ہڈی ٹوٹ جانے کی صورت میں حکومتِ عدل ہوتی ہے لہٰذا مذکورہ صورت میں بھی پاؤں کی ہڈی ٹوٹنے میں حکومتِ عدل ہوگی۔

لما قال العلامة ابوبكر الكاساني رحمه الله: فنقول في كسر العظام كلها

---

[1] لما قال العلامة الكاساني رحمه الله: النائم ينقلب على انسان فيقتله فهو القتل فى معنى قتل الخطأ من كل وجه لوجوده لامن قصد لانه مات بثقله فترتب عليه احكامه من وجوب الكفارة والدية وحرمان الميراث والوصية - (بدائع الصنائع ج ۷ ص۲۷۱ مطلب فی معنی القتل الخطاء)

ومثلهٗ فى الهداية ج۴ ص۵۶۱ كتاب الجنايات -

حکومۃ عدلٍ الا للسن۔ (بدائع الصنائع ج ۸ ص ۳۲۳ فصل یجب فیہ أرش غیر مقدر) [1]

والدین کی عدم حفاظت کی وجہ سے بچہ مرجائے تو موجب ضمان نہیں

سوال:۔ ماں نے بچے کو چولھے کے پاس بٹھا رکھا تھا کہ بچہ اچانک چولھے کی آگ کے ساتھ جل کر مرگیا، تو کیا بچے کی والدہ پر ضمان ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ والدین اگر بچے کی حفاظت سے غافل ہوگئے ہوں یا سرے سے حفاظت ہی نہیں کی ہو جس کی وجہ سے بچہ آگ میں جل کر مرگیا یا کسی اور طریقے سے اس کی موت واقع ہوگئی تو والدین پر یا ان میں سے کسی ایک پر کوئی ضمان نہیں، ہاں ان دونوں کو اللہ سے توبہ استغفار کرنا چاہیئے۔

کما فی الهندیة: وعن ابی القاسم فی الوالدین اذا لم یتعاهد الصبیّ حتی سقط من سطح ومات او احترق بالنار لا شیٔ علیهما الّا التوبة والاستغفار واختیار الفقیه ابی اللیث علی انهٗ لا کفارة علیهما ولا علی احدهما۔

(الفتاویٰ الهندیة ج ۶ ص ۳۳ باب الامر بالجنایة ومسائل الصبیان) [2]

کسی کے ہاتھ سے اچانک کوئی چیز گرنے سے کوئی ہلاک ہوجائے تو موجب ضمان ہے

سوال:۔ ایک بچہ چارپائی پر سویا ہوا تھا اس کی والدہ نے اس کے قریب ہی دیوار کے طاق میں گرم دودھ یا پانی رکھا تھا، جب وہ اس کو اٹھانے لگی تو وہ گرم دودھ یا پانی

---

[1] قال العلامة ابن نجیم المصری رحمہ اللہ: ولا قصاص فی عظم لقوله علیه الصلوٰة والسلام لا قصاص فی عظم وقال عمر وابن مسعود لا قصاص فی عظم الّا فی السن۔ (البحر الرائق ج ۸ ص ۳۰۶ باب القصاص فی ما دون النفس)

وَمِثْلُهٗ فی الدر المختار علی هامش رد المحتار ج ۵ ص ۳۵۴ باب القود فی ما دون النفس۔

[2] قال الامام قاضی خان رحمه الله: وقال بعضهم لیس علی الوالدین شیٔ الّا الاستغفار وهو الصحیح۔ (فتاویٰ قاضی خان علی هامش الهندیة ج ۳ ص ۴۴۷ فصل فی اتلاف الجنین)

بچے کے اوپر گرا جس کی وجہ سے بچے کی موت واقع ہوگئی، تو کیا بچے کی ماں پر دیت اور ضمان ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ والدین سے اس طرح اگر کوئی بچہ ہلاک ہو جائے تو یہ قتل بالسبب کے حکم میں ہے، اس قتل سے قاتل کے عاقلہ پر دیت ہے اور خود اس پر کفارہ واجب نہیں ہے، کیونکہ یہ بچہ اس کی غلطی سے ہلاک ہوا اسلئے کہ قاتل کے ہاتھ سے گری ہوئی چیز بچے کی ہلاکت کا سبب ہے۔

قال العلامة ابوبکر الکاسانی رحمہ اللہ: وکذلك اذا کان یمشی فی الطریق حاملاً سیفاً او حجرًا او لبنة او خشبة فسقط من یدہ فقتله لوجود معنی الخطاء فیه وحصوله علی سبیل المباشرة لوصول الآلة بشرة المقتول۔

(بدائع الصنائع ج۷ ص۲۷۱ مطلب قتل الذی فی معنی القتل الخطاء) [1]

سرکاری ملازم کو دوران ڈیوٹی کوئی نقصان پہنچے تو حکومت پر کوئی ضمان نہیں

سوال:۔ ایک آدمی سرکاری ملازم تھا، کام کی زیادتی کی وجہ سے دماغی عارضہ میں مبتلا ہوگیا جبکہ ڈاکٹر نے بھی اس کی تصدیق کردی ہے جس پر اسے قبل از وقت نوکری سے نکال دیا گیا، کیا حکومت پر اس ملازم کی وجہ سے کوئی ضمان ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اس آدمی نے بخوشی یہ ملازمت اختیار کی تھی، اسے معلوم تھا کہ کام زیادہ ہے یا کم، اب اگر زیادہ کام کرنے کی وجہ سے اس کو کوئی دماغی نقصان پہنچا ہے تو یہ اس کا اپنا ذاتی فعل ہے، اب اس آدمی کا دماغی عارضہ میں مبتلا ہو جانے سے حکومت نہ مباشر ہے نہ سبب ہے، اس لیے حکومت پر کسی قسم کا ضمان نہیں۔ حکومت کا

---

[1] قال العلامة الزیلعیؒ: ومن حمل شیئاً فی الطریق فسقط علی انسان ضمن سواء تلف بالوقوع او بالعثرة به بعد الوقوع لان حمل المتاع فی الطریق علی رأسه او علی ظهرہ مباح له لکنه مقید بشرط السلامة بمنزلة الرمی الی الهدف او الصید۔

(تبیین الحقائق ج۶ ص۱۴۶ باب ما یحدث الرجل فی الطریق)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۸ ص۳۵۱ باب ما یحدث الرجل فی الطریق۔

یہ قانون بھی ہے کہ وہ سرکاری ملازم جس کا ریٹائرمنٹ سے قبل میڈیکل بورڈ ہو جائے تو حکومت اس کو یکمشت کچھ رقم ادا کر دیتی ہے یہ حکومت کی اچھی پالیسی ہے۔

فقہاء نے یہاں ایک مثال دی ہے کہ دو آدمی رسہ کشی کر رہے ہوں اور رسی ٹوٹنے کی وجہ سے دونوں پیچھے کی جانب گر کر ہلاک ہو جائیں تو دونوں ایک دوسرے کے ضامن نہیں کیونکہ دونوں کی ہلاکت ان کے اپنے فعل (زور) سے واقع ہوئی ہے۔

لما قال العلامة ابوبکر الکاسانیؒ: فلما سقط علی قفاه علم انه سقط بفعل نفسه وهو مده ففقد مات کل واحد منهما من فعل نفسه فلا ضمان علی احد۔

(بدائع الصنائع ج ۷ ص۲۷۳ مطلب فی المعنی القتل الخطاء) ؎۱

قتل کی نیت سے تلوار اٹھانے والے کے قتل کا حکم

سوال: اگر ایک شخص اپنی جماعت میں سے کسی ایک فرد یا تمام جماعت والوں کو قتل کرنے کے لیے تلوار سونت لے تو کیا اس تلوار سونتنے والے کو وہ شخص یا جماعت اپنا دفاع کرتے ہوئے قتل کر سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب: مشاہر کا خون مباح ہے اس کو قتل کر دینے سے کوئی ضمان لازم نہیں آتا۔

وفی الهندیة: ومن شهر علی المسلمین سیفا وجب قتله ولا شئ بقتله وکذلک اذا شهر علی رجل سلاحا فقتله أو قتل غیره دفعا عنه فلا یجب بقتله شئ الخ

(الفتاوی الهندیة ج۶ ص۷ الباب الثانی فیمن یقتل قصاصا ومن لا یقتل) ؎۲

؎۱ قال العلامة الزیلعی رحمه الله: فان وقعا علی القفا لا تجب لهما دیة لان کل واحد منهما مات بقوة نفسه۔ (تبیین الحقائق ج۶ ص۱۵۱ باب جنایة البهیمة)

ومثلهٗ فی الهندیة ج۶ ص۸۸ کتاب الجنایات

؎۲ قال العلامة الحصکفیؒ: (ویجب قتل من شهر سیفا علی المسلمین) یعنی فی الحال کما نص علیه ابن الکمال الخ۔ (الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۵ ص۳۹۱ فصل فیما یوجب القود وما لا یوجبه)

ومثلهٗ فی الهدایة ج۴ ص۵۶۷ باب ما یوجب القصاص وما لا یوجب۔

کسی کی ٹانگ کی دیت

سوال:۔ سڑک پر ایک بچہ جا رہا تھا کہ اچانک زید نے گاڑی سے اُسے ٹکر ماردی جس کی وجہ سے بچے کی ٹانگ ٹوٹ گئی، تو کیا زید پر کچھ ضمان ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ گاڑی کے ایکسیڈنٹ میں دیت واجب ہوتی ہے اور جب ایک ٹانگ ٹوٹ جائے تو آدھی دیت واجب ہوتی ہے تاہم یہ دیت حالاً نہیں دی جائے گی بلکہ ایک سال تک انتظار کرنا پڑے گا اور ساتھ ہی یہ بات بھی ہے کہ یہ دیت عاقلہ سے وصول کی جائے گی جو مسلمان حاکم اور قاضی کے بغیر کوئی ادا نہیں کرسکتا، موجودہ وقت میں عاقلہ کی عدم موجودگی کی وجہ سے آپس میں صلح کر لینا بہتر ہے۔

وفی الهندیة :وان کان صاحب الدابة راکباً علی الدابة والدابة تسیران وطئت بیدها أو برجلها یضمن وعلی عاقلته الدیة وتلزمه الکفّارة ویحرم عن المیراث۔

وقال فی الهندیة (ج۶ ص۲۷ الباب السابع فی اعتبار حالة القتل) وفی الرجلین کمال الدیة فی الخطاء وفی احداهما نصف الدیة کذا فی المحیط۔ (الفتاوی الهندیة ج۶ ص۵۰ الباب الثانی عشر فی جنایة البهائم والجنایة علیها) [1]

دیت کی شرعی مقدار

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! شریعتِ مقدسہ میں قتل کی دیت کتنی مقرر فرمائی گئی ہے؟

الجواب:۔ شریعتِ مقدسہ میں قتل کی دیت کی مقدار اونٹوں کے اعتبار سے سو اونٹ ہے اور سونے کے اعتبار سے ایک ہزار دینار ہے اور چاندی کے اعتبار سے دس ہزار درہم ہے۔

قال العلامة برهان الدین المرغینانیؒ: والدیة فی الخطاء مائة من الابل اخماساً عشرون بنت مخاض وعشرون بنت لبون وعشرون ابن مخاض

---

[1] قال الشیخ علاؤ الدین الحصکفیؒ: (ضمن الراکب فی طریق العامة) وطئت دابة وما اصابت بیدها أو رجلها او رأسها۔ والرجلان ففیهما الدیة وفی أحدهما نصفها۔

(تنویر الابصار علی هامش رد المحتار ج۵ ص۳۸۶ کتاب الجنایات)

ومثله فی کنز الدقائق ص۴۶۵ وفیها ایضاً ص۴۵۹ کتاب الجنایات۔

وعشرون حقة وعشرون جذعة وقال ومن العين الف دینار ومن الورق عشرة آلاف درهم۔ (الهدایة ج ۴ ص۵۸۶ کتاب الجنایات) [1]

قتل موجب کفر نہیں

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کسی بے گناہ کو قتل کرنے والا انسان کافر ہو جاتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر قتل کو حرام سمجھتے ہوئے کرے تو قاتل کافر نہیں ہوتا اگرچہ قتل عمداً ہو اور ایسے قاتل کی توبہ قبول ہو جاتی ہے، تاہم قتل کو حلال سمجھتے ہوئے کرنے سے آدمی کافر ہو جاتا ہے۔

قال العلامة بدر الدین العینیؒ: وعندنا ان المؤمن اذا قتل مؤمناً لایکفر بفعله ولایخرج به من الایمان الا ان یقتله استحلالاً۔ (عمدۃ القاری جلد ۱۸ ص۱۸۳) [2]

---

[1] قال الامام علاؤ الدین ابی بکر بن مسعود الکاسانی رحمه الله: فان کان (المقتول) ذکراً خلاف فی ان الواجب بقتله من الابل مائة۔ لقوله علیه الصلوٰة والسلام فی النفس المؤمنة مائة من الابل ولاخلاف ایضاً فی انّ الواجب من الذهب الف دینار لما روی انهٗ علیه الصلوٰة والسلام جعل دیة کل ذی عهد فی عهده الف دینار (وقال بعده) واما الواجب من الفضة فقد اختلف فیه قال اصحابنا رحمهم الله تعالیٰ عشرة آلاف درهم وزن وزن سبعة۔ (بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ج ۷ ص۲۵۴ کتاب الجنایات)

وَمِثْلُهٗ فی تبیین الحقائق ج ۶ ص۱۲۶ کتاب الدیات۔

[2] قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: واعلم ان قتل النفس بغیر حق من اکبر الکبائر بعد الکفر بالله تعالیٰ وتقبل التوبة منه فان قتل مسلماً ثم مات قبل التوبة منه لایتحتم دخوله النار بل هو فی مشیئة الله تعالیٰ کسائر اصحاب الکبائر فان دخلها لم یخلد فیها الخ اما الآیة فمؤولة بقتله لایمانه او بالاستحلال او بان یراد بالخلود المکث الطویل۔ (رد المحتار ج ۵ ص۳۴۰ کتاب الجنایات)

وَمِثْلُهٗ فی التفسیرات الاحمدیة ص۱۵ سورة البقرة۔

کسی کو زخمی کرنے پر قصاص کا حکم

سوال:۔ اگر کوئی شخص کسی دوسرے پر حملہ کرکے اس کو زخمی کردے اور زخم سے خون نکل آئے تو اس کے قصاص کی کیا صورت ہوگی؟

الجواب:۔ اگر زخم ایسا ہو کہ جس میں مماثلت ہو سکے تو اس میں قصاص واجب ہے۔

قال العلامة المرغيناني رحمه الله: وفی کل شجة تتحقق فيها المماثلة القصاص انتهى وفی العناية لقوله تعالى وَالْجُرُوحَ قِصَاص ۔ (الهداية ج۴ ص۵۶۹ باب القصاص فيما دون النفس) [1]

دانت توڑنے کا قصاص

سوال:۔ اگر کوئی شخص ضرب لگا کر کسی کا دانت توڑ دے تو ضارب سے قصاص اور دیت کا معاملہ کیسے طے کیا جائے گا؟

الجواب:۔ صورت مسئولہ میں اس ضارب پر قصاص واجب ہے البتہ مصالحت کے طور پر رقم کا لین دین بھی جائز ہے خواہ ہر دانت کے بدلے میں پانچ سو درہم دیا جائے یا کم وبیش دیا جائے۔

لما فی الهندية: وفی السن القصاص وان کان سن من يقتص منه اکبر من سن الآخر ولا قصاص فی عظم الا السن کذا فی الهداية۔ ايضاً: وان شاء ضمنه أرش سنه خمسمائة۔ (الفتاوی الهندية ج۶ ص۱۲،۱۱ الباب الرابع فی القصاص فيما دون النفس) [2]

---

[1] قال ابو البرکات عبدالله بن احمد النسفی رحمه الله: و (يقتص) کل شجة يتحقق فيها المماثلة۔ (کنز الدقائق ص۳۹۳ باب القصاص)

وَمِثْلُهُ فی مختصر القدوری ص۱۷۷ کتاب الجنايات۔

[2] قال العلامة ابن نجيم المصری رحمه الله: وقال عمر وابن مسعود لا قصاص فی عظم الا فی السن۔ البحر الرائق ج ص۳۰۶ وفيه ايضاً ص۳۰۵۔ وفی السراجية فی السن الرجل خمسمائة وفی السن المرأت نصف ذلك۔

وَمِثْلُهُ فی الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۵ ص۳۵۴،۳۵۳ باب القود فيما دون النفس۔

متسبب اور مباشر پر دیت

سوال:۔ (۱) ایک شخص ونیش کا ڈرائیور ہے اور ونیش وہ مشین ہے جس کے ذریعے کنوئیں سے پتھر وغیرہ نکالے جاتے ہیں، عام معمول کے مطابق جس کنوئیں میں کام شروع تھا اس پر تین آدمی کام کر رہے تھے کہ ونیش کی رسی ٹوٹ گئی اور اس کا ڈول ان تینوں آدمیوں پر گر پڑا جس سے دو آدمی زخمی اور ایک ہلاک ہو گیا، اب سوال یہ ہے کہ اس ڈرائیور کے ذمہ شرعی حکم کیا ہے؟

(۲) دوسرا مسئلہ اس سلسلہ میں یہ ہے کہ اس ہلاک ہونے والے شخص کا صرف ایک رشتہ دار موقع پر موجود تھا جبکہ اصل ورثاء پاکستان میں تھے اور یہ واقعہ سعودی عرب میں پیش آیا تھا اور ہلاک ہونے والے شخص کے اس دور کے رشتہ دار کے پاس اسناد موجود نہیں تھے اس لیے اس کو پاکستان میں تصور کر کے اسناد (کاغذات) پاکستان میں بنا کر بھیجے گئے۔ تو ہلاک ہونے والے شخص کے اس رشتہ دار اور ایک شریک شخص نے جس کے ساتھ سعودی عرب کے اسناد موجود تھے ان دونوں نے سعودی عدالت میں اس ڈرائیور کو معاف کر دیا۔

اب سوال یہ ہے کہ ہلاک ہونے والے کے اس رشتہ دار اور شریک کا ڈرائیور کو معاف کر دینے کے بعد اس کے اصل ورثاء یعنی والد اور بھائیوں کو دعوے کا شرعاً حق حاصل ہے یا نہیں؟ اور ڈرائیور کو ان دونوں کی طرف سے معاف کر دینے سے اصل ورثاء کا حق دعوٰے ساقط ہو جاتا ہے یا نہیں؟

یہاں یہ بات ذہن نشین رہے کہ ہلاک ہونے والا شخص اس کام کا ٹھیکیدار اور ونیش کا مالک بھی خود تھا اور یہ اندوہناک واقعہ ونیش کی رسّی کمزور ہونے کی وجہ سے پیش آیا جبکہ ونیش کا مالک رسّی کی اس کمزوری سے آگاہ بھی تھا اور اس نے اس کمزوری کو دُور نہ کیا۔

الجواب:۔ (۱) صورتِ مسئولہ میں یہ قتل (ہلاکت) اقسامِ قتل میں سے ایک قسم جار مجری خطاء میں داخل ہے شرعاً اس قسم کے قتل میں دیت لازم ہوتی ہے جو قاتل ادا کرے گا۔ چونکہ بیان مذکورہ بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ مقتول نے خود کمزور رسّی ڈرائیور کو مہیا کی تھی اور بار بار اس کمزوری سے مطلع کرنے کے باوجود لیت ولعل سے کام لیتا رہا اور اس کمزور رسّی کو تبدیل نہ کیا کہ اچانک یہ حادثہ پیش آگیا۔ تو گویا مقتول خود ہی ایک گونہ اس حادثے کا ذمہ دار ہے اس لیے دیت دونوں (قاتل و مقتول) کے مابین مشترک ہوگا اور مقتول چونکہ فوت ہو چکا ہے لہٰذا اس کا حصّہ دیت ساقط ہوا، باقی قاتل (ڈرائیور) کے

کے ذمے مقتول کے ورثاء کو نصف دیت یعنی پانچ ہزار دراہم چاندی کے یا پانچ سو دینار سونے کے یا اس کی مروجہ قیمت ادا کرنا لازم ہے، مروجہ کرنسی کا حساب کسی ماہر سنار سے لگوایا جائے۔

لما قال الشیخ وھبۃ الزحیلی: یضمن المتسبب مع المباشر اذا کان للسبب تاثیر یعمل بانفرادہ فی الاتلاف متی انفرد عن المباشر ای اذا تعادلت قوۃ السبب والمباشر او اعتدل السبب والمباشر بان تساوی اثرھما فی الفعل کان المتسبب والمباشر مسئولین معاً عن القتل کان اجتمع علی قیادۃ دابۃ سائق وراکب علیھا فما احدثتہ من تلف کان الضمان علیھما لان سوق الدابۃ وحدہ یؤدی الی التلف وان لم یکن ھناک شخص راکب علیھا وکذلک اذا نخس رجل الدابۃ بأمر راکبھا یکون الضمان علی الاثنین! لأن الناخس بمنزلۃ السائق۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ ج ۶ ص ۲۴۸ ثالثاً تضمین المتسبب والمباشر معاً)۔

(۲) کسی قاتل کو دیت وغیرہ معاف کرنا شرعاً مقتول کے ان ورثاء کا حق ہے جو اس کی میراث میں حصۂ شرعی کے حقدار ہوں کوئی دوسرا شخص ان کے اس حق میں تصرف کا اختیار نہیں رکھتا۔ صورتِ مسئولہ کے مطابق ڈرائیور کو معاف کرنے والے دونوں حضرات چونکہ مقتول کے حقیقی وارث نہیں تھے ایک تو مقتول کا دور کا رشتہ دار تھا اور دوسرے کے ساتھ اس کا کوئی رشتہ بھی نہیں تھا جبکہ مقتول کے اصل وارث یعنی اس کا باپ زندہ تھا اسلئے ان ہر دو حضرات کی معافی بلا اذنِ باپ صحیح نہیں اور نہ اس سے ڈرائیور کے ذمہ سے دیت ساقط ہوتی ہے لہٰذا قاتل اپنا حصۂ دیت مقتول کے باپ یا اسکے دیگر شرعی ورثاء کو ادا کرے گا تاہم اگر وہ دیت معاف کریں تو پھر اس صورت میں ڈرائیور کے ذمے سے دیت ساقط ہوگی۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ: ولا یجوز التصرف فی مال غیرہ بلا اذنہ ولا ولایتہ إلا فی مسائل الخ۔ (الدر المختار علی ہامش رد المحتار جلد ۵ ص ۱۴۰ کتاب الغصب)

وقال العلامۃ وھبۃ الزحیلی: ومن لا حق لہ فی العفو ھو الاجنبی غیر الوارث عند الجمھور وغیر صاحب الحق عند المالکیۃ وکذا الاب والجد فی قصاص وجب للصغیر عند المالکیۃ والحنفیۃ لان الصغیر ھو صاحب الحق ولابیہ وحدہ ولایۃ الاستیفاء فقط۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ جلد ۶ ص ۲۹۸ شروط العفو)

اُجرتی قاتل سے قصاص لینے کا حکم

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ حکومتِ پاکستان کے قانون کے متعلق کہ جس شخص کے بارے میں یہ ثابت ہو جائے کہ اس نے کسی شخص کو پیسوں کے ذریعے یعنی اجرتی قاتل سے قتل کرایا ہے تو اس کی سزا بھی قاتل کے برابر ہے یعنی اس کو بھی قصاصاً قتل کیا جاوے گا۔ شریعتِ مقدسہ میں اجرت پر کسی کو قتل کروانے والے کیلئے کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ میں ضابطہ کے مطابق قصاص اجیر پر آتا ہے مستأجر پر نہیں آتا، البتہ مستأجر کو تعزیری سزا دی جائے گی۔

قال العلامة قاضی خان رحمه الله: ولو قال اقتل ابی فقتله كان على القاتل دية لابنه۔ (الفتاوی قاضی خان علی هامش الهندية ج۳ ص۴۴۱ کتاب الجنایات۔ فصل فیمن یقتل قصاصاً وفیمن لایقتل) [۱]

مقتول کے ورثاء کے ذریعے قصاص کے اجراء کی شرعی حیثیت

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! امارتِ اسلامی افغانستان میں اسلامی قوانین کے نفاذ کی وجہ سے جب قصاص لیا جاتا ہے تو بعض اوقات قاضی مقتول کے وارث کو اسلحہ دے کر اپنی موجودگی میں قصاص کا اجراء کراتا ہے، کیا شرعاً یہ طریقہ درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ حدود و قصاص کا اجراء حاکمِ وقت کی ذمہ داری ہے، البتہ ان دونوں میں اتنا فرق ضرور ہے کہ حدود کا اجراء صرف حاکمِ وقت بلاواسطہ کرے گا بخلاف قصاص کے کہ حاکم کی موجودگی میں اس کی اجازت پر مقتول کے وارث سے بھی اس کا اجراء کرایا

---

[۱] وفی الهندية: وفی جنایات المنتقى قال ابو یوسف رحمه الله تعالیٰ قال ابو حنيفة رحمه الله تعالیٰ فی رجلٍ قمط رجلاً فطرحه قدام سبع فقتله السبع لم یکن علی الذی فعل ذلك قودٌ ولا دية لكنهٗ يعزر ويضرب ويحبس حتى يموت الخ۔ (الفتاوی الهندية ج۶ ص۶ کتاب الجنایات۔ الفصل الثانی فیمن یقتل قصاصاً وفیمن لایقتل)

ومثلهٗ فی درر الحکام شرح مجلة الاحکام ج۱ ص۹۱،۹۰ المادة ۸۹، ۹۰۔

جاسکتا ہے ،اور اگر اس طرح قصاص کا اجراء کرنے سے بعد میں فریقین میں فتنہ وفساد کا خطرہ ہو تو اس کا اجراء بھی قاضی خود کرائے تاکہ کوئی فتنہ سر نہ اٹھا سکے۔

لما قال الشیخ وهبة الزحیلی: استیفاء الحدود یکون بواسطة الامام الحاکم واما القصاص فیجوز لولی الدم استیفاؤہ بشرط وجود الامام۔

(الفقہ الاسلامی وادلتہ ج۶ ص۲۶۳ الفرق بین القصاص والحدود الاخری)

قصاص کے اجراء سے گناہ کے ختم ہونے کا حکم

سوال:۔ اگر کسی قاتل سے شریعت کے مطابق قصاص لیا جائے تو کیا اس سے قاتل کا یہ گناہ معاف ہو جائے گا یا نہیں ؟ یا توبہ و استغفار کرنا بھی لازمی ہے کہ بدون اس کے معاف نہ ہوگا ؟ فقہ حنفی کی روشنی میں جواب سے مستفید فرمائیں۔

الجواب:۔ کسی شخص کو قتل کرنے سے دو قسم کے حق قاتل کے ذمے ہوتے ہیں ایک حق العبد یعنی مقتول کے ورثاء کا حق جو کہ قصاص لینے سے پورا ہو جاتا ہے اور دوسرا اللہ تعالیٰ کا حق۔ تو حنفیہ کثر اللہ سوادہم کی اس بارے میں رائے یہ ہے کہ قصاص لینے یا مقتول کے ورثاء کے معاف کر دینے سے اگرچہ حق العبد ادا ہوا لیکن اللہ کے حق کی ادائیگی کا کفارہ نہ ہو سکا بلکہ اس کے لیے توبہ و استغفار ضروری ہے ،اس لیے کہ حنفیہ کے نزدیک حدود زواجر ہیں جوابر نہیں ،البتہ جمہور علماء کے نزدیک حدود چونکہ جوابر (کفارات) ہیں اسلیئے ان کے ہاں قصاص اور عفو سے بھی یہ گناہ ختم ہو جاتا ہے۔

لما قال الشیخ وهبة الزحیلی : اختلف العلماء فی امرہ کما اختلفوا فی الحدود هل هی زواجرام جوابر ؟ قال الجمهور : القصاص من القاتل او العفو عنه یکفر اثم القتل لان الحدود کفارات لاهلها وهذا عام لم یختص قتلا من غیرہ۔ قال النووی : ظواهر الشرع تقتضی سقوط المطالبة بالعقوبة فی الآخرة۔ قال الحنفیة : القصاص او العفو لا یکفر اثم القتل لان المقتول المظلوم لا منفعة له فی القصاص وانما القصاص منفعة للاحیاء لیتناهی الناس عن القتل وَلَکُمْ فِی الْقِصَاصِ حَیٰوۃٌ ۔ (الآیۃ) (الفقہ الاسلامی وادلتہ ج۶ ص۲۶۲ هل القصاص یکفر اثم القتل)

قاضی کا اپنے علم پر قصاص کے اجراء کا حکم دینا

سوال:۔ ہمارے علاقے میں ایک شخص بڑا ظالم اور بدمعاش ہے ،لوگوں کی

عزت وآبرو اور جان ومال کو ہر وقت اس سے خطرہ رہتا ہے، اور اس نے علی الاعلان کئی قتل بھی کیے ہیں جس کا جج (قاضی) صاحب کو بھی خوب علم ہے جبکہ لوگ اس کے ڈر اور خوف کے مارے اس کے خلاف عدالت میں گواہی دینے کو بھی تیار نہیں۔ تو کیا جج اپنی معلومات کے حوالے سے اس کو قصاصاً قتل کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: حنفیہ کے ہاں اس مسئلہ میں دو قسم کی آراء ہیں۔ (۱) متقدمین احناف کے نزدیک قاضی یا جج اپنے علم کے مطابق قصاص لے سکتا ہے (۲) جبکہ متاخرین احناف عدم اجازت کے قائل ہیں کہ قاضی اپنی معلومات کے مطابق قصاص جاری نہیں کر سکتا اور اسی پر فتویٰ ہے۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: یجوز القضاء بعلمہ فی القصاص دون الحدود۔
قال ابن عابدینؒ، تحتہ مبنی علیٰ ان القاضی یقضی بعلمہ فی غیر الحدود والفتویٰ الیوم علیٰ عدم جواز القضاء بعلمہ مطلقاً۔ (رد المحتار والدر المختار ج ۶ ص ۵۴۹ کتاب الجنایات) [1]

حالتِ نشہ میں قتل کرنے والے سے قصاص لینے کا حکم

سوال: اگر کوئی آدمی نشے کی حالت میں زمین وآسمان کا فرق نہ کر سکتا ہو اور نہ ہی اسے ماں، بہن، بیوی اور بیٹی کی تمیز رہتی ہو، اب اگر وہ اسی حالت میں غیر اختیاری طور پر کسی کو قتل کر دیتا ہے تو کیا شرعاً اس سے قصاص لیا جائے گا یا نہیں؟ قرآن وسنت کی روشنی میں اس مسئلہ کی وضاحت فرمائیں؟

الجواب: قاتل سے قصاص لینا مقتول کے ورثاء کا شرعی حق ہے اور وہ بالاتفاق مذاہبِ اربعہ سکران (نشہ والے) سے ساقط نہیں ہوتا، اسلئے صورتِ مسئولہ کے مطابق قاتل سے قصاص لیا جائے گا۔ قرآن وسنت کے حکم کا مخاطب ہونے کیلئے نشہ مانع شرعی نہیں۔

لما قال العلامة وھبة الزحیلی: القصاص من السکران ویقتص من السکران

---

[1] قال العلامة وھبة الزحیلی: یجوز للقاضی القضاء بعلمہ الشخصی فی القصاص دون الحدود وھذا عند متقدمی الحنفیة وافتی المتاخرون بعدم القضاء بالعلم مطلقاً سداً للذریعة اما قضاء السوء سواء فی القصاص والحدود دام فی الاموال وغیرھا۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہٗ ج ۶ ص ۲۶۴ الفرق بین القصاص والحدود الاخری)

بشراب محرم باتفاق مذاهب الاربعة لان السکر لاینافی الخطاب الشرعی ای التکلیف فتلزمه کل احکام الشرع وتصح عباراتہ کلھا فی العقود کالبیع ۔ الخ
(الفقہ الاسلامی وادلتہٗ ج ۶ ص ۲۶۵ شروط القاتل) لہ

مقدارِ دیت سے کم مال پر صلح کرنا

سوال :۔ جناب مفتی صاحب! ہم چند ساتھی مل کر قتل کے سلسلہ میں دو گروپوں کی آپس کی دشمنی کو ختم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور فریقین بھی صلح پر آمادہ ہیں، اب اگر ہم مقدارِ دیت سے کم مال پر فیصلہ کریں اور مقتول کے ورثاء اس پر راضی ہوجائیں تو کیا ایسا کرنا جائز ہے؟

الجواب:۔ قتلِ عمد سے صلح کرنے کی صورت میں دیت کی مقدار کی پابندی ضروری نہیں ہے بلکہ جتنی مقدار مال پر فریقین راضی ہوجائیں اور صلح کریں تو قاتل پر مقتول کے ورثاء کو اتنی مقدار میں مال ادا کرنا لازم ہوگا چاہے وہ مال مقدارِ دیت سے کم ہو یا زیادہ۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: وصح فی الجنایۃ العمد مطلقاً ولو فی نفس مع اقرار باکثر من الدیۃ والارش او باقل لعدم الربٰو۔ وقال العلامۃ ابن عابدینؒ: تحت (قولہ لعدم الربٰو) لان الواجب فیہ القصاص وھو لیس بمال۔
(رد المحتار علی الدر المختار ج۴ ص ۵۳۰ کتاب الدیات) ؎۲

لہ لما قال العلامۃ علاؤ الدین الحصکفی رحمہ اللہ: یجب القود ای القصاص بقتل کل محقون الدم بالنظر لقاتلہ درر۔۔۔۔۔۔۔ بشرط کون القاتل مکلفا لما تقرر انہ لیس لصبی ومجنون عمد۔
{الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۶ ص ۵۳۲ کتاب الجنایات۔ فصل فیما یوجب القود الخ}

؎۲ لما قال العلامۃ وھبۃ الزحیلی: یجوز الاعتیاض فی القصاص بخلاف الحدود ومنھا حد القذف واجاز الشافعیۃ المعاوضۃ فیہ۔
{الفقہ الاسلامی وادلتہٗ ج ۶ ص ۲۶۴ الفرق بین القصاص والحدود الاخری}

مسوّدہ آرڈیننس نفاذ قصاص و دیّت

مجریہ ۱۹۸۰ء

اور

دار العلوم حقانیہ کی سفارشات و ترامیم

حکومتِ پاکستان نے نمبر ۳ (۲۱) (۲۲)/۸۰ آر سی، آئی آئی مجریہ ۱۳ دسمبر ۱۹۸۰ء کے تحت جرائم خلاف جسم انسانی (نفاذ قصاص و دیت آرڈیننس) ۱۹۸۰ء کا مسوّدہ قانون رائے عامہ معلوم کرنے کے لیے مشتہر کیا۔ اسلامی نظریاتی کونسل نے اس مسودہ کو دار العلوم حقانیہ کی تجاویز اور اصلاحی ترمیمات کے لئے بھیجا، چنانچہ دار العلوم حقانیہ کے مفتی اعظم حضرت مولانا محمد فرید صاحب، نائب مفتی حضرت مولانا غلام الرحمٰن صاحب نے شیخ الحدیث حضرت مولانا عبد الحق صاحبؒ کی راہنمائی، مشورہ اور موجودگی میں اس مسودہ پر ازروئے فقہ و شریعت نظر ثانی کی اور جہاں جہاں قابلِ اصلاح چیز نظر آئی اس کی اصلاح کرکے اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین کی خدمت میں ارسال کیا، اور قانونِ قصاص و دیت میں کل ۹ سفارشات پیش کی گئیں۔ (مرتب)

بخدمت اقدس جناب چیئرمین صاحب اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ!

آپ کے مرسلہ مسودہ آرڈیننس جرائم خلاف جسم انسانی (نفاذ قصاص و دیت آرڈیننس ۱۹۸۰ء) پر تفصیلی غور کیا گیا، چونکہ بعض دفعات ایسی تھیں جن کا تذکرہ مسودہ میں اجمالاً تھا اور ان کا تفصیلی حوالہ تعزیراتِ پاکستان پر دیا گیا ہے، تعزیراتِ پاکستان اس وقت ہمارے سامنے نہیں ہے

اور ہم ان کے متعلق اسلامی نقطۂ نظر سے فی الوقت جواب دینے سے قاصر ہیں، جیسا کہ دفعہ ۲
(۵) ۱۰ (الف) (ب)، (ج) (۶) ۱۰۶ (۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۱۱۱ (۱) (۴)، ۱۲۱ (۱) ۲ تعزیرات پاکستان سے
متعلق ہیں۔ اس کے علاوہ دیگر دفعات کے متعلق تجاویز اور ترامیم پیشِ خدمت ہیں:۔

(۱) اس مسودہ میں تقریباً ۳۰ مقامات ایسے ہیں جہاں قیدِ محض یا قیدِ بامشقت کو مختلف مدتوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور یا بعض مقامات پر مختلف تعداد میں کوڑوں کی سزا بیان کی گئی ہے، تو اس کے متعلق گذارش ہے کہ یہ تمام سزائیں جو بیان کی گئی ہیں ان کے ساتھ ساتھ یہ تصریح ضروری کرنی چاہیئے کہ یہ سزائیں محض تعزیرات ہیں۔ جو حکومت کی سیاسی مصلحتوں پر مبنی ہیں ورنہ یہ سزائیں شرعی نہیں ہیں جو کسی خاص نص کے تحت آتی ہوں، البتہ کوڑوں کی سزا کا جن مقامات پر ذکر ہے تو چونکہ یہ غیر منصوص سزاؤں میں ایک شدید ترین سزا ہے لہٰذا اس کے نفاذ میں نہایت احتیاط چاہیئے اور بصورتِ تعزیر دفعِ فساد کیلئے بعض مواقع پر اس کا اجرا کرنا چاہیئے تاکہ لوگوں کے لیے عبرت بنے لیکن اس کو کلیہ نہ بنایا جائے۔ مسودہ کے مندرجہ ذیل مقامات پر یہ سزائیں مذکور ہیں۔ دفعہ (۵) شق ب، ج۔ دفعہ ۱۶، دفعہ ۲۱ ب، دفعہ ۲۳ ب، دفعہ ۳۵ الف، ب، دفعہ ۳۷ الف، ب۔ دفعہ ۳۹، دفعہ ۴۳ ب، ج۔ دفعہ ۴۵ ب، دفعہ ۴۷ ب، دفعہ ۴۸، دفعہ ۵۱ ب، دفعہ ۳۵ ب، دفعہ ۵۸، دفعہ ۶۰، دفعہ ۶۲، دفعہ ۶۳، ۶۶، ۶۸، ۷۰ ا، دفعہ ۷۱ ب ۸۱ — ۸۲ الف ۹۰ — ۹۱ — ۹۴ ج، دفعہ ۹۵، ۹۷ الف ب، دفعہ ۹۸ — ۱۰۹ — ۱۱۱۔

(۲) چونکہ یہ آرڈیننس نفاذ قصاص و دیت سے تعلق رکھتا ہے اور شریعت میں قصاص و دیت کے قانون کو حفاظتِ نفس کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک ضابطہ مقرر فرمایا ہے، لہٰذا اس میں حفاظتِ نفس کے جملہ پہلوؤں پر غور کرنا چاہیئے تاکہ مبادا کسی طریقہ سے مظلوم ورثاء کی حق تلفی نہ ہو جائے۔ لہٰذا قاتلوں کا پورا پورا محاسبہ ہونا چاہیئے، اور جو لوگ قاتلوں کی حمایت کرتے ہیں یا ان کو اپنے ہاں پناہ دیتے ہیں اُن کے لیے بھی از روئے مصلحت کوئی تعزیری قانون مقرر کیا جائے، اگرچہ پناہ دینے والے ایک قوم، ایک قبیلہ یا ایک خاص علاقہ یا حکومت کے بعض افراد ہی کیوں نہ ہوں، اور نیز اُن علاقوں میں بھی قاتلوں کو گرفتار کرنا چاہیئے جو علاقے پولیٹیکل ایجنٹ کے زیرِ نگرانی ہوں جہاں قاتل مفرور ہو کر پناہ لے لیتا ہے۔

(۳) اس مسودہ کے صفحہ ۲ پر دفعہ ۲ کی شق (ج) میں جہاں بالغ[1] کی تعریف کی گئی ہے اس میں کچھ اضافہ ضروری ہے اور یہ تعریف یوں ہونی چاہیئے کہ:۔
"بالغ سے مراد ہر وہ مرد و زن ہے جس پر علامات بلوغ ظاہر ہوئی ہوں مثلاً احبال، حمل یا موئے زیر ناف کا ہونا۔ اور یا عورت سترہ سال اور مرد اٹھارہ[2] سال کی عمر کو پہنچ چکا ہو۔"
مذکورہ دونوں صورتوں میں سے ہر اس صورت کو اعتبار دیا جائے گا جو صورت پہلے وقوع پذیر ہو۔

(۴) صفحہ ۴ دفعہ ۴ کی تشریح میں جہاں گلا گھونٹنے کی صورت کو قتل عمد کی صورتوں میں شمار کیا گیا ہے وہاں یہ تصریح کرنی ضروری ہے کہ اس گلا گھونٹنے کی صورت میں قاتل کو قتل کرنا[3] حداً نہیں ہوگا بلکہ سیاستہً ہوگا۔

ولو خنق رجلاً لا یقتل الا اذا کان الرجل خناقاً معروفاً خنق غیر واحد فیقتل سیاسۃً۔ (الفتاوی الھندیۃ ج ۶ ص۵ کتاب الجنایات، الباب الثالث)[4]
(ترجمہ) "اور اگر کسی کا گلا گھونٹا گیا تو اس قاتل کو قتل نہیں کیا جائے گا، البتہ اگر قاتل مشہور گلا گھونٹنے والا ہو جس نے اس کے علاوہ اور لوگوں کے گلے بھی گھونٹے ہوں تو پھر اس کو از روئے مصلحت سیاستہً قتل کیا جائے گا۔

---

[1] سرکاری مسودہ میں بالغ کی تعریف اس طرح کی گئی ہے کہ جو شخص ۱۸ سال یا بلوغت کی عمر کو پہنچ چکا ہو الخ۔
[2] یہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب ہے، صاحبینؒ کے نزدیک ہر دونوں کے لیے پندرہ سال تک پہنچنا عمر بلوغت ہے۔
[3] یعنی گلا گھونٹنے اور مطلق زہر پلانے کو قتل عمد کہنا صحیح نہیں ہے، البتہ بعض صورتوں میں ایسے شخص کو تعزیراً قتل کیا جا سکتا ہے۔ واضح رہے کہ شرعی اصطلاحات حد اور تعزیر کو بدلنا اور مخلوط کرنا مستقبل میں بہت ہی خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔
[4] قال العلامۃ قاضی خان رحمہ اللہ: ولو خنق رجلاً لا یقتل الا اذا کان الرجل خناقاً معروفاً خنق غیر واحد فیقتل سیاسۃً۔ (فتاوی قاضی خان علی ھامش الھندیۃ ج ۳ ص۴۴۰ کتاب الجنایات، باب القتل)

(۵) مذکورہ بالا صفحہ ۱۴ دفعہ ۴ کی مذکورہ شق میں زہر دلانے کی صورت میں جو قتلِ عمد میں شمار کیا گیا ہے، اس کے متعلق یہ واضح کرنا چاہیئے:-

"کہ اس سے زہر دلانا مراد ہے جسے پلانے والے نے زور اور جبر کر کے بالاکراہ پلایا ہو تو پھر اس میں قصاص اور دیت دونوں نہیں ہیں، البتہ حکومت اس صورت میں بھی دفع فساد کے لیے ازروئے مصلحت سیاسۃً تعزیر دے سکتی ہے۔"

جیسا کہ عالمگیری میں اس کی تصریح موجود ہے:-

واذا ناولہ فشرب من غیر ان اکرھہ علیہ لم یکن علیہ قصاص ولا دیۃ سواء علم الشارب بکونہ سما اولم یعلم ۔ (الفتاوٰی الھندیۃ ج ۶ ص۶ کتاب الجنایات الباب الثانی)

(ترجمہ) "اور جب کسی کو زہر دے کر بغیر کسی زور اور جبر کے پلایا ہو تو اس صورت میں اس پر قصاص اور دیت دونوں واجب نہیں ہیں اگرچہ پینے والے کو اس کے زہر ہونے کا علم ہو یا نہ ہو۔"

صفحہ ۱۲ دفعہ ۱۴ میں قاتل کو بصورت عفو یا صلح کے بعد تعزیراً قتل کرنے میں نہایت ہی احتیاط کرنی چاہیئے تاکہ غیر اسلامی قوانین بالخصوص یہودیت سے امتیاز ہو۔

(۶) صفحہ ۱۷ دفعہ ۲۸ میں قتل کی صورت میں قاتل کو وراثت سے محرومی کا جو حکم بیان کیا گیا ہے اس میں یہ ضروری ہے کہ یہ قتلِ عمد، شبہ عمد، خطاء، جاریٰ مجریٰ خطا کی صورت میں ہے یعنی ان چار صورتوں کے قتل کی صورت میں قاتل مقتول کی وصیت یا حقِ وراثت سے محروم رہے گا اور قتل بسبب کی صورت میں قاتل مقتول کی وراثت سے محروم نہیں رہے گا، جیسا کہ کسی نے اپنی ملکیت کے علاوہ کسی دوسرے کی جگہ میں کنواں کھودا اور کوئی شخص اس کنوئیں میں گر کر ہلاک ہو گیا تو اس کو قتل بسبب کہا جائے گا جس میں قاتل مقتول کی وراثت سے محروم نہیں ہوتا۔ (ملاحظہ ہو فتاوٰی الھندیہ)

واما القتل بسبب فمثل حفر البئر ووضع الحجر فی غیر ملکہ وموجبہ اذا تلف بہ ادمی الدیۃ علی العاقلۃ ولا یتعلق بہ الکفارۃ ولا حرمان المیراث عندنا ۔

(الفتاوٰی الھندیۃ ج ۶ ص۳ کتاب الجنایات - الباب الاول)

(ترجمہ) "اور قتل بسبب جیسا کہ کسی نے اپنی ملکیت کے علاوہ دوسری جگہ میں کنواں کھودا یا کسی نے اپنی ملکیت کے علاوہ دوسری جگہ کوئی پتھر رکھا اور اس کی وجہ سے کوئی شخص ہلاک،

ہوگیا تو اس میں بصورت ہلاکتِ انسان قاتل کے عاقلہ پر دیت واجب ہوگی اور ہمارے مذہب میں اس میں کفارہ اور وراثت سے محرومی نہیں ہے۔"

(۷) صفحہ ۴۶ دفعہ ۱۱۳ میں سزائے موت کی توثیق کا اختیار جس عدالتِ مرافعہ کو دیا گیا ہے اس میں یہ تصریح ضرور کرنی چاہیئے کہ "بشرطیکہ اس عدالتِ مرافعہ کا فیصلہ بھی شرعی ہو۔"

(۸) صفحہ ۴۸ دفعہ ۱۲۳ کے آخر میں یہ اضافہ کرنا چاہیئے: "نیز خاص اور معتمد علیہ اداروں اور اہلِ حل وعقد سے بھی رائے طلب کرنی چاہیئے۔"

(۹) مذکورہ دفعات میں جہاں جرمانہ کا ذکر آیا ہے وہاں جرمانے سے مراد تعزیر بالضرب یا بالحبس مراد ہو نہ کہ تعزیر بالمال، یہ موجودہ مروجہ جرمانہ ایک غیر شرعی امر ہے۔

مسودۂ قانون دیت وقصاص کے بعض زیر بحث نکات

ویسے تو ہر دور میں ایسے لوگ موجود رہے ہیں کہ جن کو دین میں جدت پسندی کا بڑا شوق ہوتا ہے اور وہ ہر مسئلے میں چاہے وہ دینی ہو یا دنیاوی ایک جدت پیدا کرنے کی ناکام کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ دنیاوی امور میں تو ایسا کرنا ممکن ہے مگر دینی امور اور ان کے مسائل میں اپنی ذہنی ساخت کو داخل کر کے اسلام کے مسلمہ اصولوں کو پامال کرنا کسی بھی دور کے علماء حق اور مفتیانِ کرام نے گوارا نہیں کیا اور جب بھی کسی مغرب زدہ اور مفسد خیال شخص نے اسلامی قوانین پر قلم اٹھا کر بزعم خود ان میں جدت پیدا کرنے کی کوشش کی تو ان محافظینِ دین نے ایسے لوگوں کا بھرپور تعاقب کیا اور اُن کے ہر ایک نقطے کا دندان شکن جواب دیا۔

اِسلامی جمہوریہ پاکستان میں جب دیت وقصاص آرڈیننس نافذ ہوا تو اسی "روشن خیال" طبقہ نے اس آرڈیننس کے مسلّمہ نکات کو اپنے مذموم مقاصد کے حصول کے لئے رسائل وجرائد اور اخبارات میں مشق سخن بنایا۔ روز نامہ "مشرق" میں نام نہاد "محقق" اور "سکالر" نے ان مسلّمہ اور طے شدہ نکات پر سوالات اٹھائے۔ جامعہ حقانیہ کے نائب مفتی حضرت مولانا مفتی غلام الرحمٰن صاحب نے اس "محقق" کا بھرپور تعاقب کیا اور قرآن وسُنت کی روشنی میں اس کے ہر سوال کا مدلل جواب دیا جو اُسی وقت دارالعلوم کے ترجمان ماہنامہ الحق میں شائع بھی ہوا ہے اب افادۂ عام کے لئے فتاویٰ دارالعلوم حقانیہ میں شامل کیا جاتا ہے۔ (از مرتب)۔

مسوّدۂ قانون دیّت و قصاص کے بعض زیر بحث نکات

عورت، غیر مسلم اور نابالغ کی شہادت

روزنامہ مشرق مؤرخہ میں کسی ایڈوکیٹ کا مضمون بعنوان "دیت اور قصاص کے مسودۂ قانون کا جائزہ، قصاص سے مستثنیٰ 'قاتل'" نظر سے گذرا، مضمون کے عنوان سے بظاہر مضمون نگار کا اخلاص مترشح ہوتا ہے لیکن حقیقت میں یہ ایک خالی اور بے معنی بلکہ مفسدِ اخلاص ہے، مضمون نگار کی اکثر باتیں قرآن وحدیث سے لاتعلقی پر مبنی ہیں کیونکہ صاحبِ مضمون ہر جگہ اپنی رائے سے قرآن و حدیث کو متصادم کر کے اپنی عقلی توجیہات کو ترجیح دیتے ہیں، مثلاً صاحبِ مضمون لکھتے ہیں۔

"اسلامی قانون کی بنیاد قرآن وسنت ہے، تمام قوانین حالات کو سامنے رکھ کر اجتہاد کے ذریعہ قرآن وسنت کی روشنی میں تشکیل دیئے جانے ضروری ہیں، اجتہاد ہی کے ذریعہ سابقہ فقہاء کی رائے سے اختلاف بھی ہوسکتا ہے، کیونکہ سابقہ فقہاء نے اپنے وقت اور حالات کے تحت قرآن وسُنّت کی روشنی میں کسی مسئلہ پر رائے دی تھی، چونکہ وہ حالات اب نہیں رہے اس لیے ان حالات کے تحت قائم شدہ رائے بھی بدلی جاسکتی ہے، موجودہ مجوزہ مسودۂ قصاص و دیت میں سابقہ فقہ کی کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے لیکن حالات کے تقاضے پورے نہیں کیے گئے ہیں۔"

صاحبِ مضمون کے مذکورہ جملے اس بات پر دال ہیں کہ ائمہ کرام جو اپنے اپنے زمانوں میں محنت ومشقت کر کے لاکھوں مسائل مستنبط کر گئے ہیں، یہ مسائل موجودہ حالات کے تقاضوں کے موافق نہیں ہیں، چند امور چھوڑ کر ترقی کی راہ پر گامزن ہو کر کوئی نئے طریقے اختیار کرنے چاہئیں، معلوم نہیں کہ مضمون نگار کس مسلک سے تعلق رکھتے ہیں، اگر ائمہ اربعہؒ میں سے کسی ایک مسلک سے وابستہ ہوں تو پھر ان کا یہ نظریہ اور رائے غلط اور بے بنیاد ہے۔ کیونکہ اگر اس نظریہ پر عمل کیا جائے تو پھر ائمہ مجتہدین کے ان تمام مسائل کو پسِ پُشت ڈالنا ہوگا جن کے لیے ائمہ کرام نے سالہا سال تک رات دن ایک کر کے محنت کی ہے اور پھر بھی احادیث اور نصوصِ قرآنیہ سے مسائل کا استنباط کرنا بھی کارے دارد، جو عوام کو تو درکنار خواص کو بھی حاصل نہیں ہے، لہٰذا اس فساد وشر کے دور میں ائمہ کرام کی تقلید کے علاوہ کامیابی کا

اور کیا طریقہ ہو سکتا ہے بلکہ ہم جیسے لاعلموں کے لیے تقلیدِ شخصی واجب ہے، چونکہ تقلید کا موضوع خود ایک مستقل موضوع ہے جس پر مختلف کتابیں لکھی گئی ہیں، یہاں ہم تفصیل میں نہیں جانا چاہتے صرف سید الطائفہ مسند الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے ایک دو ارشاد تقلید سے متعلق نقل کرنے پر اکتفاء کرتے ہیں، حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں :-

الامة اجتمعت على ان يعتمدوا على السلف فى معرفة الشريعة فالتابعون اعتمدوا فى ذلك على الصحابة وتبع التابعين وهكذا فى كل طبقة اعتمد العلماء على من قبلهم والعقل يدل على حسن ذلك لان الشريعة لا يعرف الا بالنقل والاستنباط والنقل لا يستقيم الا بان يأخذ كل طبقة عمن قبلها بالاتصال -

(عقد الجيد فى الاجتهاد والتقليد ص ۳۶ باب سوم ان چاروں مذہبوں کے اختیار کرنے کی تاکید)

(ترجمہ) "بےشک تمام امت اس بات پر متفق ہے کہ شریعت کے سمجھنے میں اسلاف ہی پر اعتماد کرنا ہوگا، تابعین نے صحابہ پر اعتماد کرکے دین کو لیا ہے اور تبع تابعین نے تابعین پر اعتماد کیا ہے اور ایسا ہی ہر دور کے علماء نے اسلاف کے نقشِ قدم پر چل کر دین پر عمل کیا ہے، اور عقلاً بھی یہ ایک اچھی بات ہے کیونکہ شریعت کا دارومدار نقل پر ہے اور نقل سوائے اس اتباعِ اسلاف (تقلید) کے اور کسی طریقہ پر ممکن نہیں۔"

اور چند صفحات آگے چل کر حضرت شاہ صاحبؒ مزید فرماتے ہیں :-

وبما اندرست المذاهب الحقه الا هذه الاربعة كان اتباعها اتباعا للسواد الاعظم والخروج عنها خروجا عن السواد الاعظم - (عقد الجيد فى الاجتهاد والتقليد ص ۳۸ باب سوم ان چاروں مذہبوں کے اختیار کرنے کی تاکید)

(ترجمہ) "اور چوتھی صدی (ہجری) میں ماسوائے ان مذاہبِ اربعہ کے اور کوئی حق مذہب نہ رہا تو ان مذاہب کی تقلید اجماعِ امت اور تقلید نہ کرنا مخالفِ اجماعِ امت ہے۔"

لہٰذا ائمہ کرام نے جو مسائل مستنبط کئے ہیں وہ آج بھی حالات کے موافق اور مناسب ہیں، اگر کوئی حکم بظاہر ناموافق معلوم ہوتا ہو تو یہ ہمارے ہی فہم کا قصور ہوگا نفس الامر میں یوں نہیں ہوگا۔ تاہم اگر کوئی ایسا مسئلہ پیش آجائے جس کا حکم فقہ کی کسی کتاب میں موجود نہ ہو تو پھر مستند علماء اور با اعتماد صاحبِ علم حضرات ایسے جزئیات کا حکم باہم مشورہ کرکے قرآن و حدیث اور فقہ کے ان اصولوں کے مطابق نکال سکتے ہیں جن اصولوں پر فقہ کا دارومدار ہے، لیکن ان حضرات کے لیے بھی خاص شروط ہیں جو کتبِ فقہ میں موجود ہیں۔ "خون کا مسئلہ اور آنکھ کی تبدیلی" پر "مجلس تحقیق مسائلِ حاضرہ" کا بحث و تحقیق کے بعد "انسانی اعضاء کی پیوندکاری" کے نام سے رسالہ جاری کرنا اس کا بیّن ثبوت ہے۔

لیکن قصاص و دیت یا اس کے علاوہ اور اس جیسے مسائل جن کا حکم صرف ایک کتاب میں نہیں بلکہ تمام کتب فقہ میں موجود ہیں تو پھر اس کے باوجود ان کو چھوڑ کر نئے راستے تلاش کرنا کہاں کا انصاف ہے بلکہ ماسوائے تضیع اوقات اور باعث اضلال و تضلیل کے اور کوئی فائدہ نہیں ہے ۔

فاعتبروا یا اولی الابصار۔

مذکورہ نام نہاد دانشور صاحب اپنے خود ساختہ نظریہ اجتہاد کو یوں بیان فرماتے ہیں کہ :-

"مثلاً مجوزہ آرڈیننس میں قتل عمد کے ثبوت کے لیے عورت کی گواہی اور معصوم بچے کی گواہی کو قابل قبول نہیں سمجھا گیا ہے، دفعہ ۱۰ میں قتل عمد کے ثبوت کے لیے دو بالغ مردوں کی گواہی کو ہی ضروری قرار دیا گیا ہے ۔ اب فقہاء کے سامنے یہ سوال ہے کہ کیا قرآن و سنت میں عورت اور نابالغ کی گواہی کی ممانعت کر دی گئی ہے، قرآن و حدیث میں ایسی کوئی پابندی نہیں ہے"۔

صاحب مضمون کی یہ تجویز نفاذ شریعت کے لیے معاون نہیں بلکہ مبطل ضرور ہے کیونکہ یہ سراسر اسلام کے خلاف ہے بلکہ حقیقت میں اسلام کی بیخ کنی ہے ؎

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم　　　که با من ہر چہ کرد آں آشنا کرد

شاید صاحب مضمون کو اس حدیث اور آیت کریمہ کا علم نہیں جو حدود اور قصاص میں صرف بالغ مردوں کی گواہی کے متعلق وارد ہے، لیکن ان کے عدم علم کی وجہ سے آیت اور حدیث کا عدم وجود لازم نہیں ہے، بلکہ قرآن و حدیث میں یہ پابندی ہے کہ قتل کے امور میں صرف اور صرف ۲ بالغ مردوں ہی کی گواہی قابل قبول ہے عورتوں کی گواہی قابل قبول نہیں ۔ چنانچہ علامہ زیلعیؒ فرماتے ہیں :-

لحدیث الزهری مضت السنة من لدن رسول الله صلی الله علیه وسلم والخلیفتین من بعده ان لا شهادة للنساء فی الحدود والقصاص ۔ وقال الله تعالیٰ واستشهدوا شهیدین من رجالکم ۔ (تبیین الحقائق ج ۴ ص ۲۰۸ کتاب الشهادة)

(ترجمہ) "حضرت زہریؒ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور سے لے کر خلفائے راشدینؓ میں سے شیخینؓ کے دور تک کسی نے حدود اور قصاص میں عورتوں کی گواہی قبول نہیں کی ہے جبکہ اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں کہ تم دو مردوں کو گواہی کے لیے پیش کرو"۔

اور آگے چل کر مزید فرماتے ہیں :-

ولان شهادة النساء فیها شبهة البدلیة لان کل اثنین منهن قائمة مقام رجل فلا یقبل فیما یندرأ بالشبهة ۔ (تبیین الحقائق ج ۴ ص ۲۰۸ کتاب الشهادة)

(ترجمہ) "اور چونکہ دو عورتوں کا ایک مرد کے قائم مقام ہو کر گواہی دینے کی وجہ سے شبہ بدلیت ہے لہٰذا حد و قصاص میں عورتوں کی گواہی قبول نہیں ہو گی"۔

اب صاحبِ مضمون خود غور کریں کہ کیا عورت کی گواہی پر شریعتِ مقدسہ میں کوئی پابندی ہے یا نہیں؟ موصوف ایک اور جگہ فرماتے ہیں:۔

—— "اب دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر کسی قتل کو ایک بچہ نے، جو کہ سمجھ بوجھ رکھتا ہے، اپنی آنکھوں سے خود دیکھتا ہے وہی اکیلا اس قتل کا گواہ ہے باقی گواہ چشم دید نہیں ہیں بلکہ بچہ ہی واقعاتی گواہ ہے تو اس بچے کی گواہی کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے، جبکہ فطرتاً ایک بچہ جھوٹ بھی کم بولتا ہے، اسے جھوٹ پڑھایا بھی نہیں جا سکتا، وہ قاتل کو بھی پہچانتا ہے اور آلۂ قتل کو بھی پہچانتا ہے، اپنی زبان سے پورا واقعۂ قتل بتا سکتا ہے، تو پھر اس کی گواہی کو نظر انداز کر دینا انصاف کے تقاضوں کے منافی ہے"۔

واضح ہو کہ ایسے واقعات میں بچے کی گواہی کو اعتبار دینا عقلاً و نقلاً باطل ہے۔ نقلاً تو اس لیے کہ قرآنِ مجید نے گواہی دینے کے لیے رَجُلَیْن کا لفظ استعمال کیا ہے اور قرآنِ کریم کی مذکورہ آیت سے بچے کی گواہی کا ناقابلِ قبول ہونا صریح ہے کیونکہ بچے کو رجل نہیں کہا جا سکتا اور نہ اُردو زبان میں بچے کو مرد کہا جاتا ہے، اور عقلاً بھی باطل ہے۔

(۱) فقہاء نے بالاتفاق گواہی کی ادائیگی کے وقت گواہ کا بالغ ہونا شرط قرار دیا ہے۔ چنانچہ علامہ ابن نجیم المصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:۔

ولا تقبل شهادة المملوك والصبي لانهما من الولاية ولا ولاية لهما على انفسهما فالاولى ان لايكون لهما على غيرهما ولاية۔ (البحر الرائق ج ۷ ص ۷۷ کتاب الشہادۃ)

(ترجمہ) "غلام اور نابالغ کی گواہی قابلِ قبول نہیں ہے کیونکہ گواہی ایک طاقت کا استعمال ہے یہ دونوں عاجز ہو کر غیر پر کیا طاقت استعمال کریں گے"۔

(۲) یہ مسلّمات میں سے ہے کہ گواہی کے لیے عقلِ کامل کا ہونا ضروری ہے اور یہی وجہ ہے کہ پاگل کی گواہی قابلِ قبول نہیں ہے، لہٰذا اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ کیا نابالغ بچے کی گواہی درست ہے یا نہیں؟ تو یہ ظاہر ہے کہ بچہ کم عقل اور کم ہوشیار ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ بچہ نابالغی کی عمر میں اپنے مستقبل کی کامیابی کو نہیں سمجھتا، بلکہ ایسے بچے کو والدین یا کسی دوسرے سرپرست کی راہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب ایک بچہ اس حیثیت سے کسی ایسے واقعہ کو کہاں من وعن یاد رکھ سکتا ہے اور پھر

ان حالات میں گواہی کا مکمل اظہار بھی نہیں کر سکتا، اس لیے بچے کی گواہی قابلِ قبول نہیں ہے۔

(۳) اور اگر بالفرض ایک نابالغ لڑکا کسی گواہی کو زبانی یاد کر بھی لے تو عدالت یا کسی مجاز افسر کے سامنے اس کے رعب وجلال اور ہیبت کی وجہ سے مکمل گواہی نہیں سنا سکتا۔

(۴) نابالغ کی قوتِ ارادی مضبوط نہیں ہوتی اس لیے ڈرانے دھمکانے پر بچہ آسانی سے اپنی گواہی سے منحرف بھی ہو سکتا ہے، حقیقت کو غیر حقیقت اور غیر حقیقت کو حقیقت میں تبدیل کر سکتا ہے، بخلاف بالغ آدمی کے جو اپنی قوتِ ارادی پر مضبوطی سے ڈٹ سکتا ہے، گواہی درست اور صحیح نقل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اگر ایک نابالغ کی گواہی پر عمل کیا جائے تو واللہ اعلم کتنے مفاسد کے لیے راہ ہموار ہو جائے گی۔

صاحبِ مضمون آگے چل کر لکھتے ہیں:-

——"غیر مسلم کی گواہی کو نظر انداز کر دینا بھی اسلام کی روح کے خلاف ہے"——

تو واضح ہو کہ غیر مسلم کی گواہی غیر مسلم پر درست ہے، جیسا کہ خود مذکورہ مسودۂ آئین کی دفعہ ۱۰ کی شق (ب) میں کہا گیا ہے۔ اس لیے غیر مسلم کی گواہی مسلمان پر درست نہیں ہے اور یہ اسلام کی روحِ انصاف کے مخالف نہیں بلکہ عین موافق ہے، جیسا کہ علامہ ابن نجیم المصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وقید بقولہ علی مثلہ لانہا لا تقبل علی مسلم ولایۃ ولن یجعل اللہ للکافرین علی المؤمنین سبیلاً۔ (البحر الرائق ج ۶ ص ۹۴ کتاب الشہادۃ)

(ترجمہ) "یعنی غیر مسلم کی غیر مسلم پر گواہی درست ہے لیکن غیر مسلم کی مسلمان پر گواہی درست نہیں ہے کیونکہ قرآن میں ہے کہ اللہ ہرگز کافروں کو مسلمانوں پر غلبہ کی راہ نہیں دے گا۔"

اور نیز کفار چونکہ فطرتاً اسلام سے بغض وعناد رکھتے ہیں اور وہ اپنے اسی بغض وعناد کی وجہ سے اسلام کے ماننے والوں پر نہ جانے کیا کیا جھوٹی گواہی دیں گے جو حقیقت میں اصلاحِ معاشرہ کے لیے ایک تباہ کن چیز بن جائے گی۔

صاحبِ مضمون مزید لکھتے ہیں:-

——"دس سال کی عمر سے اوپر کے قاتل قصاص سے مستثنیٰ نہ ہونے چاہئیں"——

یہ تجویز بھی مذکورہ بالا تجاویز کی طرح ایک مضحکہ خیز تجویز ہے، کیونکہ شریعت میں مرد کے بلوغ کے لیے کم از کم دس سال کا کہیں بھی ذکر نہیں ہے بلکہ کم از کم بارہ سال ہیں لہٰذا دس سال کے

قاتل کو قصاص سے مستثنیٰ نہ کرنا خلافِ شریعت ہے، کیونکہ شریعت میں نابالغ کے فعل پر عدم عقل کی وجہ وجہ سے قصاص نہیں ہے، البتہ عاقلہ سے دیت لینا واجب ہے تاکہ ہر ایک اپنے اپنے نابالغ بچوں کا خیال رکھے۔

مضمون نگار آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

"اولاد کے قاتل کا معاملہ بھی عجیب ہے..... کوئی شخص کسی جنسی ترغیب پر اپنی اولاد کو قتل کر دے یا جب چاہیے دوسرے لڑکوں کی ترغیب پر وراثت سے محروم کرنے کے لیے اپنے لڑکے کو قتل کر دے، مستوجب قصاص نہیں، یہ استثنیٰ اسلام کے اصولوں کے خلاف ہے۔"

(۱) والد کو اولاد کے قتل پر قصاص میں قتل نہ کرنا اہلِ اسلام کا ایک اجماعی مسئلہ ہے، خود رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:۔

لا یقاد الوالد بولدہ۔ (جامع الترمذی ج ۱ ص ۲۵۱ ابواب الدیات) ــــ (ترجمہ) "باپ کو بیٹے کے قتل پر قصاص میں قتل نہیں کیا جائے گا۔"

(۲) والد کی ہمیشہ کے لیے اپنی اولاد سے نہایت ہی محبت اور شفقت ہوتی ہے اور بتقاضائے شفقتِ پدری کوئی سلیم العقل شخص اپنے بیٹے کو قتل نہیں کرتا، لہٰذا اس شبہ کی وجہ سے قصاص ساقط ہو گا۔ جیسا کہ علامہ ابن نجیم المصریؒ فرماتے ہیں:۔

ولان الوالد لا یقتل ولدہ غالباً لوفور شفقتہ فیکون ذلک شبہۃ فی سقوط القصاص۔ (البحر الرائق ج ۸ ص ۲۹۶ کتاب الجنایات)

(ترجمہ) "باپ عموماً اپنے بیٹے سے شفقتِ پدری کی وجہ سے بیٹے کو قتل نہیں کرتا تو اس شبہ کی وجہ سے قصاص ساقط ہو گا۔"

(۳) باپ چونکہ بیٹے کے احیاء اور زندگی کے لیے بظاہر ایک سبب ہے لہٰذا بیٹے کو اب باپ کے خاتمہ کے لیے سبب نہیں بننا چاہیئے۔

ولان الاب لا یستحق العقوبۃ بولدہ لانہ سبب لاحیائہ فمن المحال ان یکون الولد سببا لا فنائہ۔ (البحر الرائق ج ۸ ص ۲۹۶ کتاب الجنایات)

(ترجمہ) "باپ بیٹے کے قتل پر مستحق قصاص نہیں ہے کیونکہ باپ بیٹے کی زندگی کے لیے ایک سبب تھا تو اب بیٹے کا باپ کے فناء کے لیے سبب نہیں ہونا چاہیئے۔"

(۴) باپ اگر مشرک ہو اور بیٹا مسلمان ہو تو باوجود مشرک ہونے کے بیٹا باپ کو قتل نہیں کر سکتا تو

قصاص میں کیسے قتل ہوگا۔

ولهذا لا يقتله اذا وجد في صف المشركين مقاتلته۔ (البحر الرائق ج ۸ ص۲۹۶ كتاب الجنايات)

(ترجمہ) "اور بیٹا مشرک باپ کو جہاد کے دوران بھی قتل نہیں کرسکتا۔"

علاوہ ازیں اگر ایک باپ باوجود اس قدر احترام کے اپنے کسی لختِ جگر کی زندگی کا چراغ گل کردے تو پھر اس پر دیت واجب ہوگی جو کہ خود اس کے اپنے مال سے تین سالوں میں ادا کی جائے گی، اور بصورتِ مصلحت عدالت کی استصواب رائے سے تعزیر کا بھی مستحق ہے، لیکن ازروئے شرع والد پر قصاص نہیں ہے، فتاویٰ ہندیہ میں ہے:۔

وهذه الديات كلها على العاقلة الا في قتل الاب ابنه عمدا فانها في ماله في ثلاث سنين ولا تجب على العاقله۔ (الفتاوى الهندية ج ۶ ص۲۴ كتاب الديات)

(ترجمہ) "دیگر تمام دیات قاتل کے عاقلہ سے لیے جائیں گے البتہ اگر باپ بیٹے کو قتل کردے تو اس کی دیت باپ کے مال سے تین سالوں میں ادا کی جائے گی عاقلہ پر واجب نہیں ہے۔"

بس آخر میں لاعلم محبانِ دین سے عرض کروں گا کہ دینِ اسلام کا دارومدار نقل پر ہے عقل پر نہیں لہٰذا خدارا اس میں ذاتی رائے نہ دیجئے، مستند علماء سے بات پوچھ کر سپرد قرطاس کیا کریں تاکہ کسی کی گمراہی کا ذریعہ نہ بنے، اور اگر کوئی خواہ مخواہ بغض وعناد سے کام لے تو پھر اربابِ اقتدار پر لازم ہے کہ ایسے غیر ذمہ دارانہ بیانات پر اس کا مواخذہ کریں۔

عورت کی دیت نصف ہونے کا مسئلہ

وفاقی کونسل میں کی گئی تقریر

مسودہ قصاص و دیت پر ۲۵ جولائی ۱۹۸۴ء کو وفاقی کونسل میں مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہ کی دس منٹ کے محدود وقت میں کی گئی تقریر وفاقی کونسل سیکرٹریٹ کے ضبط شدہ ریکارڈ سے نقل کرکے "ماہنامہ الحق" نے شائع کیا تھا۔ قانون قصاص و دیت کے ساتھ مناسبت کی وجہ سے افادۂ عام کے لیے فتاویٰ حقانیہ میں شامل کیا جارہا ہے۔ (مرتب)

مولانا سمیع الحق: نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

جناب چیئرمین! یہ موضوع مختلف پہلوؤں کو لیے ہوئے ہے اس لیے دس منٹ میں تو اس کو سمیٹنا بڑا مشکل ہے، میں صرف دو چار اصولی باتیں عرض کروں گا اس لیے کہ جو اختلافی نوٹ ہمارے سامنے آئے ہیں ان میں زیادہ تر انہی باتوں پر زور دیا گیا ہے۔

حدیث کا تشریعی مقام

سب سے پہلی چیز جو سارے نظریاتی انتشار کی اساس بن جاتی ہے اور جس کی طرف میرے ایک دوست نے بھی اشارہ فرمایا کہ حدیث کی جو عظمت اور حیثیت ہے، اور جو تشریعی مقام ہے اسلام میں حدیث کا، اس پر ان دوستوں کی نظر نہیں پڑتی، قرآن کریم نے واضح طور پر بار بار حدیث کی تشریعی حیثیت کو اجاگر کیا ہے اور اس کو حجت تسلیم کرنا اسلام کی بنیادی شرط قرار دیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا (سورۃ النساء ۶۵)

تیرے رب کی قسم (حضور اکرم کو خطاب ہے) کہ یہ لوگ مومن نہیں بن سکتے جب تک تجھے ثالث، فیصلہ کرنے والا اور حکم تسلیم نہ کرلیں پھر ان کے دل میں بھی آپؐ کے فیصلوں پر کچھ بوجھ محسوس نہ ہو اور آپ کے فیصلوں پر سرِ تسلیم خم کرلیں۔

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ :-

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ۔

(سورۃ الاحزاب آیت ۳۶)

کسی مومن اور مومنہ کو (خواہ وہ مرد ہو یا خاتون) کوئی حق نہیں کہ جب اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی فیصلہ کیا تو ان کو اس کے ماننے یا نہ ماننے کا اختیار ہو۔ (بلکہ وہ لازماً تسلیم کرے گا)۔

ام المؤمنین سیدہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں ایک خاتون آئی اور جسم پر نقش و نگار بنانے (گودنے) کے مسئلے کے بارے میں دریافت کیا (جیسے آجکل بھی بعض لوگ جسم پر نقش و نگار گودتے ہیں) تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو پسند نہیں فرمایا۔ اس خاتون نے اس وقت ہی کہا کہ میں نے تو الٓمٓ سے وَالنَّاس تک سارے قرآن کا مطالعہ کیا ہے لیکن اس مسئلے کا ذکر مجھے قرآن میں کہیں نہیں ملا۔ (اس خاتون کے ذہن میں بھی یہی تھا کہ قرآنِ کریم میں جو بات ہے صرف وہی حجت ہے) تو حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ اگر تو نے قرآنِ کریم کو غور سے پڑھا ہوتا تو تُو ضرور اس کا حکم قرآن میں پالیتی، خاتون نے پھر کہا کہ مجھے تو معلوم نہیں ہو سکا، حضرت عائشہ صدیقہؓ نے فرمایا لو قرأتیہ لوجد تیہ یعنی یہ کہ اگر تُو نے غور کیا ہوتا تو تُو معلوم کر لیتی پھر خود ہی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ کیا یہ قرآن مجید میں نہیں ہے: مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا۔ (سورۃ الحشر ۷) یعنی اللہ نے فرمایا "جو حکم تمہیں رسولؐ نے دیا اور جو کچھ دیں اس کو لے لو اور جس چیز سے روکیں اس سے رُک جاؤ"۔

جب قرآن نے یہ اصول بیان کیا ہے اور تمام وہ تفصیلات جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائیں تو گویا وہ عین قرآن ہیں۔

تو ایک تو بنیادی بات یہ ہے کہ ہمارے دوستوں نے اس سارے مسئلہ میں حدیث کے ساتھ صحیح انصاف نہیں کیا۔ ہمارے فاضل دوست چودھری الطاف وغیرہ نے اپنے اختلافی نوٹ میں صفحہ ۱۳۴ میں یہاں تک لکھا ہے کہ احادیث جن کا زیادہ تر بلکہ ۹۹ فیصد حصہ اخبارِ احاد پر مشتمل ہے ان میں نہ تو حقانیت ہے اور نہ ہی پورا یقین شامل ہوتا ہے۔ (نعوذ باللہ من ذٰلک) حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم، ان سب سے جو روایت الگ الگ یا ایک ایک راوی کے ذریعہ نقل ہوئیں اور جو اکیلے کسی صحابی نے سُنی اور وہ اُمت کو بیان کی

ان سب کو اخبار احاد کہا جاتا ہے، اب اگر احادیث کے سارے ذخیرے کو یہ کہا جائے کہ ان میں حقانیت ہی نہیں (نعوذ باللہ) تو پھر ہمارے پاس رہ ہی کیا جائے گا؟

عورت کی دیت نصف ہونے کی روایات

دوسری بنیادی بات جس پر سارا زور دیا جاتا ہے کہ نصف دیت کے بارے میں جو روایت ہے وہ ضعیف ہے، تو اس کے بارے میں صرف اتنی گذارش ہے کہ حدیث کا ایک سلسلہ جو ہے اس مسئلے کا اُسی کو انہوں نے نشانہ بنایا ہے، حالانکہ یہ مسئلہ صرف ایک حدیث میں مذکور نہیں ہُوا کہ عورت کی دیت نصف ہے بلکہ حدیث کی وہ مستند کتابیں جو صحاح ستہ میں شامل ہیں ان سب میں منقول ہے۔ امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے ان احادیث کو نقل کیا ہے، ان کی کتاب سُنن النسائی صحاح ستہ میں شامل ہے، مؤطا امام مالک نے ان احادیث کو نقل کیا ہے جبکہ امت کا ایک بڑا طبقہ امام بخاریؒ کی "صحیح" پر بھی اس کو ترجیح دیتا ہے، گو عام رائے یہی ہے کہ اصح الکتب بعد کتاب اللہ البخاری "یعنی قرآن مجید کے بعد صحیح ترین کتاب بخاری ہے"۔ مگر امت کا ایک طبقہ خاص کر مغربی ممالک، الجزائر، مراکش، تیونس اور افریقہ کے کئی علاقے وہ مؤطا امام مالکؒ کو بخاری شریف پر بھی ترجیح دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ کنز العمال، نصب الرایہ، اور مصنف عبدالرزاق وغیرہ ———— نے ان روایات کو نقل کیا ہے روایت بھی ایک سے نہیں ہے بلکہ حضرت عمرؓ سے حضرت عثمانؓ سے، حضرت علیؓ سے، حضرت ابوہریرہؓ سے اور حضرت زید بن ثابتؓ جیسے کبار صحابہ کی یہی رائے (نصف دیت کی) تھی۔

اور علامہ کاسانیؒ نے "بدائع الصنائع" میں حضرت عمرؓ کا فیصلہ نقل کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے عورت کی نصف دیت کا جو فیصلہ دیا تھا صحابہ کرامؓ کی پوری جماعت میں سے کسی نے بھی اس پر اعتراض نہیں کیا بلکہ سب نے اس کو تسلیم کر لیا تو گویا یہ تمام صحابہ کرامؓ کا اجماع قرار پایا۔ اس کے بعد یعنی خلفائے راشدین کے بعد ائمہ اربعہؒ کا جب زمانہ آتا ہے تو سارے کے سارے ائمہ کرامؒ اس مسئلے پر متفق نظر آتے ہیں۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے قدیم و جدید کسی بھی عالم کا ایک قول اس کے خلاف نہیں سُنا۔ امام شافعیؒ، امام مالکؒ اور امام ابوحنیفہؒ کی فقہ کے حامل ہیں، تو گویا ان سب کی اس کے بارے میں یہی رائے تھی۔

فقہ جعفریہ بھی متفق ہے

ہمارے دوست علامہ سید محمد رضی مجتہد یہاں تشریف رکھتے ہیں میں ان کی موجودگی میں دعوے سے کہتا ہوں کہ فقہ جعفریہ، فقہ زیدیہ اور

شیعہ مکتبِ فکر کے جتنے بھی فقہاء و مجتہد ہیں سب اس بات پر متفق ہیں کہ عورت کی دیت نصف دیت ہے۔ تو ہمارے ان دوستوں کو اس سارے ذخیرے میں سے ایک دو قول ہی ملے ہیں۔

جنابِ والا! یہ ضروری مسئلہ ہے لہٰذا اس کی تشریح کرنے کے لیے آپ مجھے ایک دو منٹ اور دیں کیونکہ یہ مسئلہ اس سارے ہنگامے کی بنیاد قرار دیا گیا ہے، تو نصف دیت کے بارے میں صرف ان دو حضرات کا قول پیش کیا گیا ہے، ایک ابوبکر اصم اور دوسرے ابن عُلیہ۔ جبکہ بدقسمتی سے ہمارے یہ دوست ان میں سے کسی بھی نام کا تلفظ صحیح ادا نہیں کر سکتے، کبھی اس کو ابن اولیاء لکھتے ہیں کبھی اس کو کیا کہتے ہیں۔

اب ابن عُلیہ اور ابوبکر اصم کے بارے میں ہمیں یہ سوچنا چاہیئے کہ یہ ہیں کون لوگ؟ تو سب سے پہلے ان کی یہ رائے امام ابن قدامہؒ نے "المغنی" میں نقل کی، ان دو حضرات کی رائے نقل کرتے وقت وہ یہ کہتے ہیں کہ ان راویوں کے علاوہ کسی اور سے (یعنی نامعلوم راوی سے) مذکور ہے کہ ابن عُلیہؒ اور ابوبکر اصم یہ کہتے تھے کہ عورت کی دیت مرد کے مساوی ہے، ان راویوں کا نام تک نہیں لیا گیا۔ پھر ان (عُلیہؒ اور اصم) کا قول ذکر کرنے کے بعد ابن قدامہ نے صراحت کر دی ہے کہ یہ قول پوری امت کے ہاں متروک ہے کسی نے اس کو اختیار نہیں کیا۔

اب ہم ان دونوں کو علمِ حدیث کے رجال اور اسماء الرجال کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں کہ یہ دونوں کون ہیں؟ اسماء الرجال کا علم اس امت کا عظیم الشان قابلِ فخر کارنامہ ہے۔ ہر ہر راوی کو محدثین اور علماء جرح و تعدیل نے پرکھا ہے۔ تو اب سب سے پہلے ابوبکر اصم کو لیتے ہیں، جرح و تعدیل کی کتابوں میں لکھا ہے کہ امام احمد بن حنبلؒ نے کہا کہ انہوں نے ایک کمزور راوی کا نام لے کر کہا کہ میں اس کو بھی ابن عُلیہ پر ترجیح دوں گا۔ امام نسائیؒ نے کہا کہ یہ شخص متروک ہے اور محدثین کے ہاں بالکل مقبول نہیں ہے۔ ابن معینؒ نے کہا کہ یہ متروک ہے۔ اسماء الرجال کی ایک مستند کتاب "لسان المیزان" میں تو ان کی پوری قلعی کھول دی ہے۔

جنابِ چیئرمین: مولانا قبلہ کل بھی یہ بات ہوئی جو آپ بتا رہے ہیں اور آج صبح آپ سے پہلے بھی ایک صاحب نے انہی کتابوں کے حوالے سے یہ چیزیں بتائیں، بار بار کیوں وہی باتیں آپ دُہرا رہے ہیں؟

مولانا سمیع الحق: میں نے اس مسئلہ پر یہ اختلافی نوٹ دیا تھا کہ دفعہ ۲۸ کے بارے میں جب قرآنِ کریم، احادیث اور فقہاء کی واضح ہدایات ہیں تو اسے .....

جناب چیئرمین: اس طرح سے دوسروں کا حق مارا جائے گا اور کوئی بات نہیں۔
مولانا سمیع الحق: میں یہ عرض کروں گا کہ یہ نصف دیت کا مسئلہ اتنا واضح، قطعی اور مسئلہ ہے کہ اگر اس کو اسی ایوان میں طے شدہ قرار دیا جاتا اور اس بارے میں اللہ اور رسولؐ نے جو فیصلہ کیا تھا اس پر ہم سب سر تسلیم خم کر لیتے اور اس کو سپریم کورٹ یا کسی اور ادارے کے پاس مزید تفصیل کے لیے نہ بھیجتے تو اچھا ہوتا، کیونکہ اس وقت ہزاروں ایسے کیس ہیں جو اس آرڈیننس کے نفاذ کے منتظر ہیں، سینکڑوں لوگ جو کال کوٹھڑیوں میں بند ایک ایک لمحہ اس انتظار میں گن رہے ہیں کہ کب یہ نافذ ہو گا اور کب مصلحت کی راہ کھلے گی اور ہمیں انصاف ملے گا۔ اگر اس کو ہم اسی طرح ملتوی کرتے رہے تو اس کے نفاذ میں مزید تاخیر ہو جائے گی۔ پھر اللہ اور اس کے رسولؐ کے بیان کردہ مسائل و احکام میں ہزاروں حکمتیں ہوتی ہیں، اس میں نہ تو عورتوں سے زیادتی کی گئی ہے نہ مردوں سے، اور اللہ تعالیٰ مسلمانوں اور غیر مسلم سب کا خالق ہے اور آزاد اور غلام تک سب کے قصاص میں مساوات رکھی گئی ہے اسلام میں۔

صرف دیت کے ایک مسئلہ میں جو صرف قتلِ خطا کی صورت سے تعلق رکھتا ہے یہ تفصیل ہے، واضح حدود اور ہدایات ہمارے سامنے ہیں۔ تو میری رائے یہ ہے کہ ہمارے معزز ارکان اس مسئلے کو بھی جس طرح اس کی تشریح قرآن میں ہے اس طرح رکھ دیں، اور اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹ میں بھی اس کی تفصیل تھی کہ مقدار نصف دیت ہو گی تو اسی کو رکھا جائے۔

جناب چیئرمین: مولانا صاحب بہت بہت شکریہ!

الابتدائیہ

جب حکومتِ پاکستان نے قصاص و دیت آرڈیننس جاری کیا تو کچھ لوگوں نے ہڑتالوں اور جلاؤ گھیراؤ کے ذریعہ اس آرڈیننس کو ختم کرنے کیلئے حکومت پر دباؤ ڈالنے کی ناکام کوشش کی۔ اس سلسلہ میں علماء کرام، مفتیانِ عظام اور دوسرے اہلِ علم حضرات نے اسلام کے اس عادلانہ قانون کی وضاحت اور لوگوں کے شکوک و شبہات دور کرنے کے لیے اس کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی تاکہ عقلِ سلیم رکھنے والا انسان بغیر تسلیم و رضا کے رہ نہ جائے ـــــ دارالعلوم حقانیہ کے مفتی اور استاذ الحدیث حضرت مولانا مفتی غلام الرحمٰن صاحب نے بھی اس آرڈیننس کا اجمالی جائزہ لیا اور اس پر تبصرہ اور بعض شبہات کا ازالہ پیش کیا جو دارالعلوم کے ترجمان رسالہ ماہنامہ الحق میں شائع ہوا، بعد ازاں گوجرانوالہ کے ایک عالمِ دین مولانا سید تصدق بخاری صاحب نے اس پر اپنا تنقیدی نکتۂ نظر پیش کیا وہ بھی نذرِ قارئین ہے، پھر اس کے جواب الجواب میں حضرت مفتی صاحب نے اس کا بھرپور تعاقب کیا جو کہ ماہنامہ الحق میں شائع بھی ہوا ـــــ چونکہ ان مضامین کا تعلق بھی فقہ اسلامی کے ایک اہم مسئلہ سے ہے اس لیے بطور افادۂ عام دارالعلوم حقانیہ کے فتاویٰ میں شامل کیا جاتا ہے ـــــ (از مرتب) ـــــ

اسلام کا نظامِ قصاص و دیت

اجمالی جائزہ و تبصرہ اور بعض شبہات کا ازالہ

مولانا مفتی غلام الرحمٰن صاحب

قصاص و دیت کے اعلان کے بعد جب ڈرائیور برادری کی طرف سے اس پر ملک گیر احتجاج ہوا تو ملکی اور غیر ملکی ذرائع ابلاغ کے لیے یہ مسئلہ بڑی اہمیت سے موضوعِ بحث بنا رہا۔ موجودہ قصاص و دیت کے حکومتی اعلان میں اگر شرعی تقاضے پورے کئے گئے ہوتے تو اس کی تائید و تصویب اتنے زوردار لہجے میں ہوتی جتنے کہ اس کی مخالفت میں مقالے لکھے گئے۔ بعض اہم امور میں بے احتیاطی اور تساہل کا یہ نتیجہ نکلا کہ پوری دنیا اسلام کے نظامِ قصاص و دیت سے مذاق کرنے پر اتر آئی۔ خدانخواستہ اگر اسلام کی ان فوجداری دفعات میں شرعی تقاضے پورے نہ کیے گئے تو شاید آئندہ کے لیے کوئی بھی اس ملکِ خداداد میں اسلامی نظام کے نفاذ کی جرأت نہ کر سکے۔

تادمِ تحریر اس مسئلہ پر جو مقالات سامنے آئے ہیں ان میں کوئی ایسا مقالہ نظر سے نہیں گذرا جس میں قصاص و دیت کے سرکاری شائع کردہ قانون میں سقم اور کمزوری کے ہوتے ہوئے شرعی نقطہ نظر سے اس کے قابلِ عمل ہونے کو ثابت کیا گیا ہو، اربابِ علم و دانش اور نفاذِ اسلام کے مخلص اصحابِ فکر نے اصلاح کی کوشش کی، کمزوریوں اور اسقام کی نشاندہی کرنے کے بعد متبادل تجاویز پیش کیں۔

دوسری طرف بعض جدت پسندوں نے موجودہ مسوّدہ قانونِ قصاص و دیت میں سقم اور کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسلام کے نظامِ قصاص و دیت کو اپنا ہدف اور دُرفشانی کا نشانہ بنایا، ایسے رکیک اور غیر معیاری اعتراضات اور شبہات کئے جو کسی مسلمان سے ناقابلِ توقع ہیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کے اکثر اعتراضات کا منشاء مذہب اور عقیدہ سے ناواقفیت کے علاوہ مروّجہ نام نہاد آزادی اور جدت پسندی کی مذموم خواہش رہی۔

قصاص و دیت کے بارے میں اہم شبہ قصاص و دیت آرڈیننس کے بعد قصاص و دیت کے بارے میں جو غلط فہمی پیدا ہوئی اس میں ڈرائیور کو ایک لاکھ ستر ہزار روپے کی ادائیگی کا ذمہ دار ٹھہرانے کے علاوہ خود اس کا فعل بھی موضوعِ بحث رہا، یہ شبہ کیا جاتا ہے کہ ڈرائیور کے ہاتھوں کا قتل قابلِ مواخذہ جرم نہیں قرار دینا چاہیئے، کسی بھی ڈرائیور کی یہ خواہش نہیں ہوتی کہ وہ کسی شخص کو شوقیہ قتل کرے، ڈرائیور احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کے لیے اپنی جان کا نذرانہ بھی پیش کرتا ہے، موت کے منہ میں بیٹھ کر انسان کی خدمت کرتا ہے، آخر اس سے یہ توقع کیسے ممکن ہے کہ وہ جان بوجھ کر کسی کو قتل کرے، جبکہ بسا اوقات ڈرائیور کو خود اپنی جان سے بھی ہاتھ دھونے پڑتے ہیں، ایسی صورت میں ایکسیڈنٹ کی موت کو قابلِ مواخذہ جرم قرار دینا ناانصافی کے مترادف ہے۔

بعض حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ ایکسیڈنٹ کا تصور زمانۂ قدیم میں نہیں تھا کیونکہ اس وقت گاڑیاں نہیں تھیں اس لیے اس کو خواہ مخواہ قتل کی پرانی قسموں میں شمار کرنا لایعنی کوشش ہے۔

قصاص و دیّت کے بارے میں قابلِ تشریح نکات ان شبہات کے ازالہ کے لیے اسلام کے نظامِ قصاص و دیت کے چند پہلوؤں کا جائزہ لینا ضروری ہے تاکہ ایسے غیر معیاری شبہات کا موقع نہ رہے۔

(۱) ایکسیڈنٹ کی صورت میں قتل کی کیا حقیقت ہے اور یہ قتل النفس کی کون سی قسم میں آتا ہے۔

(۲) اسلامی نظامِ قصاص و دیت میں ایسی قسم کے لیے کون سی سزا مقرر ہے اور اس کے اثرات و منافع کیا ہیں؟

(۳) قصاص و دیت آرڈیننس کے مسوّدۂ قانون میں اس اعتبار سے کونسی خامیاں پائی جاتی ہیں۔

تحفظِ نفس کا محیرالعقول نظام ایکسیڈنٹ کے قتل کی حقیقت بیان کرنے سے قبل یہ جاننا چاہیئے کہ اسلام کی رُو سے انسانی نفس کو جو عزت و عظمت اور تقدس حاصل ہے وہ دنیا کے کسی قانون میں نہیں پایا جاتا۔ ایک اسٹیٹ میں انسان کے خون کو بلا امتیازِ مذہب و عقیدہ ہر لحاظ سے تحفظ حاصل ہے، یہ ممکن نہیں کہ نفسِ محترمہ کا خون رائیگاں ہو، جس صورت میں نفسِ محترمہ سے کسی غیر شرعی طریقہ سے کھیلا گیا تو اس کا حساب لیا جائے گا، اگر قصاص کی صورت میں ممکن ہو تو قصاص لیا جائے گا ورنہ دیت لازم ہوگی، اگر قاتل معلوم

نہ ہو تو قسامت کی رُو سے اہلِ محلہ سے دیت لی جائے گی ورنہ بصورتِ دیگر حکومت ذمہ دار ہوگی اس لیے فقہاء کرام نے نفسِ محترم کے ضیاع کی پانچ صورتیں بیان کی ہیں، جن میں ۱۔ قتلِ عمد میں قصاص اور ۲۔ قتل شبیہ بالعمد، خطاء ۳۔ جار مجریٰ خطاء اور قتل بسبب ۵۔ میں دیت لازمی قرار دی ہے۔ موجودہ زیرِ بحث مسئلہ کا تعلق "قتلِ خطاء" سے ہے اس لیے دوسری قسموں کی حقیقت بیان کرنے سے قطع نظر ہم صرف قتلِ خطاء کی حقیقت کا جائزہ لیں گے تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ ایکسیڈنٹ کا قتل "قتلِ خطاء" کے زمرہ میں شمار ہوتا ہے۔

قتلِ خطاء کی حقیقت

"خطاء" کے عنوان سے یہ واضح ہے کہ یہ ایسا قتل ہے جس میں قاتل کا ارادہ اور نیت شامل نہیں، گویا "قتلِ خطاء" کی حقیقت یہ ہے کہ بغیر کسی نیت اور ارادہ کے کسی انسان کے ہاتھ سے دوسرے انسان کی جان ضائع ہو، عموماً اس کی دو صورتیں بنائی جاتی ہیں۔

(۱) خطاء فی القصد (۲) خطاء فی الفعل۔

اوّل الذکر کی حقیقت یہ ہے کہ قاتل غلط فہمی کا شکار ہو یعنی کسی انسان کو حیوان سمجھ کر شکار کی نیت سے اسے مارے، اور مؤخر الذکر کا بیان یہ ہے کہ کسی بے احتیاطی یا فنی غلطی سے کسی انسان کی جان اس کے ہاتھ سے ضائع ہو، مثلاً شکار کو مارتے ہوئے اس کی گولی اچانک انسان کو لگے، یہ دونوں صورتیں ایسی ہیں جن میں قاتل کا یہ ارادہ نہیں ہوتا کہ وہ کسی کو قتل کرے بلکہ بغیر قصد و عمد سے انسان کی جان ضائع ہوئی۔

ایکسیڈنٹ کی صورت بھی کچھ اسی طرح کی ہے کیونکہ اس میں ڈرائیور کا ارادہ نہیں ہوتا کہ وہ کسی انسان کو قتل کرے، ڈرائیور تو اپنے مقصد میں مصروفِ عمل ہوتا ہے، شاید کسی بے احتیاطی یا غفلت اور لاپرواہی سے کسی انسان کی زندگی اس کے ہاتھوں سے تمام ہو، یہ بھی ممکن ہے کہ بسا اوقات ڈرائیور کی غلطی نہ ہو بلکہ مقتول خود عمداً یا سہواً گاڑی کے آگے آئے، لیکن ایسی صورت میں بھی ڈرائیور کو بری الذمہ قرار نہیں دیا جاسکتا کیونکہ قتل ہر صورت میں ڈرائیور کے ہاتھوں سے ہوا ہے۔ مثلاً شکار کو مارتے ہوئے کوئی شخص قصداً شکاری کی بندوق کے سامنے کھڑا ہو جائے تو فقہاء کی رائے میں شکاری کو بری الذمہ قرار نہیں دیا جاسکتا بہرحال ایکسیڈنٹ کا قتل، قتلِ خطاء سے کسی صورت میں زیادہ نہیں۔

قتلِ خطاء کی سزا

دنیا کا کوئی قانون ایسا نہیں جس میں خطاء قابلِ مواخذہ جرم نہ ہو، اگر کوئی شخص کسی کی کوئی قیمتی چیز غلطی سے توڑ دے تو کیا توڑنے والے کو معاف کر دیا جائے گا؟ کہ وہ محض یہ کہہ دے کہ مجھ سے غلطی ہوگئی ہے۔ شریعتِ مقدسہ میں خطاء اور نسیان اُخروی اعتبار

قابلِ مواخذہ جرم نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے کہ:۔

"میری امت کا محاسبہ خطا اور بھول پر نہیں ہوگا۔"

لیکن دنیوی احکام کے اعتبار سے اس پر مواخذہ ہے، جہاں تک حقوق العباد کا تعلق ہے اس میں خطاء اور نسیان کوئی عذر نہیں، خاص کر جب کسی چیز کے ضائع ہونے پر ضمان اور تاوان کا مسئلہ ہو۔

قتلِ خطاء بھی دنیاوی احکام کے اعتبار سے قابلِ مواخذہ جرم ہے، اس پر جو سزائیں مقرر کی گئی ہیں وہ تین ہیں:۔

(۱) اگر مقتول قاتل کا کوئی ایسا قریبی رشتہ دار ہو جس کی موت پر قاتل کو وراثت کا حق پہنچتا ہو تو قتل کرنے کی وجہ سے قاتل حقِ وراثت سے محروم رہے گا، کیونکہ اس میں اس کا بھی احتمال ہے کہ کہیں قاتل نے جائیداد ہتھیانے کے لیے قتل کا یہ طریقہ اختیار کیا ہو۔

(۲) دوسری سزا یہ ہے کہ انسانی جان اللہ تعالیٰ کی عظیم مقدس امانت ہے اس میں خیانت کرنے پر قاتل دو مہینے متواتر روزے رکھے گا تاکہ قاتل کو اپنے کیے ہوئے جرم پر ندامت اور افسوس کا احساس ہو۔ اس کا تعلق چونکہ فیما بینہ و بین اللہ ہے اس لیے اس میں جبر اور طاقت کے استعمال کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

(۳) تیسری سزا خون بہا کی ادائیگی ہے تاکہ انسان کا خون ضائع نہ ہو، قتلِ خطا کی صورت میں خون بہا دس ہزار دراہم ہیں جو دو ہزار نو سو سولہ تولہ آٹھ ماشہ (۲۹۱۶ تولہ، ۸ ماشہ) چاندی کے مساوی ہے لہٰذا اتنی مقدار میں چاندی کی مروّجہ قیمت دیت شمار ہوگی۔ خون بہا کی اتنی خطیر رقم کی تقرری میں بنیادی فلسفہ مقتول کے زخم خوردہ ورثاء کے لیے تسلّی ہے، ممکن ہے کہ اس مالی تعاون سے ان کے جذبات ٹھنڈے ہوں اور انتقامی جذبہ کا جو لاوا اُن کے دلوں میں اُبل رہا تھا شاید خون بہا کی وصولی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے۔

دیت کی ادائیگی کا ذمہ دار کون ہے؟

لیکن اتنی بڑی رقم کی ادائیگی شاید قاتل کے بس میں نہ ہو، ممکن ہے کہ تحمل کی استطاعت نہ رکھنے کی وجہ سے وہ اپنی جان کا نذرانہ پیش کر سکے جس سے دیت کی ادائیگی ناممکن ہو، اس لیے شریعت نے اس کو ممکن بنانے اور قاتل کو ہلاکت کے اس بھنور سے نکالنے کے لیے دیت کی ادائیگی کی ذمہ داری "عاقلہ" کے کندھوں پر ڈالی ہے "عاقلہ" سے مراد اہلِ دیوان (دفتری ریکارڈ میں متعلقہ زمرہ) قوم، قبیلہ ہے۔ "عاقلہ" کے تعین میں بنیادی تصور یہ ہے کہ جن لوگوں سے تکلیف اور مصیبت کے وقت قاتل تعاون اور مدد کی امید رکھتا ہو وہی اس کا

عاقلہ متصور ہوگا، موجودہ وقت میں یونین، محکمہ اور کمپنی اس کے ضمن میں آسکتے ہیں۔ مثلاً سکول کا ایک استاد کہیں قتلِ خطاء کا مرتکب ہو تو اس قتل کی دیت پورے صوبہ کے اساتذہ سے لی جائے گی۔ ممکن ہے کوئی یہ کہے کہ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ ایک گمنام شخص کے جرم کی سزا پورے محکمہ والوں کو دی جائے، لیکن اسلامی ذہن رکھنے والا شخص ایسے لایعنی شبہات کا کبھی تصور بھی نہیں کرتا، کیونکہ تمام مسلمان بمنزلہ جسدِ واحد ہیں، ایک عضو کی تکلیف پر پورا جسم تکلیف محسوس کرتا ہے، مشرق میں رہنے والے کی خوشی اور غم کا احساس مغرب میں رہنے والے مسلمان کو بھی ہوگا۔ کوئی مسلمان کسی دوسرے مسلمان کے مصیبت میں مبتلا ہونے سے لاتعلق نہیں رہ سکتا۔ اسلام میں قومی وحدت اور یگانگت بنیادی چیز ہے؛ لہٰذا ایسی مصیبت میں کم ازکم اس کے عاقلہ کو تعاون کا ہاتھ یقیناً بڑھانا چاہیئے۔

عاقلہ پر دیت کے تعین کا ایک دوسرا فائدہ یہ بھی ہے کہ اتنی بڑی قوم جب دیت ادا کرے گی تو لازماً قاتل کو ایسے اوصاف اور باتوں سے یاد کرے گی جن کا سننا قاتل کے لیے ناگوار ہوگا۔ ایسے قبیح حالات اور مناظر سے بچنے کے لیے آئندہ ہر ایک شخص نہایت احتیاط سے کام لے گا۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو حقیقت میں یہ بھی مہذب طریقہ سے قاتل کو سزا دینے کی ایک صورت ہے، ورنہ ایک معزز شخص لاکھوں روپے قربان کرکے اپنے بارے میں ایسی باتیں سننا گوارا نہیں کرتا۔

دیت کی وصولی کا طریقۂ کار

عاقلہ پر دیت کا جو بوجھ ڈالا گیا ہے یہ کوئی ایسا بوجھ نہیں جو اس کی قوتِ برداشت سے زیادہ ہو، عاقلہ سے دیت مجموعی طور پر تین سالوں میں وصول کی جائے گی، امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق کی روشنی میں ایک شخص پر تین سالوں میں چار دراہم یعنی چودہ ماشہ چاندی کی قیمت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالا جائے گا۔ لہٰذا اگر چاندی کی قیمت ۷۰ روپے فی تولہ ہو تو ایک شخص سے تین سالوں میں صرف ستر (۷۰) روپے وصول ہوں گے جو ماہانہ طور پر دو روپے سے بھی کم بنتے ہیں، پھر اگر قریبی علاقہ میں اتنی گنجائش نہ ہو تو عاقلہ کا دائرہ وسیع کیا جائے گا تاکہ ایک شخص پر زیادہ بوجھ نہ ڈالا جا سکے۔

پھر دیت کی وصولی کے لیے آسان طریقہ متعین کیا گیا ہے کہ دیت لوگوں کے ماہانہ، ششماہی اور سالانہ وظائف سے منہا کی جائے گی۔ موجودہ دور میں اگر ہر ملازم کی تنخواہ سے ماہانہ دیت کی رقم کاٹی جائے تو شاید ہی دو روپے سے متجاوز ہو جو کہ تنخواہ دار طبقہ پر کوئی خاص بوجھ نہیں۔

اس محیر العقول نظامِ تحفظِ جان سے کسی کو ڈرنا نہیں چاہیئے، اسلام دینِ فطرت ہے اس میں نہ ظلم کی حوصلہ افزائی ہے اور نہ ظالم کا استیصال مقصود ہے۔ اسلام میں ظالم اور مظلوم دونوں سے تعاون

کیا جاتا ہے۔ ظالم سے تعاون کا مطلب یہ ہے کہ اس کو ظلم سے باز رہنے پر مجبور کیا جاتا ہے اور مظلوم کی طرف ہمدردی اور تعاون کا ہاتھ بڑھایا جاتا ہے۔ اسلام کے نظام دیت میں اگر ایک طرف قاتل کو جھنجھوڑا جاتا ہے تو دوسری طرف عاقلہ پر یہ ذمہ داری ڈال کر اس کے ساتھ سہولت اور آسانی کا رویہ رکھتا ہے، پھر دیت کی وصولی سے مقتول کے غمزدہ ورثاء کے لیے اطمینان دلانے کا ہمدردانہ رویہ اسلام کا انفرادی مقام ہے۔

موجودہ نظام قصاص و دیت کی خامیاں

نظام قصاص و دیت کا آرڈی ننس کے ذریعہ نافذ کردہ مسودہ کوئی نیا نہیں، اس پر جنرل ضیاء الحق مرحوم کے دور میں اسلامی نظریاتی کونسل نے بہترین کام کیا ہے، اس وقت قصاص و دیت کا سرکاری مسودہ علماء کے سامنے پیش کیا گیا تو ہم دار العلوم حقانیہ کے خدام نے اپنی طرف سے کچھ تجاویز حکومت کو بھیجی تھیں جو ماہنامہ الحق جلد ۱۶ شمارہ ۴ میں شائع ہوئی تھیں۔ حالیہ آرڈیننس میں اسلامی خدوخال کی رعایت نہیں رکھی گئی، قتل خطا کی صورت میں صرف ڈرائیور کو دیت کا ذمہ دار ٹھہرانا اسلام کے عادلانہ نظام کی روح کے منافی ہے، ڈرائیور سے صرف اتنی رقم لی جائے گی جو اس کی برادری کے عام ممبر سے لی جاتی ہے اس میں عاقلہ کو بری الذمہ قرار دینا اسلامی نظام عدل کے تقاضوں کے خلاف ہے۔

ایسا ہی ایک لاکھ ستر ہزار روپے کا قطعی تعین بھی شرعاً درست نہیں اس لیے کہ چاندی کے اعتبار سے شرعی معیار کا اظہار ضروری ہے، یہ قیمت تو وقت کے ساتھ ساتھ کم اور زیادہ ہوتی رہتی ہے، پھر حکومت کا یہ فیصلہ بھی غیر دانشمندانہ ہے جس میں دیت کی ذمہ داری انشورنس کمپنی کے کندھوں پر ڈالی گئی ہے کیونکہ انشورنس کمپنی ہر ایک کی عاقلہ نہیں اور بغیر عاقلہ ہونے کے دیت کی ادائیگی اس کی ذمہ داری نہیں۔ اس میں کوئی اشکال نہیں کہ محکمہ، یونین اور قوم قبیلہ عاقلہ قرار دے کر ان کو دیت کی ادائیگی کا پابند قرار دیا جائے۔

علاوہ ازیں شرعی نظام شہادت کے فقدان کی وجہ سے قصاص و دیت آرڈیننس سے خاطر خواہ نتائج کی توقع بے سود ہے، موجودہ نظام شہادت کے ہوتے ہوئے اس نظام کا کامیابی سے ہمکنار ہونا مشکل نظر آتا ہے، اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ نظام قصاص و دیت کے ساتھ ساتھ نظام شہادت کا بھی شریعت کے مطابق اعلان ہو۔

ایک غلط تاثر کا دفاع

مولانا قاضی عبدالکریم کلاچوی مدظلہ

حمد وصلوٰۃ کے بعد عرض ہے کہ ۱۲ ربیع الاول ۱۴۱۱ھ کے مبارک دن ملک میں قصاص و دیت کا قانون نافذ کیا گیا تو دیندار مسلمانوں نے اسے صدر مملکت کا بہترین کارنامہ قرار دیا جو کہ حقیقت کے عین مطابق تھا ــــ نئی حکومت قائم ہوئی اور معاً بس ڈرائیوروں کی عام ہڑتال کا سانحہ پیش آیا تو افواہ اڑا دی گئی کہ اسلامی قوانین کا برداشت کرنا آسان کام نہیں، یہ تو ایک قانون نافذ کر دینے کا ردِ عمل ہے اور اگر شریعتِ اسلامیہ کو مکمل طور پر نافذ کر دیا گیا تو اس کا انجام کیا ہوگا؟

اس شرارت کے بین السطور دراصل موجودہ حکومت کو خوفزدہ کرنا ہے کہ وہ سینٹ اور قومی اسمبلی سے شریعت کو منظور کرانے کے وعدوں سے پھر جائے اور جس طرح وہ سابقہ حکومت خود اللہ تعالیٰ سے دشمنی مول لے کر غرق ہوئی ہے اسی طرح یہ بھی طبعی عمر پوری کرنے سے پہلے پہلے غرق ہو جائے۔

ہڑتالیوں سے بات چیت کے بعد اخبارات میں یہ اعلان چھپا کہ اسلامی نظریاتی کونسل نے حکومت کو یہ مشورہ دیا ہے کہ وہ قصاص و دیت کے قانون میں ترمیم کرے اور یہ بتایا جائے کہ ڈرائیور پر جو دیت عائد ہوگی وہ اس کا عاقلہ یعنی یونین وغیرہ برداشت کرے گی نہ کہ وہ ذاتی طور پر۔ اب شریعتِ اسلامیہ کے نفاذ سے خوف زدہ لوگوں نے پینترا بدلا اور کہنے لگے کہ:۔

"دیکھا! اسلامی قوانین جنہیں ابدی کہا جاتا ہے اس میں طاقت کے بل بوتے پر ترمیم کی جاسکتی ہے اور یہ کہ نفاذِ شریعت کا نعرہ لگانے والے ؎
خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں"

دراصل نفاذِ شریعت کے مخالفین کو موجودہ انتخابات سے جو دھچکا لگا ہے وہ اپنی خفت کو مٹانے کے لیے اس قسم کے حربے استعمال کرنے لگے ہیں۔

اظہارِ حقیقت

حقیقت یہ ہے کہ ہڑتالیوں کو جو پریشانی لاحق ہوئی ہے وہ اسلام کے قانونِ دیت سے نہیں بلکہ اسلام کے قانونِ دیت میں ترمیم کرنے سے پیش

آئی۔ باوثوق ذرائع کے مطابق سینٹ میں موجود علماء کرام نے قصاص و دیت سے متعلق جو مسودہ پیش کیا تھا اور اسی طرح اسلامی نظریاتی کونسل نے اس کے متعلق جو سفارشات پیش کی تھیں اس میں پہلے ہی سے یہ واضح کر دیا گیا تھا کہ اسلامی شریعت کی رو سے قتلِ خطاء کی دیت مجرم پر نہیں بلکہ عاقلہ یونین پر عائد ہوتی ہے اور یہ کہ وہ تین سال تک اس کو ادا کرنے کے پابند ہیں لیکن سابق حکومت کے کارندوں نے دانستہ یا نادانستہ، اسلام سے ناواقفیت کی بناء پر اسلام کو بدنام کرنے کے لیے "عاقلہ" کا لفظ اڑا دیا جس سے متاثرین کو پریشانی لاحق ہوئی۔ یعنی اسلامی قانونِ دیت سے سے تم نے ایک لفظ (عاقلہ) اڑا دیا تو پریشانی لاحق ہو گئی تم نے توبہ کی اور حذف شدہ لفظ کو کو واپس لاکر اس قانون کو اسلام کے مطابق کر دیا تو اطمینان ہوا۔ اس لیے ملک کے عوام کو عموماً اور حکمرانوں کو خصوصاً یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ شر اور فساد کا منبع اسلامی قوانین میں ردّ و بدل اور ان سے لاپرواہی ہے نہ کہ اسلامی قوانین کا صحیح نفاذ۔

شاعرِ مشرق کا یہ پیغام ایک لمحہ بھی نہیں بھولنا چاہیئے وہ فرماتے ہیں ؎

وہ معزز تھے زمانے میں مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلَاغُ

اصل دیت کیا ہے

سو اونٹ یا دس ہزار دراہم؟

جواب مضمون مفتی غلام الرحمٰن صاحب از مولانا سید تصدق بخاری

مؤقر جریدہ "الحق" دسمبر ۱۹۹۰ء موافق جمادی الاول ۱۴۱۱ھ میں حضرت مولانا مفتی غلام الرحمٰن صاحب مدظلہ العالی کا مقالہ "اسلام کا نظام قصاص و دیت" نظر سے گذرا تو بڑا قلق ہوا کہ حضرتِ موصوف کو بھی دیت کی مقدار کے تعین میں سخت ذہول ہوا ہے۔ آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ "قتل خطاء کی صورت میں یہ خون بہا دس ہزار دراہم ہیں جو دو ہزار تو سو سولہ تولہ آٹھ ماشہ چاندی کے مساوی ہے لہٰذا اتنی مقدار میں چاندی کی مروجہ قیمت دیت شمار ہوگی۔" (الحق ص۳۶) ۔ (ہرگز نہیں) پھر آگے جا کر یوں خامہ فرسا ہیں کہ۔

"چاندی کے اعتبار سے شرعی معیار کا اظہار ضروری ہے۔" (الحق ص۳۸)

حضرت مولانا صاحب موصوف سے اس ذہول کا ارتکاب اس لیے ہوا ہے کہ وہ اصل دیت کی احادیثِ مبارکہ پڑھنے کے باوجود بھول گئے ہیں۔ احادیث کے تتبع سے یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ سونا، چاندی، گائے اور بکریوں وغیرہا کی تعداد کے تعین میں خیر القرون میں کمی بیشی اسی لیے ہوتی رہی ہے اور آئندہ بھی قیامت تک بوقتِ ضرورت ہوتی ہی رہے گی کیونکہ یہ چیزیں اصل دیت نہیں ہیں، اصل دیت سو اونٹ ہی ہیں اسی لیے ان کی تعداد میں کبھی بھی کمی بیشی نہیں ہوئی، مولانا موصوف خود لکھتے ہیں کہ:

"یہ قیمت تو اس وقت کے ساتھ ساتھ کم اور زیادہ ہوتی رہتی ہے"۔ (الحق ص۳۸)

موصوف نے جب حکومت کی مقرر کردہ دیت کو غیر شرعی دیت تسلیم کیا ہے تو پھر حضرت موصوف کی تولوں اور ماشوں والی پیش کردہ دیت بدرجۂ اولیٰ واتم غیر شرعی ہے کیونکہ جس طرح حکومت نے سونے یا چاندی کو اصل دیت تصوّر کر کے مزلت پذیر غلطی کا ارتکاب کیا ہے اسی طرح حضرت صاحب نے دس ہزار دراہم کو اصل دیت تسلیم کر کے بہت ہی بڑی غلطی کا اظہار کیا ہے، آپ خود لکھتے ہیں:-

"ایسا ہی ایک لاکھ ستر ہزار (چھ سو دس) روپے کا قطعی تعین بھی شرعاً درست نہیں اسلیئے

چاندی کے اعتبار سے شرعی معیار کا اظہار لازمی ہے۔" (الحق ص ۳۸)

درحقیقت اصل دیت سو اونٹ ہی ہیں اس لیے دیت کے فیصلہ کے وقت سو اونٹوں کی جو قیمت ہو وہی اصل دیت ہے، دوسری جو چیزیں بھی سہولتاً دیت میں دی جائیں گی وہ سو اونٹوں کی مروجہ قیمت کے مساوی دی جائیں گی، مقررہ چیزوں کی صورت میں اس سے کم یا زیادہ دینے سے شرعی دیت ادا نہ ہو گی جیسا کہ عنقریب آرہا ہے۔

۲۹۱۶ تولے ۸ ماشے چاندی کی موجودہ قیمت بحساب ۵۵ روپے فی تولہ ایک لاکھ ساٹھ ہزار چار سو ستر روپے بنتی ہے جو کہ شرعی دیت نہیں ہے۔

غور فرمائیے موصوف کی مقرر کردہ دیت نفس حکومت کی مقرر کردہ دیت نفس سے دس ہزار روپے سے بھی زیادہ کم ہے جو ناقص ہی نہیں بلکہ انقص ہے۔

حکومت نے قصاص و دیت کا جو آرڈیننس ۱۴ اگست ۱۹۹۰ء کو جاری کیا وہ ۲ اکتوبر ۱۹۹۰ء موافق ۱۲ ربیع الاول ۱۴۱۱ھ کو نافذ العمل قرار دیا گیا جس کی دفعہ ۳۲۰ غیر محتاط ڈرائیونگ کے متعلق ناقص ہی نہیں بلکہ انقص تھی اس لیے اس کے خلاف ملک بھر میں زمینی ذرائع آمدورفت کو معطل کر دینے والی ہڑتال ہوئی۔ مذکورہ آرڈیننس میں یہ مرقوم ہے کہ غیر محتاط ڈرائیونگ کرتا ہوا جو ڈرائیور حادثہ کر کے کسی آدمی کو مار دے گا وہ مرنے والے کے ورثاء کو ایک لاکھ ستر ہزار چھ سو دس روپے بطور دیت دے گا۔ اس کے خلاف مظاہرے اور ہڑتال اس لیے ہوئے تھے کہ اس میں بھی دو نقص تھے۔ ایک تو اس میں اصل دیت کو نظر انداز کر دیا گیا ہے، دوسرا "عاقلہ" کا تعارف نہیں کرایا گیا اور نہ ہی ان کو دیت کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے۔

اس ہڑتال کا مطلب یہ لینا کہ لوگ اسلامی قوانین کو برداشت نہیں کرتے سراسر غلطی اور بے اصل ہے۔ درحقیقت یہ ہڑتال اس لیے ہوئی تھی کہ قصاص و دیت کے آرڈیننس میں ناقابل برداشت نقائص تھے جن کی تنقیح لازمی ہے۔ پھر انشورنس کمپنی کو دیت کی ادائیگی کا ذمہ دار قرار دینا ہر طرح سے شریعت اسلامیہ کے خلاف ہے۔

قانونِ دیت ــــ اصل دیت سو اونٹ ہی ہیں

ابو محمد عبد الملک بن ہشام بن ایوب الحمیری المعافری المصری المتوفی بہا سنۃ ثمان وعشرۃ ومائتین (۲۱۸ھ مطابق ۸۳۳ء) "الرسالۃ المستطرفۃ" میں رقمطراز ہیں:۔

"پہلا مقتول جس کا خون بہا (دیت) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوم فتح مکہ

میں ادا فرمایا وہ جنیدب بن اکوع کا ہے، اسے بنو کعب نے قتل کیا تھا، نبی علیہ السلام نے اس کے خون بہا (دیت) میں سو اونٹنیاں دی تھیں۔" (سیرت ابن ھشام ج ۲ ص ۴۸۳ باب فتح مکہ)

عن ابن عمر قال قام النبی صلی اللہ علیہ وسلم علی درجۃ الکعبۃ یوم الفتح فقال الحمد للہ الذی صدقنا وعدہ ونصر عبدہ وھزم الاحزاب وحدہ الا ان قتیل العمد الخطاء بالسوط او العصا مائۃ من الابل مغلظۃ منھا اربعون خلفۃ فی بطونھا اولادھا۔ (دارقطنی ج ۲ ص ۱۰۵ - البنایۃ فی شرح الھدایۃ ج ۴ ص ۳۸۲ ابن ماجۃ ج ۲ ص ۸۷۵)

(ترجمہ) "حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے دن بیت اللہ شریف کی سیڑھیوں پر کھڑے ہوئے، اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان فرمائی پھر فرمایا شکر ہے اللہ کا جس نے اپنا وعدہ سچا کر دکھایا، اپنے بندہ کو مدد دی اور اس نے تنہا دشمن کے لشکروں کو شکست دی، آگاہ ہو جاؤ خطاء کا مقتول (قتل خطاء) وہ ہے جو کوڑے اور چھڑی سے مارا جائے، اس میں دیت کے سو اونٹ ہیں، ان میں سے چالیس اونٹنیاں حاملہ (گابھن) ہیں۔"

عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ قال کانت قیمۃ الدیۃ علی عھد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثمان مائۃ دینار او ثمانیۃ الاف درھم دیۃ اھل الکتاب یومئذٍ النصف من دیۃ المسلمین قال فکان ذلک کذلک حتی استخلف عمرؓ فقام خطیباً فقال ان الابل قد غلت قال ففرضھا عمرؓ علی اھل الذھب الف دینار وعلی اھل البَقَرَۃِ مائتی بقرۃ وعلی اھل الشاۃ الفی شاۃٍ وعلی اھل الحُلَلِ مائتی حُلّۃٍ۔ قال وترک دیۃ اھل الذمۃ لم یرفعھا فیما رفع من الدیۃ۔ (ابو داؤد ج ۲ ص ۲۷۷ کتاب الدیات)

(ترجمہ) "حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں خون بہا کے اونٹوں کی قیمت آٹھ سو دینار یا آٹھ ہزار دراہم تھی اور اہلِ کتاب کا خون بہا اس زمانہ میں مسلمانوں کے خون بہا سے نصف تھا، جب حضرت عمرؓ کا زمانۂ خلافت آیا تو انہوں نے فرمایا چونکہ اونٹ کی قیمت بڑھ گئی ہے اسلیئے سونا رکھنے والوں کیلئے ایک ہزار دینار خون بہا مقرر کیا ہے اور چاندی رکھنے والوں پر بارہ ہزار دراہم اور گائیں رکھنے والوں پر دو سو گائیں اور بکریاں

رکھنے والوں پر دو ہزار بکریاں اور کپڑے رکھنے والوں پر کپڑوں کے دو سو جوڑے مقرر کئے ہیں اور ذمّی لوگوں کی دیت وہی رکھی ہے جو پہلے تھی۔"

عن ابن عباسؓ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ جعل الدیۃ اثنی عشر الف درھم۔ (جامع الترمذی ج ۳ ص ۲۲۴)

(ترجمہ) "حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بارہ ہزار دراہم خون بہا (دیت) مقرر کیا تھا۔"

علامۃ ابوالفضل جمال الدین عبداللہ بن محمد بن ابی الحسن مکرم بن احمد ابن منظور الانصاری الخزرجی الافریقی المصری ولد ۶۳۰ھ مات فی شعبان ۷۱۱ھ۔

قال وکان اھل الدیۃ الابل ثم قوّمت بعد ذلک بالذھب والفضۃ والبقرۃ والغنم وغیرھا۔ (لسان العرب ج ۱۱ ص ۶۱۴)

(ترجمہ) "صاحب لسان العربؒ فرماتے ہیں کہ اصل دیت سَو اونٹ ہی ہیں صرف لوگوں کی سہولت کے لیے ان اونٹوں کی قیمت کے برابر، بعد میں سونا و چاندی، گائیں اور بکریاں وغیرہا دیت مقرر کی گئی۔"

جس سے ثابت ہوا کہ دیت میں سونے چاندی کا اعتبار نہیں، اصل دیت جب اونٹ ہی ہیں تو دیت میں سَو اونٹ ہی دیتے ہوں گے یا پھر ان کی قیمت کے برابر دوسری مقرر کردہ اشیاء۔ دو سو گائیوں اور دو ہزار بکریوں کی قیمت بھی ایک لاکھ ستر ہزار چھ سو دس روپے سے کہیں زیادہ بنتی ہے لہٰذا ایک لاکھ ستر ہزار چھ سو دس روپے کی دیت درست نہیں۔

فقال الشافعی واحمد فی روایۃ محمد بن المنذر الابل فقط فتجب قیمۃ الابل بالغۃ ما بلغت۔ (البنایۃ ج ۴ ص ۵۵۴)

(ترجمہ) "امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبل رحمہما اللہ بھی جو لوگ کے تو ں فرماتے ہیں کہ اصل دیت سَو اونٹ ہی ہیں جو ان کی قیمت یعنے اسی قیمت کی دوسری مقرر کردہ اشیاء دیت میں دینا ہوں گی۔"

عن عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال الا ان فی قتل العمد الخطاء بالسوط والعصاء مائۃ من الابل مغلّظۃ منھا اربعون فی بطونھا اولادھا۔ وذھب قوم الی ان الدّیۃ المغلّظۃ ارباع خمسون وعشرون بنت مخاض وخمس و عشرون بنت لبون وخمس وعشرون حقۃ وخمس وعشرون جذعۃ۔

(معالم التنزیل ج ص ۲۲۵)

(ترجمہ) "حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے خبردار رہو بیشک قتل عمد خطا کوڑے (تازیانے) اور لاٹھی مارنے سے قتل ہو جائے تو اس کی دیت سَو اونٹ ہیں، ان میں چالیس حاملہ (گابھن) اونٹنیاں ہیں جن کے پیٹوں میں ان کی اولاد ہو ــــ اور ایک گروہ کا میلان اس طرف ہے کہ بلا شبہ دیتِ مغلّظہ چار قسم کے اونٹوں پر مشتمل ہے ــــ اوّلاً: ۲۵ ایسی اونٹنیاں جو ایک برس پورا کر کے دوسرے برس میں داخل ہو گئی ہوں ــــ ثانیاً: ۲۵ وہ اونٹنیاں جو دو برس پورے کر کے تیسرے میں داخل ہو گئی ہوں ــــ ثالثاً: ۲۵ وہ اونٹنیاں جو تین برس کی ہو کر چوتھے برس میں داخل ہو گئی ہوں اور جفتی کے قابل ہوں ــــ رابعاً، ۲۵ وہ اونٹنیاں جو چار برس پورے کر کے پانچویں برس میں داخل ہو گئی ہوں۔ (امام ابوحنیفہؒ اور امام ابویوسفؒ کے نزدیک)"

دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں:-

......وانّ فی النفس الدّیۃ مائۃ من الابل۔ (ابو داؤد، نسائی، ابن خزیمۃ، ابن جارود، ابن حبّان، مسند احمد، بلوغ المرام، کتاب الجنایات)

(ترجمہ) "حضرت عمرو بن حزم اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ قتلِ نفس کی اصل دیت سَو اونٹ ہی ہیں۔"

عن جابر بن عبد اللّٰہ قال فرض رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فی الدّیۃ علیٰ اھل الابل مائۃ من الابل وعلیٰ اھل البقرۃ مائتی بقرۃ وعلیٰ اھل الشاۃ الفی شاۃ وعلیٰ اھل الحلل مائتی حلۃ۔ (تفسیر مظہری ج ۲ ص ۱۸۹، ابو داؤد عن عطاء بن رباح)

(ترجمہ) "حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹ والوں پر سَو اونٹ اور گائے والوں پر دو سو گائیں اور بکریوں والوں پر دو ہزار بکریاں اور کپڑوں والوں پر دو سو جوڑے کپڑے دیت مقرر فرمائی ہے۔"

یہاں یہ بات ذہن نشین رکھتے چلئے کہ اصل دیت سَو اونٹ ہیں اس لیے آجکل کپڑوں کے دو سو جوڑوں کی دیت ادا نہ ہوگی، بلکہ اگر کپڑے ہی دیتے ہوں تو پھر سو اونٹوں کی قیمت کے برابر کپڑا دینا ہوگا۔

عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدّہٖ ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم

قال من قتل خطاءً فدیته من الابل ثلاثون بنت مخاض وثلاثون ابنة لبون وثلاثون حقۃ وعشر بنی لبون ــــ وکان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقولها علی القری اربع مائة دینار او عدلها من الورق ویقومها علی ازمان الابل اذا غلت رفع فی ثمنها واذا اهانت نقص من ثمنها علی نحو الزمان ما کان فبلغ قیمتها علی عهد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما بین اربع مائة دینار الی ثمان مائة دینار او عدلها من الورق ثمانیة الاف وقضی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کان عقله فی البقرة من اهل البقرة مائتی بقرة ومن کان عقله فی الشاة علی اهل الشاة الفی شاة۔ (ابن ماجه ج ۳ ص ۸۷۹)

(ترجمہ) "حضرت عمرو بن شعیب اپنے باپ دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص خطاء سے مارا جائے اس کی دیت (سو ۱۰۰) اونٹ ہیں (تیس ۳۰) ایسی اونٹنیاں ہیں جو ایک سال کی ہوکر دوسرے سال میں لگی ہوں، اور تیس ۳۰ ایسی اونٹنیاں جو دو سال پورے کرکے تیسرے سال میں لگی ہوں، اور تیس ۳۰ ایسی اونٹنیاں جو تین سال کی ہوکر چوتھے سال میں لگی ہوں، اور دس ۱۰ ایسے اونٹ جو دو دو برس کے ہوکر تیسرے تیسرے برس میں لگے ہوں ــــ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم گاؤں والوں پر دیت کی قیمت چارسو دینار لگاتے یا اتنی ہی قیمت کی چاندی، اور دیت کی قیمت اونٹوں کے حساب سے لگاتے، جب اونٹ گراں ہوتے تو دیت بھی گراں (زیادہ) ہو جاتی اور جب اونٹ ارزان ہوتے تو دیت بھی ارزاں (کم) ہو جاتی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک دور میں اونٹ کی قیمت چارسو دینار سے لیکر آٹھ سو دینار تک جا پہنچی تھی۔"

آجکل اونٹوں کی جگہ اگر گائے بکری دیت میں دی جائے تو ان کی قیمتیں سب سے زیادہ ہیں، بتیل بکری لی جائے تو دو ہزار بکریوں کی قیمت تقریباً چالیس لاکھ روپے بنتی ہے، دو دھیل بتیل بکری دو ہزار روپے کی کم از کم ۴۰۰۰۰۰۰ = ۲۰۰۰ × ۲۰۰۰ ــــ چالیس لاکھ روپے۔

میں بازار سے عام بکری کی قیمت معلوم کی تو دو ہزار بکریاں دس لاکھ روپے کی بنتی ہیں، ملاحظہ فرمائیے:-

(۱) اگر ایک بکری کی قیمت پانچسو روپے ہو تو دو ہزار بکریوں کی قیمت کیا ہوگی؟

۱۰۰۰۰۰۰ = ۲۰۰۰ × ۵۰۰ ــــ دس لاکھ روپے۔

غور فرمائیے! سواونٹوں کے بدلے دیت میں اگر دو ہزار بکریاں دی جائیں تو کم از کم دیت دس لاکھ روپے بنتی ہے۔

(۲) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ یہ بھی ہے کہ سواونٹوں کی جگہ گائیں رکھنے والوں سے دو سو گائیں دیت میں دلائی جائیں۔

میں نے مویشی منڈی سے قیمت معلوم کی تو پتہ چلا کہ ایک عام گائے کم از کم بتیس سو روپے کی ملتی ہے۔

۶۴۰۰۰ = ۲۰۰ × ۳۲۰۰ — چھ لاکھ چالیس ہزار۔

علامہ بدرالدین ابو محمد محمود بن احمد عینی حنفی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (ولد ۷۶۲ھ توفی ۸۵۵ھ) رقمطراز ہیں کہ:۔

قال الامام الاستیجابیؒ قیمۃ کل حُلّۃ خمسون درھما وقیمۃ کل بقرۃ خمسون درھما وقیمۃ کل شاۃ خمسۃ دراھم۔

(البنایۃ فی شرح الھدایۃ ج۴ ص۸۵۴)

(ترجمہ) علامہ استیجابیؒ فرماتے ہیں کہ ایک جوڑا کپڑے کی قیمت پچاس درہم اور ایک گائے کی قیمت پچاس دراہم اور ایک بکری کی قیمت پانچ دراہم تھی۔

آٹھ سو دینار، دس ہزار درہم، سو گائیں، ہزار بکریاں، دو سو جوڑے کپڑوں کی قیمتیں سو اونٹوں کی قیمت کے برابر نہ تھیں۔ اس لیے سیدنا عمر فاروقؓ نے یہ فیصلہ فرمایا تھا کہ اب اونٹوں کی قیمتیں بڑھ گئی ہیں لہٰذا سو اونٹوں کے بدلے ایک ہزار دینار یا بارہ ہزار دراہم یا دو سو گائیں یا دو ہزار بکریاں دیت میں دلائی جائیں گی۔

یاد رہے کہ دراہم و دنانیر اور گائیں اور بکریوں وغیرہا کی تعداد اس لیے بڑھتی گھٹتی رہی ہے کہ وہ اصل دیت نہیں، اصل دیت چونکہ سو اونٹ ہی ہیں اس لیے ہر زمانہ میں اونٹوں کی اصل قیمت کے برابر دوسری مقرر کردہ اشیاء کی تعداد بھی بڑھتی گھٹتی رہی ہے اور رہے گی۔

خیر القرون میں جب اونٹ ارزاں ہوتے تو دیت بھی کم ہو جاتی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اصل دیت کی قیمت چار سو دینار سے لے کر آٹھ سو دینار تک جا پہنچی تھی، چاندی کے آٹھ ہزار دراہم اس کے مساوی ہوتے تھے، نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم بھی

ارشاد فرمایا کہ گائے والوں اور بیل والوں سے دیت میں ۲۰۰ سو گائیں اور بکریوں والوں سے دو ہزار بکریاں لی جائیں۔

ملحوظہ: یہ بات ذہن نشین رہے کہ قتلِ نفس کی اصل دیت چونکہ ۱۰۰ اونٹ ہی ہیں اس لیے سنتِ قائمہ کے مطابق ہر زمانہ میں اونٹوں کی قیمت کے نرخ کے حساب سے ہی دیت ادا کی جائے گی خواہ وہ کم ہو یا زیادہ۔

کما مر۔ ویُقوّمُها علیٰ اثمانِ الابلِ فاذا غلت رفع قیمتها واذا هاجت رخص نقص من قیمتها۔ الخ (ابو داؤد، نسائی، مظاہر حق جلد ۳ ص ۲۶۶، مشکوٰۃ ص ۳۰۴)

(ترجمہ) "اور قیمت ٹھہراتے (نبی کریمؐ) دیت خطا کی اوپر مول اونٹوں کے پھر جس وقت مہنگے ہوتے اونٹ تو زیادہ کرتے قیمت دیت کی اور جب ظاہر ہوتی ارزانی اونٹوں کی تو قیمت کم کرتے دیت سے۔" (مظاہر حق جلد ۳ ص ۲۶۶)

اس حدیث کے تحت شاہ عبد العزیزؒ[1] محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد رشید اور نواسہ مولانا مخدومنا و مکرمنا حاجی محمد[2] اسحاق روح اللہ روحہ کے شاگرد رشید مولانا قطب[3] الدین ابن محمد محی الدین احراری الدہلوی رحمہ اللہ رقمطراز ہیں کہ:۔

"کہا طیبیؒ نے یہ دلالت کرتی ہے کہ اصل دیت میں اونٹ ہیں پس اگر نہ ملیں (اونٹ) تو واجب ہوتی ہے قیمت ان کی جس قدر کہ ہو۔"

(ملاحظہ ہو مظاہر حق جلد ۳ ص ۲۶۷ طبع اول شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور)

ایک اور جگہ قتلِ عمد کی دیت کی بابت ارشاد ہو رہا ہے اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ اصل دیت میں ۱۰۰ اونٹ ہی ہیں۔

عن عمرو بن شعیب عن ابیه عن جدّه ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال من قتل متعمّدًا دفع الی اولیاء المقتول فان

---

[1] ولادت: ۱۱۵۹ھ مطابق ۱۷۴۹ء۔ وفات ۱۲۳۸ھ مطابق ۱۷ جولائی ۱۸۲۳ء

[2] ولادت: ۱۱۹۷ھ ذی الحجہ۔ وفات ۲۵ رجب ۱۲۶۲ھ۔ محدث لاہوری ثم الدہلوی۔

[3] ولادت: ۱۲۱۹ھ وفات ۱۲۷۹ھ

شاؤا قتلوا، وان شاءوا اخذوا الدية وهي ثلاثون حقة وثلاثون جذعة واربعون خلفة وما صالحوا عليه فهو لهم۔ (جامع الترمذی جلد ۲ ص۴۲۱)

(لسان العرب جلد ۱۵ ص۳۱۳)

(ترجمہ) "حضرت عمرو بن شعیبؓ اپنے باپ سے اور ان کے باپ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو شخص کسی جان کو جان بوجھ کر قتل کر دے تو قاتل کو مقتول کے وارثوں کے حوالے کیا جائے گا، وہ اگر چاہیں تو قاتل کو اپنے مقتول کے بدلے قتل کر دیں اور اگر وہ چاہیں تو دیت لے لیں اور وہ دیت سو اونٹنیاں ہیں، ان میں سے تیس ۳۰ ایسی اونٹنیاں ہیں جو کہ تین برس پورے کر کے چوتھے برس میں داخل ہو گئی ہوں، اور تیس ۳۰ وہ جو چار برس پورے کر کے پانچویں برس میں داخل ہو گئی، اور چالیس اونٹنیاں گابھن (حاملہ) ہوں گی اور مقتول کے وارث جس بات پر صلح کر کے فیصلہ کر لیں وہی قاتل پر واجب ہو گی۔"

ایک اور جگہ قتلِ خطاء کی اصل دیت بھی سو ۱۰۰ اونٹ ہی مقرر فرمائے گئے ہیں، ارشادِ نبوی ؐ ہے:۔

عن عبد الله بن مسعود رضی الله عنه قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم فی دية الخطاء عشرون حقة وعشرون جذعة وعشرون بنت مخاض وعشرون بنت لبون وعشرون بنی مخاض۔ (ابن ماجه ج ۳ ص۸۷۹)

(ترجمہ) "حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ (متوفی ۳۲/۳۳ ھجری) سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قتلِ خطاء کی اصل دیت میں بیس ۲۰ اونٹنیاں وہ ہیں جو تین سال پورے کر کے چوتھے سال میں داخل ہو گئی ہوں، اور بیس ۲۰ اونٹنیاں ایسی ہوں جو چار سال پورے کر کے پانچویں سال میں لگی ہوئی ہوں اور بیس ۲۰ اونٹنیاں وہ جو ایک سال کی ہو کر دوسرے سال میں لگی ہوئی ہوں اور بیس ۲۰ اونٹنیاں وہ جو دو برس کی ہو کر تیسرے برس میں داخل ہو چکی ہوں اور بیس ۲۰ اونٹ وہ جو ایک ایک سال کے ہو کر دوسرے سال میں لگے ہوئے ہوں۔"

عن عبد اللہ بن مسعود قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی دیۃ الخطاء عشرون حقۃ وعشرون جذعۃ وعشرون بنت مخاض وعشرون بنت لبون وعشرون بنی مخاض۔

(ابوداؤد ج ۲ ص ۲۷۷، ابن ماجہ ج ۲ ص ۱۹۳ مطبوعہ مطبع مجتبائی دہلی۔ ابن کثیر ج ۱، ص ۵۳۵ نسائی، ترمذی، مظہری ج ۲ ص ۱۸۷، موطا امام مالک ص ۲۹۳ باب الدیۃ، کتاب العقول)

(ترجمہ) "حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی علیہ السلام نے فرمایا خطاء کی اصل دیت (سو اونٹ ہیں) بیس[۲۰] اونٹنیاں وہ جو چوتھے برس میں لگی ہوں اور بیس[۲۰] اونٹنیاں وہ ہیں جو پانچویں برس میں لگی ہوں اور بیس[۲۰] اونٹنیاں وہ ہیں جو دوسرے برس میں لگی ہوں۔

ھٰذا عند امام احمد وامام اعظم رحمہما اللہ

وان قتیل الخطاء شبہ العمد قتیل السوط والعصاء دیۃ مغلظۃ منہا اربعون فی بطونہا اولادھا یعنی مائۃ من الابل۔ (دارقطنی ج ۳ ص ۱۰۵، سنن ابن ماجہ ج ۲ ص ۸۷۷)

(ترجمہ) "اور قتل خطاء عمد وہ ہے جو کوڑے اور لاٹھی سے مار دیا جائے اس کی اصل دیت مغلظہ سو[۱۰۰] اونٹ ہیں جن میں چالیس گابھن (حاملہ) اونٹنیاں ہیں۔"

اجمعت الصحابۃ علی المائۃ لکنہم اختلفوا فی سنہا۔

(البنایۃ فی شرح الہدایۃ ج ۴ ص ۳۸۲)

(ترجمہ) "تمام صحابہ کرام رضوان اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین کا اس پر اجماع ہے کہ اصل دیت میں سو اونٹ ہی ہیں لیکن ان کی عمروں میں ان کا اختلاف ہے۔"

عن عبد اللہ بن عمرو ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال الا دیۃ الخطاء شبہ العمد ماکان بالسوط والعصاء مائۃ من الابل منہا اربعون فی بطونہا اولادھا۔ (نسائی، ابن ماجہ، دارمی، ابوداؤد، مشکوٰۃ باب الدیات)

(ترجمہ) "حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو کوڑوں اور لاٹھیوں سے مارا جائے وہ خطاء شبہ عمد ہے، اس کی دیت سو اونٹ ہیں جن میں چالیس گابھن (حاملہ) اونٹنیاں ہیں۔"

عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم بمقدار الدیۃ وانہا مائۃ من الابل ضمنہا حدیث سہل بن ابی حثمۃ فی القتیل الموجود بخیبر وان النبی صلی اللہ علیہ وسلم وداہ بمائۃ من الابل۔ وروی سفیان بن عیینۃ عن علی بن زید بن جدعان عن القاسم بن ربیعۃ عن ابن عمر قال خطبنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بمکۃ فقال الا ان قتیل خطاء العمد بالسوط والعصا فیہ الدیۃ مغلظۃ مائۃ من الابل اربعون خلفۃ فی بطونہا اولادہا۔ وفی کتاب عمرو بن حزم الذی کتبہ لہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وفی النفس مائۃ من الابل۔ وروی عمرو بن دینار عن طاؤس قال فرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دیۃ الخطاء مائۃ من الابل۔

{احکام القرآن للجصاصؒ ج ۲ ص ۳۲ باب مبلغ الدیۃ من الابل
و باب شبہ العمد ج ۲ ص ۲۲۹}

(ترجمہ) "ارشادِ نبوی ہے کہ دیت کی مقدار سو اونٹ ہیں حضرت سہلؓ کی حدیث اس پر گواہ ہے کہ خیبر میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے سو اونٹ دیت میں دیئے تھے، حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ فتح مکہ کے دن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قتلِ خطاء العمد وہ ہے جو کوڑوں اور لاٹھیوں سے مار دیا جائے اس کی دیت مغلظ سو اونٹ ہیں جن میں چالیس گابھن اونٹنیاں ہوں گی۔ اور عمرو بن حزم کو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جو خط لکھا تھا اس میں بھی یہی تحریر فرمایا تھا کہ قتلِ خطاء کی دیت سو اونٹ ہے ـــ حضرت طاؤسؒ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قتل کی دیت سو اونٹ ہی مقرر فرمائی ہے۔"

پھر یہ بات قابلِ غور ہے کہ امام جصاصؒ فرماتے ہیں یہ کہیں نہیں فرمایا گیا کہ دیت بارہ ہزار یا دس ہزار دراہم ہے اور نہ یہ فرمایا گیا کہ دیت ایک ہزار دینار ہے بلکہ ہر زمانہ میں سو اونٹوں کی قیمت کو دیکھا گیا ہے۔ (احکام القرآن للجصاص ج ۲ ص ۲۳۵)

بلاشبہ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بھی صحابۂ کرامؓ کی موجودگی میں اصل دیت سو اونٹ ہی بتائی ہے، پھر کسی صحابی نے اس سے انکار نہیں کیا اور اسی پر صحابۂ کرام کا اجماع ہے۔

(البنایۃ ج ۴ ص ۴۸۲)

اور دیت آزاد مسلم کی سو اونٹ ہے جب اونٹ نہ مل سکیں تو ان کی قیمت واجب ہے جیسا کہ

حضرت عمرؓ نے سو اونٹوں کی قیمت کے برابر سونے والوں پر ہزار دینار اور چاندی والوں پر بارہ ہزار دراہم دیت کے مقرر کئے تھے۔ اور ایک گروہ نے یہ کہا ہے کہ ذمّی اور معاہد کی دیت مسلمان کے برابر ہے۔ (معالم التنزیل ص ۲۴۵)

صاحب البنایہ لکھتے ہیں:۔

"یعنی دیت سوائے اونٹوں کے اور کسی چیز کی ثابت نہیں"۔

حضرت ثوری اور حضرت حسن بن صالح رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ دیت میں دراہم و دنانیر دیتے وقت اونٹوں کی قیمتوں کو مدنظر رکھا گیا ہے، دراہم و دنانیر کی قیمتیں بڑھتی گھٹتی رہتی ہیں اور ہم نے کتاب میں اسی کو بیان کیا ہے، اور وہ یہ کہ دیت اونٹوں ہی میں موقوف رہی ہے وہ کسی اور چیز سے ثابت نہیں، کیونکہ توقف اسی میں ہے کہ (دیت سو اونٹوں ہی کی) شرع شریف میں وارد ہے اور اسی پر اجماع ہے، اصل دیت کی اونٹوں کے سوا کوئی اور مقدار ہمارے علم میں نہیں، اگر کوئی قاضی اس کا حکم دے تو اس کے اس حکم کا نفاذ ہی نہ ہوگا کیونکہ دیت میں سو اونٹوں کے سوا کسی اور چیز کا حکم نافذ ہی نہیں ہو سکتا، اصل دیت میں سو اونٹوں کی مقدار پر صحابہ کرامؓ کا اجماع ہے اُن کا اختلاف صرف اُن کی عمروں کے بارے میں ہے۔ (البنایۃ ج ۴ ص ۷۸۳)

ایک روایت یہ بھی ہے کہ انہ جعل الدیۃ من الورق قیمۃ الابل لانہ اصل فی الدیۃ۔ (احکام القرآن للجصاص ج ۲ ص ۲۳۷)

چاندی سے دیت اونٹوں کی قیمت کے حساب سے دی گئی ہے کیونکہ چاندی اصل دیت نہیں ہے۔

اُونٹ کی طرح سونا چاندی بھی اصل دیت ہے

جواب الجواب از مولانا مفتی غلام الرحمن صاحب مدظلہ

ماہنامہ "الحق" مارچ ۱۹۹۱ء موافق شعبان ۱۴۱۱ھ کے حوالہ سے حضرت مولانا سید تصدق بخاری صاحب زید مجدہم نے "اصل دیت کیا ہے، سو اونٹ یا ہزار درہم؟" کے عنوان سے دیت کے بارے میں اپنا نقطہ نظر پیش کیا ہے، یہ احقر کے اُس مقالہ کا مواخذہ تھا جو دسمبر ۹۹ء کے "الحق" میں "اسلام کا نظامِ قصاص و دیت" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔

اختلافی نقطہ نظر موصوف کو احقر کے مقالہ میں جس بات سے تعلق ہوا ہے وہ دیت کی تقرری میں دس ہزار درہم کے تعین کا مسئلہ ہے۔ آپ کی تحریر کا خلاصہ یہ ہے کہ دیت کے تعین کا دارومدار اونٹوں پر ہے یعنی اصل دیت سو اُونٹ ہیں، دراہم و دنانیر یا دوسری چیزوں کا ذاتی طور پر کوئی اعتبار نہیں، جہاں کہیں دیت کے فیصلے ہوئے ہیں اُن میں اونٹ کو بنیادی حیثیت حاصل رہی ہے (حالانکہ ایسا نہیں) موصوف فرماتے ہیں:۔

"احادیث کے تتبع سے یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ سونا چاندی، گائے و بکریوں وغیرہا کی تعداد کے تعین میں خیر القرون میں کمی بیشی اس لیے ہوتی رہی اور آئندہ بھی قیامت تک بوقتِ ضرورت ہوتی رہے گی کیونکہ یہ چیزیں اصل دیت نہیں ہیں اصل دیت سو اُونٹ ہی ہیں اس لیے ان کی تعداد میں کمی بیشی نہیں ہوتی۔" (الحق ص ۱۲)

موصوف کے دلائل کا تجزیہ موصوف نے گیارہ صفحات پر مشتمل مضمون میں جن روایات کا سہارا لیا ہے وہ کل پانچ ہیں:۔

(۱) پہلی روایت حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی ہے، موصوف نے یہ روایت تین دفعہ ذکر کی ہے، پہلی دفعہ سیرتِ ابن ہشام کے حوالہ سے الحق ص ۱۳ پر، دوسری دفعہ معالم التنزیل کے حوالہ سے الحق ص ۱۵ پر اور تیسری دفعہ احکام القرآن کے حوالہ سے الحق ص ۲۱ پر ہے۔ اس روایت میں کسی دراہم و

دنانیر سے انکار نہیں، صرف یہ آیا ہے کہ قتل خطا کا خون بہا سو اونٹ ہے جن میں سے چالیس اونٹنیاں حاملہ ہوں گی۔

(۲) دوسری اہم روایت جس کے بارے میں موصوف اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ اس سے اُن کا مؤقف صراحتہً ثابت ہے، یہ عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی سند کی روایت ہے۔ موصوف نے یہ روایت پہلی دفعہ بحوالہ ابو داؤد (الحق ص۱۳ پر) دوسری بار بحوالہ ابن ماجہ (الحق ص۱۶ پر) تیسری بار بحوالہ ترمذی (الحق ص۱۸ پر) ذکر کی ہے۔ اس روایت کا مفاد یہ ہے کہ قتل خطا کی دیت سو اونٹنیاں ہیں جن میں تیس دوسرے سال والی، تیس تیسرے سال والی، تیس چوتھے سال والی اور دس اونٹ دوسرے سال والے ہیں۔ البتہ مؤخر الذکر روایت میں تیس اونٹنیاں چوتھے سال والی، تیس اونٹنیاں پانچویں سال والی اور چالیس اونٹنیاں حاملہ (گابھن) کی ادائیگی وارد ہے، مزید برآں دراہم و دنانیر اور دوسری چیزوں کا اندازے سے ادائیگی کا حکم بھی وارد ہے ـــــ ایسا ہی موصوف نے یہ روایت عبداللہ بن عمرو ابن العاصؓ کی دوسری سند سے مشکوٰۃ کے حوالے سے الحق ص۲۰ پر نقل کی ہے جس سے سو اونٹ کی ادائیگی کا ثبوت ملتا ہے۔

(۳) تیسری روایت حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی ہے جو موصوف نے ترمذی کے حوالہ سے الحق ص۱۴ پر نقل کی ہے، اس روایت کے الفاظ یہ ہیں:-

عن ابن عباسؓ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ جعل الدیۃ اثنی عشر الف دراھم۔

(الجامع الترمذی ج۱ ص۲۵۸ باب ما جاء فی الدیۃ کم ھی من الدراھم)

(ترجمہ) حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیت بارہ ہزار دراہم مقرر فرمائے۔

اس روایت کی رُو سے دیت میں اونٹ کی تقرری کا کوئی تذکرہ نہیں بلکہ اس سے موصوف کے عندیہ کی تردید ہو رہی ہے کیونکہ موصوف کے نزدیک اصل دیت سو اونٹ ہیں جبکہ اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹ کے اعتبار سے قطع نظر بارہ ہزار دراہم مقرر فرمائے۔

یہ الگ بات ہے کہ احناف نے بارہ ہزار کی جگہ دس ہزار دراہم کو اعتبار کیوں دیا؟ اس کی تحقیق کے لیے احناف کے فقہی ذخائر کی طرف مراجعہ کرنا ہوگا تاہم درہم کی قیمت میں تفاوت کی وجہ سے بعض روایات سے دس ہزار اور بعض سے بارہ ہزار معلوم ہوتے ہیں۔ یہ کہنا روایات سے ناواقفیت کی دلیل ہے کہ یہ تفاوت اونٹ کی قیمت کے اعتبار پر مبنی ہے۔ دراہم کا اعتبار صرف اس روایت سے نہیں بلکہ متعدد روایات سے ثابت ہے۔ (کما سیأتی انشاءاللہ) لیکن موصوف کے مؤقف

کی تردید کے لیے یہ ایک روایت ہی کافی ہے، معلوم نہیں کہ آپ کو یہ روایت نقل کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

(۴) چوتھی روایت حضرت جابرؓ بن عبداللہ کی ہے جو موصوف نے تفسیر مظہری کے حوالہ سے الحق ص۱۶ پر نقل کی ہے۔ اس روایت کی رُو سے دیت میں اونٹ کے علاوہ گائیں والوں پر دو سو گائیں، بکریوں والوں پر دو ہزار بکریاں اور کپڑے والوں پر دو سو جوڑے کپڑوں کا ثبوت ملتا ہے۔

(۵) پانچویں روایت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی ہے جو موصوف نے ابن ماجہ کے حوالہ سے الحق ص۱۹ پر اور ابوداؤد کے حوالہ سے الحق ص۲۰ پر نقل کی ہے، اس روایت سے بھی اونٹ کی ادائیگی کا ثبوت ملتا ہے۔

ان روایات کے علاوہ حضرت طاؤسؒ کی مُرسل روایت احکام القرآن کے حوالہ سے الحق ص۲۱ پر ہے جس سے اونٹ کی نشاندہی ہوتی ہے۔

امام شافعیؒ، امام احمدؒ، طیبیؒ، امام اعظمؒ، ثوریؒ اور حسن بن صالحؒ کی طرف آپ نے منسوب اقوال پیش کیے ہیں۔

اونٹ کی اصالت کے باوجود تمام روایات پر عمل ممکن نہیں

مولانا موصوف کا عندیہ درج ذیل ہے:۔

"درحقیقت اصل دیت سو اونٹ ہی ہیں اس لیے دیت کے فیصلہ کے وقت سو اونٹ کی جو قیمت ہو وہی اصل دیت ہے، دوسری جو چیزیں بھی سہولتاً دیت میں دی جائیں گی وہ بحساب سو اونٹوں کی مروجہ قیمت کے مساوی دی جائیں گی۔" (الحق ص۱۲)

موصوف کے ارشاد کے مطابق اگر ہم سو اونٹ دیت کے لیے اصل مان لیں تو پھر بھی تمام روایات پر عمل ممکن نہیں کیونکہ اونٹ کے بارے میں بھی حدیث کے دیگر ذخائر کی طرف مراجعہ سے قطع نظر صرف موصوف نے جو روایات نقل کی ہیں ان میں اتنا اختلاف پایا جاتا ہے کہ کسی ایک نوع کے اختیار کرنے سے دوسری روایات چھوٹ جاتی ہیں۔ مثلاً حضرت ابن عمرؓ کی روایت کی رُو سے جب سو اونٹ دیئے جائیں گے تو ان میں چالیس اونٹنیاں حاملہ (گابھن) ہوں گی، لیکن اس کے مقابلہ میں عمرو بن شعیب بن ابیہ عن جدہ کی سند سے جو روایت موصوف نے نقل کی ہے اس میں ابوداؤد کی روایت میں سو اونٹ کی جگہ قیمت کی ادائیگی وارد ہے، لیکن ابن ماجہ کی روایت میں سو اونٹ کی ادائیگی میں یہ صورت اختیار کی گئی ہے کہ ان میں تیس ایسی اونٹنیاں ہوں جو دوسرے سال میں داخل ہو چکی ہوں،

تیس ایسی اونٹنیاں جو تیسرے سال میں جارہی ہوں اور تیس ایسی اونٹنیاں جو چوتھے سال میں لگی ہوں اور دس ایسے اونٹ جو تیسرے برس میں داخل ہو چکے ہوں۔ گویا اس روایت میں سو اونٹ میں چار قسم کا اعتبار ہے، لیکن ترمذی کی روایت میں سو اونٹ میں تثلیث کا اعتبار ہے کہ تیس اونٹنیاں چار سال والی، تیس اونٹنیاں پانچ سال والی، اور چالیس اونٹنیاں حاملہ (گابھن) ہوں۔

اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت میں بحوالہ ابوداؤد سو اونٹ کی تقسیم میں تخمیس کا اعتبار دیا گیا ہے۔ بیس اونٹنیاں چوتھے سال والی، بیس اونٹنیاں پانچویں سال والی، بیس اونٹنیاں دو سال والی، بیس اونٹنیاں تین سال والی اور بیس اونٹ تین سال والے ہوں۔

صرف ان الفاظ کو دیکھ کر کسی ایک نوع کے تعین سے دوسری روایات پر عمل ممکن نہیں، لہٰذا محض اونٹ کی اصالت پر قول کر کے روایات کو قابلِ عمل بنانے کی راہ کامیاب نظر نہیں آتی، ایسی صورت میں قتل کی قسموں کا اعتبار کر کے دیتِ مغلظہ اور دیتِ مخففہ کی صورت نکالنی ہوگی۔

دراہم و دنانیر کو دیت کی قیمت کہنا درست نہیں دیت کی حقیقت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے معنٰی میں معاوضہ کی ماہیت چھپی ہوئی ہے کیونکہ لغوی اعتبار سے دیت مالی معاوضہ کو کہا جاتا ہے۔ اور از روئے شرع دیت اُس مال کو کہتے ہیں جو کسی کی جان کو ختم کرنے یا کسی شخص کے جسمانی اعضاء کو ناقص کرنے کے بدلے میں دیا جاتا ہے۔ (مظاہر الحق جدید از علامہ قطب الدین، جلد ۳ صفحہ ۵۳۳ کتاب الدیات)

گویا دیت حقیقت میں انسان کی قیمت ہے، کیونکہ انسان کی حقیقت میں حیوانیت میں بھی ایک جزء ہے اور حیوان جب ہلاک ہو جائے تو یہ مضمون بالقیمت ہوتا ہے اور قیمت کے تعین کے لیے ایسی چیز کی تقرری ضروری ہوتی ہے جس میں خود تعین ہو تفاوت نہ ہو، مزید برآں ممکن الوصول ہو۔ کسی حیوان کے عوض میں ایسی چیز کو واجب قرار دینا جو متفاوت ہو باہمی نزاع اور فتنہ وفساد کے لیے مواقع فراہم کرنے کے مترادف ہے جبکہ ممکن الوصول نہ ہونے کی صورت میں تعجیز کے سوا اور کچھ بھی حاصل نہیں۔ اس وجہ سے عقلاً تو اونٹ کا اعتبار ذاتی طور پہ دیت میں بالکل نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ اس کے باطنی معانی کی وجہ سے ان میں یکسانیت ممکن نہیں اور یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر جگہ اونٹ مل سکیں، مثلاً ہمارے ملک میں اگر موصوف کے مشورہ سے اونٹ کو ہی اعتبار دیا جائے تو یہ اسلامی نظام کے نفاذ کو مشکل سے مشکل تر بناتا ہے کیونکہ ملک میں ہر جگہ اونٹوں کا ملنا مشکل ہے اور اگر مقتول کے ورثاء کو سو اونٹ ہی دیئے جائیں تو یہ ان کو الٹا مشقت میں ڈالنا ہے، یہ ضروری نہیں کہ مقتول کے ورثاء

اونٹ اپنے پاس رکھ سکیں اور اگر فروخت کریں تو ملکی رواج نہ ہونے کی وجہ سے ایسی حالت میں اس کو کم سے کم قیمت دی جائے گی۔ لیکن چونکہ حدیث میں سو اونٹ کا حکم دیا گیا ہے لہٰذا عقلی وجوہات سے قطع نظر تثلیث، تربیع یا تخمیس کا اعتبار کرتے ہوئے ان کا دینا جائز ہے، پھر بھی اونٹوں کی ادائیگی ایسے ملک میں ہونی چاہیئے جہاں ان کا رواج ہو تاکہ ان کو یعنی ورثاء کو آسانی رہے ۔۔۔ اس کے علاوہ دراہم و دنانیر اپنی جگہ بغیر کسی اونٹ کی قیمت کی نسبت کے دیت کی صلاحیت رکھتے ہیں، کیونکہ دراہم و دنانیر خلقی طور پر ثمنیت سے متصف ہیں، اس کی مقدار معلوم ہے اور ہر جگہ آسانی سے میسّر ہیں بلکہ دنیا کے ہر کونے میں ان کا اعتبار پایا جاتا ہے کیونکہ دنانیر سونے اور دراہم چاندی کے ہوتے ہیں اور سونا چاندی بین الاقوامی لین دین کا ذریعہ ہے اس لیے دیت میں اس کی تقرری سے کوئی مشکلات پیدا نہیں ہوں گی۔

دراہم و دنانیر کو دیت کی قیمت کہنے میں ایک دوسری خرابی یہ بھی ہے کہ اگر ہم اصل دیت اونٹ کو مان کر دراہم و دنانیر اس کا بدل تسلیم کرلیں تو ایسی حالت میں اونٹ یکمشت نہیں لیے جاتے یہ قاتل کے ذمے محض واجب الادا ہوتے ہیں، اگر دراہم و دنانیر اس کا بدل ہو اور اس کے عوض میں دیئے جائیں تو دراہم و دنانیر کے بارے میں قاضی تین سال کی مدت ادائیگی کے لیے مقرر کرسکتا ہے لہٰذا پھر ایسی حالت میں بھی یہ قاتل کے ذمہ محض واجب الادا رہیں گے تو یہ "دیناً بدینٍ" "نسیئۃ بنسیئۃ" کی صورت لازم آئے گی جو شرعاً حرام اور ناجائز ہے۔ (المبسوط للسرخسی ج ۲۶ ص ۲۷ کتاب الدیات)

دیت کے تعین میں ائمہ مجتہدین کے مذاہب

یہاں تک تو موصوف کے مضمون کا اجمالی جائزہ تھا اب ہم اس بات کا جائزہ لیتے ہیں کہ دراہم و دنانیر کا تعین راقم الحروف کی کوئی خود ساختہ رائے نہیں بلکہ یہ محققین و مجتہدین کی تحقیقات کی روشنی میں مستقل مکاتبِ فکر کی مستند رائے ہے، بدقسمتی سے مولانا صاحب نے اپنے مقالہ میں سو اونٹ کی اصالت ائمہ اربعہ میں سے کسی کے مذہب کی طرف منسوب کرنے کی زحمت نہیں کی، موصوف نے اندازِ بیان ایسا اختیار کیا ہے کہ شاید اپنی صوابدید پر وہ احادیث سے بالذات مسائل مستنبط کررہے ہیں، آپ نے "الحق ص ۱۵" پر "الغایۃ" کے حوالے سے امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کا قول ایسے پیرایہ میں نقل کیا ہے جیساکہ ان حضرات کے اقوال آپ کی رائے کے لیے محض تائیدی حیثیت رکھتے ہوں، جبکہ بعض جگہ امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کے اقوال سے غلط فائدہ لیا ہے اور ایسی توجیہ کی ہے جو مالا یرضٰی بہٖ قائلہ کے مترادف ہے۔

کاش! اگر موصوف ابتداء ہی سے اپنا مذہبی رشتہ ظاہر کر دیتے تو یہ حقیقت واضح ہوجاتی کہ آپ کس کی ترجمانی کا حق ادا کر رہے ہیں، اس لیے دیت کے بارے میں جملہ مذاہب نقل کرنے کے بعد شاید موصوف کے بارے میں یہ واضح ہوسکے کہ وہ کس مسلک سے وابستہ ہیں تاہم طوالت سے بچنے کی خاطر عربی عبارات کے بجائے باحوالہ اردو تراجم پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

امام شافعیؒ کی رائے

امام شافعیؒ سے دیت کے بارے میں دو اقوال مروی ہیں، پہلے قول (جس کی نسبت آپؒ کی طرف عراق کے حوالہ سے کی جاتی ہے) کی رُو سے چاندی والوں سے بارہ ہزار دراہم اور سونے والوں سے ایک ہزار دینار لیے جائیں گے جیسا کہ اونٹ والوں سے سو اونٹ لیے جاتے ہیں البتہ مصر میں آپؒ کا قولِ جدید یہ ہے کہ دراہم و دنانیر کے تعین کا کوئی اعتبار نہیں بلکہ اصل دیت سو اونٹ ہے، جہاں کہیں دوسری چیزیں مثلاً سونا چاندی لیے جائیں گے تو اس میں اونٹوں کی قیمت کا اعتبار ہوگا۔ علامہ ابن رشد رحمہ اللہ فرماتے ہیں:۔

قال الشافعی بمصر لا یؤخذ من اهل الذهب ولا من اهل الورق الا قیمة الابل بالغة ما بلغت۔ (بدایة المجتهد ج۲ ص۴۰۷ کتاب الدیات فی النفوس اختلفوا فی الدراهم والدنانیر)

(ترجمہ) "امام شافعیؒ کا قول مصر میں یہ ہے کہ سونا اور چاندی والوں سے سو اونٹ کی قیمت کے علاوہ کوئی چیز نہیں لی جائے گی خواہ قیمت کتنی ہی کیوں نہ ہو۔"

لیکن شوافعؒ کے ہاں مفتیٰ بہ قول مصر کا ہے، گویا ابھی شوافع کے ہاں دیت کی اصل سو اونٹ ہے، سونا اور چاندی یعنی دراہم و دنانیر اگر دیئے جائیں تو اس میں سو اونٹ کی قیمت کا اعتبار ہوگا بذاتِ ان کا دیت سے کوئی تعلق نہیں جیسا کہ امام شافعیؒ فرماتے ہیں:۔

(ترجمہ) "آزاد مسلمان کی دیت سو اونٹ ہے اس کے سوا دوسری چیزیں درست نہیں۔"

(الام - دار المعرفة بیروت ج۶ ص۱۰۵)

امام مالکؒ کی رائے

امام مالکؒ کے نزدیک سو اونٹ کے علاوہ دراہم و دنانیر کا بھی دیت میں بطورِ اصالت اعتبار ہے۔ علامہ ابنِ رشد فرماتے ہیں:۔

وعمدة مالک تقویم عمر بن الخطاب المائة من الابل علیٰ اهل الذهب بالف دینار وعلیٰ اهل الورق اثنیٰ عشر الف درهم۔ (بدایة المجتهد ج۲ ص۴۰۷ کتاب الدیات فی النفوس)

(ترجمہ) "امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ سونے والوں پر (دیت) ایک ہزار دینار اور چاندی والوں پر بارہ ہزار دراہم ہیں۔"

امام احمد بن حنبلؒ کی رائے

امام احمد بن حنبلؒ سے بھی دو روایات مروی ہیں، ایک روایت میں آپ بھی امام شافعیؒ کی طرح صرف اونٹ کی اصالت کے قائل ہیں اور دوسرے قول میں اونٹ کے علاوہ سونے اور چاندی کے بھی قائل ہیں۔ محدثِ اعظم ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں :-

(ترجمہ) "جان لیں کہ دیت کی اصالت میں علماء کا اختلاف ہے، پس امام شافعیؒ امام احمد بن حنبلؒ سے ایک روایت کی رُو سے اور ابن المنذرؒ کے نزدیک صرف (سو) اونٹ ہیں لہٰذا اُن کی قیمت واجب ہوگی جتنی بھی ہو، اور امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اونٹ کے علاوہ سونا اور چاندی بھی ہے یہ امام احمد بن حنبلؒ کا قول اور امام شافعیؒ کی قدیم رائے ہے۔" (مرقاۃ المصابیح شرح مشکوٰۃ المصابیح جلد ۷ ص۸۳ ابواب الدیات)

ابنِ حزم ظاہریؒ کی رائے

دیت کے بارے میں سب سے سخت ترین لہجہ ابو محمد علی بن حزم ظاہریؒ کا ہے، جن سے دراہم و دنانیر کے بارے میں کوئی قول منقول نہیں جبکہ دوسرے ائمہ سے کسی نہ کسی درجہ میں دراہم اور دنانیر کے بارے میں کچھ نہ کچھ مروی ہے لیکن آپؒ دوٹوک فیصلہ کر کے فرماتے ہیں :-

(ترجمہ) "(قتلِ) عمد اور خطا کی دیت سو اونٹ ہے اگر یہ نہ ہو تو پھر ان کی قیمت واجب ہو گی۔" (ابو محمد علی بن الحزم، المحلی، ج ۷ ص۴۷۱)

مزید لکھتے ہیں :-

(ترجمہ) "ہماری طرح جن سے اونٹ کے علاوہ دوسرا کوئی قول نقل نہیں یہ ایک عظیم جماعت ہے جن میں زید بن ثابتؓ، علی بن ابی طالبؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ ہیں، ان تمام کی رائے یہ ہے کہ دیت میں سو اونٹ ہیں۔" (ابو محمد علی بن الحزم، المحلی، ج ۷ ص۴۷۳)

ان متعدد اقوال پر نظر ڈالتے ہوئے قارئین آسانی سے فیصلہ کر سکتے ہیں کہ موصوف مسلک کے اعتبار سے کن کے قریب ہیں اگرچہ آپ نے کسی جگہ اپنے مذہبی رشتہ کے اظہار کی جرأت نہیں کی بلکہ مجتہدانہ اندازِ بیان اختیار کر کے احادیث سے بالذات احکام ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

دیت کے بارے میں احناف کثرہم اللہ کا مؤقف

احناف بھی دیگر فقہی مکاتبِ فکر کی طرح دیت میں اونٹ کی اصالت کے قائل ہیں لیکن احناف نے اپنا زاویۂ فکر صرف چند روایات تک محدود نہیں رکھا بلکہ

پوری روایات کو مدنظر رکھتے ہوئے اونٹ کے علاوہ سونے (دینار) اور چاندی (دراہم) کے تعین پر بھی قول کیا۔ گویا احناف کے نزدیک سو اونٹ کی طرح ایک ہزار دینار یا دس ہزار دراہم بھی دیت کے لیے اصل ہیں۔ اگر کسی علاقہ میں اونٹ ہوں تو وہاں پر دیت میں اونٹ وصول کیے جائیں گے اور اگر کہیں اونٹ نہ ہوں تو پھر علاقہ کی حالت اور عرف کو دیکھ کر سونے کے اعتبار سے ایک ہزار دینار اور چاندی کے اعتبار سے دس ہزار دراہم وصول کئے جائیں گے۔

پاکستان میں اونٹوں کا رواج بعض خاص علاقوں تک محدود ہے اس لیے میں نے اپنے مقالہ میں اونٹ کے علاوہ دوسری چیزوں کا حساب لگایا تھا، زکوٰۃ اور دوسرے نصابوں میں چاندی کا اعتبار زیادہ کرتے ہیں اور عام عرف میں بھی دراہم کا حساب آسان تھا اس لیے احقر نے دس ہزار دراہم کا حساب تولہ اور ماشہ میں بحساب ۲ ۱/۲ ماشہ چاندی فی درہم کے حساب سے دو ہزار نو سو تولہ آٹھ ماشہ چاندی کی قیمت کا مشورہ تھا کیونکہ اس کی قیمت کے تعین میں کوئی اشتباہ نہیں رہتا، لیکن میں نے اس سے انکار کب کیا ہے کہ دیت میں اونٹ نہ دیئے جائیں؟ اور نہ احقر اس کی جرأت کر سکتا ہے، ہماری کتابوں میں ان تینوں چیزوں کے بارے میں صراحتہً لکھا ہے، چنانچہ علی بن ابی بکر المرغینانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں :-

(ترجمہ) "قتل خطا میں دیت سو اونٹ ہے ...... سونے کے اعتبار سے ایک ہزار دینار اور چاندی کے حساب سے دس ہزار دراہم ہیں، امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ان تین چیزوں کے علاوہ دوسری چیزوں سے دیت ثابت نہیں"۔ (ھدایہ جلد ۴ ص ۵۹۹ کتاب الدیات)

ہمیں اس پر فخر ہے کہ ہم سیدنا امام ابوحنیفہؒ کے مقلد ہیں اور مقلد ہونے کی حیثیت سے ہم یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ہمارے مقتداء اور پیشوا سیدنا امام ابوحنیفہؒ نے جو فرمایا ہے وہ کسی نہ کسی حدیث سے لازماً ثابت ہے۔ ہم یہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ آپ نے کوئی بات اپنی طرف سے کہہ کر کسی حدیث کی مخالفت کی ہوگی اور نہ ہم بالذات کسی حدیث یا آیت سے مسائل کے استنباط کی قوت اور طاقت رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے مفتیانِ کرام فتویٰ دیتے وقت کسی حدیث یا آیت کے حوالہ کی جگہ کسی مستند فقہی کتاب کے حوالہ پر اکتفاء کرتے ہیں، ہمارے فقہاء کرام نے دراہم و دنانیر کی اصالت کے بارے میں دو ٹوک فیصلہ کر کے فرمایا ہے :-

قال العلامۃ السرخسیؒ : واختلفوا فی ان الدراھم والدنانیر فی الدیۃ اصل ام باعتبار قیمۃ الابل فالمذھب عندنا انھما اصل۔ (المبسوط ج ۲۶ ص ۷۵ کتاب الدیات، اختلفوا فی الدراھم والدنانیر)

(ترجمہ) "علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ دراہم و دنانیر دیت میں بطور اصالت معتبر ہیں یا قیمت

کے اعتبار سے، تو ہمارے نزدیک (اونٹ کی طرح) یہ دونوں (دراہم و دنانیر بھی) دیت میں اصل ہیں۔"

بلکہ امام ابوحنیفہؒ کے اجل تلامذہ سیدنا امام ابویوسفؒ اور سیدنا امام محمدؒ کے نزدیک حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے فیصلہ کی رُو سے گائے، بکری اور کپڑوں سے بھی ثابت ہے، گویا صاحبینؒ کے نزدیک دیت کے چھ اصول ہیں، یعنی جس علاقہ میں لوگوں کو اس میں سہولت ہو اُن سے وہی وصول کیا جائے، چنانچہ بعض علماء کے نزدیک صاحبینؒ کی یہ رائے امام ابوحنیفہؒ سے دوسری روایت ہے، علامہ ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

(ترجمہ) "میرے نزدیک حق یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ اور صاحبینؒ کے درمیان اس مسئلہ میں کوئی اختلاف نہیں بلکہ امام ابوحنیفہؒ کا ایک قول صاحبین کا مذہب ہے۔" (اعلاء السنن جلد ۱۸ ص ۱۵۳ کتاب الدیات)

جبکہ عام کتابوں میں امام ابوحنیفہؒ کی طرف اول الذکر تین انواع کی نسبت ہوتی ہے اور مؤخر الذکر تینوں کا ثبوت صرف صاحبینؒ کی رائے تک محدود ہے، پھر اونٹ کی دیت میں بسا اوقات سختی اور شدت بھی پائی جاتی ہے جبکہ دراہم اور دنانیر میں خاص مقدار مقرر ہونے کی وجہ سے سختی کا امکان نہیں، اس لیے جہاں کہیں قتل کی نوعیت سخت ہو تو دیتِ مغلظہ ادا کی جائے گی، پھر یہ شدت دراہم اور دنانیر میں نہیں پائی جاتی ہے اس لیے اونٹ ہی سے ادا کی جائے گی۔ چنانچہ علامہ مرغینانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:۔

(ترجمہ) "اونٹ کے علاوہ کسی دوسری نوع میں تغلیظ ثابت نہیں کیونکہ شرع صرف اسی میں وارد ہے۔" (الہدایہ جلد ۴ ص ۴۹۹ کتاب الدیات)

لہٰذا امام ابوحنیفہؒ اور امام ابویوسفؒ کے نزدیک جب دیتِ مغلظہ کی ادائیگی کی ضرورت پڑے تو اونٹ سے چار قسم ادا کیے جائیں گے جن میں پچیس ۲۵ بنت مخاض (دوسرے سال والے) پچیس ۲۵ بنت لبون (تیسرے سال والے) پچیس ۲۵ حقہ (چوتھے سال والے) اور پچیس ۲۵ جذعہ (پانچویں سال والے) شامل ہیں، جبکہ دیتِ مخففہ دس ہزار دراہم یا ایک ہزار دینار ہے، اور اگر اونٹوں سے ادا کرنا پڑے تو پھر پانچ قسموں سے ادا کی جائے گی جس میں قیمت کے اعتبار سے یقیناً آسانی رہے گی۔

دراہم اور دنانیر کی اصالت احادیث کی رُو سے

مقالہ نگار کا یہ تجزیہ بالکل غلط ہے کہ اونٹ کے علاوہ دراہم اور دنانیر کا اعتبار

بطور اصالت دیت میں ثابت نہیں، یہ روایات کے ذخیرہ سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ ہر وہ روایت جس سے بارہ ہزار یا دس ہزار دراہم یا ایک ہزار دینار کا ثبوت ملتا ہو تو وہ آپ کی رائے کی تردید کے لیے کافی ہے کیونکہ دراہم میں بارہ ہزار یا دس ہزار کا تفاوت مروجہ سکّہ کی قیمت میں کمی و بیشی پر مبنی ہے۔ ذیل میں چند روایات اس کے بارے میں نقل کی جاتی ہیں :۔

(۱) امام ترمذیؒ نے "جمع بین البابین" کی عادت اپناتے ہوئے پہلے جب "باب ما جاء فی الدیۃ کم ھی من الابل" کا تذکرہ کیا تو اس سے فارغ ہو کر دوسرا باب "ما جآء فی الدّیۃ کم ھی من الدراھم" لایا، آپ نے اس میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت دو سندوں سے لائی ہے کہ :۔

(۱) عن ابن عباسؓ عن النبیّ صلی اللہ علیہ وسلم انہٗ جعل الدیۃ اثنیٰ عشر

(جامع ترمذی ج ۱ ص۲۵۶ باب ما جاء فی الدیۃ کم ھی من الدراھم)

(ترجمہ) "حضرت ابن عباسؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ آپؐ نے دیت بارہ ہزار دراہم مقرر کی۔"

حضرت ملّا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ یہ روایت امام ترمذیؒ کے علاوہ امام ابوداؤد، سنن النسائی، اور دارمی نے بھی نقل کی ہے، یہی وہ روایت ہے جو حضرت مولانا نے الحق ص۱۴ پر نقل کی۔ بعض روایات میں یہ اضافہ بھی ہے کہ :۔

(۲) ان رجل من بنی عدی قتل فجعل النبی صلی اللہ علیہ وسلم دیتہ اثنیٰ عشر الفا۔ (مرقاۃ ج ۷ ص۸۳ باب الدیات)

(ترجمہ) "بنی عدی کا ایک آدمی قتل ہو گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی دیت بارہ ہزار دراہم مقرر کی۔"

(۲) حضرت عمر بن خطابؓ سے امام ابوحنیفہؒ کی سند سے روایت نقل کرتے ہوئے امام محمدؒ فرماتے ہیں :۔

اخبرنا ابوحنیفۃؒ عن الھیثم عن عامر الشعبی عن عبیدۃ السلمانی عن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ قال علیٰ اھل الورق من الدّیۃ عشرۃ الاف درھم وعلیٰ اھل الذّھب الف دینار۔ (کتاب الآثار ص۹۶ کتاب الدیات)

یہ روایت عبیدہ السلمانی سے اس طریقہ پر بھی مروی ہے کہ :۔

بلغنا عن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ انہ جعل الدیۃ علیٰ اَھل الْاِبِل مائۃ اِبِل وعلیٰ اھل الورق عشرۃ الاف درھم۔ (المبسوط ج ۲۶ ص۷۷ کتاب الدیات)

(ترجمہ) "حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں جب نظام زندگی کے لیے رجسٹر تیار ہوئے تو آپ نے اونٹ والوں پر سو اونٹ، سونے والوں پر ایک ہزار دینار اور چاندی والوں پر دس ہزار دراہم مقرر کیے۔"

ظاہر بات ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب نظام زندگی کا دستور مرتب فرما رہے تھے تو اس میں بڑے بڑے صحابہؓ بھی شریک تھے اور آپ کے اس اقدام پر کسی صحابی کا اعتراض منقول نہیں، معلوم ہوتا ہے کہ تمام صحابہؓ نے آپ کی اس رائے کی تصویب کی، گویا اس پر صحابہؓ کا اجماع ہوا کہ سو اونٹ کی طرح ہزار دینار اور دس ہزار دراہم بھی دیت میں دیئے جا سکتے ہیں، ہمارے لیے یہی اجماع صحابہؓ بڑی سند ہے۔

(۳) حضرت عطا رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ:-

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وضع الدیۃ علی الناس فی اموالہم علی اہل الابل مائۃ بعیر واہل الشاۃ الفی شاۃ وعلی اہل البقر مائتی بقرۃ وعلی اہل البرود مائتی حلۃ۔ (کتاب الخراج ص ۱۵۵ الحدود وعلی اہل الجنایات)

(ترجمہ) "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں پر ان کے اموال میں دیت مقرر فرمائی، پس اونٹ والوں پر سو اونٹ، بکری والوں پر دو ہزار بکریاں، گائے والوں پر دو سو گائیں اور کپڑے والوں پر دو سو جوڑے۔"

اس روایت میں اگرچہ دراہم و دنانیر کا تذکرہ نہیں ہے لیکن یہ ضرور ثابت ہو رہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹ کے علاوہ دوسری چیزوں کو بغیر کسی اونٹ کی قیمت کی نسبت سے اعتبار دیا جبکہ ہمارے بعض ائمہ سے یہ دوسری چیزیں بھی مروی ہیں، اور بقولِ بعض امام ابو حنیفہؒ سے بھی دراہم و دنانیر کے علاوہ دوسری چیزوں کے بارے میں روایت آئی ہے۔

(۴) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقولہ روایات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اونٹ کے علاوہ دراہم و دنانیر کا بھی اعتبار ہے، آپ فرماتے ہیں:-

ان النبی علیہ السلام قال من سبح فی کل یوم ولیلۃ مثل دیۃ اثنی عشر الف تسبیحۃ فکانما حرر رقبۃ من ولد اسمٰعیل۔ (المبسوط للسرخسی ج ۲۶ ص ۷۷ کتاب الدیات)

(ترجمہ) "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے دن رات میں اپنی دیت کی طرح بارہ ہزار دفعہ تسبیحات پڑھیں گویا اس نے اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے ایک غلام آزاد کیا۔"

حضرت عکرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ:-

"حضرت ابو ہریرہؓ رات و دن میں بارہ ہزار تسبیح پڑھتے اور فرماتے کہ میں اپنی دیت کے

اندازہ سے تسبیحات پڑھتا ہوں“ (دفاع ابو ہریرہؓ ص۳۸)

جبکہ حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے دس ہزار دراہم کے بارے میں بھی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک روایت مروی ہے ۔ (اعلاء السنن جلد ۱۸ ص۱۵۸ باب تقدیم الدیات من غیر الابل)

(۵) عمرو بن حزمؓ سے بھی ایک روایت ہے کہ :-

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم جعل الدیۃ من الدراھم اثنی عشر الفا۔

(المبسوط للسرخسی ج۲۶ ص۷۸ کتاب الدیات)

(۶) حضرت سعید بن المسیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ :-

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال دیۃ کل ذی عھد فی عھدہ الف دینار۔

(المبسوط للسرخسی ج۲۶ ص۷۸ کتاب الدیات)

(۷) حضرت عثمانؓ کے دور میں بھی ایک واقعہ پیش آیا تو آپ نے ایک ہزار دینار دیت مقرر فرمائی ۔ (اعلاء السنن جلد ۱۸ ص۱۵۵ باب تقدیم الدیات من غیر الابل)

(۸) ایسے ہی حضرت عمر بن عبد العزیزؒ سے بھی دس ہزار دراہم دیت کی روایت منقول ہے ۔

(اعلاء السنن جلد ۱۸ ص۱۵۵ باب تقدیم الدیات من غیر الابل)

ان تمام روایات کو مدنظر رکھ کر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اونٹ کی طرح دراہم اور دنانیر بھی دیت میں بطورِ اصالت ثابت ہیں، لہٰذا دس ہزار دراہم کے حساب سے چاندی کی مروجہ قیمت بطورِ دیت ادا کرنا روایات سے ذہول نہیں بلکہ روایات کے مطابق عمل کرنے کی ایک آسان صورت ہے ۔

کتاب
الجہاد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
وَجَاهِدُوا بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ
[التوبۃ : ۴۱]
ترجمہ: اپنی جانوں اور مالوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کرو

باب شرائط الجهاد وآدابه
(جہاد کے شرائط و آداب کا بیان)

جہاد کے شرائط

سوال:۔ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ موجودہ وقت میں تبلیغی جماعت والے حد سے بڑھ گئے ہیں لہٰذا ان پر بجائے تبلیغ کے جہاد فرض ہوتا ہے تو کیا اُن لوگوں کا یہ کہنا درست ہے؟

الجواب:۔ فقہاء کرام نے جہاد کی فرضیت کے لیے جن شرائط کا لحاظ کیا ہے وہ اہلِ اقتدار کے علاوہ عوام الناس میں نہیں پائے جاتے ہیں اس لیے تبلیغی حضرات پر یہ فریضہ عائد نہیں ہوتا ہے" اور وہ شرائط یہ ہیں:۔

لما فی الهندية: واما شرائطه فشیئان احدهما امتناع العدو عن قبول ما دعی الیه من الدین الحق وعدم الامان والعهد بیننا وبینهم والثانی ان یرجوا لشوکة واهل للمسلمین فی القتال فانه لا یحل له القتال لما فیه من القاء نفسه فی التهلکة۔

(الفتاویٰ الهندية ج ۲ ص ۱۸۸ کتاب السیر۔ الباب الاول فی تفسیره شرعاً وشرطه وحکمه) [۱]

جہاد کی قسمیں

سوال:۔ کیا جہاد فرضِ عین ہے یا فرضِ کفایہ؟

الجواب:۔ جہاد کی دو قسمیں ہیں (۱) فرض عین (۲) فرض کفایہ۔ اگر نفیر عام کی صورت میں پیش آئے یعنی دشمن اتنا زیادہ طاقتور ہو کہ قریب والے اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے تو اس صورت میں جہاد فرضِ عین ہے، اور اگر بعض لوگ دشمن کا مقابلہ کر سکتے ہوں تو دوسروں پر جہاد فرض کفایہ ہے یعنی بعض افراد کا جہاد کرنا دوسروں سے اس

---

[۱] وقال العلامة التمرتاشیؒ: ولا بد لفرضیته من قید آخر وهو الاستطاعة۔ وقال العلامة الحصکفیؒ تحته وفی السراج وشرط لوجوبه القدرة علی السلاح لا امن الطریق فان علم انه اذا حارب قتل وان لم یحارب اسر لم یلزمه القتال۔

(الدر المختار علی هامش رد المختار ج ۳ ص ۲۲۱ کتاب الجهاد، مطلب طاعة الوالدین)

ومثله فی البحر الرائق ج ۵ ص ۷۲ کتاب السیر۔

ذمہ داری ساقط کر دیتا ہے۔

لما قال العلامة الحصکفی رحمہ اللہ: کل ما فرض لغیرہ فھو فرض کفایة اذا حصل المقصود بالبعض والا ففرض عین۔ (الدر المختار علی ھامش رد المحتار ج۳ ص۲۱۸ کتاب الجھاد) لہ

جہاد کے دوران امیر کی اہمیت

سوال:۔ جہاد کے دوران مجاہدین کی ترتیب ونظم ونسق برابر کرنے کے لیے امیر بنانا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جہاد کے دوران مجاہدین کی ترتیب اور نظم ونسق درست کرنے کیلئے ایک ماہر جنگ کے اصول اور طریقہ کار سے باخبر، نیک اور متبع سنت امیر کی تقرری سُنتِ نبوی ہے، اس لیے جنگ سے پہلے امیر مقرر کرنا اچھا اقدام ہے تاکہ مجاہدین کے نظم ونسق کو برقرار رکھا جا سکے۔

لما قال العلامة الکاسانی رحمہ اللہ: ومنھا ان یؤمر علیھم امیرًا لان النبی صلی اللہ علیہ وسلم ما بعث جیشًا الا وأمر علیھم امیرًا ولان الحاجة الی الامیر ماسة لانہ لابد من تنفیذ الاحکام وسیاسة الرعیة ولا یتقوی ذلک الا بالامیر لتعذر الرجوع فی کل حادثة الی الامام۔ (بدائع الصنائع ج۷ ص۹۹ فصل فی بیان ما یندب الیہ الامام ...الخ) لہ۲

لہ لما قال العلامة الکاسانی رحمہ اللہ: واما بیان کیفیة فرضیة الجھاد فالامر فیہ لا یخلو من احد وجھین اما ان کان النفیر عامًا وأما فان لم یکن النفیر عامًا فھو فرض کفایة ومعناہ ان یفترض علی جمیع من ھو اھل للجھاد لکن اذا قام بہ البعض سقط عن الباقین فاما اذا عم النفیر بان ھجم العدو علی بلد فھو فرض عین یفترض علی کل واحد من آحاد المسلمین ممن ھو قادر علیہ۔

(بدائع الصنائع ج۷ ص۹۸ کتاب السیر)

وَمِثْلُہٗ فی فتح القدیر ج۵ ص۱۸۹ کتاب السیر۔

۲ہ وقال العلامة ابن عابدین رحمہ اللہ: قال فی الملتقی وینبغی الامام ان یعرض الجیش عند دخول دار الحرب لیعلم الفارس من الراجل قال فی شرحہ وان یکتب اسماءھم وان یؤمر علیھم من کان بصیرًا بامور الحرب وتدبیرھا ولو من الموالی وعلیھم طاعتہ لان مخالفة الامیر حرام الا اذا اتفق الاکثر انہ ضرر فیتبع۔ (رد المحتار ج۳ ص۲۳۴ کتاب الجھاد۔ فصل فی کیفیة القسمة)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیة ج۲ ص۱۹۲ کتاب السیر الباب الاول فی تفسیرہ

جہاد کی ذمہ داری کا حکم

سوال :۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس بارے میں کہ ایک شخص کی منگنی ہو چکی ہے لیکن تاحال شادی نہیں ہوئی جبکہ اُسے جہاد پر جانے کا شوق ہے اور والدین کی طرف سے اجازت بھی مل چکی ہے۔ تو کیا اس شخص کا جہاد کے لیے جانا موجبِ مواخذہ ہے یا نہیں؟

الجواب :۔ چونکہ جہاد کی فرضیت کے لیے استطاعت یعنی آلاتِ حرب اور قدرت علی الجہاد شرط ہے اس لیے یہ جہاد عوام پر فرضِ عین نہیں ہے بلکہ یہ حکومت کی ذمہ داری ہے۔ لہٰذا مذکورہ شخص کا جہاد کے لیے جانا یا نہ جانا موجبِ مواخذہ نہیں ہے البتہ جانے سے اجر ضرور ملتا ہے جبکہ نیت صحیح ہو۔

لما قال الشیخ التمرتاشی رحمہ اللہ : ولا بد لفرضیتہ من قید اٰخر ھو الاستطاعۃ قال العلامۃ الحصکفی رحمہ اللہ : تحتہ وفی السراج وشرط لوجوبہ القدرۃ علی السلاح لا امن الطریق فان علم انہ اذا حارب قتل وان لم یحارب اُسر لم یلزمہ القتال۔ (الدر المختار علیٰ ھامش رد المحتار ج۳ ص۲۲۱ کتاب الجہاد)[1]

نفیر عام کی تعریف

سوال :۔ نفیر عام کا معنیٰ اور تعریف کیا ہے؟ اور کون سی حالت میں نفیر عام کا حکم لگایا جاسکتا ہے؟

الجواب :۔ فقہاء کرام نے نفیر عام کی تعریف یوں بیان کی ہے کہ جب کفار بلادِ اسلام میں داخل ہو جائیں تو اس وقت ہر ذی قدرت جو اُن بلاد کے ساتھ تعلق رکھتا ہے پر جہاد فرض ہو جاتا ہے۔

قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ : (تحت قولہ وان ھجم العدو) ای دخل بلدۃ بغتۃ وھٰذہ الحالۃ تسمّی النفیر العام قال فی الاختیار والنفیر العام

---

[1] وفی الھندیۃ : واما شرائطہ فشیئان احدھما امتناع العدو عن قبول ما دعی الیہ من الدین الحق وعدم الامان والعھد بیننا وبینھم والثانی ان یرجوا الشوکۃ للمسلمین فی القتال فانہ لا یحل لہ القتال لما فیہ من القاء نفسہ فی التھلکۃ۔

(الفتاویٰ الھندیۃ ج۲ ص۱۸۸ کتاب السیر۔ الباب الاول فی تفسیرہ)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۵ ص۷۳ کتاب السیر۔

ان یحتاج الی جمیع المسلمین ۔ (رد المحتار ج ۳ ص ۲۲۱ کتاب الجہاد ۔ مطلب طاعة الوالدین فرض فی فرض کفایة) [1]

افغانستان کا جہاد کن لوگوں پر فرض ہے

سوال: ۔ کیا افغانستان کا جہاد فرضِ عین ہے یا فرضِ کفایہ؟ اگر فرضِ عین ہے تو کن لوگوں پر فرض ہوتا ہے؟ اور کیا پاکستان کے لوگوں پر بھی یہ فرض عائد ہوتا ہے یا نہیں؟

الجواب: ۔ افغانستان کا جہاد نفیرِ عام ہونے کی وجہ سے فرضِ عین ہے تاہم کمزور اور قدرت نہ رکھنے والے افراد پر یہ ذمہ داری عائد نہیں ہوتی بلکہ یہ ذمہ داری اہلِ اقتدار اور سربراہوں کی ہے، اس لیے اگرچہ عوام الناس اور رعیت پر یہ جہاد فرض نہیں ہوتا لیکن ان کے لیے مجاہدین کی اعانت اور ہمدردی کرنا ضروری ہے۔

لما قال العلامة الکاسانی رحمه الله: واما بیان من یفترض علیه فنقول انه لا یفترض الاعلی القادر علیه فمن لا قدرة له لا جهاد علیه لان الجهاد بذل الجهد وهو الوسع والطاقة بالقتال او المبالغة فی عمل القتال ومن لا وسع له کیف یبذل الوسع ۔ (بدائع الصنائع ج ۷ ص ۹۸ کتاب السیر) [2]

جہادِ کشمیر کی فرضیت کا حکم

سوال: ۔ مسلمانانِ مقبوضہ کشمیر جو کہ عرصۂ دراز سے ایک جابر اور ظالم حکومت کے زیرِ تسلط ہیں، وہاں ان

---

[1] وفی الهندیة: ومعنی النفیر العام ان یخبر اهل مدینة ان العدو قد جاء یرید انفسکم وذراریکم واموالکم فاذا اخبروا علی هذا الوجه افترض علی کل من قدر علی الجهاد من اهل تلك البلدة ان یخرج للجهاد ۔

(الفتاوی الهندیة ج ۲ ص ۱۸۸ کتاب السیر الباب الاول فی تفسیره)

وَمِثْلُهٗ فی بدائع الصنائع ج ۷ ص ۹۸ کتاب السیر)

[2] وفی الهندیة: واما شرائط اباحته فشیئان احدهما امتناع العدو عن قبول ما دعی الیه من الدین الحق وعدم الامان والعهد بیننا وبینهم والثانی ان یرجو الشوکة والقوة لاهل الاسلام باجتهاده لما فیه من القاء نفسه فی التهلکة ۔

(الفتاوی الهندیة ج ۲ ص ۱۸۸ کتاب السیر الباب الاول فی تفسیره)

وَمِثْلُهٗ فی رد المحتار ج ۳ ص ۲۲۱ کتاب الجهاد، مطلب طاعة الوالدین ۔

ظالموں نے مسلمانوں کا قتلِ عام شروع کر رکھا ہے، ان کے گھر اور جائیداد وغیرہ کو تباہ کیا جا رہا ہے، پردہ نشین مسلم عورتوں کی آبروریزی ہو رہی ہے، تو کیا ایسی حالت میں اس ظالم اور جابر حکومت کے خلاف جہاد فرض عین ہے یا نہیں؟ اور ان مظلوم مسلمانوں کی اعانت ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب: مسئولہ حالات کے پیشِ نظر اس جابر اور ظالم حکومت کے خلاف جہاد فرض عین ہے کیونکہ مسلمانانِ کشمیر پر بھارتی حکومت نے جبر و ظلم کا بازار گرم کر رکھا ہے اور مسلمانوں کا قتلِ عام کیا جا رہا ہے اور ان کی عزت و عصمت کو پائمال کیا جا رہا ہے لیکن عوام اور رعیت کا ان کافروں سے مقابلہ دشوار ہے اس لیے تمام تر ذمہ داری اہلِ اقتدار پر عائد ہوتی ہے، اگر ان کے قریب کی مملکتِ اسلامیہ کفار کا مقابلہ نہ کر سکے تو الاقرب فالاقرب پر حتیٰ کہ شرقاً و غرباً تمام ممالکِ اسلامیہ پر جہاد فرض ہوتا ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدين رحمه الله: ونقل صاحب النهاية عن الذخيرة ان الجهاد اذا جاء النفير انما يصير فرض عين على من يقرب من العدو فاما من وراءهم يبعد من العدو فهو فرض كفاية عليهم حتى يسعهم تركه اذا لم يحتج اليهم فان احتيج اليهم بان عجز من كان يقرب من العدو عن المقاومة مع العدو او لم يعجزوا عنها لكنهم تكاسلوا ولم يجاهدوا فانه يفترض على من يليهم فرض عين كالصلوٰة والصوم لا يسعهم تركه ثم وثم الى ان يفترض على جميع اهل الاسلام شرقاً وغرباً على هذا الترتيب۔ (رد المحتار ج۳ صفحہ ۲۲۰ کتاب الجہاد۔ مطلب فی الفرق فرض عین و فرض الکفایۃ)[1]

---

[1] وفی الھندیۃ: وانما یفرض فرض عین علیٰ من کان یقرب من العدو وھم یقدرون علی الجھاد واما علیٰ من وراءھم ممن یبعد من العدو فانہ یفترض فرض کفایۃ لا فرض عین حتیٰ یسعھم ترکہ فاذا احتیج بان عجز من کان یقرب من العدو عن المقاومۃ مع العدو او تکاسلوا ولم یجاھدوا فانہ یفترض علیٰ من یلیھم فرض عین ثم وثم الیٰ ان یفرض علیٰ جمیع اھل الارض شرقاً وغرباً علیٰ ھذا الترتیب۔

(الفتاویٰ الھندیۃ ج ۲ ص۱۸۸ کتاب السیر۔ الباب الاول فی تفسیرہ)

ومثلہ فی فتح القدیر ج ۵ ص۱۹۱ کتاب السیر۔

برما کے مظلوم مسلمانوں پر جہاد کا حکم

سوال :۔ سرزمینِ برما میں مسلمان بہت عرصہ سے آباد ہیں جبکہ وہاں پر تا حال غیر مسلموں کی حکومت ہے اور گذشتہ کئی سالوں سے حکومت کی طرف سے مسلمانوں پر ظلم و بربریت کا سلسلہ جاری ہے تو کیا مسلمانانِ برما پر جہاد فرضِ عین ہے یا نہیں ؟ اور طاقت نہ رکھنے کی صورت میں ان کے لیے کیا حکم ہے ؟

الجواب :۔ جب مسلمانوں پر ظلم و تشدد میں اضافہ ہو جائے تو ان پر وہاں کے کافروں اور ظالموں کے خلاف جہاد فرضِ عین ہو جاتا ہے ، صورتِ مسئولہ میں برما کے مسلمانوں کی کمزوری اور جہاد پر قدرت نہ رکھنے کی وجہ سے ان کے پڑوسی اسلامی ممالک پر ان کی امداد کے لیے جہاد باقاعدہ فرض ہے ، لہٰذا الاقرب فالاقرب شرقاً وغرباً تمام اسلامی حکومتوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے ۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ : ونقل صاحب النهاية عن الذخيرة ان الجهاد اذا جاء النفير انما يصير فرض عين على من يقرب من العدو فاما من وراءهم يبعد من العدو فهو فرض كفاية عليهم حتى يسعهم تركه اذا لم يحتج اليهم فان احتيج اليهم بان عجز من كان يقرب من العدو عن المقاومة مع العدو او لم يعجزوا عنها لكنهم تكاسلوا ولم يجاهدوا فانه يفترض على من يليهم فرض عين كالصلوٰة والصوم لا يسعهم تركه ثم و ثم الى ان يفترض على جميع اهل الاسلام شرقاً وغرباً على هذا الترتيب ۔ (رد المحتار ج۳ ص۲۲۰ كتاب الجهاد مطلب في الفرق بين فرض العين وفرض الكفاية)[1]

---

[1] وفي الهندية : ثم بعد مجئ النفير العام لا يفترض الجهاد على جميع اهل الاسلام شرقاً وغرباً فرض عين وان بلغهم النفير وانما يفترض فرض عين على من كان يقرب من العدو ويقدرون على الجهاد .... الى ان قال فانه يفترض على من يليهم فرض عين ثم و ثم الى ان يفرض على جميع اهل الارض شرقاً وغرباً على هذا الترتيب ۔ (الفتاوى الهندية ج۲ ص۱۸۸ كتاب السير الباب الاول في تفسيره ۔

ومثله في فتح القدير ج۵ ص۱۹۱ كتاب السير ۔

بوسنیا میں جہاد کا شرعی حکم

سوال :۔ بوسنیا ہرزیگوینا میں جو جنگ مسلمانوں کے خلاف ہو رہی ہے اور ان کا قتلِ عام ہو رہا ہے، ان کی عورتوں کی اجتماعی آبروریزی ہو رہی ہے، مسلمانوں کی جان و مال، عزت و آبرو پائمال کی جا رہی ہے، لیکن وہاں کے مسلمان کمزور و ناتواں ہونے کی وجہ سے کفّار کے مقابلہ سے قاصر ہیں، تو کیا ان کفار کے ساتھ جہاد کرنا اور ان کے فساد کو دفع کرنا اور مظلوم مسلمانوں کی اعانت کرنا تمام ممالکِ اسلامیہ پر فرض ہے یا نہیں؟

الجواب :۔ کفّار جب مسلمانوں کے کسی ملک میں داخل ہو جائیں اور وہاں کے مسلمان کفار کا مقابلہ نہ کر سکیں تو ایسی صورت میں جہاد الاقرب فالاقرب پر باقاعدہ فرض ہو جاتا ہے حتیٰ کہ شرقاً و غرباً تمام ممالکِ اسلامیہ پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے، لہٰذا بوسنیا کے مظلوم مسلمانوں کی ہر ممکن طریقہ سے اعانت کرنا اور ان کفار کے فساد کو دفع کرنا تمام اسلامی ممالک کی ذمہ داری ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: ونقل صاحب النهاية عن الذخيرة ان الجهاد اذا جاء النفير انما يصير فرض عين على من يقرب من العدو فاما من وراءهم يبعد من العدو فهو فرض كفاية عليهم حتى يسعهم تركه اذا لم يحتج اليهم فان احتيج اليهم بان عجز من كان يقرب من العدو عن المقاومة مع العدو او لم يعجزوا عنها لكنهم تكاسلوا ولم يجاهدوا فانه يفترض على من يليهم فرض عين كالصلوة والصوم لا يسعهم تركه ثم وثم الى ان يفترض على جميع اهل الاسلام شرقاً وغرباً على هذا الترتيب - (رد المحتار ج ۳ ص۲۲۰ کتاب الجهاد - مطلب في الفرق بين فرض العين وفرض الكفاية)[1]

---

[1] وفی الهندية: ثم بعد مجئ النفير العام لا يفترض الجهاد على جميع اهل الاسلام شرقاً وغرباً فرض عين وان بلغهم النفير وانما يفرض فرض عين على من كان يقرب من العدو وهم يقدرون على الجهاد ...... الى ان قال فانه يفترض على من يليهم فرض عين ثم وثم الى ان يفرض على جميع اهل الارض شرقاً وغرباً على هذا الترتيب -

(الفتاوى الهندية ج ۲ ص۱۸۸ کتاب السير- الباب الاول في تفسيره)

وَمِثْلُهٗ فی فتح القدیر ج ۵ ص۱۹۱ کتاب السیر -

مسلمان فاسق حکمران سے مسلح جہاد کا حکم

سوال:۔ پاکستان جو کہ ایک اسلامی مملکت ہے اور اس کے بیشتر قوانین غیر شرعی ہیں تو اس کے حکمرانوں کے ساتھ مسلح جہاد کا کیا حکم ہے؟ کیا مسلمان فاسق حکمران کے ساتھ جہاد بالسیف اور قتل و قتال جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ احادیثِ نبویہ اور فقہاء کرام کی تصریحات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مسلمان فاسق حکمران سے مسلح جہاد اور قتل و مقاتلہ بالاجماع جائز نہیں، البتہ بغیر قتال کے اس کے خلاف آواز اٹھانا اور منکرات سے روکنا خواہ جلسے جلوس سے ہو یا ہڑتال وغیرہ سے ہو ضروری ہے۔

لما ورد فی الحدیث: عن امّ سلمۃؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ستکون امراء فتعرفون وتنکرون فمن عرف برئ ومن انکر سلم ولکن من رضی وتابع قالوا افلا نقاتلھم قال لا ما صلّوا۔ (مسلم شریف ج ۲ ص ۱۲۸ کتاب الامارۃ۔ باب وجوب الانکار الخ) [1]

جہادِ افغانستان کی شرعی حیثیت

سوال:۔ افغانستان کی موجودہ جنگ جو کمیونسٹوں کے خلاف ہو رہی ہے کیا یہ شرعی جہاد ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ افغانستان کی موجودہ جنگ جو کہ کمیونسٹوں اور روسیوں کے خلاف جاری ہے بلا شک وشبہ شرعی جہاد ہے کیونکہ کمیونسٹوں اور روسیوں نے افغانستان پر جبراً قبضہ کر کے وہاں ظلم و زیادتی اور بربریت و درندگی کا بازار گرم کر رکھا ہے اور مسلمانوں کی جان و مال

---

[1] وقال العلامۃ ملّا علی القاریؒ: والمراد بالکفر ھنا المعاصی والمعنی لاتنازعوا ولاۃ الامور فی ولایتھم ولا تعترضوا علیھم الا ان تروا منھم منکرًا محققًا تعلمونہ من قواعد الاسلام فاذا رأیتم ذٰلک فانکروہ علیھم وقوموا بالحق حیثما کنتم واما الخروج علیھم وقتالھم فحرام باجماع المسلمین وان کانوا فسقۃ ظالمین واجمع اھل السنۃ علیٰ ان السلطان لاینعزل بالفسق لتھییج الفتن فی عزلہ واراقۃ الدماء وتفریق ذات البین فتکون المفسدۃ فی عزلہ اکثر منھا فی بقائہ۔

(مرقاۃ شرح مشکوٰۃ ج ۷ ص ۲۰۱ کتاب الامارۃ والقضاء الفصل الاول)

ومثلہ فی شرح المسلم للنووی ج ۲ ص ۱۲۸ کتاب الامارۃ۔ باب وجوب الانکار علی الامراء۔

اور عزت وآبرو کو پامال کیا ہوا ہے اور دینِ اسلام کو ختم کرنے کے درپے ہیں، اس لیے ان غاصبین کے خلاف جنگ کرنا اور ان کے فساد کو رفع کرنا عین جہاد ہے۔

لما قال العلامة ابن الهمام: اورد الجهاد عقيب الحدود لانه بعد ان ناسبها بوجهين باتحاد المقصود من كل منهما ومن مضمون هٰذا الكتاب وهو اخلاء العالم من الفساد ويكون كل منهما حسنًا لحسن لغيره وذٰلك الغير هو اعلاء كلمة الله تعالىٰ يتأدى بفعل نفس المامور به فهو القتال۔ (فتح القدير ج ۵ ص ۱۸۷ كتاب السير)[1]

لڑائی شروع ہونے سے پہلے اسلام کی دعوت دینے کا حکم

سوال: کفار کے ساتھ لڑائی شروع ہونے سے پہلے کیا ان کو اسلام کی دعوت دینا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر کسی علاقہ کے رہنے والوں کو اسلام کی دعوت بالکل نہیں پہنچی ہو تو ان کے ساتھ اعلانِ جہاد سے پہلے انہیں اسلام کی دعوت دینا ضروری ہے ہاں اگر انہیں پہلے سے اسلام کی دعوت پہنچی ہو تو پھر ان کو دوبارہ دعوت دینا مستحب ہے ضروری نہیں، لیکن دعوت نہ دینے کی صورت میں جہاد کرنے سے گناہ لازم نہیں آتا۔

لما قال العلامة الكاساني رحمه الله: فان كان الدعوة لم تبلغهم فعليهم الافتتاح بالدعوة الى الاسلام باللسان لقوله تعالىٰ: اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ۔ (الآية) ولا يجوز لهم القتال قبل الدعوة .... الى ان قال فان كانت قد بلغتهم جاز لهم ان يفتتحوا القتال من غير تجديد الدعوة لما بينا ان الحجة لازمة والعذر فى الحقيقة منقطع وشبهة العذر انقطعت بالتبليغ مرة لكن مع هٰذا الافضل ان لا يفتتحوا القتال الا بعد

---

[1] وقال العلامة ابن نجيم: مناسبة الحدود من حيث ان المقصود منهما اخلاء العالم عن الفساد وكان كل منهما حسنًا للمعنى فى غيره وقال لانه ما فرض لعينه اذ هو افساد فى نفسه وانما فرض لاعزاز دين الله ودفع الشر عن العباد۔

(البحر الرائق ج ۵ ص ۷ كتاب السير)

ومِثْلُهٗ فى الهندية ج ۲ ص ۱۸۸ كتاب السير۔ الباب الاول فى تفسيره۔

تجدید الدعوۃ لرجاء الاجابۃ فی الجملۃ ۔ (بدائع الصنائع ج ۷ ص ۱۰۱ کتاب السیر) لہ

سوال :۔ بعض لوگوں کا خیال

کفار کے خلاف مدافعانہ اور اقدامی دونوں قسم کے جہاد مشروع ہیں

ہے کہ اسلام میں صرف مدافعانہ جہاد مشروع ہے اور اقدامی جہاد مشروع نہیں ہے کیونکہ اقدامی جہاد اگر کفار کے خلاف شروع ہو جائے تو اسلام ایک خونخوار مذہب شمار ہوگا اور اس سے اسلام کی بدنامی ہوگی، کیا واقعی اسلام میں اقدامی جہاد مشروع نہیں ہے ؟

الجواب :۔ اسلام درحقیقت ایک امن پسند دین ہے وہ خونریزی نہیں چاہتا تاہم بوقتِ ضرورت جب دین کو غیر مسلموں سے خطرہ ہو یا اعلاء کلمۃ اللہ مقصود ہو تو اسلام اقدامی اور دفاعی دونوں قسم کے جہاد کی اجازت دیتا ہے لیکن کسی صورت میں بھی ظلم و جبر کا قائل نہیں ہے ۔

لما قال العلامۃ ابن نجیم رحمہ اللہ : مناسبتہ للحدود من حیث ان المقصود منہما اخلاء العالم عن الفساد فکان کل منہما حسنٌ لمعنی فی غیرہٖ وقال لانہٗ ما فرض لعینہٖ اذ ھو افساد فی نفسہٖ وانما فرض لاعزاز دین اللہ تعالیٰ ودفع الشر عن العباد ۔ (البحر الرائق ج ۵ ص ۷۰ کتاب السیر) ۲ہ

لہ وقال العلامۃ التمرتاشی رحمہ اللہ : ولا نقاتل من لا تبلغھم الدعوۃ الی الاسلام ۔ وقال الحصکفی رحمہ اللہ : وھو وان استشھد فی زماننا شرقاً وغرباً لکن لا شک ان فی بلاد اللہ تعالیٰ من لا شعور لہٗ بذٰلک وندع ندباً من بلغتھم الا اذا تضمن ذٰلک ضرراً ۔ (الدر المختار علی ھامش رد المحتار ج ۳ ص ۲۲۳ کتاب الجھاد ۔ مطلب اذا علم انہٗ یقتل یجوز لہ الخ)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج ۵ ص ۷۵ کتاب السیر ۔

۲ہ وقال العلامۃ ابن عابدینؒ : (قولہ لاتحاد المقصود) وھو اخلاء الارض عن الفساد الخ (وقولہٗ غیر خفی) لان الحدود اخلاء عن الفسق والجھاد اخلاء عن الکفر ۔ (رد المحتار ج ۳ ص ۲۱۷ کتاب الجھاد)

وَمِثْلُہٗ فی فتح القدیر ج ۵ ص ۱۸۷ کتاب السیر ۔

مغلوب ہونے کا یقین ہو تو کمانڈر کا حکم ماننا مناسب نہیں

سوال:۔ مجاہدین کو لڑائی کے دوران اگر مغلوب ہونے کا یقین ہو اور کمانڈر (امیر) مجاہدین کو حملہ کرنے پر مجبور کرے تو کیا اس صورت میں کمانڈر کا حکم ماننا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر مجاہدین کا اس بات پر یقین ہو کہ کمانڈر کے حکم کی تعمیل کرنے میں مجاہدین کا کوئی فائدہ نہیں بلکہ ضرر اور نقصان کا اندیشہ ہے اور ان کے حملے سے کفار کو نقصان اور ضرر کا احتمال بھی نہ ہو تو ایسی صورت میں کمانڈر (امیر) کے حکم کی تعمیل کرنا مناسب نہیں ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: فاما اذا علم ان لا ینکی فیھم فانه لایحل له ان یحمل علیھم لانه لایحصل بحملته شئ من اعزاز الدین۔
(رد المحتار ج۴ ص۱۲۷ کتاب الجهاد۔ مطلب اذا علم انه یقتل یجوز له ان یقاتل) [1]

والدہ کی اجازت کے بغیر جہاد کے لیے جانا

سوال:۔ ایک شخص جہاد میں شرکت کی خواہش رکھتا ہے لیکن اس کی والدہ اس کو اجازت نہیں دیتی، تو کیا یہ شخص والدہ کی اجازت کے بغیر جہاد کے لیے جا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جہاد فرضِ عین نہ ہونے کی صورت میں مذکورہ شخص والدہ کی اجازت کے بغیر نہیں جا سکتا کیونکہ والدین کی اطاعت فرضِ عین ہے اور فرضِ عین کا مرتبہ فرضِ کفایہ پر مقدم ہے ہاں اجازت کی صورت میں جا سکتا ہے، تاہم اگر جہاد فرضِ عین ہو جائے تو اس وقت والدین کی اجازت کی ضرورت نہیں۔

لما قال العلامة الکاسانی رحمه الله: وکذا الولد لایخرج الا باذن والدیه او احدھما اذا کان الآخر میتاً لان بر الوالدین فرض عین فکان مقدما علی

---

[1] وفی الهندیة: وان علموا انهم لاینتفعون به بیقین بل یتفرقون لایطیعونه فی ذلك۔ (الفتاوی الهندیة ج۲ ص۱۹۲ کتاب السیر۔ الباب الاول فی تفسیرہ)
ومِثلُهٗ فی التاتارخانیة ج۵ ص۲۵۶ کتاب السیر۔ الفصل العاشر۔

فرض الکفایۃ والا ان کل سفر لا یومن فیہ الھلاک ویشتد فیہ الخطر لا یحل للولد ان یخرج الیہ بغیر اذن والدیہ لانھما یشفقان علی ولدھما فیتضرر ان بذلک وکل سفر لا یشتد فیہ الخطر یحل لہ ان یخرج الیہ بغیر اذنھما۔

(بدائع الصنائع ج ۷ ص ۹۸ کتاب السیر) لہ

والدین کے علاوہ دوسرے محارم کی اجازت کے بغیر جہاد کیلئے جانا

سوال: اگر ایک شخص کو اس کے والدین جہاد پر جانے کی اجازت دے دیں اور دوسرے محارم مثلاً بھائی وغیرہ اجازت نہیں دیتے ہوں تو کیا ایسی صورت میں یہ شخص ان محارم کی اجازت کے بغیر جہاد کیلئے جا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر والدین کے علاوہ دوسرے محارم کسی کو جہاد کیلئے جانے کی اجازت نہیں دیتے ہوں اور جہاد فرض عین نہ ہو اور ان محارم کے ضیاع کا خطرہ بھی نہ ہو تو بغیر ان کی اجازت کے بھی جانا مرخص ہے، البتہ اگر ان کا نفقہ اس پر واجب ہو اور جہاد کے لیے جانے میں ان کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو تو ان کی اجازت کے بغیر جانا جائز نہیں۔

لما قال العلامۃ ابن عابدینؒ: واما غیر ھؤلاء کالزوجۃ والاولاد والاخوات والاعمام فانہ یخرج بلا اذنھم الا اذا کانت نفقتھم واجبۃ علیہ وخاف علیھم الضیعۃ اھ ملخصاً من شرح السیر الکبیر۔ (رد المحتار ج ۳ ص ۲۲۰ کتاب الجہاد۔ مطلب طاعۃ الوالدین فرض عین) [۲]

لہ وقال العلامۃ الحصکفیؒ: لا یفرض علی صبی وبالغ لہ ابوان او احدھما لان طاعتھما فرض عین۔ (الدر المختار علی ھامش رد المحتار ج ۳ ص ۲۲۰ کتاب الجہاد، مطلب طاعۃ الوالدین فرض عین)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج ۲ ص ۱۸۹ کتاب السیر، الباب الاول فی تفسیرہ۔

[۲] وقال العلامۃ ابن نجیمؒ: وفی الذخیرۃ ان من سوی الاصول اذا کرھوا خروجہ للجہاد فان کان یخاف علیھم الضیاع فانہ لا یخرج بغیر اذنھم والا یخرج وکذا امرأتہ۔ (البحر الرائق ج ۵ ص ۵۲ کتاب السیر)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج ۲ ص ۱۸۹ کتاب السیر، الباب الاول فی تفسیرہ۔

اہل وعیال کیلئے نان ونفقہ کا متبادل انتظام نہ ہونے کی صورت میں جہاد کے لیے جانا

سوال :- ایک آدمی کا جہاد میں جانے کا ارادہ ہے لیکن اس کے چھوٹے چھوٹے بچے اور بیویاں ہیں اور ان کے لیے اس شخص کے علاوہ اور کوئی کمانے والا (کفیل) نہیں، تو کیا ایسی صورت میں یہ شخص جہاد کے لیے جا سکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب :- چونکہ یہ شخص اپنے اہل وعیال کا اکیلا ضامن ہے اور ان کا نان ونفقہ اس پر واجب ہے اس لیے اگر ان کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو تو پھر یہ شخص جہاد کے لیے نہیں جا سکتا، تاہم اگر ان کے ضائع ہونے یا انہیں ضرر پہنچنے کا خطرہ نہ ہو تو اس کے لیے جہاد پر جانے میں کوئی حرج نہیں ۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ، واما غیرهما کالزوجة والاولاد والاخوات والاعمام فانه یخرج بلا اذنهم الا اذا کانت نفقتهم واجبة علیه وخاف علیهم الضیعة ۔اھ ملخصاً من شرح السیر الکبیر۔ (رد المحتار ج۳ ص۲۲۰ کتاب الجهاد مطلب طاعة الوالدین فرض کفایة) [1]

جہاد فرض عین نہ ہونے کی صورت میں بھائیوں سے مشورہ کرنا

سوال :- ایک شخص کو جہاد پر جانے کا شوق ہے، والدین بھی اجازت دیتے ہیں لیکن یہ کہتے ہیں کہ بھائیوں سے بھی مشورہ کر لو، تو کیا اس صورت میں اس شخص کے لیے بھائیوں سے مشورہ کرنا ضروری ہے یا نہیں ؟ اور بغیر بھائیوں کے مشورہ کے جہاد کے لیے جا سکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب :- جہاد کے لیے جانے میں والدین کے علاوہ کسی دوسرے محارم سے اجازت لینا ضروری نہیں، البتہ اگر ان (دیگر رشتہ داروں) کا نان ونفقہ جہاد میں جانے والے پر ہو اور اس کا متبادل انتظام نہ ہو اور ان کے ضائع ہونے کا خطرہ بھی ہو تو پھر بغیر ان کی

---

[1] وقال العلامة ابن نجیمؒ، وفی الذخیرة ان من سوی الاصول اذا کرهوا خروجه للجهاد فان کان یخاف علیهم الضیاع فانه لا یخرج بغیر اذنهم والا یخرج وکذا امرأته۔ (البحر الرائق ج۵ ص۷۲ کتاب السیر)

ومثله فی الهندیة ج۲ ص۱۸۹ کتاب السیر، الباب الاول فی تفسیره۔

اجازت کے جہاد میں جانا مرخص نہیں تاہم اجازت کی صورت میں کوئی حرج نہیں۔

لماقال العلامة ابن عابدینؒ: واما غیرھوٗ لاءکزوجة والاولاد والاخوات والاعمام فانهٗ یخرج بلااذنہم الا اذا کانت نفقتہم واجبة علیه وخاف علیہم الضیعة ملخصًا من شرح السیرالکبیر۔ (ردالمحتار ج۳ ص۲۲۳ کتاب الجہاد، مطلب طاعة الوالدین فرض عین) [۱]

عالم دین کے لیے جہاد میں جانے کا حکم

سوال:۔ علماء کرام اور مدرسین حضرات جہاد کے دوران بھی اپنے مخصوص مشاغل میں مصروف رہتے ہیں، کیا ان پر جہاد فرض نہیں ہوتا؟

الجواب:۔ چونکہ جہاد سے مقصود اعلاء کلمۃ اللہ ہے اور درس و تدریس سے بھی ثباتِ دین اور قیامِ دین مقصود ہے اس لیے فقیہ و عالم کے لیے فرضِ عین نہ ہونے کی صورت میں جہاد کو جانا ضیاعِ دین کا خطرہ ہے لہٰذا علماء کے لیے جہاد میں جانا مناسب نہیں۔

لماقال العلامة الحصکفیؒ: وعالم لیس فی البلدة أفقه منه فلیس له الغزو لخوف ضیاعھم سراجیة۔ وعمم فی البزازیة السفر ولا یخفی ان المقید یفید غیره بالاولی وفرض عین ان هجم العدو فیخرج الکل ولو بلا اذن۔ (الدرالمختار علیٰ ہامش ردالمحتار ج۳ ص۲۲۱ کتاب الجہاد، مطلب طاعة الوالدین فرض عین) [۲]

---

[۱] وفی الهندیة: واما من سواهم من ذوی الرحم المحرم کالأخت وبنیه واخواته وعماته واخواله وخالاته وکل ذی رحم محرم منهم اذا کرهوا خروجه للجهاد وکان یشق ذٰلك علیهم فان کان یخاف علیهم الضیعة بان کانت نفقتهم علیه بان لم یکن لهم مالٌ وکانوا صغارًا اوصغائر وکن کبائر الا انهٗ لا ازواج لهن اوکانوا کبارًا زمنی لاحرفة لهم فانهٗ لا یخرج بغیراذنهم وان کان لایخاف علیهم الضیع ...... الیٰ ان قال کان لهٗ ان یخرج بلا اذنهم۔

(الفتاوی الهندیة ج۲ ص۱۸۹ کتاب السیر۔ الباب الاوّل فی تفسیره)

وَمِثْلُهٗ فی البحرالرائق ج۵ ص۷۲ کتاب السیر۔

[۲] وفی الهندیة: عالم لیس فی البلدة أحدٌ افقه منه لیس له ان یغزو لما یدخل علیهم من الضیاعة کذا فی السراجیة۔ (الفتاوی الهندیة ج۲ ص۱۹۰ کتاب السیر الباب الاوّل فی تفسیره)

وَمِثْلُهٗ فی السراجیة ص۲۴ کتاب السیر۔ باب الجهاد فرض کفایة۔

جہاد پر قدرت نہ رکھنے کی صورت میں عالمِ اسلام کی ذمہ داریاں

سوال :۔ اگر کفار مسلمانوں کے ملک پر حملہ کرکے اس پر قبضہ کرلیں جیسا کہ رُوس نے جارحیت کرتے ہوئے افغانستان پر قبضہ کرلیا اور وہاں ظلم وستم کا بازار گرم کر رکھا ہے، تو کیا افغانستان کی عوام کے علاوہ ہمسایہ اسلامی ممالک پاکستان وغیرہ کی عوام پر روس کے خلاف جہاد فرض عین ہے یا نہیں؟

الجواب :۔ افغانستان پر روسی جارحیت سے جہاد کا حکم نفیرِ عام ہے لیکن جہاد کی فرضیت کے لیے یہ شرط ہے کہ قدرت علی الجہاد ہو لہٰذا افغانستان کی عوام اور پاکستان کی عوام کی عدم قدرت کی وجہ سے روسی فوجوں سے مقابلہ دشوار معلوم ہوتا ہے اس لیے یہ فرضیت اہلِ اقتدار اور دونوں ممالک کے سربراہان حکومت پر عائد ہوتی ہے اور علی الترتیب الاقرب فالاقرب کی بناء پر حتیٰ کہ شرقاً وغرباً تمام اسلامی حکومتوں پر روسی جارحیت کے خلاف جہاد فرض ہوتا ہے۔

لما قال العلامۃ ابن عابدینؒ : ونقل صاحب النہایۃ عن الذخیرۃ ان الجہاد اذا جاء النفیر انما یصیر فرض عین علی من یقرب من العدو فاما من وراءھم یبعد من العدو فھو فرض کفایۃ علیہم حتی یسعھم ترکہ اذا لم یحتج الیہم فان احتیج الیہم بان عجز من کان یقرب من العدو عن المقاومۃ مع العدو او لم یعجزوا منھا لکنھم تکاسلوا ولم یجاھدوا فانہ یفترض علی من یلیہم فرض عین کالصلوٰۃ والصوم لا یسعھم ترکہ ثم وثم الی ان یفترض علی جمیع اھل الاسلام شرقاً وغرباً علی ھذا الترتیب۔ (ردالمحتار ج ۳ ص ۲۲۰ کتاب الجہاد، مطلب فی الفرق بین فرضِ عین وفرض کفایۃ) [۱]

---

[۱] وفی الہندیۃ : ثم بعد مجیٔ النفیر لا یفترض الجہاد علی جمیع اھل الاسلام شرقاً وغرباً فرض عین وان بلغھم النفیر وانما یفترض فرض عین علی من کان یقرب من العدو وھم یقدرون علی الجہاد الی ان قال فانہ یفترض علی من یلیھم فرض عین ثم وثم الی ان یفترض علی جمیع اھل الارض شرقاً وغرباً علی ھذا الترتیب۔

(الفتاوی الہندیۃ ج ۲ ص ۱۸۸ کتاب السیر۔ الباب الاول فی تفسیرہ)

وَمِثْلُہٗ فی فتح القدیر ج ۵ ص ۱۹۱ کتاب السیر۔

مظلوم مسلمانوں کی حمایت اور اعانت مسلم ارباب اقتدار کی ذمہ داری ہے

سوال:۔ موجودہ دور میں مسلمانوں کو ختم کرنے کے لیے کافروں نے بزعم خود منصوبے بنا رکھے ہیں جن کے تحت ہر جگہ کافروں کی طرف سے مسلمانوں کا قتلِ عام ہو رہا ہے، تو کیا ایسی حالت میں عالم اسلام کے اہلِ اقتدار پر مظلوم مسلمانوں کی امداد و نصرت لازم آتی ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ تمام ممالکِ اسلامیہ اور اہلِ اقتدار پر مظلوم مسلمانوں کی حمایت اور اعانت ضروری ہے اور جہاں کہیں بھی مسلمانوں پر ظلم ہو رہا ہو تو اُن کے ساتھ قریب کی اسلامی حکومت پر ان کی اعانت اور یہود و ہنود کے ساتھ جہاد فرض ہو جاتا ہے، اور قدرت نہ رکھنے کی صورت میں شرقاً و غرباً تمام اہلِ اسلام اور اہلِ اقتدار پر جہاد کا فریضہ عائد ہوتا ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدين رحمه الله: ونقل صاحب النهاية عن الذخيرة ان الجهاد اذا جاء النفير انما يصير فرض عين على من يقرب من العدو فاما من ورائهم يبعد من العدو فهو فرض كفاية عليهم حتى يسعهم تركه اذا لم يحتج عليهم فان احتيج اليهم بان عجز من كان يقرب من العدو عن المقاومة مع العدو ولم يعجزوا لكنهم تكاسلوا ولم يجاهدوا فانه يفترض على من يليه فرض عين كالصلوٰة والصوم لا يسعهم تركه ثم وثم الى ان يفترض على جميع اهل الاسلام شرقاً وغرباً على هذا التدريج۔

(رد المحتار ج ۳ ص ۲۳۰ كتاب الجهاد، مطلب فى الفرق بين فرض عين وفرض كفاية) [۱]

---

[۱] وفي الهندية: وانما يفرض فرض عين على من كان يقرب من العدو وهم يقدرون على الجهاد واما على من وراءهم ممن يبعد من العدو فانه يفترض فرض كفاية لا فرض عين حتى يسعهم تركه فاذا احتيج بان عجز من كان يقرب من العدو عن المقاومة مع العدو او تكاسلوا ولم يجاهدوا فانه يفترض على من يليهم فرض عين ثم وثم إلى ان يفرض على جميع اهل الارض شرقاً وغرباً على هذا الترتيب۔ (الفتاوى الهندية ج ۲ ص ۱۸۸ كتاب السير۔ الباب الاول فى تفسيره)

وَمِثْلُهٗ فى فتح القدير ج ۵ ص ۱۹۱ كتاب السير۔

لفظ فی سبیل اللہ کی تحقیق

سوال: تبلیغی حضرات لفظ فی سبیل اللہ کو صرف تبلیغ ہی میں منحصر کرتے ہیں اور جہاد کو اس میں شامل نہیں کرتے، کیا ان حضرات کا یہ انحصار درست ہے یا نہیں؟

الجواب: لفظ فی سبیل اللہ ایک وسیع المعنیٰ لفظ ہے، دین کی خاطر اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے جو محنت و مشقت کی جائے وہ اس کے مفہوم میں داخل ہے لہٰذا دین کے تمام شعبوں میں کام کرنے والے افراد اس کا مصداق ہیں، دین کے کسی خاص شعبہ کو متعین طور پر اس کا مصداق ٹھہرا کر دوسرے شعبوں کو اس سے خارج کر دینا غلط فہمی پر مبنی ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: وقد قال فی البدائع فی سبیل اللہ جمیع القرب فیدخل فیہ کل من سعیٰ فی طاعة اللہ تعالیٰ وسبیل الخیرات اذا کان محتاجاً۔

(رد المحتار ج ۳ ص ۶۷)[۱]

دشمن کے جاسوس کو قتل کرنے کا حکم

سوال: جو شخص کافر حکومت کا جاسوس بن کر مسلمانوں کے خفیہ حالات اس تک پہنچائے یا کافر حکومت کے تعاون سے وہاں کے مسلمانوں کو ستائے تو یہ شخص اگر پکڑا جائے تو اسے قتل کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: اگر بدون قتل کے کوئی تدبیر اس کی فہمائش کے لیے کارگر نہ ہو تو اُسے قتل کرنے میں کوئی حرج نہیں، یہ اس صورت میں ہے کہ پکڑا جانے والا جاسوس مسلمان ہو اور اگر حربی ہو تو اس کو قتل کرنے میں کوئی کلام نہیں، اگرچہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور بعض دُوسرے ائمہ سے مسلمان جاسوس کو قتل نہ کرنے کے اقوال مروی ہیں۔

لما قال العلامة الامام القرطبیؒ: فان کان الجاسوس کافراً فقال الاوزاعیؒ یکون نقضاً لعهده وقال اصبغ: الجاسوس الحربی یقتل والجاسوس المسلم والذمی یعاقبان الا ان تظاهرا علی الاسلام فیقتلان۔ (الجامع احکام القرآن ج ۸ ص ۵۳ سورة الممتحنة)

---

[۱] لما فی الحدیث: وعن انس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من خرج فی طلب العلم فهو فی سبیل اللہ حتی یرجع۔ رواه الترمذی والدارمی۔ (مشکوٰة ج ۱ ص ۳۴ کتاب العلم)
ومثلہ فی البحر الرائق ج ۲ ص ۴۲ کتاب السیر۔

وقال الحافظ العینیؒ وقال القدوریؒ : الجاسوس یقتل وانما نفی القتل عن حاطب لما علم النبی صلی اللہ علیہ وسلم منہ ولکن مذھب الشافعی وطائفۃ ان الجاسوس المسلم یعزر ولا یجوز قتلہ وان کان ذا ھیئۃ عفی عنہ بھذا الحدیث وعن ابی حنیفۃ والاوزاعی یوجع عقوبۃ ویطال حبسہ وقال ابن وھب من المالکیۃ یقتل الا ان یتوب وعن بعضھم انہ یقتل اذا کانت عادتہ ذلک وبہ قال ابن الماجشون وقال ابن القاسم یضرب عنقہ لانہ لا تعرف توبتہ وبہ قال سحنون ومن قال بقتلہ فقد خالف الحدیث واقوال المتقدمین وقال الاوزاعیؒ فان کان کافرا یکون ناقضا للعھد وقال اصبغ : الجاسوس الحربی یقتل والمسلم والذمی یعاقبان الا ان یظاھرا علی الاسلام فیقتلان -

(عمدۃ القاری ج ۱۴ ص۲۵۶ باب الجاسوس، کتاب الجھاد) ۱؎

۱؎ وقال العلامۃ الحصکفیؒ : وفی المجتبیٰ : الاصل ان کل شخص رأی مسلما یزنی ان یحل لہ قتلہ وانما یمتنع خوفا من ان لا یصدق انہ زنی وعلی ھذا القیاس المکابر بالظلم وقطاع الطریق وصاحب المکس وجمیع الظلمۃ بادنی شیء لہ قیمۃ وجمیع الکبائر والاعونۃ والسعاۃ یباح قتل الکل وثیاب قاتلھم انتھی وافتی الناصحی بوجوب قتل کل مؤذ ــــــــــ وقال العلامۃ ابن عابدینؒ : (قولہ وجمیع الکبائر) ای اھلھا والظاھر ان المراد بھا المتعدی ضررھا الی الغیر فیکون قولہ والاعونۃ والسعاۃ عطف تفسیر او عطف خاص علی عام فیشمل کل من کان من اھل الفساد کالساحر وقاطع الطریق واللص واللوطی والخناق ونحوھم ممن عم ضررہ ولا ینزجر بغیر القتل قولہ والاعونۃ کانہ جمع معین او عوان بمعناہ والمراد بہ الساعی الی الحکام بالافساد فعطف السعاۃ علیہ عطف تفسیرہ وفی رسالۃ احکام السیاسۃ عن جمع النسفی سئل شیخ الاسلام عن قتل الاعونۃ والظلمۃ والسعاۃ فی ایام الفترۃ قال یباح قتلھم لانھم ساعون فی الارض بالفساد فقیل انھم یمتنعون ذلک فی ایام الفترۃ ویختفون قال ذلک امتناع ضرورۃ "ولو ردوا لعادوا لما نھوا عنہ" کما نشاھد وسئلنا الشیخ اباشجاع عنہ فقال بیاح قتلہ وثیاب قاتلہ قولہ وافتی الناصحی لعل الوجوب بنظر للامام ونوابہ والاباحۃ بنظر لغیرھم -

(رد المحتار ج ۳ ص۱۹۷، ۱۹۸ باب التعزیر، مطلب یکون التعزیر بالقتل)

ومثلہ فی البحر الرائق ج ۵ ص۴۲ فصل فی التعزیر -

دشمنوں کے گھروں اور عسکری ٹھکانوں کو تباہ کرنا

سوال:- کیا کفار کے ساتھ جنگ کے دوران ان کے گھروں اور عسکری ٹھکانوں کو تباہ کرنا مشروع ہے یا نہیں ؟

الجواب:- چونکہ مقصود اس سے ان کی شان وشوکت کو ختم کرنا اور ان پر غصے کا اظہار کرنا ہے اس لیے ان کے گھروں اور عسکری ٹھکانوں کو تباہ کرنا مشروع ہے، اور یہ بھی جہاد میں سے ہے۔

وقال العلامة الكاسانیؒ: ولا بأس باحراق حصونهم بالنار واغراقها بالماء وتخريبها وهدمها ونصب المجانيق عليها لقوله تعالىٰ: يخربون بيوتهم بايديهم وايدی المؤمنين ولان كل شیء من باب القتال لما فيه من قهر العدو وكبتهم وغيظهم۔

(بدائع الصنائع ج ۷ ص۱۰۰ كتاب السير)

اہل حرب کے باغات اور فصلوں کو برباد کرنا

سوال:- کیا کفار کے ساتھ جنگ کے دوران اُن کے باغات اور فصلوں کو تباہ کرنا اور قطع کرنا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب:- کفار کے ساتھ جنگ کی حالت میں ان کے باغات اور فصلوں کو کاٹنے اور برباد کرنے میں چونکہ ان کی شان وشوکت اور غرور وتکبّر کو توڑنا مقصود ہوتا ہے لہٰذا دورانِ جہاد اُن کے باغات اور فصلوں وغیرہ کو تباہ کرنے میں کوئی حرج نہیں، تاہم بلا وجہ مال مویشی اور باغات کو تباہ نہ کیا جائے۔

لما قال العلامة برهان الدين المرغينانی رحمه الله: قال وارسلوا عليهم الماء وقطعوا اشجارهم وافسدوا زروعهم لان فی جميع ذٰلك الحاق الكبت والغيظ بهم وكسر شوكتهم وتفريق

---

[1] وقال العلامة ابن عابدينؒ: (تحت قولهٖ وحرّقهم) اراد حرق دورهم وامتعتهم قاله عينی والظاهر ان المراد حرق ذاتهم بالمجانيق واذا جازت محاربتهم يحرقهم فمالهم اولىٰ۔

(ردالمحتار ج۳ ص۲۲۳ كتاب الجهاد)

ومِثلُهٗ فی الهندية ج۲ ص۱۹۴ كتاب السير۔ الباب الثانی فی كيفية القتال۔

جمعهم فیکون مشروعاً۔ (الهدایة ج ۲ ص۲۵۵ کتاب السیر باب کیفیة القتال) لـه

جنگ کے دوران کافر اگر کلمہ پڑھ لے تو اسے قتل کرنا جائز نہیں

سوال:۔ ایک کافر اور منکر خدا اگر دوران جنگ مجاہدین کے سامنے یہ الفاظ کہے کہ میں مسلمان ہوتا ہوں اور کلمۂ توحید پڑھ لے، تو کیا اسلام لانے کے بعد اس کا قتل کرنا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ حالت جنگ میں اگر کسی غیر مسلم نے مسلمانوں کے سامنے اپنے ایمان کا اظہار کیا اور کلمۂ توحید پڑھ کر وحدانیت باری تعالیٰ کا اقرار کر لیا تو شریعت مطہرہ میں ایسے شخص کو قتل کرنا جائز نہیں، کیونکہ ایسی صورت میں صرف اس کے اقرار ایمان پر ہی اکتفا کر لینا کافی ہے۔

لما قال العلامة ابن نجیمؒ: والکفار اقسام قسم یجحدون الباری جل وعلا واسلامهم اقرارهم بوجوده وقسم یقرون به ولکن ینکرون وحدانیته واسلامهم اقرارهم بوحدانیته۔ (البحر الرائق ج ۵ ص۷۴ کتاب السیر) لـه ۲

جنگ کے دوران کافر باپ کے قتل کا حکم

سوال:۔ اگر کسی کا باپ کمیونسٹوں کی طرف سے مجاہدین اسلام کے خلاف لڑ رہا ہو تو اس کو قتل کرنا بیٹے کے لیے جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ چونکہ اسلام میں والدین کے اپنی اولاد پر بہت زیادہ حقوق ہیں

لـه وفی الهندیة: ونصبوا علیهم المجانیق وحرقوهم وارسلوا علیهم الماء وقطعوا شجرهم وافسدوا زروعهم۔ (الفتاوى الهندیة ج ۲ ص۱۹۳ کتاب السیر، الباب الثانی فی کیفیة القتال)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج ۵ ص۷۶ کتاب السیر۔

لـه ۲ وفی الهندیة: قال القدوری فی کتابه الکفار علی نوعین فمنهم من یجحد الباری عزوجل ومنهم من یقربه الا انه ینکر وحدانیته کعبدة الاوثان فمن انکره اذا اقر به یحکم باسلامه ومن اقر وجحد وحدانیته اذا اقر بوحدانیته بان قال لا اله الا الله یحکم بالاسلام۔

(الفتاوى الهندیة ج ۲ ص۱۹۵ کتاب السیر، الباب الثانی فی کیفیة القتال)

وَمِثْلُهٗ فی التاتارخانیة ج ۵ ص۲۳۳ کتاب السیر، الفصل الرابع فی بیان ما ینتهی به الامر بالقتال۔

اس لیے کسی کے والدین اگرچہ کافر ہی ہوں پھر بھی اسلام دنیاوی امور میں ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنے اور ان کا احترام کرنے کا حکم دیتا ہے، اس بناء پر باپ جب کفار کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف لڑ رہا ہو تو بیٹے کے لیے باپ پر اقدام علی القتل مرخص نہیں البتہ اگر اُسے قتل کیے بغیر کوئی اور تدبیر مناسب ممکن نہ ہو یا باپ سے قتل ہو جانے کا خطرہ ہو تو اس مجبوری کے پیشِ نظر باپ کو قتل کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامة المرغینانیؒ: ویکرہ ان یبتدء الرجل اباہ من المشرکین فیقتلہٗ لقولہ تعالیٰ: وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا (الآیۃ) ولانہٗ یجب احیاءہٗ بالانفاق فیناقضہ الاطلاق فی افنائہ فان ادرکہٗ امتنع علیہ حتی یقتلہٗ غیرہٗ لان المقصود یحصل بغیرہ من غیر اقتحامہ الماثم وان قصد الاب قتلہٗ بحیث لایمکنہ دفعہ الا بقتلہ لاباس بہ لان مقصودہ الدفع الا تریٰ انہٗ لوشہر الاب سیفہ علی ابنہ ولایمکنہ دفعہ الا بقتلہ یقتلہ لما بینا فہٰذا اولیٰ۔

(الھدایۃ ج ۲ ص۲۵۷ کتاب السیر، باب کیفیۃ القتال) [1]

کمیونسٹوں کے ساتھ رہنے والے مسلمانوں کے احکام

سوال:۔ افغانستان پر رُوسی قبضہ کے بعد اکثر لوگوں نے ہجرت کرلی لیکن بعض لوگ ایسے ہیں جنہوں نے ابھی تک ہجرت نہیں کی اور کمیونسٹوں کے قرب و جوار میں رہ رہے ہیں، تو کیا ایسے لوگوں کا قتل کرنا اور انہیں نقصان پہنچانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ صورتِ مذکورہ میں جن لوگوں نے ہجرت نہیں کی ہے اور وہاں کمیونسٹوں کے قرب و جوار میں زندگی بسر کر رہے ہوں اور مجاہدین کے خلاف کمیونسٹوں کی اعانت نہیں کرتے ہوں تو اگرچہ وہ لوگ ہجرت نہ کرنے کی وجہ سے گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں

---

[1] وفی الھندیۃ: ولاباس بان یقتل الرجل من المسلمین کل ذی رحم محرم من المشرکین یبتدئ بہ الا الوالد والوالدۃ والاجداد من قبل الرجال والنساء والجدات۔

(الفتاویٰ الھندیۃ ج ۲ ص۱۹۴ کتاب السیر، الباب الثانی فی کیفیۃ القتال)

ومثلہٗ فی بدائع الصنائع ج ۷ ص۱۰۱ کتاب السیر۔

لیکن شریعتِ مقدسہ ان کو قصداً وارادۃً قتل کرنے کی اجازت نہیں دیتی، البتہ اُن کے اموال کو ضبط کرنا جبکہ اس سے کفار کو فائدہ ہو رہا ہو درست ہے۔

لما قال العلامة محمد کامل الطرابلسیؒ: ومنه تعلم من يدخل تحت جوارهم وامانهم من غيرا عانة لهم بنفسه وبماله ولا يكون عينا لهم علينا ولا ردا اًُ دونهم لا يباح قتله وانما هو عاص معصيةً لا تبيح ما عصمه الاسلام من دمه وماله وانما ابيح اخذ اموالهم ايضاً لكونهم يعينون به العدو على مقاتل الاسلام ومقاومته ومناواته ومناهضته فابيح اخذه لذلك۔

(الفتاوى الكاملية ص۲۵۱ كتاب الجنايات) [۱]

کمیونسٹوں کے معاونین کا حکم

سوال:- کمیونسٹوں کے معاونین اور ان کی پشت پناہی کرنے والوں کا کیا حکم ہے؟ کیا ان کا قتل جائز ہے؟

الجواب:- کمیونسٹ چونکہ اپنے عقائد اور نظریات کی بناء پر اہلِ حرب قرار دیئے گئے ہیں لہٰذا واقعی طور پر جو لوگ کمیونسٹوں کے حامی ہوں اور ان کے ساتھ امداد و تعاون کرتے ہوں تو یہ بھی انہی لوگوں کے حکم میں ہیں، لہٰذا ان کو بھی قتل کرنا مرخص ہے۔

لما قال العلامة محمد کامل الطرابلسیؒ: سئلت عن بلدة استولى عليها الكفار وتمكنوا منها فانضم اليهم بعض القبائل والعشائر وصاروا يقاتلون معهم المسلمين وينهبون مالهم وينصحون الكفار ويعينونهم على اذى المسلمين فكانوا اشد ضرراً على المسلمين من الكفار فما حكم فيهم وهذا حالهم۔ فالجواب انى لم اقف على حكم هؤلاء فى كتب مذهبنا معاشر الحنفية ولكن وقفت عن حكمهم

---

[۱] قال العلامة ابن عابدينؒ: قوله بالمجانيق اى يرمى النار بها عليهم لكن جواز التحريق والتغريق مقيد كما فى شرح السير بما اذا لم يتمكنوا من الظفر بهم بدون ذلك بلا مشقة عظيمة فان تمكنوا بدونها فلا يجوز لان فيه اهلاك اطفالهم ونسائهم ومن عندهم من المسلمين۔ (رد المحتار ج۴ ص۱۲۹ كتاب الجهاد۔ مطلب فى ان الكفار مخاطبون ندبا)

ومثله فى الهداية ج۲ ص۲۵۶ كتاب السير۔

فی کتب بعض السادۃ المالکیۃ الیٰ ان قال والظاھر ان حکم ھٰؤلاءِ حکم اھل الحرب فی قتلھم واخذ اموالھم واما اولادھم فلا یقتلون ولا یکون فیأً واِنما اُبیح قتل البالغین منھم لکونھم ردأ العدو الحرب ومعینون لہٗ بانفسھم و حکم الردء اذا لم یقاتل مع العدو حکم المقاتل فاحری اذا قاتل۔

(الفتاویٰ الکاملیۃ ص۲۵ کتاب الجنایات) لہ

کمیونسٹوں کی عورتوں اور بچوں کو قتل کرنا

سوال:۔ کمیونسٹوں کے بچوں اور ان کی عورتوں کو قتل کرنا جائز ہے یا نہیں؟ فقہاء احناف کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟

الجواب:۔ کمیونسٹوں کے بچوں اور عورتوں کو قصداً و ارادۃً قتل کرنا جائز نہیں البتہ اگر کمیونسٹوں کو اور ان کے گھروں کو تباہ کرنا مقصود ہو تو ان میں جو بچے اور عورتیں غیر ارادی طور پر قتل ہو جائیں تو اس میں کوئی حرج نہیں، نیز اگر ان میں سے کوئی ذی رائے ہو یا جنگ کرنے والا ہو یا ان کی سربراہ عورت ہو تو قصداً و ارادۃً بھی قتل کئے جاسکتے ہیں تاکہ شر و فساد کا خاتمہ ہو جائے۔

لما قال العلامۃ المرغینانیؒ: ولا یقتلوا امرأۃ ولا صبیاً ولا شیخاً فانیاً ومقعداً ولا اعمیٰ لان المبیح للقتل عندنا ھو الحراب ولا یحقق منھم ..... الا ان یکون احد ھٰؤلاء ممن لہ رأی فی الحراب او یکون المرأۃ ملکۃ لتعدی ضررھا الی العباد وکذا یقتل من قاتل من ھٰؤلاء دفعاً للشرّ ولان القتال مبیح حقیقتہ۔ (الھدایۃ ج۲ ص۲۵۶ کتاب السیر باب کیفیۃ القتال) ۲ہ

لہ وقال العلامۃ الحصکفیؒ: وجمیع الکبائر والاعونۃ والسعاۃ یباح قتل الکل ویثاب قاتلھم انتھی وافتی الناصحی بوجوب قتل کل مؤذٍ۔ وقال ابن عابدینؒ: بعد قولہ وجمیع الکبائر ای اھلھا والظاھر ان المراد بھا المتعدی ضررھا ای الغیر الیٰ ان قال فیشمل کل من کان من اھل الفساد۔

(ردّ المحتار ج۴ ص۱۹۸ باب التعزیر، مطلب یکون التعزیر بالقتل)

۲ہ وقال العلامۃ الکاسانیؒ: اما حال القتال فلا یحل فیھا قتل امرأۃ ولا صبی ولا شیخ فانٍ۔ (بدائع الصنائع ج۷ ص۱۰۱ کتاب السیر)

ومثلہٗ فی البحر الرائق ج۵ ص۷۷ کتاب السیر۔

دشمن سے اسلحہ لیکر اُسے مجاہدین کے خفیہ راز بتانیوالے کو قتل کرنے کا حکم

سوال، پاکستان یا افغانستان کے بعض قبائلی علاقوں میں کچھ لوگ مجاہدین کو نقصان پہنچاتے اور ان کے عسکری راستوں کو قطع کرنے کے لیے روسی کمیونسٹ حکومت سے اسلحہ لیتے ہیں اور مجاہدین کے خفیہ حالات اور مراکز کی اطلاع بھی دشمن کو کرتے ہیں، توکیا ایسے لوگوں کو قتل کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جو لوگ مجاہدین اسلام کے خلاف کمیونسٹوں یا دیگر مخالفین اسلام کے ساتھ کسی بھی قسم کی معاونت کرتے ہوں اور مجاہدینِ اسلام کے خفیہ راز اور عسکری مراکز کی نشاندہی دشمنوں کو کرتے ہیں تو ایسے لوگوں کو قتل کرنا جائز ہے، ان کا حکم زنادقہ کا حکم ہے۔

لما قال العلامة محمد کامل الطرابلسیؒ: ومنهم من لجأ للمسلمین وصار یقاتل العدو معهم وهو مع ذلك یعین العدو خفیة ویعلمه باحوال عساکر المسلمین ویطلعه علیٰ عوراتهم ویتربص بهم الدوائر وقد اطلع لهم علیٰ کتب کتبها فی ذلك الوقت کثیر من مشائخهم المعروفین بالاجواد...... الی ان قال وحکم اولئك حکم الزنادقة ان اطلع علیهم قتلوا وان لا فامرهم الی الله۔ (الفتاویٰ الکاملیة ص۲۵۱ کتاب الجنایات)[1]

جہاد کے دوران مونچھیں بڑھانا

سوال:۔ کیا مجاہدین کے لیے جہاد کے دوران مونچھیں بڑھانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جہاد کے دوران ہر مناسب طریقے سے دشمن پر رعب اور دباؤ ڈالنا

---

[1] قال العلامة الحصکفی رحمه الله: وجمیع الکبائر والاعونة والسعاة یباح قتل کل وبثاب قاتلهم انتهی وافتی الناصحی بوجوب قتل کل موذٍ۔ وقال ابن عابدینؒ: (تحت قوله وجمیع الکبائر) ای اهلها والظاهر ان المراد بها المتعدی ضررها الی الغیر فیکون قوله والاعونة والسعاة عطف تفسیر او عطف خاص علیٰ عام فیشمل کل من کان من اهل الفساد کالساحر وقاطع الطریق واللص واللوطی والخناق ونحوهم من عم ضرره ولا ینزجر بغیر القتل قوله والاعونة کانه جمع معین او عوان بمعنا والمراد به الساعی الی الحکام بالافساد فعطف السعاة عطف تفسیر۔

(رد المحتار ج۴ ص۱۹۸ باب التعزیر)

اور اس کی شان و شوکت کو ٹھیس پہنچانا مشروع ہی نہیں بلکہ مستحسن بھی ہے، مونچھیں بڑھانے کی صورت میں چونکہ دشمن پر رعب پڑنے کا امکان ہوتا ہے اس لیے جہاد کے دوران مونچھیں بڑھانا ایک اچھا قدم ہے۔

قال العلامة ابن نجیمؒ: ویندب للمجاهد فی دار الحرب توفیر الاظفار وان کان قصها من الفطرة لانه اذا سقط السلاح من یده ودنا منه العدو ربما یتمکن من دفعه باظافیره وهو نظیر قص الشوارب فانه سنة ثم الغازی فی دار الحرب مندوب الی توفیرها وتطویلها لیکون اهیب فی عین من یبارزه والحاصل ان مایعین المرء علی الجهاد فهو مندوب الی اکتسابه لما فیه من اعزاز المسلمین وقهر المشرکین۔
(البحر الرائق ج۵ ص۷۶ کتاب السیر) [۱]

دشمن سے تحفظِ دین کی خاطر توریہ کا بروئے کار لانا

سوال:۔ جہاد میں کفار کو ہلاک کرنے اور ان کو شکست دینے کے لیے جھوٹ بولنا اور انہیں دھوکہ دینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ دھوکہ دہی اور جھوٹ بولنا کسی بھی آسمانی مذہب میں جائز نہیں اس لیے اس کا کسی بھی وقت جائز اور حلال متصور نہیں تاہم بعض مواضع ایسے ہیں جن میں اگر دین کو نقصان پہنچتا ہو اور اس سے بچنے کے لیے ظاہری دھوکہ اور جھوٹ کے علاوہ کوئی تلافی ممکن نہ ہو تو ایسے مواضع پر جھوٹ کا سہارا لیا جاسکتا ہے تو چونکہ درحقیقت یہ جھوٹ نہیں اس لیے دشمن سے حفاظتِ دین کی خاطر ظاہری دھوکہ اور جھوٹ میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامة عالم بن العلاء الانصاریؒ: روی عن علیؓ انه قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم الحرب خدعة فیه دلیل علی انه لاباس بالخداع فی الحرب ولیس المراد الکذب المحض وانما المراد استعمال المعاریض۔ (الفتاوی التاتارخانیة ج۵ ص۲۵۰ کتاب السیر، الفصل التاسع فی الخدعة فی الحرب) [۲]

---

[۱] وفی الهندیة: قالوا لا بأس عن طول الشارب للغزاة لیکون اهیب فی عین العدو وکذا فی الغیاثیة۔
(الفتاوی الهندیة ج۵ ص۳۵۹ کتاب الکراهیة)

[۲] قال العلامة العثمانیؒ: بعد ذکر الحدیث ما نصه وفیه علی انه لاباس للمجاهد ان یخادع قرنه فی حال القتال۔ (اعلاء السنن ج۱۲ ص۴۵ کتاب السیر)

ومثله فی خلاصة الفتاوی ج۴ ص۳۴۶ کتاب الکراهیة۔ الفصل الثالث فیما یتعلق بالمعاصی۔

جنگ کے دوران مسلمان افواج کا پیچھے ہٹ جانے کا حکم

سوال :- کفار کے ساتھ جنگ کے دوران مسلمانوں کی فوج اپنے مورچوں پر آخری دم تک ثابت قدم رہے گی یا کسی موقعہ پر پیچھے ہٹ جانے کی بھی اجازت موجود ہے ؟

الجواب :- کفار کے مقابلہ میں مسلمان اللہ تعالیٰ کی طرف سے ثابت قدمی پر مامور ہیں اور ان کا میدان چھوڑنا جرم ہے، لیکن کفار کی تعداد اگر اتنی زیادہ ہو کہ ان کا مقابلہ ناممکن ہو یا تعداد کے لحاظ سے اگرچہ کم ہوں لیکن مسلمان فوج کا غالب خیال یہ ہو کہ کفار کا مقابلہ نہیں کر سکتے تو ایسی حالت میں دوبارہ تیاری کے لیے پیچھے ہٹ جانا شرعاً جرم نہیں ۔

کما قال اللہ تعالیٰ: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوهُمُ الْأَدْبَارَ - وَمَنْ يُوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهُ إِلَّا مُتَحَرِّفًا لِقِتَالٍ أَوْ مُتَحَيِّزًا إِلَىٰ فِئَةٍ فَقَدْ بَاءَ بِغَضَبٍ مِنَ اللَّهِ وَمَأْوَاهُ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ۝ (سورۃ الانفال آیت ۱۵) [1]

---

[1] وقال العلامۃ الکاسانیؒ: وعلی ھذا الغزوات إذا جاءھم جمع من المشرکین مالا طاقۃ لھم بہ وخافوھم ان یقتلوھم فلا بأس لھم ان ینحازوا إلی بعض امصار المسلمین او الی بعض جیوشھم والحکم فی ھذا الباب لغالب الرأی واکبر الظن دون العدد فان غلب علی ظن الغزاۃ انھم یقاومونھم یلزمھم الثبات وان کانوا اقل عدداً منھم وان کان غالب ظنھم انھم یغلبون فلا بأس ان ینحازوا الی المسلمین لیستعینوا بھم وان کانوا اکثر عدداً من الکفرۃ ۔

(بدائع الصنائع ج ۷ ص ۹۸ کتاب السیر فصل بیان من یفترض)

باب الغنائم وقسمتها

(مالِ غنیمت کے احکام و مسائل)

مالِ غنیمت غانمین کا حق ہے نہ کہ حکومت کا

سوال:۔ کفار کے ساتھ جنگ کے دوران جب اسلامی فوج کافروں کی افواج کو مغلوب کر کے مالِ غنیمت پر قبضہ کرے تو کیا یہ مالِ غنیمت فوج کا حق ہے یا حکومت کا حق ہے؟

الجواب:۔ شرعی اعتبار سے مالِ غنیمت کے پانچ حصے کر کے ان میں سے ۱/۵ حصہ بیت المال میں داخل کر کے باقی ۴/۵ حصہ خاص اس فوج پر تقسیم کیا جائے گا جس نے دورانِ جنگ اس مالِ غنیمت پر قبضہ کیا ہو اور اس کے برعکس حکومت کا یہ قانون کہ سارا مالِ غنیمت حکومت کا ہو گا دیگر قوانین کی طرح ایک غیر اسلامی اور غیر شرعی قانون ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنت کے بھی خلاف ہے۔

لما قال العلامة المرغینانی رحمہ اللہ: ویقسم الامام الغنیمة فیخرج خمسها لقوله تعالیٰ: فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَ لِلرَّسُوْلِهٖ۔ استثنی الخمس ویقسم اربعة اخماس بین الغانمین لان النبی علیہ السلام قسمها بین الغانمین۔ (الهداية ج ۲ ص ۵۶۲ باب الغنائم وقسمتها)[1]

مالِ غنیمت تمام مجاہدین کا مشترکہ سرمایہ ہے

سوال:۔ جب امیر لشکر میدانِ جنگ میں دشمن کے کسی علاقہ پر قبضہ کرنے کے لیے مجاہدین کو چار جماعتوں پر تقسیم کر کے بھیج دے اور ان چار جماعتوں میں سے ایک جماعت اس علاقہ پر قبضہ کر کے مالِ غنیمت پر قبضہ کر لے تو کیا اس مالِ غنیمت میں تمام جماعتیں شریک ہوں گی یا یہ صرف قابض جماعت کا حق ہو گا۔

---

[1] وقال العلامة الحصکفی رحمہ اللہ: فی المغرب الغنیمة ما نیل من الکفار عنوة والحرب قائمة فتخمس وباقیها للغانمین۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۴ ص ۱۳۷ کتاب الجهاد، باب المغنم وقسمته)

وَمِثْلُهٗ فی فتح القدیر ج ۵ ص ۲۳۴ کتاب الغنائم وقسمتها، فصل فی کیفیة القسمة

الجواب:۔ مذکورہ صورت میں یہ مالِ غنیمت مجاہدین کی تمام جماعتوں کا مشترکہ حق ہے خواہ کسی ایک جماعت نے ہی اس مال پر قبضہ کیا ہو، البتہ اگر امیرِ لشکر کسی خاص مصلحت کی بناء پر یہ مالِ غنیمت کسی خاص جماعت پر تقسیم کر دے تو اس میں کوئی حرج نہیں ۔

لما قال العلامة المرغینانیؒ: قال الردء والمقاتل فی العسکر سواء لاستوائهم فی السبب وهو المجاوزة او شهود الوقعة علیٰ ما عرف وکذلک اذا لم یقاتل لمرض اولغیره لما ذکرنا۔ (الهدایة ج ۲ ص۲۶۳ کتاب السیر، باب الغنائم وقسمتها) ؎۱

سوال: جہادِ افغانستان | **تنفیل (انعام) نہ ہونے کی صورت میں مالِ غنیمت تمام مجاہدین کا مشترکہ ہوگا**

میں ایک مجاہد نے ایک روسی کافر کو ہلاک کر کے اس کی کلاشنکوف پر قبضہ کر لیا، اب دیگر مجاہدین اس کو یہ کہتے ہیں کہ یہ کلاشنکوف آپ اکیلے کا حق نہیں بلکہ تمام مجاہدین کا اس میں حق ہے اور یہ مالِ غنیمت ہے جبکہ وہ مجاہد یہ کہتا کہ اس کلاشنکوف پر صرف میرا حق ہے کوئی اور اس میں شریک نہیں ہے، تو اس مسئلہ کا شرعی حل کیا ہوگا؟

الجواب:۔ مالِ غنیمت تمام مجاہدین کے درمیان مشترکہ ہوتا ہے کسی ایک مجاہد کا بغیر تقسیم کے مالِ غنیمت میں سے کچھ لینا جائز نہیں، تاہم اگر امیرِ جہاد نے تنفیل (انعام) کا اعلان کیا ہو یعنی جو مجاہد جس حربی کو قتل کرے گا تو مقتول سے جو اسلحہ اُسے حاصل ہوگا وہ اسی کا ہوگا۔ تو ایسی صورت میں اگر کسی مجاہد نے کسی حربی کو قتل کر کے اس کے اسلحہ پر قبضہ کر لیا تو وہ اسلحہ اسی مجاہد کا حق ہوگا کوئی اور اس کے ساتھ اس اسلحہ میں شریک نہیں ہوگا، اس کے علاوہ جملہ مالِ غنیمت تمام مجاہدین کا مشترکہ مال ہے ۔

لما فی الهندیة: قال محمدؒ ولا یستحق القاتل سلب المقتول بنفس القتل ما لم

؎۱ وقال العلامة ابن عابدینؒ: (تنبیه) قال فی البحر وافاد المصنف ان المقاتل وغیره سواء حتیٰ یستحق الجندی الذی لم یقاتل لمرض وغیره وانه لا یتمیز واحد علی آخر بشیء حتیٰ امیر العسکر وهذا بلا خلاف کذا فی الفتح وفی المحیط والمتطوع فی الغزو وصاحب الدیوان سواء ۔

(رد المحتار ج ۴ ص۱۴۴ کتاب الجهاد، باب المغنم وقسمته)

وَمِثْلُهٗ فی البحر ج ۵ ص۸۵ کتاب السیر، باب الغنائم وقسمتها ۔

ینفل الامام قبل القتال فیقول من قتل قتیلاً فلهٗ سلبه وهذا مذهب علمائنا۔
(الفتاویٰ الهندیة ج۲ ص۲۱۲ کتاب السیر الباب الرابع الفصل الثالث فی التنفل) ؎

دارالحرب سے مالِ غنیمت لانے کی قدرت نہ ہو تو اس کا حکم

سوال:- جہاد کے دوران اگر مسلمان کفار کے بہت سارے مال واسباب پر قبضہ کریں اور اس میں بعض ایسی اشیاء بھی شامل ہوں کہ ان کو دارالاسلام میں منتقل کرنا مشکل ہو مثلاً حیوانات اور دوسری بھاری اشیاء، تو ایسی اشیاء کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

الجواب:- اگر مقبوضہ اشیاء ایسی ہوں کہ ان کو دارالاسلام میں منتقل کرنا مشکل ہو جیسا کہ حیوانات اور بھاری اسلحہ وغیرہ، تو شریعت کی رُو سے حیوانات کو پہلے ذبح کرکے بعد میں دارالحرب میں چھوڑا جائے تاکہ کفار ان سے فائدہ نہ اٹھا سکیں اور اسلحہ وغیرہ کو کسی ایسی خفیہ جگہ دفن کیا جائے کہ کفار کو اس کا پتہ نہ چل سکے، بچوں اور عورتوں کو ایسی جگہ چھوڑ دیا جائے کہ وہاں بھوک اور پیاس سے دم توڑ جائیں تاکہ کفار کو ان سے تقویت نہ پہنچے اور برتن وغیرہ توڑ دیئے جائیں۔

کما قال العلامة التمرتاشیؒ: وحرم عقر دابة شق نقلها فتذبح وتحرق کما تحرق اسلحة وامتعة تعذر نقلها ومالا یحرق منها یدفن بموضع خفی وتکسر اوانیهم وتراق ادهانهم مغایظة لهم ویترکون صبیانا ونساءهم شق اخراجها بارض خربة حتی یموتوا جوعا۔ (تنویر الابصار علی صدر ردالمحتار ج۴ ص۱۳۰ کتاب الجهاد۔ باب المغنم وقسمته) ؎

؎ وقال العلامة الکاسانیؒ: هذا اذا نفل الامام فان لم ینفل شیئاً وقتل رجل من الغزاة قتیلاً لم یختص بسلبه عندنا۔ (بدائع الصنائع ج۷ ص۱۱۵ کتاب السیر) ومثله فی الهدایة ج۲ ص۲۶۳ کتاب السیر۔ باب الغنائم وقسمتها

؎ قال العلامة الکاسانیؒ: وان لم یقدر المسلمون علی حمل هؤلاء ونقلهم الی دارالاسلام لا یحل قتلهم ویترکون فی دارالحرب لان الشرع نهی عن قتلهم ولا قدرة علی نقلهم فیترکون ضرورة واما الحیوان والسلاح اذا لم یقدروا علی الاخراج الی دارالاسلام اما الحیوان فیذبح ثم یحرق بالنار لئلا یمکنهم الانتفاع به اما السلاح فما امکن احراقه بالنار یحرق ومالا یحتمل الاحراق کالحدید ونحوه فیدفن بالتراب لئلا یجدوه۔ (بدائع الصنائع ج۷ ص۱۰۲ کتاب السیر)

ومثله فی الهندیة ج۲ ص۲۰۸ کتاب السیر۔ الباب الرابع فی الغنائم وقسمتها۔ الفصل الاول فی الغنائم۔

دارالحرب میں مسلمان تاجر کے مال کا حکم

سوال:۔ بعض مسلمان تاجر دارالحرب میں سامانِ تجارت وغیرہ لاتے ہیں اور وہاں خرید وفروخت کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں، اگر مجاہدین ان کے سامان اور مال پر قبضہ کرلیں تو کیا یہ مال وغیرہ مالِ غنیمت شمار ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ دارالحرب کو مالِ تجارت مہیا کرنا مسلمانوں کے لیے زیبا نہیں کیونکہ اس سے کفار کو تقویت ملتی ہے جو کہ اعانت علی المعصیت کے مترادف ہے، اور مجاہدین کا مسلمانوں کے مالِ تجارت پر قبضہ کرنے سے وہ مال مالِ غنیمت شمار نہیں ہوتا بلکہ مالِ غنیمت وہ ہے جو کفار سے بزورِ شمشیر حاصل کیا جائے۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: الغنیمة اسمٌ لما یؤخذ من اموال الکفرة بقوة الغزاة وقهر الکفرة۔ (رد المحتار ج۴ ص۱۳۷ کتاب الجهاد والمغنم) [۱]

مالِ غنیمت میں خیانت کرنا حرام ہے

سوال:۔ مالِ غنیمت میں خیانت کرنا شرعاً کیا حکم رکھتا ہے؟ آیاتِ قرآنیہ اور احادیثِ نبویہ میں اس کا کوئی ذکر ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مالِ غنیمت میں خیانت کرنا شرعاً حرام ہے، یہ مسلمان کی شان کے خلاف ہے کہ وہ اس میں خیانت کرے کیونکہ اس کی حرمت پر قرآنی نصوص اور احادیثِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) دال ہیں۔

لقوله تعالیٰ: وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَغُلَّ وَمَنْ يَغْلُلْ يَأْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ثُمَّ تُوَفَّىٰ كُلُّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ۝ (سورۃ آلِ عمران آیت ۱۶۱) [۲]

---

[۱] وقال العلامة الکاسانیؒ: فالغنیمة عندنا اسم للماخوذ من اهل الحرب علی سبیل القهر والغلبة۔ (بدائع الصنائع ج۷ ص۱۱۷ کتاب السیر)
وَمِثْلُهُ فی الهندیة ج۲ ص۲۰۴ کتاب السیر، الباب الرابع فی الغنائم، الفصل الاول فی الغنائم۔

[۲] وفی الحدیث: عن ابن عباسؓ یقول حدثنی عمر بن الخطابؓ قال قیل لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان فلاناً قد استشهد قال کلا قد رأیتهٗ فی النار بعباءة قد غلّها قال قم یا عمر فناد انه لا یدخل الجنة الا المؤمنون ثلاثاً۔ هذا حدیث حسن صحیح غریب۔ (ترمذی ج۱ ص۹۱ باب ما جاء فی الغلول)
وَمِثْلُهُ فی ابی داؤد ج۲ ص۱۴ باب فی تعظیم الغلول۔ کتاب الجهاد۔

مالِ غنیمت کی نیت سے جہاد کرنے کا حکم

سوال:- مالِ غنیمت کے حصول کی نیت سے جہاد میں حصہ لینے سے ثواب کی اُمید کی جا سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:- کسی آدمی کا جہاد کو جانے سے اگر مقصودِ اصلی مالِ غنیمت ہو تو اُس کو جہاد کا ثواب نہیں ملے گا، ہاں اگر مقصودِ اصلی جہاد اور رضائے الٰہی کا حصول ہو لیکن اس کے ساتھ مالِ غنیمت کا بھی ارادہ ہو تو ثواب ملنے کی اُمید ہے۔

لما فی الحدیث: عن ابی ھریرۃؓ ان رجلاً قال یارسول اللہ رجل یرید الجہاد فی سبیل اللہ وھو یبتغی غرضاً من غرض الدنیا فقال علیہ السلام لا اجر لہٗ فاعظم ذٰلک علی الناس وقال للرجل عد لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلعلک لم تفہمہ فقال یارسول اللہ رجل یرید الجہاد فی سبیل اللہ وھو یبتغی غرضاً من غرض الدنیا قال لا اجر لہٗ فقالوا للرجل عد لرسول اللہ فقال لہ الثالثۃ فقال لا اجر لہٗ۔[1]

(سنن ابی داؤد ج۱ کتاب الجہاد باب فیمن یغزو ویلتمس الدنیا ص۳۴۸)

شہید کے ورثاء کو مالِ غنیمت میں حصہ دینے کا حکم

سوال:- اگر کوئی مجاہد کفار کے ساتھ جنگ کے دوران شہید ہو جائے تو کیا اس کے ورثاء کو مالِ غنیمت میں سے حصہ دیا جائے گا یا نہیں؟

الجواب:- مجاہدین جب مالِ غنیمت پر قبضہ کر کے دارالاسلام میں لے آئیں یا تقسیم کر لیں اور اس کے بعد کوئی شہید ہو جائے تو ایسی حالت میں اس کا حصہ اس کے

---

[1] وقال العلامۃ ابن عابدینؒ: ثم تاویلہٗ من وجھین احدھما ان یری انہٗ یرید الجہاد ومرادہٗ فی الحقیقۃ المال فھٰذا کان حال المنافقین ولا اجر لہٗ او یکون معظم مقصودہ المال وفی مثلہٗ قال علیہ السلام للذی استوجر علی الجہاد بدینارین انما لک دینارک فی الدنیا والاٰخرۃ واما اذا کان معظم مقصودہ الجہاد یرغب معہ الغنیمۃ فھو داخل فی قولہٖ تعالیٰ: لَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلاً مِّنْ رَّبِّکُمْ۔ یعنی التجارۃ فی الحج فکما انہٗ لا یحرم ثواب الحج فکذا الجہاد۔ (ردّ المحتار ج۴ ص۱۲۰ کتاب الجہاد مطلب فیمن یرید الجہاد مع الغنیمۃ)

ورثاء کو دیا جائے گا، اور اگر کوئی دار الحرب میں شہید ہو گیا یا تقسیم غنیمت سے پہلے شہید ہو گیا تو ایسی صورت میں اس کے ورثاء کو حصہ نہیں دیا جائے گا۔

لما قال العلامة المرغینانی رحمہ اللہ: ومن مات من الغانمین فی دار الحرب فلا حق لہٗ فی الغنیمة ومن مات منهم بعد اخراجها الی دار الاسلام فنصیبهٗ لورثته لان الارث یجری فی الملك ولا ملك قبل الاحراز وانما الملك بعدهٗ۔

(الهدایة ج۲ ص۲۶۴ کتاب السیر۔ باب الغنائم وقسمتها) [1]

مالِ غنیمت میں عورتوں کے حصہ کا حکم

سوال:۔ اگر جہاد میں عورتیں بھی شریک ہوں یعنی وہ زخمیوں کو پانی وغیرہ پلاتی ہوں یا ان کی مرہم پٹی کرتی ہوں تو مالِ غنیمت میں ان کو حصہ ملے گا یا نہیں جبکہ وہ مردوں کے ساتھ اس جہاد میں شریک ہیں؟

الجواب:۔ یہ مسئلہ علماء امت کے ہاں مختلف فیہ ہے، بعض حضرات عورتوں کو بھی مردوں کے برابر مالِ غنیمت میں حصہ دینے کے قائل ہیں جبکہ حنفیہ اور دوسرے علماء ان کیلئے مردوں کے برابر حصہ کے قائل نہیں، تاہم یہ حاکم وقت کی صوابدید پر موقوف ہے کہ وہ (سہم) مردوں کے حصے سے کم جتنا مناسب سمجھے عورتوں کو مالِ غنیمت سے کچھ مال دے سکتا ہے۔

لما قال العلامة ظفر احمد العثمانیؒ: قال فی الهدایة والکفایة ولا یسهم لمملوك ولا امرأة ولا صبی ولا ذمی ولکن یرضخ لهم ای یعطون قلیلاً من کثیر فان الرضخة هی الاعطاء کذلك فالرضخ لا یبلغ السهم ولکن دونه علی حسب ما یراه الامام۔ (اعلاء السنن ج ۱۲ ص۱۹۰ باب لا یسهم لمملوك ولا امرأة الخ)

---

[1] وقال العلامة التمرتاشی رحمہ اللہ: ولا من مات ثمة قبل قسمة او بیع ولو مات بعد احدهما ثمة او بعد الاحراز بدارنا یورث نصیبهٗ لتاکد ملکه۔

(تنویر الابصار علی هامش ردّ المحتار ج۴ ص۱۴۲ کتاب الجهاد باب المغنم)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج ۲ ص۲۰۸ کتاب السیر، الباب الرابع فی الغنائم، الفصل الاول فی الغنائم۔

باب المستامن

(دارالاسلام میں رہنے والے کفار کے احکام ومسائل)

دارالاسلام بننے کے لیے شرائط

سوال:۔ دارالحرب سے دارالاسلام بننے کے لیے کون سی شرائط ہیں؟

الجواب:۔ فقہاء کرام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ دارالحرب سے دارالاسلام بننے کے لیے صرف ایک شرط ہے کہ احکام میں اسلام کا ظہور ہوجائے تو وہ دارالاسلام شمار ہوگا۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: ودار الحرب تصیر دار الاسلام باجراء احکام اھل الاسلام فیھا کجمعةٍ وعیدٍ۔ (الدر المختار علی ھامش رد المحتار ج۳ ص۲۷۷ کتاب الجهاد قبیل باب العشر والخراج والجزیة) [1]

دارالحرب بننے کے لیے شرائط

سوال:۔ دارالاسلام سے دارالحرب بننے کے لیے کیا شرائط ہیں؟

الجواب:۔ دارالاسلام سے دارالحرب بننے میں فقہاء کرام کے درمیان اختلاف ہے، امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک تین شرائط کا ہونا ضروری ہے (۱) احکام کفر اس میں ظاہر ہوجائیں (۲) دارالکفر کے ساتھ متصل ہوجائے (۳) مسلمان اور ذمی اپنے امن میں نہ رہ جائے بلکہ کفار کے امن میں داخل ہوجائیں، اور صاحبین رحمہم اللہ کے نزدیک دارالحرب بننے کے لیے صرف ایک شرط ہے کہ کفر کے احکام کا ظہور ہوجائے۔

لما قال العلامة الکاسانی رحمہ اللہ:۔ قال ابوحنیفةؒ انھا لا تصیر دار الکفر إلّا بثلث شرائط احدھا ظھور احکام الکفر فیھا والثانی ان تکون متاخمة دار الکفر

---

[1] وقال العلامة الکاسانیؒ: لاخلاف بین اصحابنا فی ان دار الکفر تصیر دار الاسلام بظھور احکام الاسلام فیھا۔ (بدائع الصنائع ج۷ ص۱۳۰ کتاب السیر)

وَمِثْلُهٗ فی الھندیة ج۲ ص۲۳۲ کتاب السیر، الباب الخامس فی استیلاء الکفار۔

والثالث ان لایبقی فیہا مسلم ولا ذمی آمناً بالامان الاول وھو امان المسلمین وقال ابویوسف ومحمد انہا تصیر دار الکفر بظہور احکام الکفر فیہا۔

(بدائع الصنائع ج ۷ ص ۱۳۰ فصل الاحکام تختلف باختلاف الدارین) لہ

سمندر کا دارالحرب میں داخل ہونا

سوال :- آجکل جغرافیائی تقسیم میں سمندر کا کچھ کچھ حصہ قریبی ممالک کے قبضے میں ہوتا ہے جس میں کسی دوسرے ملک کا بغیر اجازت کے داخل ہونا سمندری حدود کی خلاف ورزی سمجھی جاتی ہے، سوال یہ ہے کہ کیا کافر ممالک کے ساتھ سمندر بھی دارالحرب کے حکم میں داخل ہوسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب :- جب کفار مسلمانوں کے کسی علاقہ پر قبضہ کرنے کے ساتھ ساتھ وہاں کی سمندری حدود پر بھی قبضہ کرلیں اور بلادِ اسلام سے اس علاقہ کا تعلق ختم ہوجائے تو اس کی سمندری حدود بھی حکماً دارالحرب میں شامل ہوجاتی ہیں۔

لما قال العلامۃ ابن عابدین : قولہ واحرزوھا دارھم ویلحق بہا البحر الملح ونحوہ کمفازۃ لیس وراثہا بلاد الاسلام نقلہ بعضہم عن الحموی وفی حاشیۃ ابی السعود عن شرح النظم الہاملی سطح البحر لہ حکم دار الحرب۔

(رد المحتار ج ۳ ص ۲۶۶ کتاب الجہاد باب استیلاء الکفار)

کسی حربی کی دارالاسلام میں قیام امن کی مدت

سوال :- ایک غیر مسلم شخص کسی اسلامی حکومت میں کتنی مدت تک

لہ وفی الہندیۃ : قال محمد فی الزیادات انما تصیر دارالاسلام دارالحرب عند ابی حنیفۃ بشروط ثلثۃ احدھا اجراء احکام الکفار علی سبیل الاشتہار وان لایحکم فیہا بحکم الاسلام والثانی ان تکون متصلۃ بدار الحرب لایتخلل بینہما بلد من بلاد الاسلام والثالث ان لایبقی فیہا مومن ولا ذمی آمنا بامانہ الاول الذی کان ثابتا قبل استیلاء الکفار للمسلم باسلامہ وللذمی بعقد الذمۃ وقال ابویوسف ومحمد بشرط واحد لاغیر وھو اظہار احکام الکفر وھو القیاس۔ (الفتاوی الہندیۃ ج ۲ ص ۲۳۲ کتاب السیر الباب الخامس فی استیلاء الکفار)

ومثلہ فی تنویر الابصار علی ہامش رد المحتار ج ص ۲۷۲ کتاب الجہاد، قبیل باب العشر والخراج والجزیۃ۔

اجازت حاصل کر کے قیام کر سکتا ہے؟

الجواب:۔ غیر مسلموں کی عادات واخلاق کو دیکھتے ہوئے ہر وقت اُن سے اسلامی معاشرہ کو خطرہ ہوتا ہے، اس لیے ان کو ایک سال سے زیادہ عرصہ تک دارالاسلام میں قیام کی اجازت دینا جائز نہیں تاہم اگر حاکم وقت بہتر سمجھے تو زیادہ عرصہ کے لیے قیام کی اجازت دے سکتا ہے۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: لایمکن حربی مستأمن فینا سنة لئلا یصیر عینا لهم وعونا علینا وقیل له ان اقمت سنة وضعنا علیك الجزیة فان مکث سنة فهو ذمی۔

(الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۳ ص۲۷۳ کتاب الجهاد۔ فصل فی استئمان الکافر) [1]

غیر مسلم قیدیوں کے معاملہ کا حکم

سوال:۔ جہاد کے دوران اگر مجاہدین کچھ کافروں کو قیدی بنالیں اور اسی طرح کافروں نے بھی کچھ مسلمانوں کو قیدی بنا لیا ہو تو ان غیر مسلم قیدیوں کے ساتھ شرعاً کیا معاملہ کرنا چاہیئے؟ کیا انہیں قتل کیا جائے یا ان کے بدلے میں مسلمان قیدیوں کو رہا کرایا جائے گا یا فدیہ لے کر چھوڑ دیئے جائیں گے؟

الجواب:۔ جہاد کے دوران جب کفار قیدی بنالئے جائیں تو حاکم وقت کی مرضی ہے کہ چاہے تو ان کو قتل کر دے یا ان کو غلام بنالے یا اُن پر ذمی کے احکام لگا کر چھوڑ دے، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک دشمن کی قید میں مسلمان قیدیوں کے بدلے میں غیر مسلم قیدیوں کو آزاد نہیں کیا جائے گا جبکہ صاحبینؒ کے نزدیک ان سے فدیہ لینے کے بجائے مسلمان قیدیوں کو رہا کرایا جائے گا۔

لما قال العلامة برهان الدین المرغینانی رحمه الله: وهو فی الاساری بالخیار ان شاء قتلهم ...... وان شاء استرقهم وان شاء ترکهم احرارا ذمة

---

[1] وقال العلامة المرغینانی رحمه الله: واذا دخل الحربی الینا مستأمنا لم یمکن ان یقیم فی دارنا سنة ویقول له الامام ان اقمت تمام السنة وضعت علیك الجزیة۔

(الهدایة ج۲ ص۵۷۸ کتاب السیر، باب المستامن)

ومثله فی بدائع الصنائع ج۷ ص۱۱۰ فصل من یسع ترکه فی دار الحرب۔

للمسلمین ۔۔۔۔۔۔ الیٰ ان قال ولا یفادی بالاساریٰ عند ابی حنیفةؒ وقالا یفادی بہم اساری المسلمین ۔ (الھدایة ج۲ ص۲۶۱ کتاب السیر۔ باب الغنائم) [۱]

سوال:۔ کیا اجازت نامہ

حربی کا بغیر اجازت کے دارالاسلام میں داخل ہونے کا حکم

(قانونی دستاویزات) کے بغیر اگر کوئی حربی دارالاسلام میں داخل ہو جائے تو اس کو کوئی سزا دی جاسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جب کسی ملک میں دارالاسلام کی شرائط پوری ہوں اور وہاں اسلامی حکومت ہو تو کسی حربی کا اس ملک میں حکام کی اجازت کے بغیر آنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ کفار کا جاسوس بن کر آیا ہے، ایسی حالت میں اس کو بطور سزا کے غلام بنالیا جائے، اس لیے کسی حربی کا بغیر حاکمِ وقت کی اجازت کے دارالاسلام میں داخل ہونا صحیح نہیں۔

لما قال العلامة ابن عابدین رحمہ اللہ: قید بالمستأمن لانہ لو دخل دارنا بلا امان کان وما معه فیأ ولو قال دخلت بامان الا ان یثبت ۔(ردالمحتار ج۴ ص۲۷۲، کتاب الجہاد، فصل فی استئمان الکافر) [۲]

---

[۱] قال العلامة ابن عابدین رحمہ اللہ: وقتل الاساری ان شاء ان لم یسلموا واسترقهم او ترکهم احراراً ذمة لنا الا مشرکی العرب والمرتدین کما سیجیئ وحرم منهم ای اطلاقهم مجاناً ولو بعد اسلامهم ابن کمال لتعلق حق الغانمین وجوزه الشافعی لقوله تعالیٰ: فَاَمَّا مَنًّا بعد واما فِداءً حتّٰی تضع الحرب اوزارها قلنا نسخ بقوله: فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ۔ شرح مجمع وحرم فداءهم بعد تمام الحرب واما قبله فیجوز بالمال لا بالاسیر المسلم دُرر وصدر الشریعة وقالا یجوز وهو اظهر الروایتین عن الامام شمنی ۔

(ردالمحتار ج۳ ص۲۵۱ کتاب الجہاد، باب المغنم وقسمته)

[۲] وقال العلامة ابن نجیمؒ: لانه لو دخل دارنا بلا امان فهو وما معه فئی فان قال دخلت بامان لم یصدق واخذ ۔ (البحر الرائق ج۵ ص۱۰۱ باب المستأمن)

وَمِثْلُهٗ فی فتح القدیر ج۵ ص۲۷۱ کتاب السیر، باب المستامن ۔

افغانستان کے دار الحرب ہونے یا نہ ہونے کا حکم

سوال :- جناب مفتی صاحب! جہاد افغانستان کے وقت افغانستان دار الحرب تھا یا نہیں ؟

الجواب :- فقہاء کرام نے کسی ملک کے دار الحرب بننے کے لیے جن شرائط کا لحاظ کیا ہے وہ جہاد کے وقت افغانستان میں مکمل طور پر نہیں پائی جاتی تھیں اس لیے افغانستان کا دار الحرب ہونا فقہی نقطۂ نظر سے درست معلوم نہیں ہوتا ہے۔

لما قال العلامة بدر الدين محمود بن اسمٰعيل رحمہ اللہ : لا تصير دار حرب الا باجراء احكام الشرك واتصالها بدار الحرب بان لا يكون بينها وبين دار الحرب مصر للمسلمين وان لا يبقى فيها مسلم او ذمي امنا على نفسه بالامان الاول لا يبقى امنا الا بامان المشركين وعندهما باجراء احكام الشرك تصير دار حرب اتصلت او لا وبقى احد بالامان الاول او لا

(جامع الفصولين ج۱ ص۱۳ کتاب السیر) [2]

اسلامی ممالک میں غیر مسلموں کے لیے نئی عبادت گاہیں بنانے کا حکم

سوال :- ایک اسلامی مملکت میں جب غیر مسلم رہائش پذیر ہوں تو کیا ان کو اپنے لیے نئی عبادت گاہیں بنانے کی شرعاً اجازت ہے یا نہیں ؟

الجواب :- کسی بھی اسلامی مملکت میں رہائش پذیر غیر مسلموں کو اپنے لیے نئی عبادت گاہیں بنانے کی شرعاً اجازت نہیں دی جاسکتی ، البتہ ان کی سابقہ عبادت گاہوں کی حفاظت کرنا اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے ۔

---

[1] وقال العلامة التمرتاشيؒ : لا تصير دار الاسلام دار حرب الا بامور ثلاثة باجراء[1] الاحكام اهل الشرك وباتصالها[2] بدار الحرب وبان[3] لا يبقى فيها مسلم او ذمي امنا بالامان الاول ۔ (تنوير الابصار على هامش رد المحتار ج۴ ص۲۷۴ کتاب الجهاد ، فصل[1] استئمان الكافر

ومثله فى الهندية على هامش الهندية ج۲ ص۳۱۲ كتاب السير باب الرابع فى المرتد وما يصير الكافر به مسلماً ۔

لما قال العلامة التمرتاشی رحمہ اللہ: ولا یحدث بیعۃٌ ولا کنیسۃٌ ولا صومعۃٌ ولا بیت نار ولا مقبرۃ فی دار الاسلام ولو قریۃ فی المختار۔

(تنویر الابصار علیٰ ھامش رد المحتار ج ۴ ص ۲۹۶ کتاب الجہاد، فصل فی الجزیۃ)[۱]

دارالاسلام میں عیسائیت کی تبلیغ کا حکم

سوال:۔ آجکل مملکتِ خداداد پاکستان میں عیسائی کھلے عام بازاروں میں عیسائیت کی تبلیغ کرتے ہیں، کیا اسلام اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ غیر مسلم دارالاسلام میں اپنے مذہب کی آزادی سے تبلیغ کرتے پھریں؟

الجواب:۔ اسلام اس بات کی ہرگز اجازت نہیں دیتا کہ کوئی غیر مسلم آزادی سے مسلمانوں میں اپنے مذہب کی تبلیغ کرے بلکہ مسلمان حاکمِ وقت پر یہ لازم ہے کہ وہ انہیں اس عمل سے باز رکھے، جہاں تک دارالاسلام میں غیر مسلموں کی مذہبی آزادی کا تعلق ہے تو وہ صرف ان کے ہم مذہبوں تک محدود ہے یہاں تک کہ وہ بلند آواز سے اپنی مذہبی کتاب کی تلاوت بھی نہیں کر سکتے۔

لما قال العلامۃ ظفر احمد العثمانیؒ: وقد حکی ابن تیمیۃ اجماع الفقہاء وسائر الائمۃ رحمہم اللہ علیٰ مراعاۃ تلک الشروط قال ولولا شہرتہا عند الفقہاء لذکرنا الفاظ کل طائفۃ فیہا...... ومن جملۃ الشروط مایعود باخفاء منکرات دینہم وترک اظہارہا کمنعہم من اظہارہا الخمر والناقوس والنیران والاعیاد ونحو ذٰلک ومنہا مایعود باخفاء شعائر دینہم کاصواتہم بکتابہم۔

{اعلاء السنن ج ۱۲ ص ۴۸۸ باب شروط اھل الذمۃ وما یجوز لھم فی دارنا وما لا یجوز لھم}

---

[۱] وقال العلامۃ الکاسانی رحمہ اللہ: واما الکنائس والبیع القدیمۃ فلا یتعرض لھا ولا ینھدم شئ منھا واما احداث کنیسۃ اُخریٰ یمنعون عنہ فیما صار مصراً من امصار المسلمین لقولہ علیہ السلام لا کنیسۃ فی الاسلام الا فی دار الاسلام۔

(بدائع الصنائع ج ۷ ص ۱۱۴ کتاب السیر)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج ۲ ص ۲۴۸ کتاب السیر، الباب الثامن فی الجزیۃ۔

باب معاملات مع الکفّار

(غیر مسلموں کے ساتھ معاملات کے احکام ومسائل)

غیر مسلم کو سلام کرنا

سوال:۔میں ایک غیر مسلم کمپنی میں ملازم ہوں وہاں میرے کچھ عیسائی اور ہندو دوست ہیں، کیا میں اُن کو سلام کرسکتا ہوں یا نہیں؟

الجواب:۔کسی بھی غیر مسلم پر سلام کی ابتداء ممنوع ہے کیونکہ کسی کو سلام میں پہل کرنے سے درحقیقت اس شخص کی عظمت پیش نظر ہوتی ہے جبکہ مسلمان کے لیے یہ مناسب نہیں کہ کسی غیر مسلم کی عزت وعظمت اس پر غالب رہے، تاہم بوقتِ ضرورت اسے مناسب الفاظ سے سلام کرنا مرخص ہے۔

لما قال العلامة علاؤالدین الحصکفیؒ:۔ویحرم تعظیمه وتکره مصافحته ولایبدأ بالسلام الا لحاجة۔ (الدرالمختار علی ہامش ردالمحتار ج۳ ص۲۸۲ کتاب الجہاد) [1]

غیر مسلم کے سلام کا جواب دینا

سوال:۔غیر مسلم کے سلام کا جواب دینے کا شرعی طریقہ کیا ہے؟ کیا اس کو سلام کا جواب دیا جائے گا یا نہیں؟

الجواب:۔غیر مسلم کے سلام کے جواب میں صرف وعلیك کہنا کافی ہے، تاہم اگر کسی غیر مسلم کے سلام کے جواب میں اللہ سے اس کی ہدایت کا طالب ہوکر یوں جواب دیا جائے السلام علی من اتبع الهدیٰ تو بہتر ہے۔

لما فی الهندیة: واذا کان له حاجة فلا بأس برد سلام علی اهل الذمة

---

[1] قال العلامة ابن البزاز الکردری رحمه الله: وفی السیر لا بأس برد سلام اهل الذمة والنهی عن البدأة الا اذا کان محتاجاً الیه فلا بأس بها ایضاً ولکن یکره مصافحهم۔ (الفتاوی البزازیة علی هامش الهندیة ج۶ ص۳۵۵ کتاب الکراهیة۔ فصل نوع فی السلام)

ومثله فی البحرالرائق ج۵ ص۱۱۳ کتاب الجهاد۔ فصل فی الجزیة۔ فروع فی الجزیة۔

ولکن لا یزاد علیٰ قوله وعلیکم۔ قال الفقیه ابواللیثؒ ان مررت بقوم وفیهم کفار فانت بالخیار انهٔ شئت قلتُ السلام علیکم وتریں به المسلمین وان شئت قلت السلام علیٰ من اتبع الهدیٰ کذا فی الذخیرة۔ (الفتاویٰ الهندیة ج۵ ص۳۲۵ کتاب الکراهیة۔ الباب السابع فی السلام الخ) [1]

غیر مسلموں کو عبادت خانے کی طرف راہبری کرنا

سوال:۔ اگر کوئی غیر مسلم کسی مسلمان سے اپنی عبادت کی جگہ کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہے تو کیا مسلمان کے لیے یہ جائز ہے کہ اس بارے میں غیر مسلم کی رہبری کرے؟

الجواب:۔ چونکہ ایسے امور میں کسی غیر مسلم کی رہبری کرنے سے اس کی اصلاح کی جگہ بے دینی اور کفر کو تقویت ملنے کا امکان ہے، اس لیے کسی غیر مسلم کے ساتھ ایسے معاملات میں تعاون علی المعصیت کے مترادف ہے۔

قال الله تبارك وتعالیٰ: وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ۔ (سورة المائدة آیت ۲)

وقال العلامة قاضی خانؒ: ذمی سأل مسلماً عن طریق البیعة لاینبغی للمسلم ان یدل له علیٰ ذلك لانهٗ اعانة علی المعصیة۔ (فتاویٰ قاضی خان علیٰ هامش الهندیة ج۳ ص۵۹۱ الباب الثالث فی الوکالة بالبیع۔ کتاب الوکالة) [2]

غیر مسلم کی عزت وتوقیر کرنا

سوال:۔ اگر کوئی غیر مسلم کسی مسلمان کے پاس مہمان بن کر آئے تو مسلمان کا اس کی عزت واحترام کے لیے

---

[1] قال العلامة قاضی خان رحمه الله: اذا سلم الیهودی أو النصرانی أو المجوسی علیٰ مسلم۔ قال محمد رحمه الله: یقول المسلم وعلیك ینوی بذلك السلام لحدیث مرفوع الیٰ رسول الله صلی الله علیه وسلم انه قال اذ سلموا علیکم فردوا علیهم۔ (فتاویٰ قاضی خان علیٰ هامش الهندیة ج۳ ص۲۸۳ کتاب الکراهیة)

وَمِثْلُهٗ فی الدر المختار علیٰ هامش رد المحتار ج۳ ص۲۸۳ کتاب الجهاد۔

[2] وَفی الهندیة: ذمی سأل مسلما عن طریق البیعة لاینبغی للمسلم ان یدله علیٰ ذلك لانهٗ اعانة علی المعصیة۔ (الفتاویٰ الهندیة ج۲ ص۲۵۰ کتاب السیر۔ الباب الثامن فی الجزیة)

وَمِثْلُهٗ فی البزازیة علیٰ هامش الهندیة ج۶ ص۳۵۹ کتاب الکراهیة الثالث فیما یتعلق بالمناهی۔

محفل میں کھڑے ہو جانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- غیر مسلموں سے مدارات یعنی معاشرتی تعلقات رکھنے میں کوئی حرج نہیں، اگر یہ اٹھنا بیٹھنا معاشرہ میں بلا امتیازِ مذہب وعقیدہ کسی مہمان کا حق سمجھا جاتا ہو تو ایسی حالت میں یہ تعلقات قائم کرنا جائز ہے، نیز کسی غیر مسلم کے شر و فساد سے بچنے کے لیے بھی اس سے معاشرتی تعلقات قائم کرنا جائز ہے بلکہ ایسے تعلقات سے اگر یہ توقع ہو کہ وہ غیر مسلم اسلام قبول کرلے گا تو پھر اسے فرائضِ منصبی کا تقاضا سمجھے، تاہم اگر اس سے غیر مسلم کے مذہب وعقیدہ یا اس کے کسی غیر اسلامی شعار کی عزت وتوقیر مقصود ہو تو پھر ایک مسلمان کے لیے ایسا کرنا جائز نہیں۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: وجب علی المسلم عدم تعظیم الکفر قال فی الذخیرة اذا دخل یهودی الحمام ان خدمه المسلم طمعاً فی فلوسه فلا بأس به وان تعظیماً له فان کان لیمیل الی الاسلام فکذلک وان لم ینو شیئاً کره وان قام تعظیماً لذاته وما هو علیه کفر لان رضا بالکفر کفر فکیف بتعظیم الکفر قلت وبه علم انه لو قام له خوفاً من شره فلا بأس بل اذا تحقق الضرورة فقد یجب وقد یستحب علیٰ حسب حال ما یتوقعه۔ (رد المحتار ج ۳ ص ۲۸۳ کتاب الجهاد) [1]

غیر مسلموں کے برتنوں میں کھانا پینا

سوال:- ایک مسلمان کے لیے کفار اور مشرکین کے برتنوں میں کھانا پینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- کفار کے برتنوں کو استعمال کرنے سے پہلے اچھی طرح دھولیا جائے دھونے سے پہلے ایسے برتنوں میں کھانا پینا مکروہ ہے تاہم اگر دھوئے بغیر ان میں کھا پی لیا جائے تو جائز مع الکراہت ہے اور ایسا کرنے والا حرام کھانے پینے والوں میں شمار نہ ہوگا بشرطیکہ ان برتنوں کی ناپاکی کا علم نہ ہو، اور اگر علم ہو تو دھونے سے پہلے ان برتنوں میں

---

[1] وفی الهندیة: اذا دخل ذمی علی مسلم فقام له ان قام طمعاً فی میله الی الاسلام فلا بأس به وان فعل ذلک تعظیماً له من غیر ان ینوی شیئاً مما ذکرنا او قام طمعاً لغناه کره له ذلک۔ (الفتاویٰ الهندیة ج ۵ ص ۳۴۸ کتاب الکراهیة، الباب الرابع عشر فی اهل الذمة والاحکام الخ)
ومثله فی البحر الرائق ج ۵ ص ۱۱۴ کتاب الجهاد۔

کھانا پینا جائز نہیں ۔

لقوله علیه الصلوٰة والسلام: تأکل فی اٰنیتهم فان وجدتم غیراٰنیتهم فلا تأکلوا فیها فان لم تجدوا فاغسلوها ثم کلوا فیها۔ (صحیح بخاری ج ۲ ص ۸۲۵ کتاب الذبائح ۔ باب ما جاء فی الصید) [۱]

غیر مسلموں کے ساتھ کھانا پینا

سوال :۔ غیر مسلموں کے ساتھ ایک برتن میں کھانا پینا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ غیر مسلموں میں جب تک کوئی ظاہری نجاست نہ ہو تو ان کے ساتھ ایک برتن میں کھانے پینے میں کوئی حرج نہیں، تاہم اعتقادی اختلاف باعثِ کراہت ہے۔

وفی الهندیة : ولم یذکر محمدؒ الاکل مع المجوس ومع غیره من اهل الشرک انه هل یحل ام لا وحکی عن الحاکم الامام عبد الرحمٰن الکاتب انه ان ابتلی به مسلم مرة او مرتین لا بأس به واما الدوام علیه فیکره کذا فی المحیط ۔ (الفتاوی الهندیة ج ۵ ص ۳۴۷ کتاب الکراهیة ۔ الباب الرابع عشر فی اهل الذمة والاحکام التی تعود الیهم) [۲]

غیر مسلم کی ملازمت کرنا

سوال :۔ پاکستان سے کئی لوگ امریکہ اور دوسرے غیر اسلامی ممالک میں روزگار کے سلسلہ میں جاتے ہیں اور وہاں غیر مسلموں کی ملازمت اختیار کر لیتے ہیں، تو کیا غیر مسلموں کے ہاں ملازمت کرنا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ غیر مسلم کی ملازمت کرنا اس طور پر کرنا کہ اس سے اسلام اور مسلمانوں

---

[۱] قال شیخ الاسلام حافظ الدین ابن البزازؒ : والاکل والشرب فی اوانی المشرکین یکره والاکل مع الکفار لو ابتلی به المسلم لا بأس لو مرة او مرتین اما الدوام علیه یکره۔ (الفتاوی البزازیة علی هامش الهندیة ج ۶ ص ۳۵۹ کتاب الکراهیة ۔ الثالث فیما یتعلق بالمناهی)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج ۵ ص ۳۴۷ کتاب الکراهیة ۔ الباب الرابع عشر فی اهل الذمة ۔

[۲] قال شیخ الاسلام حافظ الدین ابن البزازؒ : والاکل مع الکفار لو ابتلی به المسلم لا بأس لو مرة او مرتین اما الدوام علیه یکره ۔ (الفتاوی البزازیة علی هامش الهندیة ج ۶ ص ۳۵۹ کتاب الکراهیة ۔ الثالث فیما یتعلق بالمناهی)

کی توہین نہ ہوتی ہو جائز ہے اور اگر اس میں اسلام یا مسلمانوں کی توہین کا کوئی پہلو نکلتا ہو تو پھر ایسی ملازمت کرنا جائز نہیں ۔

لما فی الحدیث؛ لان خباب بن الارت رضؓ عمل لعاص بن وائل باجرة ولم ینکر علیه النبی صلی الله علیه وسلم ۔ (صحیح بخاری ج۱ ص۳۰۴ باب الاجارة) [1]

ہندوؤں کی متروکہ جائیداد کا حکم

سوال:۔ غیر مسلموں مثلاً ہندوؤں وغیرہ کے متروکہ مال کا صحیح مصرف کیا ہے؟ علاوہ ازیں جو غیر مسلم ایک جگہ سے چلے جائیں اور ان کے املاک وہاں رہ جائیں تو ازروئے شریعت اس کا صحیح مصرف کیا ہے؟

الجواب:۔ غیر مسلموں کا متروکہ مال بیت المال میں جمع کرنا چاہیئے، اسی طرح جو مال بلا جنگ کے کفار سے حاصل ہو یا جو مال مسلم عاشر لیتا ہے اس کا صحیح مصرف مسلمانوں کی مصلحتوں میں خرچ کرنا ہے، مثلاً سرحدوں کی حفاظت پر خرچ کرنا، دریاؤں اور نہروں پر پل بنانا، علماء، طلباء اور قاضیوں کے وظائف، اسلامی فوج کی تنخواہیں اور ان کے اہل و عیال کی فلاح و بہبود پر خرچ کرنا وغیرہ ۔

قال العلامة محمد بن عبد الله التمرتاشیؒ: ومصرف الجزیة والخراج ومال التغلبی وهدیتهم للامام وانما یقبلها اذا وقع عندهم ان قتالنا للدین لا الدنیا جوهرة وما أخذ منهم بلا حرب ومنه ترکة ذمی وما أخذه عاشر منهم ظهیریة مصالحنا ۔ (تنویر الابصار علی هامش رد المحتار ج۳ ص۳۰۶ باب العشر والخراج والجزیة) [2]

---

[1] قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ: المسلم اذا اجر نفسه من الکافر لیخدمه جاز ویکره قال الفضلؒ لا یجوز فی خدمة ومافیه اضلال بخلاف الزراعة والسقی ۔ (خلاصة الفتاویٰ ج۳ ص۱۴۹ کتاب الاجارة) ۔ ومثلهٗ فی البزازیة علی هامش الهندیة ج۵ ص۱۲۵ کتاب الاجارة ۔

[2] وقال الامام عبد الله بن احمد حافظ الدین النسفیؒ: وما اخذ منهم بلا قتال یصرف فی مصالحنا کسد الثغور وبناء القناطیر والجسور ۔
(کنز الدقائق علی هامش البحر الرائق ج۵ ص۱۱۷ کتاب الجهاد)
ومثلهٗ فی الهدایة ج۲ ص۵۹۹ کتاب الجهاد ۔

اہل کتاب کے سوا دوسرے غیر مسلموں کے ذبیحہ کا حکم

سوال:۔ کسی ایسے ملک میں جہاں شرعی طریقہ سے جانور ذبح نہ ہوتے ہوں مسلمانوں کے لیے وہاں کے غیر مسلموں کے ہاتھ کا ذبیحہ کھانا کیسا ہے؟

الجواب: اہل کتاب کے علاوہ دوسرے کفار کا ذبیحہ مطلقاً حرام ہے چاہے ذبح کرنے والا ہندو ہو یا سکھ، مجوسی ہو یا پارسی، کسی حال میں بھی ان کا ذبیحہ حلال نہیں۔

قال العلامة ابو بکر الحدادی الیمنیؒ، ولا توکل ذبیحة المجوسی والمرتد والوثنی لان المرتد لاملة له والوثنی مثله واما المجوس فلقوله علیه السلام سنوابهم سنة اهل الکتاب غیر ناکحی نساءهم ولا آکل ذبائحهم الحدیث۔

(الجوهرة النیرة ج۲ ص۲۴۶ کتاب الذبائح)[1]

اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے مذہبی حقوق کا حکم

سوال:۔ ایک اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کو کہاں تک مذہبی حقوق حاصل ہیں؟ کیا وہ دارالاسلام اپنی مذہبی عبادت و رسومات ادا کر سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب:۔ کسی بھی اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کو جان و مال اور مذہبی آزادی کا تحفظ حاصل ہے لیکن اگر وہ مسلمانوں کو گمراہ کرنے کے لیے تقریر و تحریر کا طریقہ اختیار کریں تو انہیں اس سے منع کیا جائے گا۔

لما فی الهندیة: ولیس للنصرانی ان یضرب فی منزله بالناقوس فی مصر المسلمین ولان یجمع فیه بهم انما له أن یصلی فیه ولا ان یخرجوا الصلیب او غیر ذٰلک من کنائسهم ولو رفعوا اصواتهم بقرأة الزبور والانجیل ان کان فیه اظهار الشرک منعوا عن ذٰلک وان لم یقع بذٰلک اظهار الشرک لا یمنعون ویمنعون عن قرأة ذٰلک

---

[1] قال العلامة ابن نجیمؒ: لا مجوسی ووثنی ومُرتد ومحرم وتارک التسمیة عمداً یعنی لا تحل ذبیحة هٰؤلاء۔ (البحر الرائق ج۸ ص۱۶۸ کتاب الذبائح)

وَمِثْلُهٗ فی الهدایة ج۴ ص۴۳۴ کتاب الذبائح۔

فی اسواق المسلمین ۔ (الفتاوی الهندية ج ۲ ص۲۵۱ کتاب السیر الباب الثامن فی الجزیة)

غیر مسلم ممالک سے درآمد شدہ کھانے پینے کی چیزوں کے استعمال کا حکم

سوال:۔ غیر مسلم ممالک سے گوشت، ذبح شدہ مرغی، گھی اور دودھ وغیرہ سے بنی ہوئی کھانے پینے کی اشیاء پاکستان اور دوسرے اسلامی ممالک میں درآمد کی جاتی ہیں جبکہ گوشت کے ڈبے پر یہ لکھا ہوتا ہے کہ "اس کو اسلامی طریقہ سے ذبح کیا گیا ہے"۔ کیا ایک مسلمان کے لیے ان چیزوں کا استعمال جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ گوشت کے علاوہ جو حلال چیزیں غیر مسلم ممالک سے آتی ہوں اور ان میں حرام چیزیں مثلاً شراب یا سُور (خنزیر) کے اجزاء شامل نہ ہوں تو ان چیزوں کا کھانا پینا جائز ہے، البتہ اگر گوشت کے ڈبے پر اسلامی طریقہ سے ذبح ہونے کے لکھے ہوئے الفاظ صحیح ہوں تو پھر اس کے کھانے میں کوئی حرج نہیں اور اگر دوسرے قرائن اور ذرائع سے ان الفاظ کا غلط ہونا ثابت ہو جائے تو پھر ایسے گوشت کا کھانا جائز نہیں۔

وفی الهندية: من ارسل اجیراً له مجوسیاً او خادماً فاشتری لحما فقال اشتریته من یهودی او نصرانی او مسلم وسعه اکله...... رجل اشتری لحما فلما قبضه اخبره مسلم ثقة انه قد خالطه لحم الخنزیر لم یسعه ان یاکله۔
(الفتاوی الهندية ج ۵ ص۳۰۸، ۳۰۹ کتاب الکراهية الباب الاول)[۲]

---

[۱] قال العلامة عالم بن العلاء الانصاری رحمه الله: ولیس للنصرانی انه یضرب فی منزله بالناقوس فی مصر من امصار المسلمین۔
(الفتاوی التاتارخانية ج ۵ ص۳۵۱ کتاب الخراج)

ومثله فی فتاوی قاضی خان علی هامش الهندية ج ۳ ص۵۸۹ کتاب السیر فصل فی اهل الذمة۔

[۲] وقال العلامة فخر الدین حسن بن منصور: مسلم اشتری لحما وقبضه فاخبره مسلم ثقة انه ذبیحة المجوس فانه لا ینبغی للمشتری ان یاکل ولا یطعم غیره لان المخبر اخبر بحرمة العین وبطلان الملك۔ (فتاوی قاضیخان علی هامش الهندية ج ۳ ص۴۰۶ الباب السادس والعشرون)

ومثله فی رد المحتار ج ۵ ص۲۴۳ کتاب الحظر والاباحة، باب الاستبراء۔

اِسلامی ملک میں غیر مسلموں کا نئی عبادت گاہ بنانا

سوال:۔ دارالاسلام میں غیر مسلم اپنے لیے نئی عبادت گاہ تعمیر کر سکتے ہیں یا نہیں ؟

الجواب:۔ دارالاسلام میں غیر مسلموں کو نئی عبادت گاہ تعمیر کرنے کی اجازت نہیں تاہم پرانی عبادت گاہیں باقی رکھ سکتے ہیں اور ان کی مرمت وغیرہ بھی کر سکتے ہیں لیکن کسی بھی قدیم عبادت گاہ میں اضافہ نہیں کر سکتے۔ اسی طرح اگر کسی شہر میں غیر مسلموں کی کوئی عبادت گاہ ویران ہو جائے تو اسے از سرِ نو آباد کرنے کی بھی اجازت نہیں۔

کما فی الهندية : ان اراد اهل الذمة احداث البيع والكنائس او المجوس احداث بيت النار ان ارادو ذلك فی امصار المسلمين وفيما كان من فناء المصر منعوا عن ذلك عند الكل۔ (الفتاوی الهندية ج۲ ص۲۴۷ كتاب السير، الباب الثامن فی الجزية) [۱]

غیر مسلموں کا مسجد میں داخل ہونا

سوال:۔ چند دن قبل برطانیہ کی شہزادی پاکستان آئی تو اس کو حکومت کی سرپرستی میں لاہور کی بادشاہی مسجد میں لایا گیا، تو کیا کوئی غیر مسلم مسجد میں داخل ہو سکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ جب کافر حالتِ جنابت میں نہ ہو اور اس کے بدن پر کوئی ایسی ظاہری نجاست بھی نہ ہو جو مسجد کے آداب کے خلاف ہو تو پھر اس کا مسجد میں داخل ہونا جائز ہے۔

كما فی الهندية : لا بأس بدخول اهل الذمة المسجد الحرام وسائر المساجد وهو الصحيح كذا فی المحيط السرخسی۔ (الفتاوی الهندية ج۵ ص۳۴۶ كتاب الكراهية الباب الرابع عشر) [۲]

---

[۱] قال العلامة التمرتاشیؒ : ولا يجوز ان يحدث بيعة ولا كنيسة ولا صومعة ولا بيت نار ولا مقبرة ۔ (تنوير الابصار علی هامش رد المحتار ج۴ ص۲۰۲ كتاب السير)

ومثله فی فتاوی قاضی خان علی هامش الهندية ج۳ ص۵۹۰ كتاب السير فصل فی اهل الذمة ما يؤخذ منه الخ

[۲] قال العلامة ابن عابدينؒ : ان الامام سرخسیؒ ذكر فی شرح السير الكبير ان ابا سفيان جاء الی المدينة ودخل المسجد ولذلك قصة قال فهذا دليل لنا علی مالكؒ بمنعه المشرك من ان يدخل شيئا من المساجد ثم قال ان الشافعیؒ : قال يمنعونه من دخول المسجد الحرام خاصة للآية اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فاما عندنا لا يمنعون كما لا يمنعون عن دخول سائر المساجد ويستوی فی ذلك الحربی والذمی۔ (رد المحتار ج۳ ص۳۰۱ كتاب الجهاد باب العشر والخراج مطلب) ـــــ ومثله فی البزازية علی هامش الهندية ج۶ ص۳۷۱ كتاب الكراهية۔

مساجد میں غیر مسلم کا چندہ استعمال کرنا

سوال:۔ اگر کوئی غیر مسلم مسجد کی تعمیر اور مرمت کے لیے چندہ دے تو کیا وہ چندہ مسجد میں لگایا جا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر کافروں کا چندہ دینے میں اسلام اور مسلمانوں کی توہین کا احتمال نہ ہو اور ان کے مذہب میں اس کی حیثیت قربت اور ثواب کی ہو اور وہ بھی ثواب کی نیت سے دیں تو پھر قبول کرنا اور مسجد کی تعمیر و مرمت پر خرچ کرنا جائز ہے۔ کیونکہ حنفیہ کے مذہب میں کافر کے وقف کی صحت میں یہ شرط ہے کہ وہ ہمارے اور ان کے نزدیک قربت کا ذریعہ ہو پس ظاہر ہے کہ کفار کا چندہ مسجد میں صرف کرنا اہلِ اسلام کے نزدیک تو قربت ہے، کفّار و ہنود مساجد میں جو کچھ دیتے ہیں وہ اعتقاداً اس کو قربت سمجھتے ہیں، لیکن عصرِ حاضر میں غیر مسلموں کی امداد برائے مساجد عموماً مسلمانوں کو کسی نہ کسی مخمصہ سے دوچار کرنے کے لیے ہوتی ہے اس لیے اس سے بچنا ضروری ہے۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: ان شرط وقف الذمی ان یکون قربة عندنا و عندھم کالوقف علی الفقراء او علی مسجد القدس بخلاف الوقف علی بیعة فانہ قربة عندھم فقط او علی حج او عمرة فانہ قربة عندنا فقط فافاد ان ھذا شرط لوقف الذمی فقط لان وقف المسلم لایشترط کونہ قربة عندھم بل عندنا کوقفنا علی حج و عمرة بخلافہ علی بیعة فانہ غیر قربة عندنا بل عندھم۔

(ردالمحتار ج ۳ ص ۳۹۴ کتاب الوقف)[1]

ہندوؤں کی عبادت گاہ کی جگہ مسجد بنانا

سوال:۔ ہمارے علاقے میں ہندوؤں کی متروکہ جائیداد میں ایک مندر بھی ہے بعض مسلمانوں کا ارادہ ہے کہ اس کی جگہ مسجد بنادی جائے، تو کیا ہندوؤں کی متروکہ عبادت گاہ

---

[1] قال العلامة ابن نجیم المصری رحمہ اللہ: واما الاسلام فلیس من شرطہ فصح وقف الذمی بشرط کونہ قربة عندنا و عندھم کما وقف علی اولادہ او علی الفقراء۔ (البحرالرائق ج ۵ ص ۱۸۹ کتاب الوقف)

ومثلہ فی الھندیة ج ۲ ص ۳۵۲ کتاب الوقف۔

کی جگہ مسجد بنانا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :- اگرچہ مسلمانوں کی عبادت کے لیے کوئی جگہ خاص نہیں، کرۂ ارض پر کسی جگہ بھی نماز پڑھنا جائز ہے، لیکن ہندوؤں کے عبادت خانے کو جوں کا توں رکھ کر اس کو بطور مسجد کے استعمال کرنے سے چونکہ ان کے عبادت خانے کی عظمت و برتری قائم رہنے کا شبہ ہے لہٰذا اسے بطور مسجد استعمال کرنا جائز نہیں تاہم اگر اس کو گرا کر اس کی جگہ مسجد بنائی جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

حدیث میں ہے : عن طلق بن علیؓ قال خرجنا وفدا الیٰ رسول اللہ علیہ وسلم فبایعناہ وصلینا معہ واخبرناہ انّ بارضنا بیعۃ لنا فاستوھبناہ من فضل طھورہٖ فدعا بماء فتوضاء وتمضمض ثم صبّہ لنا فی اداوۃ وامرنا فقال اُخرجوا فاذا اتیتم ارضکم فاکسروا بیعتکم وانضحوا مکانھا بھٰذا الماء واتخذ وھا مسجداً قلنا ان البلد بعید والحر شدید والماء ینشف فقال مُدُّوہ من الماء فانہ لا یزیدہ الا طیبا، رواہ النسائی ۔ (مشکوٰۃ المصابیح ج ۱ ص ۶۹ باب المساجد) [۱]

غیر مسلم کی دعوت قبول کرنا

سوال :- اگر کوئی غیر مسلم کسی خوشی وغیرہ کے موقعہ پر مسلمانوں کو دعوت دے اور اس کے ساتھ خوراک کے حلال ہونے کی یقین دہانی بھی کرادے تو کیا مسلمانوں کے لیے اس دعوت کو قبول کرنا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :- اگر اس دعوت کی وجہ سے اسلام متاثر نہ ہوتا ہو تو اس دعوت کو قبول کرنے اور اس کے کھانے میں کوئی مضائقہ نہیں، خاص کر اس دعوت میں جہاں پر خوراک کی حلت کی یقین دہانی بھی ہو۔

لما فی الھندیۃ : ولا بأس بالذھاب الیٰ ضیافۃ اھل الذمۃ ھکذا ذکر محمدؒ

---

[۱] لما ورد فی الحدیث : عن طلق بن علی فاخرجنا وفدا الیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فبایعناہ وصلینا معہ واخبرناہ ان بارضنا بیعۃ لنا فاستوھبناہ من فضل طھورہٖ الحدیث۔

(سنن النسائی ج ۱ ص ۷۲ کتاب المساجد)

ومثلہٗ فی مشکوٰۃ المصابیح (حاشیہ) ج ۱ ص ۶۹ کتاب الصلوٰۃ ۔ ابواب المساجد۔

وفی اضحیۃ النوازل المجوس او النصرانی اذا دعا رجل الیٰ طعامہ تکرہ الاجابۃ وان قال اشتریت اللحم من السوق فان کان الداعی نصرانیاً فلا بأس بہ ۔
(الفتاویٰ الهندیۃ ج ۵ ص۳۴۷ کتاب الکراھیۃ ، الباب الرابع عشر) [1]

مسلمانوں کا غیر مسلموں کی عبادت گاہوں میں داخل ہونا

سوال :۔ کیا مسلمان کے لیے غیر مسلموں کی عبادت گاہوں میں جانا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ مسلمان کے لیے غیر مسلموں کی عبادت گاہوں میں داخل ہونا مکروہ ہے لیکن یہ مکروہ اس لیے نہیں کہ مسلمان کو یہ حق حاصل نہیں بلکہ اسلئے نہیں کہ یہ عبادت گاہیں شیاطین کے جمع ہونے کی جگہ ہوتی ہیں ۔

کما فی الهندیۃ : یکرہ للمسلم الدخول فی البیعۃ والکنیسۃ وانما یکرہ من حیث انہٗ مجمع الشیاطین لا من حیث انہٗ لیس لہٗ حق الدخول ۔
(الفتاویٰ الهندیۃ ج ۵ ص۳۴۶ کتاب الکراھیۃ ۔الباب الرابع عشر) [2]

قادیانیوں سے لین دین کرنے کا حکم

سوال :۔ مسلمانوں کے لیے قادیانیوں کے ساتھ لین دین یعنی تجارت کرنا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ اگرچہ غیر مسلموں سے دنیاوی معاملات کرنے میں کوئی حرج نہیں لیکن قادیانی اپنے آپ کو مسلمان کہہ کر مسلمانوں کو دھوکہ دینے کی کوشش کرتے ہیں جس سے بسا اوقات ان کے کفریہ عقائد مخفی رہ جاتے ہیں، اس لیے یہ مرتدین کے حکم میں ہو کر ان سے کسی قسم کی تجارت کرنا جائز نہیں ۔

قال العلامۃ برھان الدین المرغینانیؒ : ویزیل ملک المرتد عن اموالہ یرتدہ

---

[1] قال الامام ابن البزاز الکردریؒ : وان اجابۃ الدعوۃ ولو لاھل الذمۃ سنۃ ۔
(البزازیۃ علیٰ ھامش الهندیۃ ج ۶ ص۳۳۳ السادس فی التشبیہ)

[2] قال العلامۃ ابن عابدینؒ : ویکرہ للمسلم الدخول فی البیعۃ والکنیسۃ ۔
(رد المحتار ج ۶ ص۳۸۷ کتاب الحظر والاباحۃ ۔فصل فی البیع)

زوالا مواعی فان اسلم عادت الی حالھا۔ (الھدایۃ ج۲ ص۱۶۰ کتاب السیر) [1]

مُرتد کے ساتھ تعلقات قائم کرنا

سوال:۔ جو شخص اسلام چھوڑ کر ہندو مذہب اختیار کرے تو اس سے دوستی اور محبت رکھنا اور خندہ پیشانی سے ملنا اور اس کے ساتھ کھانا پینا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ وہ شخص جو دینِ اسلام چھوڑ کر ہندو مذہب اختیار کرے مرتد ہے، اس سے تعلقات اور میل جول رکھنا صحیح نہیں، اسی طرح اس سے خندہ پیشانی سے پیش آنا مصافحہ کرنا، ملنا جلنا اور اس کے ساتھ کھانا پینا، رشتۂ عقد و مناکحت قائم کرنا ناجائز اور ممنوع ہے۔

کما قال العلامۃ محمد بن عبد اللہ التمرتاشیؒ: ومن ارتد عرض الحاکم علیہ الاسلام استحبابا..... وتکشف شبھۃ ویحبس وجوبا ثلاثۃ ایام فان اسلم فبھا والاقتل لحدیث من بدل دینہ فاقتلوہ۔ (تنویر الابصار علی ہامش رد المحتار ج۳ ص۳۱۲ باب العشر والخراج والجزیۃ) [2]

قادیانی کا چندہ مسجد میں لگانا

سوال:۔ اگر کوئی قادیانی مسجد کی تعمیر کے لیے اینٹیں وغیرہ دے تو کیا ان اینٹوں کو مسجد میں لگانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ قادیانی چونکہ مُرتد اور دائرہ اسلام سے خارج ہیں اور مُرتد کے حالتِ ارتداد میں کئے ہوئے تصرفات موقوف ہوتے ہیں، اگر وہ دوبارہ مسلمان ہو جائے تو حالتِ ارتداد میں کئے ہوئے اس کے تصرفات صحیح ہو جائیں گے اور اگر وہ حالتِ ارتداد

---

[1] قال شیخ الاسلام حافظ الدین النسفیؒ: ویزیل ملک المرتد عن مالہ زوالا موقوفاً فان اسلم عاد ملکہ۔ (کنز الدقائق علی ہامش البحر الرائق ج۵ ص۱۳۰ باب احکام المرتدین)

وَمِثْلُہٗ فی فتح القدیر ج۵ ص۳۱۲ کتاب الجھاد۔ احکام المرتدین۔

[2] وقال شیخ الاسلام حافظ الدین النسفیؒ: یعرض الاسلام علی المرتد وتکشف شبھتہ ویحبس ثلاثۃ ایام فان اسلم والاقتل۔ (کنز الدقائق علی ہامش البحر الرائق ج۵ ص۱۲۵ باب احکام المرتدین)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج۲ ص۲۵۳ کتاب السیر۔ الباب الثامن فی الجزیۃ۔

میں ہی مر جائے یا قتل کر دیا جائے یا دار الحرب چلا جائے تو حالتِ ارتداد کے تصرفات باطل ہو جائیں گے ۔ لہٰذا کسی بھی قادیانی مُرتد کی طرف سے دی ہوئی اینٹیں اور دوسرا تعمیراتی سامان مسجد میں لگانا جائز نہیں جب تک کہ وہ مسلمان نہ ہو جائے ۔

قال العلامۃ برہان الدین المرغینانیؒ : وما باعہ او اشتراہ او اعتقہ او وھبہ او رھنہ او تصرف فیہ من اموالہ فی حال ردتہ فھو موقوف فان اسلم صحت عقودہ وان مات او قتل او لحق بدار الحرب بطلت ۔

(الھدایۃ ج ۲ ص ۶۰۳ کتاب الجھاد ، باب المرتد) [۱]

قادیانی کی نمازِ جنازہ کا حکم

سوال :- میرے رشتہ داروں میں ایک شخص قادیانی ہے، اس کے مرنے کے بعد میرے لیے اس کے جنازہ میں شرکت کرنا اور اس پر نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :- چونکہ قادیانی مُرتد اور دائرۂ اسلام سے خارج ہیں، اس بناء پر ان میں سے کسی کی بھی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی جائے گی چاہے وہ قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو ، اور نہ ہی قادیانیوں کے مذہب کے مطابق موت کی رسومات میں ان کے ساتھ شامل ہونا جائز ہے، اور اگر ایسے رشتہ دار کی تدفین کے لیے اس کا ہم مذہب کوئی آدمی نہ ہو تو تدفین کے شرعی طریقہ سے ہٹ کر صرف زمین میں گڑھا کھود کر اسے دفن کیا جائے گا ۔

کما قال العلامۃ علاؤ الدین الحصکفیؒ : اما المرتد فیلقی فی حفرۃ کالکلب ۔

(الدر المختار علی ھامش رد المحتار ج ۱ ص ۶۵۷ باب صلوۃ الجنازۃ) [۱]

---

[۱] قال العلامۃ ابن نجیم المصری رحمہ اللہ : وتوقف مبایعتہ وعتقہ وھبتہ فان آمن نفذ وان ھلک بطل بیان لتصرف حال ردتہ بعد بیان حکم املاکہ قبل ردتہ

(البحر الرائق ج ۵ ص ۱۳۳ باب احکام المرتدین)

وَمِثْلُہٗ فی فتح القدیر ج ۵ ص ۳۲ باب احکام المرتدین ۔

[۲] قال العلامۃ ابن نجیم المصری رحمہ اللہ : اما المرتد فلا یغسل ولا یکفن وانما یلقی فی حفرۃ کالکلب ولا یدفع الیٰ من انتقل الیٰ دینھم ۔ (البحر الرائق ج ۲ ص ۱۹۱ کتاب الجنائز ۔ فصل السلطان احق بصلوتہ)

وَمِثْلُہٗ فی الخانیۃ علی ھامش الھندیۃ ج ۱ ص ۱۹۵ کتاب الجنائز ۔

قادیانیوں کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرنے کا حکم

سوال:- قادیانیوں کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب:- قادیانی ضروریاتِ دین سے انکار کی بناء پر کافر اور مرتد ہیں اُن کو اہلِ اسلام کے قبرستان میں دفن کرنا جائز نہیں ۔

کما قال العلامة ابن نجیم المصری رحمه الله : اما المرتد فلا یغسل ولا یکفن وانما یلقی فی حفیرة کالکلب ولا یدفع الی من انتقل الی دینهم۔

(البحر الرائق ج ۲ ص ۱۹۱ کتاب الجنائز۔ فصل فی السلطان احق بصلاته) [1]

قادیانی مسلمان کا وارث نہیں بن سکتا

سوال:- اگر کوئی شخص قادیانی ہو اور اس کا بیٹا مسلمان ہو تو بیٹے کے فوت ہو جانے کے بعد باپ اس کے مال میں میراث کا حقدار بن سکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب:- قادیانی اور مسلمان ایک دوسرے کی میراث کے حقدار نہیں بن سکتے مذکورہ بالا صورت میں قادیانی مرتد کی میراث بیت المال میں داخل کی جائے گی ، اسی طرح کوئی قادیانی کسی مسلمان کی میراث میں حقدار نہیں بن سکتا بلکہ مسلمان کی میراث اس کے مسلمان ورثاء میں قاعدہ شرعی کے مطابق تقسیم ہو گی ۔

لما قال الشیخ سراج الدین السجاوندیؒ : واما المرتد فلا یرث من احد لا من مسلم ولا من مرتد مثله ۔ (السراجی ص ۷۵ فصل فی المرتد) [2]

---

[1] قال العلامة الحصکفی رحمه الله : اما المرتد فیلقی فی حفرة کالکلب ۔
(الدر المختار علی هامش رد المحتار ج ۱ ص ۶۵۷ باب صلوٰة الجنازة)
و مثله فی فتح القدیر ج ۲ ص ۹۴ کتاب الجنائز ۔

[2] قال فی الهندیة : المرتد لا یرث من مسلم ولا من مرتد مثله کذا فی المحیط ۔ (الفتاوی الهندیة ج ۶ ص ۴۵۵ الباب السادس فی میراث اهل الکفر)
و مثله فی الخانیة علی هامش الهندیة ج ۳ ص ۵۸۰ کتاب الفرائض ۔

مُرتد کی میراث کا حکم

سوال:۔ اگر مرتد دارالاسلام میں مرجائے تو اس کا ترکہ مسلمان ورثاءؑ کو ملے گا یا مرتد ورثاء کو، اور اگر دارالحرب میں مرجائے تو پھر ترکہ کس کو ملے گا؟

الجواب:۔ اگر مرتد دارالاسلام میں مرجائے یا قتل ہوجائے تو حالتِ اسلام کا کمایا ہوا مال اس کے مسلم ورثاء کو ملے گا اور حالتِ ارتداد میں کمایا ہوا مال مالِ فئے میں شمار ہوکر بیت المال میں داخل کیا جائے گا، اور اگر دارالحرب میں مرجائے تو حالتِ اسلام میں کمایا ہوا مال اس کے مسلم ورثاء کو ملے گا اور حالتِ ارتداد کا کمایا ہوا مال مرتد ورثاء کے مابین تقسیم ہوگا۔

قال العلامة المرغینانیؒ: وان مات او قتل علیٰ ردته انتقل ما اکتسبه فی اسلامه الیٰ ورثة المسلمین وکان ما اکتسبه فی حال ردته فیئاً۔ (الهدایة ج۲ ص۶۰۱ باب احکام المرتد)[1]

مرزائی کی دعوتِ طعام قبول کرنا

سوال:۔ ہمارے محلے میں چند مرزائی رہتے ہیں، وہ کبھی کبھی کسی خوشی کے موقعہ پر دعوت کرتے ہیں اور اس میں ہم مسلمانوں کو بھی بلاتے ہیں، کیا مرزائیوں کی دعوت کو قبول کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مرزائی مرتد ہوکر واجب القتل ہیں، اس لیے مرتد سے کسی قسم کے تعلقات رکھنا یا اس کے ہاں دعوت کھانا جائز نہیں۔

لما قال شیخ الاسلام حافظ الدین النسفیؒ: یعرض الاسلام علی المرتد وتکشف شبهة ویحبس ثلاثة ایام فان اسلم والا قتل۔ (کنز الدقائق علیٰ هامش البحر الرائق ج۵ ص۱۲۵ باب احکام المرتدین)[2]

---

[1] قال العلامة الحصکفیؒ وابن عابدینؒ: وان مات او قتل علیٰ ردته او حکم بلحاقه ورث کسب اسلامه وارثه المسلم ولو زوجته بشرط العدة (زیلعی) بعد قضاء دین اسلامه وکسب ردته فیٔ بعد قضاء دین ردته الخ اما ما اکتسبه فی دار الحرب فهو لابنه الذی ارتد ولحق معه اذا مات مرتد الا انه اکتسبه وهو من اهل الحرب وهم یتوارثون فیما بینهم۔ (الدر المختار ورد المحتار ج۳ ص۳۲۸، ۳۲۹ باب المرتد)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۵ ص۱۳۰، ۱۳۱ باب احکام المرتدین۔

[2] قال العلامة محمد بن عبد الله التمرتاشیؒ: ومن ارتد عرض الحاکم علیه الاسلام استحبابا ...... وتکشف شبهة ...... ویحبس وجوبا ثلاثة ایام فان اسلم فیها والا قتل لحدیث من بدل دینه فاقتلوه۔ (تنویر الابصار علیٰ هامش رد المحتار ج۳ ص۳۱۲ باب المرتد)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج۲ ص۲۵۳ الباب الثامن فی الجزیة۔

شیعہ کے ہاتھ کا ذبیحہ کھانے کا حکم

سوال :- جو شخص حضرت علیؓ کی الوہیت کا عقیدہ رکھتا ہو، حضرت جبرئیل کی غلطی کی طرف نسبت کرتا ہو اور الوہیت میں تناسخ کا قائل ہونے کے علاوہ امام مہدی کے خروج تک تمام اسلامی احکام کو معطل سمجھتا ہو ایسے شخص کا حکم کیا ہے، کیا ایسے شخص کو سلام کرنا اور اس کے ہاتھ کا ذبیحہ کھانا اور اس کے ساتھ تعلقات قائم کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب :- جو شخص الوہیتِ علیؓ کا عقیدہ رکھتا ہو اور حضرتِ جبرائیلؑ کو غلطی کی طرف نسبت کرتا ہو اور الوہیت میں تناسخ کا معتقد ہو اور تمام اسلامی احکام کو خروجِ امام تک معطل سمجھتا ہو وہ بلاشبہ کافر ہے اور ایسے شخص کا حکم مرتد کی طرح ہے۔

کما فی الهندية : ويجب اكفار الروافض فی قولهم برجعة الاموات الی الدنيا وبتناسخ الارواح وبانتقال روح الاله الی الائمة وبقولهم فی خروج امام باطن و بتعطيلهم الامر والنهی الیٰ ان يخرج الامام الباطن وبقولهم ان جبرائيلؑ غلط فی الوحی الی محمد صلی الله عليه وسلم دون علی بن ابی طالبؓ وهٰؤلاء القوم خارجون عن ملة الاسلام واحكامهم احكام المرتدين - كذا فی الظهيرية - (الفتاوٰی الهندية ج۲ ص۲۶۴ كتاب السير - الباب التاسع)

اور مرتد کو سلام کرنا اور اس کے ہاتھ کا مذبوحہ کھانا اور اس کے ساتھ کسی قسم کے تعلقات رکھنا ہرگز جائز نہیں۔

قال العلامة المرغينانیؒ : ويزيل ملك المرتد عن امواله بردته زوالا مراعی فان اسلم عادت الی حالها..... وباطل بالاتفاق كالنكاح والذبيحة لانه يعتمد الملة ولا ملة له - (الهداية ج۲ ص۶۰۱ تا ۶۰۳ باب احكام المرتد، كتاب الجهاد) [1]

---

[1] وقال العلامة عالم بن العلاء الانصاریؒ : ويجب اكفار الروافض فی قولهم يرجع الاموات الی الدنيا وبانتقال الاموات وتناسخ الارواح وانتقال روح الاله الی الائمة وان الائمة الهة وقولهم فی خروج امام باطن وبتعطيلهم الأمر والنهی الیٰ ان يخرج الامام الباطن ..... وهٰؤلاء القوم خارجون عن ملة الاسلام واحكامهم احكام المرتدين - (الفتاوٰی التاتارخانية ج۵ ص۵۳۸ كتاب احكام المرتدين)

وَمِثْلُهٗ فی فتاوٰی قاضی خان علی هامش الهندية ج۲ ص۳۱۸ كتاب الفاظ تكون اسلامًا او كفرًا الخ

شیعہ کا مال جبراً لینے کا حکم

سوال:۔ شیعوں کے اموال جبراً یا چوری کر کے لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگرچہ شیعہ کے بعض فرقے غیر مسلموں کے حکم میں ہیں لیکن حربی نہ ہونے کی وجہ سے ان کے اموال محفوظ رہیں گے، ان کے اموال کی چوری کرنا یا جبراً لینا جائز ہے یا نہیں؟

قال العلامۃ الحصکفیؒ: اذا صار ذمیا یجری القصاص بینہ وبین المسلم ویضمن المسلم قیمۃ خمرہ وخنزیرہ اذا تلفہ وتجب الدیۃ علیہ اذا قتلہ خطاءً ویجب کف الاذی عنہ۔ وقال ابن عابدینؒ۔ قید بالمستأمن لانہ لو دخل دارنا بلا امان کان ہو وما معہ فیئاً۔ (الدرالمختار علیٰ ھامش ردالمحتار ج ۳ ص ۲۷۲ باب المستأمن کتاب الجہاد) [1]

شیعہ پر نماز جنازہ پڑھنا

سوال:۔ جو شیعہ ضروریاتِ دین کا منکر ہو اس پر نماز جنازہ پڑھنا اہل سنت والجماعت کیلئے جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ شیعوں میں سے جو شخص ضروریاتِ دین کا منکر ہو اس پر نماز جنازہ پڑھنا جائز نہیں البتہ جس کے عقائد کفریہ نہ ہوں اس پر نماز جنازہ پڑھنا جائز ہے۔

لما فی الہندیۃ: ولو قذف عائشۃ رضی اللہ عنہا بالزنی کفر باللہ ...... من انکر امامۃ ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ فہو کافر۔

(الفتاویٰ الہندیۃ ج ۲ ص ۲۶۴ کتاب السیر۔ الباب التاسع فی احکام المرتدین) [2]

---

[1] وفی الہندیۃ: وتثبت احکام الذمی فی حقہ من منع الخروج الی دار الحرب وجریان القصاص بینہ وبین المسلم وضمان المسلم قیمۃ خمرہ وخنزیرہ اذا تلفہ ووجوب الدیۃ اذا قتل خطاء ووجوب کف الاذی عنہ۔

(الفتاویٰ الہندیۃ ج ۲ ص ۲۳۵ کتاب السیر۔ الباب الثامن فی المستأمن)

وَمِثْلُہٗ فی فتح القدیر ج ۵ ص ۲۷۱ کتاب السیر۔ باب احکام المرتد۔

[2] قال العلامۃ ابن نجیم المصری رحمہ اللہ: وبقذف عائشۃ رضی اللہ عنہا من نسائہ صلی اللہ علیہ وسلم فقط وبانکارہ صحبۃ ابی بکر رضی اللہ عنہ الخ

(البحر الرائق ج ۵ ص ۱۲۱ باب احکام المرتدین)

وَمِثْلُہٗ فی ردالمحتار ج ۳ ص ۳۲۱ کتاب الجہاد، باب احکام المرتد۔

مسلمان کو کافر کی میراث نہیں مل سکتی

سوال:۔ مسلمان کافر سے اور کافر مسلمان سے میراث لے سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ چونکہ اختلافِ دین وعقیدہ مانع ارث ہے، اس لیے کافر مسلمان کی میراث نہیں لے سکتا اور نہ ہی مسلمان کو کافر کی میراث دی جاسکتی ہے۔

لما قال شیخ الاسلام محمد بن عبد اللہ التمرتاشیؒ: وموانعہ الرق والقتل واختلاف الدین۔ (تنویر الابصار علیٰ ہامش رد المحتار ج۵ ص۵۴۲ کتاب الفرائض)[1]

کفار کے لیے دعائیں کرنا

سوال:۔ اکثر لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ دعا کچھ اس طرح کرتے ہیں کہ اے اللہ مسلمانوں پر رحم فرما اور کفار کو نیست و نابود فرما۔ تو کیا اس قسم کی دعائیں کرنا شرعاً صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اس قسم کی دعاؤں کی صحت میں تو کوئی اشکال نہیں، البتہ مسلمانوں کی طرح کفار بھی رحم کے مستحق ہیں ان کے لیے بھی ہدایت کی دعا کرنی چاہیئے۔ ہمارے اکابرین کا یہی طریقہ چلا آرہا ہے وہ اپنی دعاؤں میں کفار کے لیے بھی رحم کی دعاء کیا کرتے تھے۔

وذکر العلامۃ مسلم بن الحجاج القشیریؒ: عن ابی کثیر قال حدثنی ابوھریرۃ قال کنت ادعو أمی الی الاسلام وھی مشرکۃ فدعوتھا یوماً فاسمعتنی فی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما اکرہ فاتیت رسول اللہ علیہ وسلم وانا ابکی قلتُ یا رسول اللہ انی کنت ادعوا أمی الی الاسلام فتابی علیّ فدعوتھا الیوم فاسمعتنی فیک ما اکرہ فادع اللہ ان یھدی أم ابی ھریرۃ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللھم اھد ام ابی ھریرۃ۔۔الخ (الجامع الصحیح المسلم ج۲ ص۳۰۱ کتاب الفضائل،باب فضائل ابی ھریرۃ)[2]

---

[1] قال العلامۃ السجاوندی رحمہ اللہ: المانع من الارث اربعۃ الرق وافر...... واختلاف الدین۔ (السراجی ص۵ فصل فی موانع الارث) وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۸ ص۴۸۸ کتاب الفرائض۔

[2] وذکر العلامۃ ابو عیسیٰ الترمذیؒ: عن جابرٍ قالوا یا رسول اللہ احرقتنا نبال ثقیف فادع اللہ علیھم فقال اللھم اھد ثقیفا۔ (الجامع الترمذی ج۲ ص۲۳۱ ابواب المناقب۔ باب فی ثقیف وجنیفۃ)

غیر مسلموں سے امداد لینے کا حکم

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلے میں کہ ڈاکٹر آرنسٹ لعل ڈائریکٹر کرسچین ہسپتال ٹیکسلا نے اس بات کے پیشِ نظر کہ دیر کے غریب عوام علاج معالجہ کے لیے اُن کے قائم کردہ کرسچین ہسپتال ٹیکسلا میں آرہے ہیں، دیر ہی کے ایک گاؤں انگرام میں ایک ہسپتال بنانے کی منظوری دی ہے اور وہاں پر پائندہ خیل قبیلے کے ایک جرگے نے ۳۲ ایکڑ مشترکہ زمین اس ہسپتال کی تعمیر کے لیے دی ہے۔ جبکہ مقامی طور پر کچھ لوگوں نے یہ خدشہ ظاہر کیا ہے کہ یہ لوگ ہسپتال کی آڑ میں عیسائیت پھیلانے کے لیے تبلیغ کریں گے، پمفلٹ تقسیم کریں گے، مریضوں اور اُن کے تیمارداروں کو عیسائیت کی دعوت دیں گے وغیرہ وغیرہ۔ یہ خدشات جب مجوزہ ہسپتال کی انتظامیہ کے سربراہ ڈاکٹر آرنسٹ لعل کے سامنے پیش کئے گئے تو اس نے کہا کہ اس قسم کی کوئی بات نہیں ہوگی، آپ لوگ جو شرط لگانا چاہتے ہیں لگا لیں ہم ان کی پابندی کریں گے۔ چنانچہ ڈاکٹر مذکورہ کے سامنے چند شرائط پیش کی گئیں جو کہ اس نے تسلیم کریں اور سرکاری سٹامپ پیپر پر بیان حلفی کی صورت میں لکھ کر سٹیمپ (مُہر) لگا کر دستخط کر دیئے ہیں، یہ شرائط مندرجہ ذیل ہیں:۔

۱۔ انگرام ہسپتال میں کوئی مسیحی تبلیغ نہ ہوگی۔

۲۔ مذکورہ ہسپتال میں کوئی مسیحی لٹریچر تقسیم نہ ہوگا۔

۳۔ انگرام ہسپتال میں کوئی گرجاگھر تعمیر نہ ہوگا۔

۴۔ انگرام ہسپتال میں کوئی صلیب کا نشان نہیں لگایا جائے گا۔

۵۔ ہسپتال کے بیت الخلاء اسلامی اقدار کے مطابق شمالاً جنوباً بنائے جائیں گے۔

۶۔ انگرام ہسپتال کا نام مسیحی نام سے مُبرّا ہوگا۔

۷۔ سٹیشنری پر کسی قسم کی بائیبل مقدس کی آیات طبع نہ ہوں گی۔

۸۔ انگرام ہسپتال کی بلڈنگ سادہ اور مضبوط بنائی جائے گی جو کسی بھی سرکاری ہسپتال کی بلڈنگ سے اچھی ہوگی۔

۹۔ یہ ہسپتال خالص انسانی ہمدردی کی بنیاد پر کام کرے گا نیز ہسپتال میں جو کوئی مریض آئے گا اس کا علاج کم خرچ اور رنگ ونسل کے امتیاز کے بغیر کیا جائے گا۔

۱۰۔ ہسپتال کے احاطہ کے اندر ایک طرف مسجد کے لیے جگہ مخصوص کی جائے گی لیکن

مریضوں کی تکلیف کے پیشِ نظر لاؤڈ سپیکر لگانے کی اجازت نہ ہوگی۔
اس تمام صورتِ حال کے پیشِ نظر اب سوال یہ ہے کہ ڈاکٹر آرنسٹ لعل جو کہ عیسائی ہے، کے تعاون سے اس ہسپتال کی تعمیر شرعی طور پر جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ کے مطابق کرسچین ہسپتال بنانے والوں نے جرگے کی طرف سے مقرر کردہ جن شرائط کی ہر لحاظ سے پابندی کرنے کا معاہدہ کیا ہے اُن تمام شرائط کا لحاظ اور پابندی کرنے کی صورت میں اس ادارہ کی طرف سے مسلمانوں کے لیے ہسپتال بنانا جائز ہے، اگر ہسپتال بنانے والوں کی طرف سے کسی بھی مرحلہ پر ان شرائط کی خلاف ورزی کی گئی تو مسلمانوں کو اس کے بند کرنے کا حق حاصل ہوگا۔ اصولاً تعلیم، صحت، سائنس و ٹیکنالوجی اور دیگر دُنیاوی امور و معاملات میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کا ایک دوسرے سے افادہ اور استفادہ کرنا شرعاً جائز ہے بشرطیکہ اسلام اور اسلامی اقدار اس سے متاثر نہ ہوتے ہوں۔

واللہ اعلم وعلمہ اتم

مسلمانوں کے خلاف کفار کی مدد کرنا

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء کرام و مفتیان عظام کہ ایک اسلامی ملک کسی دوسرے اسلامی ملک کے خلاف کسی کافر ملک کی امداد و تعاون کر سکتا ہے یا نہیں؟ جبکہ وہ ملک خالص اسلامی ہے، اس میں کلی طور پر اسلامی قوانین رائج ہیں اور کافر ملک صرف اسلامی قوانین جاری کرنے کی وجہ سے اس کا مخالف بن گیا ہے اور اس پر ظلم و زیادتی کرنے کے لیے بے بنیاد اور من گھڑت الزامات لگا رہا ہے جس کا اس کے پاس کوئی ثبوت بھی نہیں ہے۔ مہربانی فرما کر اس بارے میں شرعی نقطۂ نظر سے مطلع فرمائیں؟

الجواب:۔ کسی مسلمان ملک کے خلاف کسی بھی کافر ملک سے محض دنیاوی مفادات کی خاطر تعاون کرنا یا اس کا آلۂ کار بننا شرعی نقطۂ نظر سے حرام و ناجائز ہے۔ کسی بھی مسلمان ملک کا سربراہ اگر ایسا کرتا ہے تو اس کے خلاف بغاوت کرنا اور ایسی لادین قیادت کو ختم کر کے صالح اور دیندار شخص کو حاکم مقرر کرنا مسلمان رعایا پر لازم اور ضروری ہے، اسلیے کہ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، وہ نہ تو خود اس پر ظلم کرے گا اور نہ بے بنیاد الزامات کی بنا پر اسے کسی کافر کے حوالے کرنے کا شرعاً مجاز ہے۔

لقولہ علیہ السلام: المؤمن اخو المؤمن لا یظلمہ ویسلمہ۔ (الحدیث)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ابتدائیہ

امریکہ سی ٹی بی ٹی (CTBT) یعنی ایٹمی ہتھیاروں پر پابندی کے جامع معاہدہ کے نام سے پاکستان کو اس معاہدہ پر دستخط کرا کے پابند بنانا چاہتا ہے جس سے بظاہر پاکستان کو حاصل ایٹمی توانائی کے استعمال یا اس کی مزید ترقی کو روکنا مقصود ہے۔ کیا شرعاً کسی مسلمان ملک کے حکمرانوں کو اپنی جہادی قوت، آلات و وسائل اور حربی تکنیک کو کفار کے دباؤ یا کسی لالچ کے نتیجے میں اسے محدود اور معطل یا منجمد و مفلوج کرنے کی اجازت ہے؟ اس مسئلہ کی از روئے قرآن و سنت شرعی حیثیت واضح کرنے کے لیے ملک اور عالم اسلام کے معروف، معتمد اور ممتاز دینی ادارہ دارالعلوم حقانیہ کے دارالافتاء نے مدلل روشنی ڈالی ہے جو اعیانِ حکومت، ممبران پارلیمنٹ، سیاستدانوں، سائنسدانوں، فوجی اداروں، علماء، دانشوروں، صحافیوں اور عام مسلمانوں کے غور و فکر کے لیے پیشِ خدمت ہے۔

اللہ تعالیٰ اس حقیر سی خدمت کو ملک و ملت کے بہتر مستقبل اور فلاح و بہبود کا ذریعہ بنا دے۔ (آمین)

(مولانا) سمیع الحق
مہتمم دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک (نوشہرہ)
۱۰ ستمبر ۱۹۹۸ء

استفتاء

سی ٹی بی ٹی اور این پی ٹی یعنی ایٹمی پروگرام، اس کی توسیع اور ٹیسٹ پر پابندی کا جامع معاہدہ

مملکتِ اسلامیہ پاکستان جو کہ برصغیر کے کروڑوں مسلمانوں کی قربانیوں کا ثمرہ ہے، اس کی تقسیم کا مقصد ہی یہاں پر ایک آزاد اور خود مختار اسلامی مملکت کا قیام تھا، الحمدللہ پاکستان اسلام اور مسلمانوں کی قربانیوں کی وجہ سے معرضِ وجود میں آیا اور اس نے عالمِ اسلام کے لیے ہر دور میں ہراول دستے کا کردار ادا کیا۔ یہود و ہنود اور مغربی ممالک پاکستان کے قیام کے روزِ اول ہی سے اس کے وجود کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے درپے ہیں اور مختلف سازشوں سے اس کو آئے دن کمزور کرنے کی ہر ممکن کوشش میں مصروف ہیں، اس کا سب سے بڑا ثبوت ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان کو پاکستان سے علیحدہ کرنا ہے۔ پھر ۱۹۴۸ء میں جبکہ پاکستان کے قیام کا ایک سال بھی پورا نہیں ہوا تھا کہ اس پر جنگ مسلط کر دی گئی، اس کے بعد ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء میں جنگیں ہوئیں اور ہمارے خلاف بدترین جارحیت کی گئی۔ اب جبکہ مقبوضہ کشمیر میں تحریکِ آزادی کے مجاہدین ہندوؤں کے خلاف جہاد میں سرگرمِ عمل ہیں اور پاکستان نے بھی ہر سطح پر خصوصاً بین الاقوامی فورم میں مسئلہ کشمیر اجاگر کیا ہے۔ تو ہندوستان نے تحریکِ آزادی کشمیر کو ختم کرنے اور پاکستان کو صفحہ ہستی سے مٹانے کیلئے ۱۱ اور ۱۳ مئی ۱۹۹۸ء کو ایٹمی دھماکے کئے، یہ دھماکے ہندوستان میں واجپائی حکومت نے کئے جس کا بنیادی منشور ہی اسلام اور پاکستان دشمنی پر مبنی ہے، یاد رہے کہ ہندوستان ۱۹۷۴ء میں ایٹمی قوت بن چکا ہے۔ ان حالات میں پاکستان کو یہ حق مکمل طور پر حاصل تھا کہ وہ بھی اپنے دفاع کے لئے قرآنی نص کے مطابق ہر ممکن صلاحیت خواہ وہ عسکری ہو یا حربی، حاصل کرے اور ہر لحاظ سے خود کو مضبوط کرنے کی کوشش کرے، کیونکہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: وَاَعِدُّوا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ۔ (سورۃ الانفال آیت ۶۰)

اس وقت حکومتِ پاکستان نے اپنا ایٹمی پروگرام یہود و ہنود کے مکروہ عزائم کو بھانپتے ہوئے شروع کیا تھا اور اس عظیم مقصد کے لیے اپنے ذرائع و وسائل اور حیثیت سے بڑھ کر ملک و ملت اور قابلِ فخر سائنسدانوں نے طویل اور صبر آزما ایثار کا مظاہرہ کیا اور اس پر اربوں روپے خرچ ہوئے اور بمشکل تمام اس کو عالمِ کفر کی خونخوار نظروں سے بچائے رکھا، گویا پوری قوم نے خونِ جگر سے اس پروگرام کی آبیاری کی اور اپنے ملک و ملت و عالمِ اسلام کو ایک ناقابلِ تسخیر ایٹمی قوت بنا کر عالمِ کفر اور بھارت کے مذموم ارادوں کو خاک میں ملا دیا جس سے تمام پاکستانی قوم اور پورے عالمِ اسلام کا سر فخر سے بلند ہوا، قوم کو نئی راہ اور نئی سمت مل گئی اور ہم جو اکیسویں صدی میں عالمِ اسلام اور پاکستان کو ایٹمی قوت کی حیثیت سے (جو کہ سائنس، ٹیکنالوجی اور عسکری طاقت کی معراج سمجھی جاتی ہے) داخل ہو رہے ہیں تو موجودہ حکومت جس نے سی ٹی بی ٹی کے معاہدے پر دستخطوں کا حتمی فیصلہ کر لیا ہے جو ہمارے قومی و فوجی دفاع کی شہ رگ کو کاٹنے کے مترادف ہے حکومت اس معاہدہ (CTBT) پر دستخط کر کے ہمیں ایک بے غیرت، بے حمیت، بزدل اور سوداگر قوم بنانا چاہتی ہے اور معاہدے کے بعد ہمیں ہندوستان و اسرائیل کے خونخوار بھیڑیوں کے سامنے بے دست و پا پھینکنے کی کوشش کر رہی ہے خاص کر ایسے حالات میں کہ جب ہندوستان جس کو ایٹمی پروگرام کو منجمد کرنے کے جامع معاہدے پر دستخط کرنے میں اب تک انکار و تردد ہے اور اگر اس نے دستخط کر بھی دیئے تو اس کی فوجی اور دفاعی ساز و سامان کی صلاحیت، جنگی ٹیکنالوجی اور افرادی قوت ہم سے کئی گنا زیادہ ہے جس کا مقابلہ ہماری ایٹمی قوت کے بغیر نہیں ہو سکتا، حالانکہ خود یہود و نصاریٰ اور عالمی کفر و استعمار کے پانچ بدمعاشوں اور دہشت گردوں نے بھی ابھی تک اس معاہدے کی توثیق نہیں کی ہے اور نہ ان کا کوئی ارادہ ہے۔ اس معاہدے پر دستخط کر دینے کے بعد پاکستان اور عالمِ اسلام کا ناقابلِ تصور نقصان ہو گا، چند نقصانات درج ذیل ہیں:۔

(۱) کشمیر کی تحریکِ آزادی پر ہر لحاظ سے براہِ راست برا اثر پڑے گا۔

(۲) ہندوستان اور عالمِ کفر کے ایٹمی پروگرام روز بروز جاری و ساری اور ترقی کی منازل طے کرتے رہیں گے اور اس کے برعکس ہمارا ایٹمی پروگرام اس معاہدہ کی پابندی کی وجہ سے منجمد ہو کر رہ جائے گا۔

(۳) بھارت کے مقابلے میں ہماری پوزیشن عسکری، حربی اور سیاسی لحاظ سے کمزور تر ہو جائے گی۔

(۴) معاہدہ پر دستخط کرنے کے بعد عالمِ کفر کی طرف سے ہم سے نت نئے مطالبات کا ایک لا متناہی سلسلہ شروع ہو جائے گا جس کا مشاہدہ ہم عراق، لیبیا وغیرہ ملکوں میں کر رہے ہیں۔

(۵) ایٹمی دھماکے کرنے کے بعد عالمِ اسلام خصوصاً عالمِ عرب کو ایک ولولۂ تازہ عطا ہوا تھا اور اسرائیل اور دوسری استعماری کفری طاقتیں مرعوب ہو گئی تھیں، معاہدے کے بعد ہماری حیثیت محض ایک سوداگر قوم کی سی ہو جائے گی۔

(۶) اگر مستقبل میں عالمِ اسلام اور عالمِ کفر کے درمیان کوئی بڑی جنگ شروع ہوتی (جس کی ابتداء امریکہ عراق، لیبیا، سوڈان اور افغانستان سے کر چکا ہے) تو اس میں پاکستان اس معاہدے کے بعد کوئی اہم کردار ادا نہیں کر سکے گا بلکہ پاکستان امریکہ کی ایک کالونی کی حیثیت اختیار کر جائے گا۔

(۷) اس کے نتیجے میں عالمِ اسلام اور دوسرے مقامات میں جہادی قوتوں کو شدید دھچکا لگے گا اور مجاہدین کی حوصلہ شکنی ہوگی۔

(۸) پاکستان عالمِ اسلام کو کبھی بھی ایٹمی ٹیکنالوجی منتقل نہیں کر سکے گا۔

اس خطرناک صورتحال کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے علماء کرام و مفتیانِ دینِ متین کیا فرماتے ہیں کہ:-

(ا) ملک و ملت کے ان عظیم نقصانات، جو کہ معاہدے پر دستخط ہونے کے بعد یقینی اور حتمی ہیں کیا موجودہ حکومت کو اس بات کا حق اور اختیار پہنچتا ہے کہ وہ ایک ارب مسلمانوں کے متفقہ فیصلے کے برعکس ذلت و رسوائی کے اس محضر نامے اور اپنی موت و قتل کے پروانے پر دستخط کر دے؟ (اور اس کے صلے میں ہمیں جو موہوم امداد بلکہ خیرات اور بھیک ملے گی کیا وہ ماضی کی طرح حکمرانوں کی جیبوں میں نہیں جائے گی؟) ان نقصانات اور خطرناک حقائق کی موجودگی میں اس معاہدے پر دستخط کرنے کیلئے مہم چلانا یا اس کی حمایت کرنا اور اس پر دستخط کرنا دین و شریعت کی روشنی میں اس کا کیا حکم ہے؟ اور یہ معاہدہ شرعی اعتبار سے جائز ہے یا ناجائز؟

(ب) اور وہ لوگ جو اس پر دستخط کرتے ہیں یا اس کی حمایت کرتے ہیں یا اس پر دستخط کے لیے مہم چلاتے ہیں خواہ وہ حزبِ اقتدار سے ہوں یا حزبِ اختلاف سے، سیاستدان ہوں یا بیوروکریٹس اور حکومتی مشنری، ان کا شرعاً کیا حکم ہے؟

(ج) اور آیا یہ لوگ ملک وملت اور اپنے حلف سے انحراف کا ارتکاب کرنے والوں کے زمرے میں آتے ہیں یا نہیں؟

الجواب

اعداد آلاتِ حرب قرآن کریم کی روشنی میں

اعداد (تیاری) آلاتِ جہاد کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ○ (سورۃ الانفال آیت ۶۰) "اور تیار کرو ان کی لڑائی کے واسطے جو کچھ جمع کرسکو قوت سے اور پلے ہوئے گھوڑوں سے کہ اس سے دھاک پڑے اللہ کے دشمنوں اور تمہارے دشمنوں پر اور دوسروں پر ان کے سوا، جن کو تم نہیں جانتے اللہ ان کو جانتا ہے اور جو کچھ تم خرچ کرو گے اللہ کے راستے میں وہ پورا ملے گا اور تمہارا حق نہ رہ جائے گا" (ترجمہ از معارف القرآن) اس کی تفسیر میں امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "وهذه الاٰية تدل علىٰ ان الاستعداد للجهاد بالنبل والسلاح وتعليم الفروسية فريضة" (تفسیر کبیر ج ۱۵ ص ۱۸۵ سورۃ الانفال) (یہ آیت کریمہ جہاد کے لیے تیاریٔ اسلحہ، تیراندازی اور شہسواری کی تعلیم کی فرضیت پر دلالت کرتی ہے)۔

علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ اسی آیت کے ضمن میں فوائد عثمانی میں تحریر فرماتے ہیں۔

"مسلمانوں پر فرض ہے کہ جہاں تک قدرت ہو سامانِ جہاد فراہم کریں، نبی اکرم ﷺ کے عہدِ مبارکہ میں گھوڑوں کی سواری، شمشیر زنی اور تیراندازی کی مشق کرنا سامانِ جہاد تھا۔ آج بندوق، توپ، ہوائی جہاز، آبدوز کشتیاں، آہن پوش کروزر وغیرہ کا تیار کرنا اور استعمال میں لانا اور فنونِ حربیہ کا سیکھنا بلکہ ورزش وغیرہ کرنا سب جہاد ہے اسی طرح آئندہ جو اسلحہ وآلاتِ حرب وضرب تیار ہوں وہ سب آیت کے منشاء میں داخل ہیں"۔ (تفسیر عثمانی ص ۲۴۲ سورۃ الانفال)

لہٰذا اس آیت کے عموم میں موجودہ وقت میں جو آلاتِ حرب وضرب اور سائنس وٹیکنالوجی کی بدولت جو بم اور میزائل وغیرہ تیار کئے گئے ہیں مثلاً کروز میزائل، سکڈ میزائل، نیپام بم، ہائیڈروجن بم اور ایٹم بم جیسے مہلک ہتھیار، یہ تمام مااستطعتم کے عموم میں آتے ہیں۔ چنانچہ مولانا محمد ادریس کاندھلوی اپنی تفسیر معارف القرآن جلد ۳ ص ۲۵۵ سورۃ الانفال پر لکھتے ہیں: لہٰذا اس آیت کی رو سے

مسلمان حکومتوں پر جدید اسلحہ کی تیاری اور اس کے کارخانوں کا قائم کرنا فرض ہوگا۔ اس لیے اس آیت میں قیامت تک کے لیے ہر زمان و مکان کے مناسب قوت و طاقت کی فراہمی کا حکم دیا گیا ہے۔ جس طرح کافروں نے تباہ کن ہتھیار تیار کئے ہیں ہم مسلمانوں پر بھی اسی قسم کے بلکہ ان سے بھی زیادہ تباہ کن ہتھیاروں کا تیار کرنا فرض ہوگا تاکہ کفر اور شرک کا مقابلہ کر سکیں۔

اس کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور فقہاء کے اقوال

اسی طرح احادیث کریمہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اعداد آلاتِ حرب کی تاکید اور ترغیب فرمائی ہے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: "عن عقبة بن عامر قال سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم وهو علی المنبر یقول واعدوا لهم ما استطعتم من قوة الا ان القوة الرمی الا ان القوة الرمی الا ان القوة الرمی" (صحیح مسلم ج ۲ ص۱۴۳ باب فضل الرمی والحث علیه۔ کتاب الجهاد)

(ترجمہ حدیث) "عقبہ بن عامرؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے اس حال میں کہ آپؐ منبر پر تشریف فرما تھے، آپؐ نے ارشاد فرمایا: اور تیار کرو کافروں کے ساتھ جنگ کے واسطے وہ چیزیں جو تم قوت سے کر سکو، خبردار! بیشک قوت تیر اندازی ہے، خبردار! بیشک قوت تیر اندازی ہے، خبردار! بیشک قوت تیر اندازی ہے۔"

اس حدیث کی تفسیر میں علامہ ابوبکر الجصاص الرازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:۔

ومعنی قوله الا ان القوة الرمی انه من معظم ما یجب اعداده للقوة علی قتال العدو ولم ینف به ان یکون غیره من القوة بل عموم اللفظ شامل لجمیع ما یستعان به علی علی العدو من سائر انواع السلاح وآلات الحرب۔ (احکام القرآن جلد ۲ ص۸۵ سورة الانفال)

دوسری روایت ہے: عن عقبة بن عامرؓ قال سمعت رسول الله یقول ان الله یدخل بالسهم الواحد ثلاثة نفر الجنة صانعه یحتسب فی صنعته الخیر والرامی به ومنبله۔

(رواہ ابوداؤد بذل المجهود ج ۱۱ ص۴۲۸ کتاب الجهاد۔ باب الرمی)

(ترجمہ حدیث) "عقبہ بن عامرؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے آپؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ایک تیر پر تین آدمیوں کو جنت میں داخل کرتا ہے، اس کا بنانے والا جس کے بنانے سے اس کی نیت خیر کی ہو، اور اس کا پھینکنے والا، تیسرا تیر دینے والا تیر انداز کے ہاتھ میں۔"

اس حدیث کے متعلق شارح ابوداؤد مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ لکھتے ہیں:۔

ولم يكون في زمن رسول الله الا رمي السهام فيدخل بل يعوض عنه فيه مايرمي به من الرصاص بالبندوقيه والمدافع وغير ذلك من آلات الحرب الجديدة في هذا الزمان فانها اغنت عن رمي السهام بالقوس وعطلته ۔ (بذل المجهود جلد ۱۱ ص ۴۲۸ باب في الرمي ۔ کتاب الجهاد)

فقہائے کرام میں فقہ حنفی کی مشہور و معروف شخصیت علامہ ابن نجیم المصریؒ فرماتے ہیں۔

يندب للمجاهد في دار الحرب توفير الاظفار وان كان قصها من الفطرة لانه اذا سقط السلاح من يده ودنا منه العدو ربما يتمكن من دفعه بالاظافير وهو نظير قص الشوارب فانه سنة ثم الغازي في دار الحرب مندوب الى توفيرها وتطويلها ليكون اهيب في عين من يبارز ۔ فالحاصل ان ما يعين المرء على الجهاد فهو مندوب الى اكتسابه لما فيه من اعزاز المسلمين وقهر المشركين ۔ (البحر الرائق ج ۵ ص ۷۶ کتاب الجهاد)

(ترجمہ) "یعنی دار الحرب میں مجاہد کے لیے ناخن بڑھانا باوجودیکہ ناخنوں کا کٹوانا ایک فطری امر ہے، مندوب اور مستحب ہے کیونکہ دوران جنگ وجہاد اگر اس کے پاس اسلحہ نہ ہو اور دشمن اس کے بالکل قریب ہو تو ناخنوں کے ذریعہ بھی وہ اپنے دشمن کو دفع کر سکتا ہے، اور اس کی نظیر مونچھوں کو ترشوانا ہے کیونکہ یہ سنت ہے، پھر غازی کے لیے دار الحرب میں مونچھوں کا بڑھانا مستحب ہے تاکہ اس سے اُس کے مقابل دشمن پر رعب اور دھاک بیٹھ جائے ۔ حاصل کلام یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو کہ مجاہد وغازی کے لیے جہاد میں ممد ومعاون ثابت ہو تو وہ مندوب اور مستحب ہے اس لیے کہ اس میں مسلمانوں کا وقار اور مشرکین کی تذلیل وتوہین ہے۔"

ان تصریحات کی موجودگی میں یہ بات بالکل عیاں ہے کہ مسلمانوں کے لیے ہر قسم کا اسلحہ اور جنگی ساز و سامان دشمن کے مقابلے کے لیے تیار رکھنا فرض اور ضروری ہے تاکہ جہاد کے وقت ان کی توجہ اسلحہ کی تیاری پر نہ ہو۔

آلات حرب یا عسکری قوت کو ضائع کرنے یا ان کو منجمد کرنے پر وعیدیں

جس مسلمان ملک کے پاس یہ آلات حرب (اور وہ بھی جدید ترین شکل میں) ہوں، ان آلات کو ضائع کرنے یا استعمال میں نہ لانے کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: عن عقبة بن عامر قال سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول من علم الرمي ثم تركه فليس منا او قد عصى ۔ (صحیح مسلم ج ۲ ص ۱۴۳ باب فضل الرمي والحث ۔ کتاب الجهاد)

(ترجمہ) "حضرت عقبہ بن عامرؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے

آپؐ نے فرمایا کہ جس کسی نے تیر اندازی سیکھی اور پھر اس کو چھوڑ دیا تو وہ ہم میں سے نہیں یا وہ گنہگار رہتا ہے۔"

مندرجہ بالا حدیث کے ذیل میں شارح مسلم امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :۔

"ھٰذا تشدید عظیم فی نسیان الرمی" بعد علمہ ومکروہ کراھۃ شدیدۃ من ترکہ بلا عذر۔ (صحیح مسلم ج ۲ ص ۱۴۳ باب فصل الرمی والحث۔ کتاب الجھاد)

اور اس حدیث کی تشریح میں ملا علی قاری حنفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں "جس نے تیر اندازی سیکھی اور پھر اس کو چھوڑ دیا تو وہ ہم میں سے نہیں، گویا اس نے اس میں کوئی نقص دیکھا اور اس کے ساتھ استہزاء کیا اور یہ صورتیں کفران نعمت کے زمرے میں آتی ہیں، شراح حدیث نے اس نعمت کو نعمت خطیرہ سے تعبیر کیا ہے۔" (مرقاۃ ج ۷ ص ۳۱۴ باب اعداد آلۃ الجھاد)

اور یہی حدیث ایک اور روایت میں یوں بیان کی گئی ہے "من تعلم الرمی ثم نسیہ فھی نعمۃ جحدھا" (مجموعۃ الفتاوٰی لابن تیمیۃ ج ۲۸ ص ۹ الجھاد)

مختصراً ان احادیث مبارکہ کی روشنی میں یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ جس طرح اعداد آلات حرب مسلمانوں کے لیے ضروری اور لازمی ہے اسی طرح فن عسکری کو سیکھ کر اس کو ترک کرنا، اسے بھول جانا انتہائی لائق ملامت امر ہے جس کی طرف امام نوویؒ اور ملا علی قاریؒ نے بصراحت تنبیہ کی ہے۔ موجودہ حالات اور زمانے کے تناظر میں دیکھا جائے تو ایک مسلمان ملک کے پاس جو قوت اور طاقت ہو جس سے دشمنان اسلام مرعوب ہوتے ہوں اس طاقت اور قوت کو ختم کرنا یا اس کو استعمال میں نہ لانا یا اس کو منجمد کرنا اسی وعید کے ضمن میں آتے ہیں۔

علامہ برہان الدین المرغینانیؒ نے حرمت اکل لحم فرس (یعنی گھوڑے کے گوشت کی حرمت) کی ایک علت یہ بھی لکھی ہے کہ: "ویکرہ لحم الفرس عند ابی حنیفۃؒ ..... ولانہ آلۃ ارھاب العدو فیکرہ اکلہ احتراماً لہ ولھذا یضرب لہ بسھم فی الغنیمۃ ولانہ فی اباحتہ تقلیل آلۃ الجھاد۔" (الھدایۃ علی صدر فتح القدیر ج ۸ ص ۴۲۰، ۴۲۱ کتاب الجھاد)

یعنی امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک گھوڑے کا گوشت کھانا مکروہ ہے (اس کی ایک علت یہ ہے) کہ دشمن کے ڈرانے دھمکانے اور مرعوب کرنے کا آلہ ہے اس لیے اس کے احترام کی وجہ سے اس کا کھانا مکروہ (تحریمی) ہے اور اسی احترام و عظمت کی بناء پر مال غنیمت میں گھوڑے کا مستقل حصہ ہے۔ (اور دوسری علت یہ ہے) کہ اس کی اباحت کی صورت میں آلۂ جہاد کی

تقلیل ہوتی ہے۔"

کفار اور غیر مسلموں کے دباؤ میں آکر ایٹمی صلاحیت اور عسکری قوت کو منجمد یا اس میں تخفیف کرنے کے متعلق کسی بین الاقوامی معاہدے پر دستخط کرنے کے بارے میں ان نصوصِ قطعیہ سے استدلال کیا جا سکتا ہے، ارشادِ ربانی ہے :۔

فَلَا تُطِعِ الْكَافِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ۔ (سورۃ الفرقان آیت ۵۲)

(ترجمہ) "سو تو کہنا مت مان منکروں کا اور مقابلہ کر ان کے ساتھ بڑے زور کا۔"

دوسری جگہ اللہ فرماتے ہیں : وَلَا تَرْكَنُوْا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ۔ (سورۃ ہود ۱۱۳)

(ترجمہ) "اور مت جھکو ان کی طرف جنہوں نے ظلم کیا پھر تم کو لگے گی آگ۔"

ایک اور فرمانِ ربانی ہے کہ : وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَاَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيْلُوْنَ عَلَيْكُمْ مَيْلَةً وَّاحِدَةً۔ (سورۃ النساء آیت ۱۰۲)

(ترجمہ) "کافر چاہتے ہیں کہ کسی طرح تم بے خبر ہو جاؤ اپنے ہتھیاروں سے اور اسباب سے تاکہ تم پر حملہ کریں یکبارگی۔"

ان نصوص میں تدبر کرنے سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پوری شد و مد کے ساتھ مسلمانوں کو ہر وقت کفار کے مقابلے میں تیار رہنے کا حکم دیا ہے اور کفار کی طرف معمولی میلان کو بھی موجب دخولِ نار ٹھہرایا ہے۔ اب اگر ہمارے مسلم حکمران یہود و ہنود اور نصاریٰ کے دباؤ میں آکر اس رسوائے زمانہ معاہدہ (سی ٹی بی ٹی) پر دستخط کرتے ہیں تو لازمی طور پر ان نصوصِ قطعیہ اور ارشاداتِ ربانیہ کی خلاف ورزی ہوگی۔

وہ معاہدہ جو مسلمانوں کے مفادات کے منافی ہو اس کی پابندی ضروری نہیں

اگر تخفیفِ اسلحہ کے متعلق کوئی بین الاقوامی معاہدہ موجود ہو اور اس کا کنٹرول بھی کفار کے ہاتھ میں ہو تو کیا اس صورت میں مسلمان اس معاہدہ کے پابند ہیں؟ سو اس بارے میں سب سے پہلے جب ہم قرآن کریم کی طرف رجوع کرتے ہیں تو مندرجہ ذیل آیات سامنے آتی ہیں : (۱) يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكَافِرِيْنَ اَوْلِيَاءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۔ (سورۃ النساء آیت ۱۴۴)

(ترجمہ) "اے ایمان والو! نہ بناؤ کافروں کو اپنا رفیق مسلمانوں کو چھوڑ کر کیا لیا چاہتے ہو اپنے اوپر اللہ کا صریح الزام۔" (۲) وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَاءٍ

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَائِنِينَ ۝ (سورۃ الانفال آیت ۵۸)۔ (ترجمہ) "اور اگر تم کو ڈر ہو کسی قوم سے دغا کا تو پھینک دو ان کا عہد ان کی طرف اسی طرح پر کہ ہو جاؤ تم اور وہ برابر، بیشک اللہ کو خوش نہیں آتے دغا باز"۔ یعنی اگر آپ کو کسی قوم معاہد سے خیانت اور عہد شکنی کا اندیشہ پیدا ہو جائے تو ان کا عہد ان کی طرف اسی صورت میں واپس کر دیں کہ آپ اور وہ برابر ہو جائیں کیونکہ اللہ خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ (معارف القرآن ج۴ ص۲۶۹ سورۃ الانفال)

یہود و نصاریٰ کے ساتھ دوستی کی ممانعت

ارشاد باری تعالیٰ ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ إِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ۝ فَتَرَى الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ يُسَارِعُونَ فِيهِمْ يَقُولُونَ نَخْشَىٰ أَنْ تُصِيبَنَا دَائِرَةٌ فَعَسَى اللّٰهُ أَنْ يَأْتِيَ بِالْفَتْحِ أَوْ أَمْرٍ مِنْ عِنْدِهِ فَيُصْبِحُوا عَلَىٰ مَا أَسَرُّوا فِي أَنْفُسِهِمْ نَادِمِينَ ۝ (سورۃ المائدہ آیت ۵۱، ۵۲) ـــ (ترجمہ) "اے ایمان والو! مت بناؤ یہود و نصاریٰ کو دوست، وہ آپس میں دوست ہیں ایک دوسرے کے، اور جو کوئی تم میں سے دوستی کرے ان سے تو وہ انہیں میں ہے، اللہ ہدایت نہیں کرتا ظالم لوگوں کو۔ اب تو دیکھے گا ان کو جن کے دل میں بیماری ہے ڈر کر ملتے ہیں ان میں کہتے ہیں کہ ہم کو ڈر ہے کہ نہ آجائے ہم پر گردش زمانہ کی، سو قریب ہے کہ اللہ جلد ظاہر فرما دے فتح یا کوئی امر اپنے پاس سے تو لگیں اپنے جی کی چھپی بات پر پچھتانے"۔

علامہ ابوبکر الجصاص الرازیؒ اس آیت کے ضمن میں تحریر کرتے ہیں کہ: "ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے کفار کی دوستی اور ان کے اذلال سے منع فرمایا اور ان کی اہانت اور اذلال کا حکم فرمایا اور ان سے مسلمانوں کے (اجتماعی) کاموں میں امداد لینے سے منع فرمایا ہے کیونکہ اس میں ان کی عزت اور برتری ہے۔ (احکام القرآن ج۳ ص۱۲۳)

ان آیات سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ سی ٹی بی ٹی اور این پی ٹی پر دستخط کرنے اور اس کے لیے راہ ہموار کرنے اور اس سلسلے میں تعاون کرنے کی صورت میں جو لوگ کفار اور یہود و نصاریٰ کے ساتھ دوستی کا جو مظاہرہ کرتے ہیں ان کا حشر کفار اور یہود و نصاریٰ کے ساتھ ہی ہوگا، لہٰذا حکومت کو چاہیئے کہ اس معاہدہ پر دستخط کی صورت میں عقل و ہوش سے کام لے اور اس انجام بد سے اپنے آپ کو بچائے۔ نیز سی ٹی بی ٹی پر دستخط کرنے کے حامیوں کا یہ کہنا کہ دستخط نہ کرنے کی صورت میں یہ

یہ ہو جائے گا وہ ہو جائے گا، اس کو ان آیات میں عذرِ لنگ قرار دیا گیا ہے۔

تخفیفِ اسلحہ کے اس معاہدے (سی ٹی بی ٹی) پر دستخط کرنے کی صورت میں کفّار کی طرف سے امداد کے وعدے

تخفیفِ اسلحہ کے اس معاہدے (سی ٹی بی ٹی) پر دستخط کرنے کی صورت میں کفّار کی طرف سے مالی امداد و تحفظات کا وعدہ کیا گیا ہے، اس کے برعکس اعداد آلاتِ حرب کے متعلق جو آیتِ کریمہ ہم نے ذکر کی ہے کہ "وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ" تو اس آیت کے آخر میں فرمانِ ربانی ہے: "وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ" اس میں غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان جہادی سامان پر جتنا بھی خرچ کریں گے اس کے متعلق خدائی وعدہ ہے کہ "یوف الیکم" یعنی وہ خرچ تم مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے پورا پورا دیا جائے گا بغیر کسی کمی کے۔ گویا یہ آیتِ کریمہ تصریح ہے اس بات پر کہ اگر اعداد آلاتِ حرب پر آپ کا کچھ خرچ ہوا ہو اور ضرور ہوتا ہے تو اس کا انتظام اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔

اب اقتصادی پابندیوں کے خوف سے سی ٹی بی ٹی یا این پی ٹی پر دستخط کرنا گویا اللہ کے وعدے سے انحراف ہے۔ اسی طرح دیگر بھی کئی آیتیں ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے لیے اپنی عزت و وقار کو مجروح کر کے کفار سے استعانت لینا صحیح نہیں، جیسا کہ فرمانِ الٰہی ہے:

(۱) يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا۔ (آل عمران ۱۱۸)

ترجمہ: "اے ایمان والو! نہ بناؤ بھیدی کسی کو اپنوں کے سوا وہ کمی نہیں کرتے تمہاری خرابی میں۔"

علامہ ابوبکر الجصاص الرازی رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: "وفی هذه الآية دلالة علىٰ انه لا تجوز الاستعانة باهل الذمة فی امور المسلمين من العمالات والكتبة" (احکام القرآن جلد۲ ص۳۴ سورۃ آلِ عمران)

اسی آیت یعنی لا تتخذوا بطانة میں اس بات کی دلیل ہے کہ مسلمانوں کے اجتماعی کاموں اور ملازمتوں میں کفار اہلِ ذمہ سے امداد لینا جائز نہیں ہے۔

(۲) اسی طرح دوسری آیتِ کریمہ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰى اَوْلِيَآءَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ۔ (سورۃ النساء آیت ۵۱) میں بھی اس چیز کی وضاحت کر دی گئی ہے۔

اس آیت کے ذیل میں علامہ ابوبکر الجصاص الرازیؒ فرماتے ہیں کہ: "ان آیات میں حق تعالیٰ نے کفار کی دوستی اور ان کے اعزاز سے منع فرمایا ہے اور ان کی اہانت و اذلال کا حکم دیا ہے

اور ان سے مسلمانوں کے (اجتماعی) کاموں میں امداد لینے سے منع فرمایا ہے کیونکہ اسی میں ان کی عزت اور برتری ہے۔" (احکام القرآن جلد ۳ ص ۱۲۳ سورۃ النساء)

ارشادِ ربانی ہے: الذین یتخذون الکافرین اولیاء من دون المؤمنین ایبتغون عندھم العزۃ فان العزۃ للہ جمیعًا۔ (سورۃ النساء آیت ۱۳۹)۔ (ترجمہ) "جو لوگ مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق بناتے ہیں کیا وہ ان کے ذریعے قوت وعزت چاہتے ہیں (وہ یاد رکھیں کہ) قوت وعزت تو ساری کی ساری اللہ کے لیے ہے، یعنی قوت وعزت اللہ تعالےٰ کے قوانین میں عمل کرنے سے حاصل ہوتی ہے"۔

مندرجہ بالا تصریحات اور نصوص کی رُو سے کفار سے امداد طلب کرنا اور ان کے ساتھ دوستی کرنا اس خاطر سے کہ اس میں ہماری عزت ہے بالکل صحیح نہیں، اور یہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ مسلمان ممالک نے جن کافر ملکوں کے ساتھ جتنے بھی معاہدے کئے ہیں انہوں نے ایفائے عہد کا خیال نہیں رکھا، پاکستان اور عربوں کے کافروں کے ساتھ ہونے والے معاہدے ہمارے سامنے ہیں جن سوائے خسارے کے اور کچھ ہمارے ہاتھ نہیں آیا۔

علامہ ابوبکر الجصاص رازیؒ مذکورہ بالا آیت کے ضمن میں لکھتے ہیں: "وھذا یدل علی انہ غیر جائز للمؤمنین الاستنصار بالکفار علی غیرھم من الکفار اذا کان متی غلبوا کان حکم الکفر ھو الغالب وبذلک قال اصحابنا"۔ (احکام القرآن ج ۲ ص ۳۵۲ سورۃ النساء)

فتویٰ کا خُلاصہ اور حاصل

مذکورہ بالا دلائل جو قرآن کریم کی صریح آیات، سنتِ نبویؐ کی واضح ہدایات، مفسرین، محدثین اور فقہاء امت کی تشریحات پر مشتمل ہیں اور جن پر تمام فقہی مکاتب کا اجماع ہے، سے حسب ذیل امور ثابت ہوتے ہیں:۔

(۱) اعداء اسلام کی جارحیت اور اسلامی ممالک کی حفاظت اور دفاع کیلئے ہر قسم کا فوجی سازوسامان، آلاتِ حرب کی تیاری اور اس میں شب وروز ترقی اور دشمن کے ارھاب کے لیے اعداد آلاتِ جہاد فرضِ عین ہے، یہاں تک کہ اسلام کے اساسی عبادات مثلاً نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج کی فرضیت محدود اوقات اور مقدار سے وابستہ ہیں، مگر دشمن کے مقابلہ کی تیاری غیر محدود، غیر مقید، غیر مؤقت اور تمام ممکنہ استطاعتوں سے وابستہ ہے جسے اللہ نے وَاَعِدُّوا لَھُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ (الآیۃ) میں بیان فرمایا ہے۔

(ب) دشمنانِ اسلام کے کسی دباؤ اور ترغیب و ترہیب میں آکر ایسا کوئی اقدام یا معاہدہ ہرگز جائز نہیں جس سے فوجی اور حربی تیاریوں میں تعطل پیدا ہو یا اس میں کمی آسکتی ہو یا تیار شدہ حربی سازوسامان کے استعمال کو منجمد کیا جا سکتا ہو یا حربی ٹریننگ، مشق اور تربیت کو نقصان پہنچ سکتا ہو یا اس میں کمی آسکتی ہو یا ان سارے امور پر کسی قسم کی قدغن لگ سکتی ہو۔

(ج) سی ٹی بی ٹی اور این پی ٹی کی شکل میں زیر بحث معاہدہ میں یہ سارے خطرات، خدشات اور گوناگوں پابندیاں موجود ہیں اس لحاظ سے اس پر کسی بھی مسلمان ملک کیلئے بشمول پاکستان کے دستخط کرنا یا اس کی تحریری اور زبانی کسی قسم کی تائید اور اتفاق کی از روئے قرآن وسنت و اجماع اُمت ہرگز اجازت نہیں، اگر کسی بھی مسلم حکومت کا سربراہ، وزیر اعظم یا ممبر پارلیمنٹ یا کوئی عام شہری اس کی موافقت اور تائید کرتا ہے تو وہ قرآن وسُنت اور اللہ و رسول کے واضح احکام کی صریح مخالفت اور ان احکام سے کھلی بغاوت کا مرتکب ہے۔ ایسے لوگوں کو اپنے دین، عقیدہ اور ایمان کی خیر منانی چاہیئے، جان بوجھ کر ایسا کرنے والے ملک و ملت کے غدار ہیں کہ اس طرح وہ ملک کی آزادی، سالمیت اور خودمختاری سلب کرانے جیسے قبیح جرم کے مرتکب ہوں گے۔ از روئے شرع ایسی صورت میں پوری قوم کو دینی، ملی اور قومی جُرم کے مُرتکب حکمرانوں کے خلاف ہر قسم کی جدوجہد نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہوگی۔

كتاب
الدعوى
والقضاء

البينة على المدعى
واليمين على من انكر

کتاب الدّعوٰی والقضاء

(دعویٰ اور قضاء کے احکام و مسائل)

قاضی کے علم پر فیصلے کا حکم

سوال:۔ کیا قاضی اپنے علم پر کسی مقدمہ کا فیصلہ کرسکتا ہے؟

الجواب:۔ شریعتِ مطہرہ نے فیصلے کا جو طریقۂ کار وضع کیا ہے اور جو قواعد و ضوابط مرتب کیے ہیں قاضی فیصلے کرنے میں ان کا پابند ہے، لہٰذا قاضی یا تو مدعی کے گواہوں پر فیصلہ کرے گا اور اگر گواہ موجود نہ ہوں تو مدعا علیہ کی قسم پر فیصلہ کرے گا، اس طریقے کے مطابق فیصلہ کرنے میں قاضی پر کوئی تہمت وغیرہ لازم نہیں آتی اور فریقین بھی مطمئن ہو جاتے ہیں۔ اگر قاضی کو یقینی طور پر کسی فریق کے متعلق معلومات حاصل ہوں کہ یہ حق پر ہے تو اگرچہ متقدمین علماء نے ان یقینی معلومات کے حصول پر قاضی کو فیصلے کا اختیار دیا ہے لیکن معاشرہ میں بگاڑ پیدا ہونے کے سبب چونکہ دورِ حاضر میں قاضیوں پر وہ اعتماد باقی نہیں رہا جو متقدمین کے دور میں تھا اس لیے متاخرین علماء کرام نے قاضی کو تہمت کے اندیشہ سے محفوظ رہنے اور مقضی علیہ کو اطمینان دلانے کی خاطر قاضی کے اپنے علم پر فیصلہ کرنے کو ناجائز قرار دیا ہے۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ: والفتوٰی علیٰ عدمہ فی زماننا کما نقلہ فی الاشباہ عن جامع الفصولین وقید بزماننا لفساد القضاۃ فیہ واصل المذھب الجواز۔

(رد المحتار ج۴ ص۳۸۳ کتاب القضاء، مطلب فی حکم القاضی بعلمہ) [1]

قاضی کا مدعی یا مدعیٰ علیہ کے ہاں قیام کرنے کا حکم

سوال:۔ کیا قاضی مدعی یا مدعیٰ علیہ کے ہاں قیام کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ قضاء کا منصب چونکہ بڑا نازک اہمیت کا حامل ہے اس لیے شریعت نے

---

[1] قال العلامۃ ابن نجیمؒ: ورجح فی جامع الفصولین قول محمد قال وینبغی ان یفتیٰ بہ لما علم من احوال قضاۃ زماننا ثم نقل ان محمداً قال لا یقضی القاضی بعلمہ ثم نقل عن عیون المذاھب ان بقولہ یفتی۔ (البحر الرائق ج۶ ص۲۵۸ کتاب القضاء)

ومثلہٗ فی الاشباہ والنظائر ج۲ ص۳۳۶ کتاب القضاء والشھادۃ والدعاوی۔

تفصیل کے ساتھ اس کے آداب بیان کیے ہیں، دراصل ان تمام آداب کا مقصد یہ ہے کہ قاضی تہمت سے محفوظ رہے تاکہ اس کا وقار معاشرہ میں قائم رہے، اس لیے شریعت نے قاضی کیلئے ہر اس فعل سے اجتناب کرنا لازمی قرار دیا ہے جس کے صدور سے قاضی کے وقار پر حرف آتا ہے اور فریقین کے اعتماد کے اٹھنے کا ذریعہ بنتا ہو، چونکہ مدعی یا مدعیٰ علیہ کے ہاں قیام کرنے سے قاضی پر تہمت لازم آنے کا اندیشہ ہے جس کی وجہ سے اس پر اعتماد باقی نہیں رہے گا جو کہ قضا کے باب میں مطلوب ہے اس لیے قاضی کے لیے کسی ایک فریق کے ہاں قیام کرنا جائز نہیں۔

کما فی الهندیة: فاما اذا کانت لصاحب الدعوة خصومة لا یجیب دعوته وان کانت بینهما قرابة او مباسطة قبل القضاء۔ (الفتاویٰ الهندیة ج۳ ص۳۳۱ الباب التاسع فی رزق القاضی) [1]

مدعی اور مدعیٰ علیہ کا قاضی کے تعین میں اختلاف کا حکم

سوال:۔ مدعی اور مدعیٰ علیہ دونوں مختلف علاقوں سے تعلق رکھتے ہیں، ایک متنازعہ مسئلہ میں مُدعی اپنے علاقے کے قاضی سے فیصلہ کرانا چاہتا ہے اور مدعیٰ علیہ اپنے علاقہ کے قاضی سے، تو اس صورت میں کون سے علاقے کے قاضی کو ترجیح دی جائے گی؟

الجواب:۔ جب مدعی اپنے حق کے حصول کے لیے کسی پر دعویٰ کرتا ہے تو مدعی کو حق دیتے وقت بظاہر مدعا علیہ کو نقصان اٹھانا پڑتا ہے اس لیے اس کو اطمینان دلانا بھی ضروری ہے تو شرعی دائرہ اختیار میں رہتے ہوئے اس کو جس قاضی کے پاس جانے سے اطمینان حاصل ہوتا ہے تو اس کو وہاں مقدمہ چلانے کا اختیار حاصل ہے لہٰذا اگر مدعی اور مدعا علیہ میں قاضی کے بارے میں اختلاف پیدا ہو جائے تو مفتیٰ بہ قول کے مطابق مدعا علیہ کی رائے کو ترجیح حاصل ہوگی۔

لما قال العلامة بدر الدین محمد بن اسماعیل الشهیر بابن قاضی سماوةؒ: وان کان من المحلتین فاراد المدعی ان یخاصمه الی قاضی محلته وابىٰ الآخر قال ابویوسفؒ

---

[1] قال العلامة الحصکفی رحمه الله: ولا یجیب دعوة خصم وغیر معتاد ولو عامة للتهمة۔ (الدر المختار ج۴ ص۳۴۷ کتاب القضاء، مطلب فی حکم الهدیة للمفتی)
ومِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۷ ص۲۸۱ کتاب العاریة۔

العبرة للمدعی قال محمد لا بل للمدعیٰ علیہ وبہ یفتی۔ (جامع الفصولین ج ۱ ص ۲۱ الفصل التاسع والثلاثون فی المتفرقات) [1]

فیصلے کو ماننے سے انکار کرنے پر جرمانہ وصول کرنے کا حکم

سوال:۔ فریقین کے مابین فیصلہ کرتے وقت ثالث نے دونوں فریقوں سے پانچ پانچ کلاشنکوف اپنے پاس رکھیں اور شرط یہ لگائی کہ فیصلہ کا اختیار دینے کے بعد جو کوئی بھی فریق فیصلہ ماننے سے انکار کرے تو اس کی کلاشنکوف بطور جرمانہ ضبط کرلی جائیں گی، دونوں فریقوں نے اس وقت یہ شرط قبول کرلی، چنانچہ فیصلے کے بعد ایک فریق نے فیصلہ ماننے سے انکار کردیا جس کی وجہ سے اس کی پانچ کلاشنکوف ضبط کرلی گئیں، تو کیا اس طرح فیصلے سے انکار کرنے پر جرمانہ وصول کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جب فریقین نے خوشی سے ثالث کو فیصلے کا اختیار دیا تو ثالث کا فیصلہ اگر شرعی اصول کے منافی نہ ہو تو اس سے انکار کرنا جائز نہیں بلکہ اس فیصلے کا ماننا فریقین پر لازم ہے اس لیے کہ ایسے فیصلے سے انکار ایک غیر شرعی امر ہے اور کسی غیر شرعی امر کے ارتکاب پر جرمانہ وصول کرنا جائز ہے اگرچہ اصل مذہب عدم جواز کا ہے لیکن معاشرہ میں برائیوں کے انسداد کے لیے چونکہ شرعی طریقے سے تعزیرات کا نظام مفقود ہے اور برائیوں کا انسداد ضروری ہے اس لیے اگر کوئی ایسی طاقت اور قوت موجود نہ ہو جس سے جرائم کا انسداد ہوسکے اور تعزیر بالمال سے اس کا انسداد ہوسکتا ہو تو ایسی صورت میں معاشرہ کی اصلاح کی خاطر امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے قول پر فتویٰ دینا زیادہ مناسب ہے۔

لما قال العلامة طاهر بن عبد الرشيد البخاری رحمہ اللہ:۔ قال المصنف سمعت من ثقة ان التعزير باخذ المال ان رأى القاضی او الوالی جاز ومن جملة ذلك رجل

---

[1] قال العلامة سليم رستم بن باز اللبنانی: اذا طلب احد الخصمين فی البلدة التی تعدد حكامها المرافعة فی حضور حاكم وطلب الآخر المرافعة فی حضور حاكم آخر ووقع الاختلاف بينهما على هذا الوجه يرجح الحاكم الذی اختاره المدعىٰ عليه۔
(شرح مجلة الاحكام المادة ۱۸۰۳ ص ۱۱۷۱ الكتاب السادس عشر فی القضاء۔ الفصل الثالث فی وظائف الحاكم)
ومثلہ فی تنقيح الحامدية ج ۱ ص ۳۱ كتاب القضاء۔ باب هل العبرة بقاضی المدعی الخ۔

لا یحضر الجماعة یجوز تعزیره باخذ المال۔ (خلاصۃ الفتاوٰی ج۴ ص۳۴۴ کتاب الحدود، الفصل الاول) [۱]

حکومت کی طرف سے مقرر کردہ جج کی شرعی حیثیت

سوال:۔ کیا دور حاضر میں حکومت کے مقرر کردہ جج یا مجسٹریٹ شرعی قاضی کا قائم مقام ہو سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب:۔ قاضی کا تقرر دراصل لوگوں کے تنازعات حل کرنے کے لیے ہوتا ہے ان تنازعات کو حل کرنے کے لیے شریعت نے باقاعدہ حدود بیان کی ہیں، اسی طرح منصبِ قضاء پر فائز ہونے کے لیے بھی کچھ شرائط عائد کی ہیں اس لیے اگر ان شرائط کی رعایت رکھتے ہوئے حکومتِ وقت جس کو بھی مسلمانوں کے تنازعات ختم کرانے کے لیے جج یا مجسٹریٹ مقرر کرے تو وہ شرعی قاضی کے قائم مقام ہوگا۔ چونکہ قاضی لوگوں کے تنازعات حل کرنے کے بارے میں وکیل کی حیثیت رکھتا ہے اور حکومت کو اس بارے میں اختیار حاصل ہے کہ اس کام کے لیے جس کو بھی چاہے مقرر کر سکتی ہے، لیکن اس میں یہ ضروری ہے کہ جج شرعی اصول کے موافق ہو اور اس کے فیصلے شرعی قواعد کے خلاف نہ ہوں۔

قال العلامة سلیم رستم باز: الحاکم وکیل من قبل السلطان فی اجراء المحاکمة والحکم۔ (شرح مجلة الاحکام۔ المادة ۱۸۰۰ ص۱۱۶۲ الکتاب السادس عشر، الفصل الثالث)

اہلِ بدعت کا اعلیٰ منصب پر فائز ہونے کا حکم

سوال:۔ کیا اہلِ بدعت جو کہ اعتقادی فاسق ہیں، میں سے کسی کو رؤیتِ ہلال کمیٹی کا چیئرمین بنانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اعلیٰ منصب (کلیدی اسامی) پر کسی عادل اور پابندِ شریعت شخص کو مقرر کرنا

---

[۱] قال العلامة الزیلعی رحمه الله: عن ابی یوسف ان التعزیر باخذ الاموال جائز للامام۔ (تبیین الحقائق ج۳ ص۲۰۷ باب حد القذف، فصل فی التعزیر)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۵ ص۴۱ باب حد القذف، فصل فی التعزیر۔

[۲] قال العلامة الکاسانی: کل مایخرج به الوکیل عن الوکالة یخرج به القاضی عن القضاء۔ (بدائع الصنائع ج۷ ص۱۶ کتاب آداب القاضی، فصل فی بیان مایخرج به الوکیل)

وَمِثْلُهٗ فی الاحکام السلطانیة ص۶۵ فی ولایة القضاء۔

حکومتِ وقت کی ذمہ داری ہے کیونکہ عادل اور نیک آدمی کے تقرر کے بغیر لوگوں کو ان کے حقوق کا تحفظ فراہم کرنا دشوار ہے، اور رؤیتِ ہلال کمیٹی کے چیئرمین کے ساتھ تو دینی امور کا خاص تعلق ہے، تو جو شخص خود بدعات کے ارتکاب کی وجہ سے شرعی حدود سے تجاوز کرتے ہوئے فسق وفجور میں مبتلا ہو وہ دوسرے مسلمانوں کی عبادات کے تحفظ کا کیا لحاظ رکھے گا، اس لیے حکومت کے لیے مناسب نہیں کہ عادل اور پابندِ شریعت لوگوں کے ہوتے ہوئے اہلِ بدعت میں سے کسی کو اس منصب پر فائز کرے، تاہم جب حکومت نے اس کو مقرر کیا ہو تو دینی امور میں اس کا حکم شرعی قواعد کے تحت نافذ العمل ہوگا جیسا کہ فاسق کا حکم نافذ العمل ہوگا۔

لما قال العلامة المرغيناني رحمه الله: والفاسق اهل للقضاء حتى لو قلد يصح الا انه لا ينبغي ان يقلد كما في حكم الشهادة۔ (الهداية ج۳ ص۱۳۲ كتاب ادب القاضي) [۱]

مدعیٰ علیہ قسم سے انکار کر دے تو فیصلہ مدعی کے حق میں ہوگا

سوال:۔ جب مدعی اپنے دعویٰ پر گواہ پیش نہ کر سکے تو مدعیٰ علیہ پر قسم لازم آتی ہے لیکن اگر مدعیٰ علیہ قسم کھانے سے انکار کر دے تو فیصلہ کس کے حق میں ہوگا؟

الجواب:۔ جب شرائط شرعی کے تحت مدعی کا دعویٰ قاضی کے ہاں سماعت کیلئے منظور ہو جائے تو مدعیٰ علیہ پر مدعی کا جواب دینا واجب ہے کہ یا تو مدعی کے حق کا اقرار کرے یا انکار، اگر مدعیٰ علیہ مدعی کے حق سے انکار کرے تو مدعی پر لازم ہے کہ گواہ پیش کرے اگر مدعی گواہ پیش کرنے سے عاجز ہو جائے تو پھر مدعیٰ علیہ پر قسم لازم آئے گی اور اگر مدعیٰ علیہ قسم کھانے سے انکار کرے تو اس پر مدعی کا حق لازم ہو جائے گا اور فیصلہ مدعی کے حق میں ہوگا۔

لما قال العلامة المرغيناني رح: واذا نكل المدعىٰ عليه عن اليمين قضى عليه بالنكول والزمه ما ادعىٰ عليه۔ (الهداية ج۳ ص۲۰۲ باب اليمين، كتاب القضاء) [۲]

---

[۱] قال العلامة ابن عابدينؒ: والوجه تنفيذ قضاء كل من ولاه سلطان ذو شوكة وان كان جاهلاً فاسقاً وهو ظاهر المذهب عندنا وحينئذٍ فيحكم بفتوىٰ غيره۔ (رد المحتار ج۴ ص۳۳۳ كتاب القضاء)

ومِثْلُهٗ فی جامع الفصولين ج۱ ص۱۶ الفصل التاسع والثلاثون فی المتفرقات۔

[۲] قال العلامة الحصكفيؒ: وقضى القاضي عليه بنكوله مرةً لنكوله فی مجلس القاضي حقيقةً۔

(الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۴ ص۴۲۷ كتاب الدعوىٰ)

ومِثْلُهٗ فی مجلة الاحكام۔ المادة ۱۸۲۱ ص۱۱۰۶ كتاب الدعوىٰ، الباب الثانی۔

جج کا ثالث کے فیصلے پر فیصلہ سنانے کا حکم

سوال:۔ فریقین نے کسی تنازعہ کے تصفیہ کے لیے ثالث مقرر کیا، ثالث کے فیصلے کے بعد وہ مقدمہ عدالت میں پیش کیا گیا جج نے چھان بین کے بعد بعینہٖ ثالث کے فیصلے کے مطابق فیصلہ سنایا، تو کیا جج کے لیے ثالث کے فیصلہ پر فیصلہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جب فریقین تنازعہ کے تصفیہ کے لیے باہمی رضامندی سے کسی کو ثالث مقرر کرتے ہیں تو وہ جو بھی فیصلہ کرے فریقین پر نافذ ہوتا ہے، جب اس کا فیصلہ عدالت میں پیش کیا جائے تو ثالث کا فیصلہ اگر شرعی قواعد وضوابط کے عین مطابق ہو تو جج کے لیے یہ فیصلہ توڑنا جائز نہیں کیونکہ اس کے توڑنے میں فریقین کا فائدہ نہیں بلکہ انتشار کا سبب بن سکتا ہے البتہ اگر اس کا فیصلہ کسی مختلف فیہ امر میں ہو اور وہ جج کی رائے کے موافق ہو تو پھر جج کے لیے اس کا توڑنا مناسب نہیں اور اگر جج کی رائے کے خلاف ہو تو جج اپنی رائے کے مطابق اس میں تغیر وتبدل کا اختیار رکھتا ہے اس لیے مذکورہ صورت میں اگر ثالث کا فیصلہ جج کی رائے کے موافق ہو تو جج اس فیصلے کو مدار بنا کر اس پر اپنا فیصلہ سنا سکتا ہے۔

لما قال العلامة ابوبکر بن مسعود الکاسانیؒ: ومنها انه اذا حکم فی فصل مجتهد فیه ثم رفع حکمه الی القاضی ورأیه یخالف رأی الحاکم المحکم له ان یفسخ حکمه۔ (بدائع الصنائع ج۷ ص۳ کتاب القضاء فصل فی بیان من یصلح للقضاء) [1]

دعویٰ کے اثبات کے لیے تحریری ثبوت پیش کرنے کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے اپنی زندگی میں اپنی جائیداد سے ایک مکان اپنے بیٹے پر فروخت کیا اور مکان کا اسے قبضہ بھی دے دیا، اس کے مرنے کے بعد دوسرے ورثاء نے اس مکان میں شرکت کا دعویٰ کیا اور اپنے دعویٰ کے اثبات کیلئے میت کی طرف سے باقاعدہ وصیت نامہ پیش کیا جس میں مکان ورثاء میں تقسیم کیا گیا ہے، تو کیا

---

[1] قال العلامة سلیم رستم باز اللبنانیؒ: ان قضی المحکم فی فصل مجتهد فیه ثم رفع حکمه الی قاض مولی من السلطان امضاه ان وافق مذهبه لانه لا فائدة فی نقضه۔
(شرح مجلة الاحکام، المادة ۱۸۴۹ ص۱۱۹۹ الباب الرابع)
ومثله فی خلاصة الفتاوی ج۴ ص۲۹ کتاب القضاء۔ الفصل الرابع۔

اس تحریری وصیت نامہ کے تحت دوسرے ورثاء کے حق میں فیصلہ ہوسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ از روئے شریعت جو دستاویزات تغیر و تبدل سے محفوظ ہوں ان کو اعتبار دے کر اس پر فیصلہ کیا جاسکتا ہے لیکن موجودہ حالات میں چونکہ مکر و فریب نے معاشرہ میں اکثر لوگوں کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے جس کی وجہ سے سچے اور جھوٹے کاغذات میں تمیز مشکل ہوگئی ہے اس لیے اگر تحریری معاہدہ پر باقاعدہ گواہ موجود ہوں تو اس کو اعتبار دیا جائے گا ورنہ نہیں۔ صورتِ مرقومہ میں جو لوگ مکان میں شرکت کا دعویٰ کرتے ہیں اور اپنے دعویٰ کے اثبات کیلئے تحریری وصیت نامہ پیش کرتے ہیں اگر وہ اس پر گواہ پیش کرتے ہیں تو پھر اس وصیت نامہ کی شرعی حیثیت ہوسکتی ہے اور فریقین کے دعویٰ کی چھان بین کے بعد فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔

لما قال العلامة سليم رستم بازؒ:۔ ولا يعمل بالخط والختم وحدهما الا اذا كان سالماً من شبهة التزوير والتصنيع فيعمل به يعني انه يكون مداراً للحكم ولا يحتاج الى الثبوت بوجه آخر۔ (شرح مجلة الاحكام، المادة ۱۷۳۶ صـ۱۰۹۰ الباب الثاني)[1]

مدعی کا مدعیٰ علیہ سے مقدمہ کا خرچہ لینے کا حکم

سوال:۔ مقدمہ جیتنے کی صورت میں مدعی عدالت کا خرچہ مدعیٰ علیہ سے لے سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جب مدعی اپنے حق کے حصول کے لیے عدالت میں دعویٰ دائر کرتا ہے تو عدالت کا عملہ اس کے حق کے احیاء کیلئے مصروفِ عمل ہوتا ہے تو اس کا تمام تر فائدہ مدعی کو ہی پہنچتا ہے اور عدالت کی اشیاء کا استعمال اس کے فائدہ کے لیے ہوتا ہے اس لیے ان اشیاء کا خرچہ مدعی پر عائد ہوتا ہے، کیونکہ فقہاء نے لکھا ہے کہ قاضی کو اختیار ہے اگر وہ مقدمہ کے رجسٹرڈ وغیرہ کا خرچہ مدعی سے وصول کرنا چاہے تو وصول کرسکتا ہے، جب عدالت کا خرچہ مدعی پر آتا ہے تو مدعیٰ علیہ کو اس کا ضامن ٹھہرانا اور اس سے خرچہ وصول کرنا

---

[1] قال العلامة ابن عابدينؒ:۔ فالحاصل ان المدار على انتفاء الشبهة ظاهراً وعليه فما يوجد في دفاتر التجار في زماننا اذا مات احدهم وقد حرر بخطه ما عليه في دفتره الذي يقرب من اليقين انه لا يكتب فيه على سبيل التجربة والهزل يعمل به۔ (تنقيح الفتاوى الحامدية ج ۲ صـ۲۱ كتاب الدعوى)
ومثله في تقريرات الرافعي ج ۲ صـ۹۲ كتاب الدعوى۔

شرعاً جائز نہیں ہے۔

کمافی الهندیة: وعلیٰ هذا الصحیفة التی یکتب وفیها دعوی المدعین وشهادتهم ان رأی القاضی ان یطلب ذٰلك من المدعی فله ذٰلك۔ (الفتاویٰ الهندیة ج ۳ ص۳۳۰ الباب التاسع فی رزق القاضی) [1]

حاکمِ وقت کا مملوکہ زمین قاضی کو بطور عطیہ دینے کا حکم

سوال:- چار بھائیوں کی مشترکہ جائیداد ایک نواب نے کسی قاضی کو بطورِ عطیہ دے دی، قاضی نے اس جائیداد پر باضابطہ قبضہ کیا اور باقاعدہ نفع حاصل کرتا رہا، مذکورہ نواب کا اقتدار ختم ہوتے ہی ان بھائیوں نے حکومت سے اپنی جائیداد کی واپسی کا مطالبہ کیا عدالت میں تقریباً سترہ (۱۷) سال مقدمہ جاری رہنے کے بعد فیصلہ دو بھائیوں کے حق میں ہوا اور باقی دو بھائیوں کو محض اس وجہ سے اپنے حق سے محروم رکھا کہ انہوں نے نواب کو دستخط کر دیئے تھے۔ اب یہ مشترکہ اور غیر منقسم جائیداد قاضی کے قبضہ میں ہے، مذکورہ بھائیوں نے قاضی سے جائیداد کی واپسی کا مطالبہ کیا لیکن اس نے انکار کر دیا اور کہا کہ چونکہ یہ میرے قبضہ میں ہے اور مذکورہ نواب نے مجھے دی ہے اس لیے یہ میرا ہی حق ہے۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا قاضی کے لیے ایسی زمین پر قابض رہنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: شریعت نے حاکم صرف اس جائیداد سے عطیات دینے کا حق دیا ہے جو کسی کی مملوکہ نہ ہو اور جو جائیداد پہلے ہی سے کسی کی ملکیت چلی آ رہی ہو اس کا کوئی کسی کو بطور عطیہ یا انعام دینا جائز نہیں، اس لیے مذکورہ نواب نے اپنی حکومت میں جو مملوکہ زمین قاضی کو دی ہے اس پر قاضی کی ملکیت ثابت نہیں ہوتی اور خاص کر جب مذکورہ نواب کی حکومت ختم ہونے پر حکومت نے مالکوں کے حق میں فیصلہ کیا ہو تو یہ جائیداد اصل مالکوں کو واپس کی جائے گی قاضی کے لیے اس پر بے جا قبضہ کرنا جائز نہیں بلکہ یہ غصب کے حکم میں ہوگا، اس لیے اگر قاضی کے تصرفات کی وجہ سے اس زمین کو نقصان پہنچا تو اس کی ذمہ داری قاضی پر عائد ہوگی۔

---

[1] قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ: واذا اراد القاضی ان یکتب السجل و یأخذ علیٰ ذٰلك اجراً یاخذ منه مقدار ما یجوز اخذه لغیره۔ (خلاصة الفتاویٰ ج ۴ ص۷)

ومثله فی منحة الخالق علیٰ هامش البحر الرائق ج ۶ ص۲۷۹ کتاب القضاء الفصل الثانی۔

لما قال العلامة ابوبکر بن مسعود الکاسانیؒ: ولو غصب ارضاً فبنیٰ علیها اوغرس فیها لاینقطع ملک المالک ویقال للغاصب اقلع البناء والغرس وردّها فارغة لان الارض بحالها لم تتغیر ولم تصر شیئاً آخر۔ (بدائع الصنائع ج۷ ص۱۴۹ کتاب الغصب، فصل فی حکم الغصب) [۱]

ایک بھائی کی عدم موجودگی میں مشترکہ جائیداد کے فیصلے کا طریقۂ کار

سوال: بھائیوں کی آپس میں مشترکہ جائیداد تھی اس پر کسی شخص نے ملکیت کا دعویٰ کیا، اب ان بھائیوں میں سے ایک بھائی موجود نہیں تو کیا اس کی عدم موجودگی میں کوئی فیصلہ وغیرہ ہوسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: اگر غائب نے اپنی طرف سے کسی بھائی کو اپنی جائیداد کے تنازعہ کے متعلق مکمل اختیار دیا ہے تو وہ بھائی اس کی طرف سے وکیل بن کر باقاعدہ خصومت کرسکتا ہے اور اس کی موجودگی میں قاضی فیصلہ کرسکتا ہے، لیکن اگر اس نے اپنی طرف سے مکمل اختیار نہ دیا ہو تو پھر جو بھائی موجود ہے وہ شریک کی مانند ہو کر جن شرائط کے تحت ایک بھائی دوسرے شریک کی طرف سے خصم بن سکتا ہے انہی شرائط کے تحت ایک بھائی دوسرے بھائی کی طرف سے خصم بن سکتا ہے۔ اس لیے اگر یہ مشترکہ جائیداد بھائیوں کے قبضہ میں ہو، تقسیم نہیں کی گئی ہو اور ایک ہی سبب کے تحت سب بھائیوں کو اس پر ملکیت حاصل ہو تو جو بھائی موجود ہے اس کی موجودگی میں فیصلہ کیا جائے گا اور اگر ان شرائط میں سے کوئی شرط موجود نہ ہو تو پھر غائب کی عدم موجودگی میں فیصلہ جائز نہیں۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: انه ینتصب احدهم عن الباقین بشروط ثلاثة کون العین کلها فی یده وان لاتکون مقسومة وان یصدق الغائب انها ارث عن المیت۔ (ردالمحتار ج۴ ص۳۴۳ کتاب القضاء) [۲]

---

[۱] قال العلامة المرغینانیؒ: ومن غصب ارضاً فغرس فیها او بنیٰ قیل له اقلع البناء والغرس وردها وفیه ایضاً فان کانت الارض تنقص بقلع ذلک فللمالک ان یضمن له قیمة البناء وقیمة الغرس مقلوعاً ویکونان له۔ (الهدایة ج۳ ص۳۷۹ کتاب الغصب، فصل فیما یتغیر بفعل الغاصب) ـــ ومثله فی مجلة الاحکام، المادة ۹۰۵ ص۵۰۱ الفصل الثانی۔

[۲] قال العلامة قاضی سماوةؒ: کون المدعی شیئین بینهما لامحالة فی هذه الصور یحکم علی الغائب وفیه ایضاً وذکر عامة المشائخ ان السببیة تشترط فی ما کان المدعی شیئاً واحداً وهو الاشبه والاقرب الی الفقه۔ (جامع الفصولین ج۱ ص۵۵ الفصل الخامس فی القضاء علی الغائب الخ)

ومثله فی تنقیح الفتاوی الحامدیة ج۱ ص۳۱۳ کتاب القضاء۔

مکرہ کے اقرار پر فیصلے کا حکم

سوال:۔ ایک شخص پر اپنے باپ کے قتل کا دعویٰ کیا گیا، دعویٰ کے اثبات پر کوئی گواہ بھی پیش نہیں ہوا، صرف پولیس کے مظالم سے بچنے کی غرض سے مُدعیٰ علیہ نے اقرارِ جرم کیا، جب اسے عدالت میں پیش کیا گیا تو اس نے اپنے اقرار سے رجوع کرلیا، تو کیا پولیس کے سامنے اقرار کو مدار بنا کر اس شخص کو باپ کی میراث سے محروم کرنے کا فیصلہ صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قتل موانع میراث میں سے ہے اور باپ کو قتل کرنے سے بیٹا باپ کی میراث سے محروم ہو جاتا ہے لیکن اس شرط پر کہ قتل کا ثبوت شرعی قواعد وضوابط کے تحت ثابت ہو، اور قتل کے ثبوت کی دو صورتیں ہیں، ایک معائنہ کی شہادت کہ قتل پر چشم دید گواہ پیش ہو جائیں اور دوسری صورت اپنی مرضی سے قتل کا اقرار کرنا، چونکہ مذکورہ بالا صورت میں صرف پولیس کے مظالم سے بچنے کے لیے بیٹے نے باپ کے قتل کا اقرار کیا ہے اس لیے یہ شخص مکرہ کے اقرار کے حکم میں ہوگا، جس طرح مکرہ کا اقرار حجت نہیں ہوتا اسی طرح اس شخص کا اقرار بھی حجت نہیں لہٰذا اس شخص کو باپ کی میراث سے محروم کرنا جائز نہیں ہے۔

کما فی الھندیۃ: وکذا الرضا والطوع شرط حتی لایصح اقرار المکرہ کذا فی النہایۃ۔
(الفتاویٰ الھندیۃ ج۴ ص۱۵۶ کتاب الاقرار، الباب الاول) [۱]

شریک کی عدم موجودگی میں قاضی کے فیصلے کا جائزہ

سوال:۔ دو اشخاص کے درمیان ایک مشترکہ زمین تھی ایک شریک کی عدم موجودگی میں دوسرے پر کسی نے دعویٰ کیا اور اپنے دعویٰ پر گواہ بھی پیش کیے، قاضی نے شریک کی عدم موجودگی میں مدعی کے حق میں فیصلہ کر دیا، تو کیا جو شریک موجود ہے اس کو غائب کا نائب قرار دے کر اس پر فیصلہ کرنا درست ہے یا نہیں؟ اب غائب شریک واپس آگیا ہے اور دوبارہ دعویٰ کرنا چاہتا ہے تو کیا اس کا دعویٰ درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جو شریک حاضر ہے اگر زمین مذکورہ اس کے قبضہ میں ہو اور تقسیم نہ کی گئی ہو اور غائب شریک اس کا اعتراف بھی کرتا ہو کہ یہ زمین ہم دونوں میں مشترکہ ہے تو اس صورت میں

---

[۱] قال العلامۃ ابن نجیمؒ: اقرار المکرہ باطل۔ (الاشباہ والنظائر ج۲ ص۲۹۶ باب الاقرار۔
وَمِثْلُہٗ فی مجلۃ الاحکام، المادۃ ۱۵۷۵ ص۸۶۲ کتاب الاقرار۔ الباب الاول۔

جو شریک موجود ہے وہ دوسرے شریک کی طرف سے خصم بن سکتا ہے اور اس کو غائب کا نائب قرار دے کر اس کی موجودگی میں فیصلہ کرنا درست ہے، اگر ان شرائط کو ملحوظ رکھتے ہوئے قاضی نے فیصلہ کیا ہو تو یہ فیصلہ صحیح اور نافذ العمل ہوگا۔ اسی بناء پر اگر غائب واپس آجائے اور دوبارہ ملکیت کا دعویٰ کرے تو یہ دعویٰ درست نہیں لیکن اگر ان شرائط کی رعایت نہ کی گئی ہو تو جو شریک موجود ہے وہ غائب کی طرف سے خصم بننے کا اہل نہیں، اس لیے ایسی صورت میں اگر قاضی غائب کی عدم موجودگی میں فیصلہ کرے تو یہ فیصلہ صحیح نہیں تو جب وہ حاضر ہو جائے اور دوبارہ ملکیت کا دعویٰ کرنا چاہے تو اس کا دعویٰ درست ہے۔

لما قال العلامة التمرتاشی رحمہ اللہ: لا یقضی علی غائب ولا له الا بحضور نائبه حقیقة کوکیله ووصیه ومتولی الوقف۔

وفی الدر المختار: افاد الکاف عدم الحصر فان احد الورثة کذلك ینتصب خصما عن الباقین وکذا احد شریك الدین۔

وفی رد المحتار: انه ینتصب احدهم عن الباقی بشروط ثلاثة کون العین کلها فی یده وان لا تکون مقسومة وان یصدق الغائب انها ارث عن المیت۔

(تنویر الابصار علی هامش رد المحتار ج۴ ص۳۲۳ کتاب الحوالة)[1]

اقرار کے بعد مقروض کا قرض سے انکار اور اس پر ایک عدالتی فیصلے کا جائزہ

سوال:۔ ایک شخص نے کسی کو بارہ سو روپے (۱۲۰۰) بطور قرض دیئے اور اس شخص نے گواہوں کے سامنے بارہ سو (۱۲۰۰) روپے وصولی کا اقرار بھی کیا، جب قرض دینے والے شخص نے مقروض سے اپنی رقم کی واپسی کا مطالبہ کیا تو مقروض نے دو (۲) آدمی قرض کی ادائیگی میں مزید مہلت مانگنے کے لیے اس شخص کے پاس بھیجے چنانچہ وہ مزید مہلت دینے پر راضی ہو گیا، کچھ عرصہ کے بعد مقروض نے قرض واپس کرنے سے صاف انکار کر دیا، قرض خواہ

---

[1] قال العلامة قاضی سماوۃ: کون المدعی شیئین بینهما سببیة لا محالة فی هذه الصور یحکم علی الغائب وفیه ایضا وذکر عامة المشائخ ان السببیة تشترط فی ما لو کان المدعی شیئا واحدا وهو الاشبه والاقرب الی الفقه۔ (جامع الفصولین ج۱ ص۵۵ الفصل الخامس فی القضاء علی الغائب)

ومثله فی تنقیح الفتاوی الحامدیة ج۱ ص۳۱۳ کتاب القضاء۔

نے مجبور ہو کر عدالت میں دعویٰ دائر کر دیا اور مقروض کے اقرار پر باقاعدہ گواہ بھی پیش کئے لیکن اس کے باوجود جج نے مقروض کے حق میں فیصلہ سُنا دیا، کیا جج کا یہ فیصلہ صحیح ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ جب ایک عاقل بالغ شخص کسی کے حق کا اقرار کر لے تو وہ اپنے اقرار پر ماخوذ ہوتا ہے اور اس کے اقرار کے موافق اس پر ضمان لازم آتا ہے۔ مذکورہ صورت میں جب مقروض نے ایک دفعہ لوگوں کے سامنے بارہ ۱۲ سو روپے بطور قرض لینے کا اقرار کر لیا تو پھر قرض کی واپسی سے انکار جائز نہیں اور مزید برآں قرض کی ادائیگی کے لیے مزید مہلت مانگنے کے لیے دو آدمی قرض خواہ کے پاس بھیجنے سے قرض کے اقرار کی مزید تاکید ہوتی ہے اسلیے اگر قرض دہندہ نے مقروض کے اقرار پر گواہ پیش کیے ہوں تو ان گواہوں کے ہوتے ہوئے جج کا اس کے حق میں فیصلہ کرنا صحیح نہیں ۔

قال العلامة طاهر بن عبد الرشيد البخاريؒ : وكذا لو قال اخّرها عنّي او صالحني فاقرار۔
(خلاصة الفتاوىٰ ج ۴ ص ۱۴۱ كتاب الاقرار، الفصل الاول)[1]

باپ کو عدالتی سزا سے بچانے کے لیے اعترافِ جرم کرنے کا حکم

سوال:۔ ایک قتل میں باپ بیٹا دونوں شریک تھے عدالت نے جرم ثابت ہونے پر دونوں کو سزا کا مستحق قرار دیا لیکن بعد میں باپ کو بچانے کی خاطر بیٹے نے اعتراف کیا کہ میں نے مقتول کو اپنی بہن کے ساتھ قابلِ اعتراض حالت میں دیکھ کر قتل کیا لیکن میرا والد اس میں شریک نہیں تھا، اُس کے اِس بیان پر عدالت نے باپ کو سزا سے بری کر دیا اور بیٹے کو عمر قید کی سزا سُنادی، حالانکہ یہ واقعہ سراسر جھوٹ پر مبنی ہے۔ تو کیا بیٹے کے اس بیان پر باپ کو بری الذمہ قرار دینا صحیح ہے ؟

الجواب:۔ شریعتِ مطہرہ نے شہادت کو ہر قسم کے خطرات سے تحفظ دلانے کے لیے احتیاط پر مبنی زرّیں اصول مرتب کیے ہیں کیونکہ فیصلے کا اصل دار و مدار صحیح شہادت پر ہے، اس میں ذرہ برابر تغیّر و تبدّل سے فیصلے کی پوری نوعیت بدل جاتی ہے، اس لیے جہاں کہیں بھی

---

[1] قال العلامة ابن نجيمؒ : لو قال لى عليك الف فقال اتزنه او انتقدها او اجلني به او قضيتكه فهو اقرار۔ (البحر الرائق ج ۷ ص ۲۵۱ كتاب الاقرار۔
وَمِثْلُهٗ فى شرح المجلة (۸۵۸) ص ۱۰۶۲ الكتاب الثالث عشر فى الاقرار۔

اس میں شبہ کا احتمال موجود ہو تو شریعت نے ایسی شہادت کو غیر معتبر قرار دیا ہے۔ اس بناء پر جس شہادت میں بھی ذاتی منفعت یا باہمی قریبی رشتہ کی وجہ سے دوسرے کو منفعت دلانے کا تصور پایا جاتا ہو وہ شہادت مقبول نہیں، چونکہ باپ بیٹے کے منافع اکثر ایک ہوتے ہیں اس لیے ان دونوں کی گواہی ایک دوسرے کے حق میں قبول نہیں۔ صورتِ مذکورہ میں حسبِ بیان جب مجرم نے اعترافِ جرم کیا تو اس وجہ سے وہ سزا کا مستحق ہوا لیکن اس کے باپ کے بارے میں اس کی گواہی قبول نہیں لہٰذا بیٹے کے بیان پر باپ کو بری الذمہ قرار دینا صحیح نہیں۔

لما قال العلامة ابوالحسن علی بن ابی بکر المرغینانیؒ: ولا شہادۃ الوالد لولدہٖ وولد ولدہٖ ولا شہادۃ الولد لِاَبَوَیْہِ ولاجدادہٖ۔ (الہدایۃ ج۳ ص۱۶۱ باب من یقبل شہادتہ ومن لا یقبل) ؎

مُدعی کے بیانات میں تعارض کا جائزہ

سوال:۔ ایک شخص کی زمین اس کے چچا زاد بھائی کے زیرِ قبضہ تھی اور وہ اس سے فائدہ اٹھاتا رہا، بعد میں اس نے دعویٰ کیا کہ یہ زمین چونکہ دیہہ شاملات ہے اور اس کو میں نے آباد کیا ہے اس لیے اب یہ میری ہے، بعد میں اس نے دوبارہ یہ دعویٰ کیا کہ یہ زمین مجھے آباؤ اجداد سے ورثہ میں ملی ہے اس لیے یہ میری ملکیت ہے، ازروئے شرع اس شخص کی ملکیت کا دعویٰ صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ فقہاء کرام نے کسی دعویٰ کی صحت کے لیے یہ شرط قرار دی ہے کہ مُدعی کے بیانات کا آپس میں تناقض نہ ہو، اگر اس کے بیانات میں تناقض آجائے تو اس سے اس کا دعویٰ ساقط ہو جاتا ہے۔ صورتِ مسئولہ میں جب مدعی نے ایک دفعہ یہ بیان دیا کہ یہ زمین دیہہ شاملات ہے اور میں نے آباد کی ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ زمین پہلے سے کسی کی مملوکہ نہیں تھی بلکہ آباد کرنے سے یہ میری مملوکہ بن گئی ہے لیکن بعد میں جب اس نے یہ دعویٰ کیا کہ یہ

؎ قال العلامۃ طاہر بن عبد الرشید البخاری رحمہ اللہ: لا یجوز شہادۃ الرجل لولدہٖ ولا لوالدہٖ وان علیٰ من قبل الاب والأم ولحافدہٖ وان سفل۔
(خلاصۃ الفتاوٰی ج۴ ص۶۰ الفصل الثانی فی الشہادات)

وَمِثْلُہٗ فی مجلۃ الاحکام، المادۃ ۱۷۰۰ ص۱۰۲۳ الکتاب الخامس عشر، الفصل الثالث۔

مجھے آباؤ اجداد سے تقسیم میں ملی ہے تو اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ زمین پہلے سے میرے آباؤ اجداد کی مملوکہ ہے تو مدعی کے دونوں بیانات کا آپس میں تناقض ہے اس لیے اس کا دعویٰ صحیح نہیں۔

لما قال العلامة الکاسانیؒ: ومنها عدم التناقض فی الدعوٰی وهو ان لایسبق منه ما یناقض دعوٰه لاستحالة وجود الشئ مع ماینا قضه و ینافیه۔ (بدائع الصنائع ج۶ ص۲۲۳ کتاب الدعوٰی، فصل فی الشرائط المصححه للدعوٰی) ؎۱

ملک اور بیع کے دعویٰ میں فیصلہ بیع کے گواہوں پر ہوگا

سوال:۔ ایک شخص نے کسی پر سو ۱۰۰ کنال زمین فروخت کی اور کاغذات میں مشتری کا نام درج کر دیا اور اس کے عوض آٹھ سو ۸۰۰ روپے وصول کیے، بعد میں بائع نے دعویٰ کیا کہ میں نے آٹھ سو روپے صرف دس ۱۰ کنال زمین کے عوض وصول کیے ہیں اور باقی ۹۰ کنال بطور امانت دی تھی جبکہ مشتری یہ دعویٰ کرتا ہے کہ میں نے پوری سو ۱۰۰ کنال زمین کے آٹھ سو ۸۰۰ روپے ادا کیے ہیں، دونوں اپنے دعویٰ پر گواہ پیش کرتے ہیں، تو اس صورت میں کس کے گواہوں پر فیصلہ کیا جائے گا؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ میں مشتری بیع قطعی کا دعویٰ کرتا ہے اور بائع ملکیت کا دعویٰ کرتا ہے اور زمین چونکہ مشتری کے قبضہ میں ہے اس لیے مشتری ذو الید ہے اور بائع خارج، تو عام طور پر فقہاءؒ کے بیان کردہ اصول کے تحت خارج کے گواہ ذو الید پر مقدم ہوتے ہیں لیکن اگر ذو الید خارج سے شراء کا دعویٰ کرے تو پھر ذو الید کے گواہ خارج پر مقدم کیے جائیں گے، اور حسب بیان چونکہ مشتری ذو الید ہے اور شراء کا دعویٰ کرتا ہے اسلئے اگر طرفین اپنے اپنے دعویٰ پر گواہ پیش کریں تو مشتری کے گواہوں کو ترجیح دی جائے گی اور فیصلہ اس کے گواہوں کے موافق ہوگا۔

لما قال العلامة ابن نجیم المصریؒ: ولو برهن الخارج و ذو الید علی الشراء منه فذو الید احق۔ (البحرالرائق ج۷ ص۲۴۲ باب دعوی الرجلین) ؎۲

؎۱ قال العلامة سلیم رستم بازؒ:۔ التناقض یکون مانعا الدعوی الملکیة۔ (مجلة الاحکام، المادہ ۱۶۴۷ ص۹۵۹)
وَمِثْلُهٗ فی جامع الفصولین ج۱ ص۱۲۳ الفصل العاشر فی التناقض فی الدعوٰی۔

؎۲ قال العلامة المرغینانیؒ: وان اقام الخارج البینة علی الملك المطلق وصاحب الید البینة علی الشراء منه کان صاحب الید اولی۔ (الهدایة ج۳ ص۲۲۲ کتاب الدعوٰی)
وَمِثْلُهٗ فی مجلة الاحکام، المادة ۱۷۶۳ ص۱۱۳۲ کتاب الدعوٰی۔ الفصل الثانی۔

حدود بیان کیے بغیر زمین پر ملکیت کے دعویٰ کا حکم

سوال :۔ ایک شخص نے کسی پر دعویٰ کیا کہ میں نے اس سے سولہ کنال زمین خریدی ہے اور یہ میری ملکیت ہے، لیکن دعویٰ میں حدود بیان نہیں کیں، تو کیا حدود بیان کیے بغیر زمین کی ملکیت کا دعویٰ صحیح ہے یا نہیں ؟

الجواب :کسی بھی دعویٰ میں یہ ضروری ہے کہ مُدعی کو اپنے مُدعیٰ پر علم حاصل ہو اور اپنے حق کا تعین کر سکتا ہو، کیونکہ اگر مُدعیٰ ہی معلوم نہ ہو تو جہالت کی وجہ سے مُدعی کے حق کی تمیز اور اثبات مشکل ہوگا، چونکہ زمین میں حق کا تعین اور تمیز حدود کے بیان کرنے سے ہوتا ہے اس لیے فقہاءؒ نے زمین پر ملکیت کے دعویٰ میں حدود کا بیان کرنا شرط قرار دیا ہے کہ حدود کے بیان کیے بغیر زمین کی ملکیت کا دعویٰ صحیح نہیں، اس لیے مذکورہ صورت میں مُدعی جب تک اپنے دعویٰ میں زمین کی حدود بیان کرے اس وقت تک اس کا دعویٰ قابلِ سماعت نہیں ۔

لما قال العلامة ابن نجیمؒ : روان ادعیٰ عقارا ذکر حدودہ) لانہ لا تعذر التعریف بالاشارۃ لتعذر النقل فیصار الی التحدید وکما یشترط التحدید فی الدعویٰ یشترط فی الشھادۃ (البحرالرائق ج ۷ ص۱۹۷ کتاب الدعویٰ) [1]

فصل کے نقصان کی وجہ سے پڑوسی سے درخت کو جڑ سے کاٹنے کے مطالبہ کا حکم

سوال: ایک شخص کی زمین میں درخت ہے جس کی کچھ شاخیں پڑوسی کے کھیت کی طرف جھکی ہوئی ہیں جن کے سایہ سے اسکی فصل کو نقصان پہنچتا ہے، اب پڑوسی اس شخص سے درخت کو جڑ سے کاٹنے کا مطالبہ کرتا ہے تو کیا پڑوسی کا یہ مطالبہ صحیح ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ اسلام میں معاشرتی زندگی میں باہمی اُلفت و محبت کو بڑی اہمیت حاصل ہے کیونکہ اس محبت واُلفت کے بغیر پُرسکون زندگی کا تصور بھی محال ہے، اور یہ اُلفت و محبت صحیح طریقے سے تب قائم ہوسکتی ہے جب معاشرے کا ہر فرد دوسرے حقوق کا لحاظ رکھے اور ہر کوئی دوسرے

---

[1] قال العلامة التمرتاشی رحمہ اللہ : ویشترط التحدید فی دعویٰ العقار کما یشترط فی الشھادۃ علیہ ۔ (تنویر الابصار علی ھامش ردالمحتار ج ۴ ص ۴۶۹ کتاب الدعویٰ)
وَمِثْلُہٗ فی مجلۃ الاحکام ، المادۃ ۱۶۲۳ ص ۱۹۱ کتاب الدعویٰ۔

کو اذیت پہنچانے سے گریز کرے، اس لیے اگر کسی کے تصرفات سے دوسرے کے حقوق کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہو تو اسلام نے اس قسم کے تصرفات سے اس کو باز رہنے کی تاکید کی ہے، اس لیے مذکورہ صورت میں اگر درخت کی شاخوں سے پڑوسی کے کھیت کو نقصان پہنچتا ہو تو درخت کے مالک سے مطالبہ کیا جائے گا کہ اگر شاخ کو اوپر باندھنے سے پڑوسی کے نقصان کا ازالہ ممکن ہو تو مالک کو شاخیں باندھنے پر مجبور کیا جائے گا اور اگر باندھنے سے بھی نقصان دور نہ ہوتا ہو تو پھر مالک کو شاخیں کاٹنے پر مجبور کیا جائے گا البتہ درخت کو جڑ سے کاٹنے کا مطالبہ صحیح نہیں ہے۔

لما قال العلامة سلیم رستم بازؒ: من امتدت اغصان شجر بستانه الی دار جاره او بستانه فلجاره ان یکلفه تفریغ هوائه بالربط او القطع (شرح مجلة الاحکام، المادة ۱۱۹۶ ص ۶۵۶) [۱]

عاریۃً کسی کی زمین پر تصرفات کی وجہ سے استحقاق کا دعوی کرنا

سوال:- ایک قوم نے اپنی کچھ زمین حکومتِ افغانستان کو عاریۃً دی، حکومت نے اس زمین پر پولیس اسٹیشن (تھانہ) بنایا، تیس ۳۰ سال بعد اب ایک افغان کمانڈر نے اس زمین پر قبضہ کیا ہے اور وہ اس پر آبادی کرنا چاہتا ہے اور کہتا ہے کہ مجھے حکومت نے اس زمین پر آبادی کی اجازت دی ہے، از روئے شریعت اس زمین میں مذکورہ کمانڈر کے تصرفات جائز ہیں یا نہیں؟

الجواب:- جو زمین غیر مملوکہ ہو اس میں حاکمِ وقت کو تصرفات کا اختیار حاصل ہے اگر وہ اس زمین میں سے کسی کو کچھ دینا چاہے تو دے سکتا ہے لیکن جو زمین پہلے سے مملوکہ ہو حاکمِ وقت کو اصل مالک کی مرضی کے بغیر کسی کو دینا جائز نہیں۔ اس لیے مذکورہ صورت میں جب ایک قوم نے اپنی مملوکہ زمین حکومت کو عاریۃً دے دی تو اس زمین پر اُس قوم کی ملکیت برقرار ہے اور وہ جب بھی واپسی کا مطالبہ کرے زمین اُسے واپس کی جائے گی، لہٰذا کمانڈر مذکور کا اس زمین پر قبضہ کرنا اور اس میں آبادی کرنا جائز نہیں، اور جو آبادی وغیرہ کی ہو تو اُسے گرا کر زمین اصل مالکوں کو

---

[۱] قال الامام فخر الدین حسن بن منصورؒ: رجل له نخلة فی ملکه وخرج سعفها الی ارض جاره کان الجار ان یقطع ویفرغ هواء ملکه لان من ملک ارضاً ملک ما تحته الی الثری وما فوقه الی السماء فکان له ان یقطع وهذا اذا کان لایمکنه تفریغ الهواء الا بالقطع۔

(الفتاوی الخانیة علی هامش الهندیة ج۳ ص۱۰۳ باب الصلح فی العقار الخ)

واپس کی جائے گی۔

لما قال العلامة المرغینانی رحمہ اللہ: واذا استعار ارضاً لیبنی فیھا او لیغرس جاز وللمعیر ان یرجع فیھا ویکلفہ قلع البناء والغرس۔ (الھدایۃ ج۳ ص۲۸۱ کتاب العاریۃ) ؎۱

کسی کی مملوکہ زمین پر قبضہ کے متعلق فیصلہ کا حکم

سوال:۔ ایک شخص تیس ۳۰ سال قبل اپنی مملوکہ زمین میں تصرف کرتا رہا، کسی عذر کی وجہ سے اسے وطن چھوڑ کر باہر جانا پڑا، اس کی عدم موجودگی میں اس کے تین چچازاد بھائیوں نے اس میں تصرّف شروع کردیا، جب یہ شخص واپس آیا تو اس نے اچھے تعلقات کی وجہ سے ان کو تصرف سے نہیں روکا، اب تقریباً دس ۱۰ سال سے وہ زمین پر قابض ہیں اور زمین واپس کرنے سے انکار کرتے ہیں، مالک کے پاس زمین کی ملکیت پر باقاعدہ گواہ موجود ہیں، تو فیصلہ کس کے حق میں ہوگا؟

الجواب:۔ مدتِ مدید تک غیر کی مملوکہ زمین محض تصرف کی وجہ سے کسی کی ملک میں نہیں آسکتی بلکہ ملکیت کے لیے باقاعدہ اسباب مقرر ہیں، ان اسباب میں سے کسی بھی سبب کی عدم موجودگی میں کسی چیز پر ملکیت کا تصور ہی ناممکن ہے اس لیے اگر مالک شہادتِ شرعیہ سے اپنی ملکیت ثابت کرے تو اس کو اپنی زمین واپس کی جائے گی، صورتِ مسئولہ میں چچازاد بھائیوں نے اس پر جبراً قبضہ کر رکھا ہے یہ سب غاصب ہیں اور غاصب پر مغصوبہ چیز کی واپسی لازم ہے۔ اگر انہوں نے زمین میں تصرفات کی وجہ سے اس کو کوئی نقصان پہنچایا ہو تو اس کی ذمہ داری ان پر عائد ہوگی۔

لما قال العلامۃ المرغینانی رحمہ اللہ: ومن غصب ارضاً فغرس فیھا او بنیٰ قیل لہ اقلع البناء والغرس وردھا (وفیہ ایضاً) فان کانت الارض تنقص بقلع ذلک فللمالک ان یضمن لہ قیمۃ البناء وقیمۃ الغرس مقلوعاً ویکونان لہ۔ (الھدایۃ ج۳ ص۳۷۹ کتاب الغصب) ؎۲

؎۱ قال العلامۃ سلیم رستم باز رحمہ اللہ: استعارۃ الارض لغرس الاشجار وللبناء علیھا صحیحۃ لکن للمعیر ان یرجع عن الاعارۃ متی شاء فاذا رجع لزم المستعیر قلع الاشجار ورفع البناء۔ (مجلۃ الاحکام، المادۃ ۸۳۱ ص۱۶۰م)
ومثلہ فی خلاصۃ الفتاوٰی ج۲ ص۱۹۲ کتاب العاریۃ۔

؎۲ قال العلامۃ الکاسانی رحمہ اللہ: ومن غصب ارضاً فبنیٰ علیھا او غرس فیھا لا تنقطع ملک المالک ویقال للغاصب اقلع البناء والغرس وردھا فارغۃ لان الارض بحالھا لم تتغیر ولم تصر شیئاً آخر۔ (بدائع الصنائع ج۷ ص۱۴۹ کتاب الغصب فصل حکم الغصب) ــــ ومثلہ فی مجلۃ الاحکام، المادۃ ۹۰۵ ص۵۰۱ الکتاب الثامن۔ الفصل الثانی)

مدعی کا زمین کا مالک ہونا ضروری نہیں

سوال :- ایک آدمی کافی مدت سے کسی کی زمین پر قابض ہے اور مالک کو باقاعدہ اجارہ دیتا ہے، دریں حالات کسی نے اس زمین کے کچھ حصہ پر قبضہ کرلیا، مزارع نے جب دعویٰ کیا تو مدعیٰ علیہ نے چھوڑنے سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ زمین تمہاری نہیں ہے اس لیے میں تمہیں فصل کا حصہ نہیں دوں گا، مالک اگر دعویٰ کرے تو دیکھا جائے گا۔ کیا ایسے حالات میں مزارع کا یہ دعویٰ درست ہے یا نہیں ؟ اور مدعیٰ علیہ رفع سے انکار میں کہاں تک حق بجانب ہے ؟

الجواب : صورتِ مسئولہ میں مزارع کا دعویٰ درست ہے اور جب تک زمین پر مزارع تصرّف کررہا ہو تو اس کو دعویٰ کرنے کا حق حاصل ہے اور مدعیٰ علیہ کا اس سے جان چھڑانا بے سود ہے۔

لما قال العلامة سليم رستم باز: ولكن اذا غصب الوديعة او المستعار او الماجور او المرهون فللوديع والمستعير والمستاجر والمرتهن ان يدعى بها على الغاصب وحده ولا يلزم حضور المالك۔ وليس للمالك ان يدعى بها وحده مالم يحضر هؤلاء (شرح مجلة الاحكام، المادة ١٦٣٧ ص ٩٤١ الفصل الثالث)[1]

زمین کے نامعلوم حصہ پر ملکیت کے دعویٰ کا حکم

سوال :- ایک آدمی کسی کی مملوکہ زمین کے کچھ حصہ کی ملکیت کا دعویٰ کرتا ہے کہ اس زمین میں میرا حصہ ہے اور اپنے دعویٰ پر گواہ بھی پیش کرتا ہے کہ اس زمین کا کچھ حصہ میرے والد نے مالکِ زمین کو دیا ہے، لیکن نہ تو اس کو مقدار معلوم ہے اور نہ حدودِ اربعہ، جبکہ مالکِ زمین اس کی ملکیت سے انکار کرتا ہے، تو کیا اس شخص کا دعویٰ صحیح ہے یا نہیں ؟

الجواب :- فقہاءِ کرام نے کسی دعویٰ کی صحت کے لیے جو شرائط بیان کی ہیں ان میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ مُدعی جس چیز پر ملکیت کا دعویٰ کرتا ہو وہ چیز معلوم ہو، اگر مجہول ہو تو پھر اس پر دعویٰ کرنا صحیح نہیں کیونکہ اگر مدعیٰ بہ مجہول ہو تو پھر اس پر نہ تو صحیح شہادت قائم ہوسکتی ہے اور نہ

---

[1] لما في الهندية : اذا ادعى رجل دارا في يدي رجل انها في اجارتي آجرفيها فلان وادعى ذواليد انها في اجارتي آجرنيها فلان آخر تسمع دعوى المدعي وينتصب صاحب اليد خصماً۔
(الفتاوى الهندية ج۴ ص ۱۳۷ الباب الخامس فيمن يصلح خصماً لغيره)
ومثله في خلاصة الفتاوى ج۴ ص ۸۴ كتاب الدعوى۔

صحیح فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔ صورتِ مسئولہ میں چونکہ مدعی کو نہ تو مدعیٰ بہ کی مقدار معلوم ہے اور نہ حدودِ اربعہ، جبکہ زمین کے دعویٰ میں حدودِ اربعہ بیان کرنا ضروری ہے اس لیے اس آدمی کا دعویٰ قابلِ سماعت نہیں۔

قال العلامة الحصكفيؒ: معلومية المال المدعىٰ اذ لا يقضى بمجهول ولا يقال مدعىٰ فيه وبه الا ان يتضمن الاخبار۔ (الدر المختار على صدر رد المحتار ج۴ ص۴۶۷ كتاب القضاء)[1]

عاریہ پر لی ہوئی زمین سے معیر کو تنگ کرنے کیلئے مستعیر کا درخت نہ کاٹنے کے متعلق فیصلہ

سوال:۔ ایک شخص نے اپنی زمین کسی کو بطور عاریہ دی ہے اُس نے زمین میں درخت لگائے اور پھر بیچ دیئے لیکن زمین واپس ہونے کے باوجود صرف تنگ کرنے کی غرض سے نہ تو خود درخت کاٹتا ہے اور نہ مشتری کو کاٹنے دیتا ہے جس کی وجہ سے زمین کو نقصان پہنچ رہا ہے، اس بارے میں فیصلہ کس طرح کیا جائے گا؟

الجواب:۔ چونکہ عاریت پر زمین دینے والا اس زمین کا مالک ہے اور اپنی زمین میں ہر قسم کے تصرف کا حق رکھتا ہے، تو جس طرح کسی کو زمین عاریہ پر دینے کا اُسے اختیار ہے اسی طرح اسی زمین کو کسی سے واپس لینے کا بھی اس کو اختیار حاصل ہے، جب بھی وہ اپنی زمین کی واپسی کا مطالبہ کرے تو بے چون وچرا اُسے زمین واپس کرنا مستعیر کی ذمہ داری ہے اس لیے عاریہ پر دینے والے کو تنگ کرنے کی غرض سے اپنے لگائے ہوئے درختوں کو چھوڑ دینا جائز نہیں اسلئے اُسے درخت کاٹنے پر مجبور کیا جائے گا۔

كما قال العلامة سليم رستم بازؒ: استعارة الارض لغرس الاشجار والبناء عليها صحيحة لكن للمعير ان يرجع عن الاعارة متى شاء فاذا رجع لزم المستعير قلع الاشجار ورفع البناء۔ (مجلة الاحكام، المادة ۸۳۱ ص۱۶۰ الفصل الثانى فى احكام العارية وضمانها)[2]

---

[1] قال العلامة ابوبكر الكاسانيؒ: ومنها ان يكون المدعىٰ معلوماً لتعذر الشهادة والقضاء بالمجهول (بدائع الصنائع ج۶ ص۲۲۲ كتاب الدعوىٰ فصل لشرائط المصححة للدعوىٰ)

وَمِثْلُهٗ فى مجلة الاحكام، المادة ۱۶۱۹ ص۱۹۱ الباب الاول، الفصل الاول فى شرط صحة الدعوىٰ۔

[2] قال العلامة برهان الدين المرغينانى رحمه الله: واذا استعار ارضاً ليبنى فيها او ليغرس جاز وللمعير ان يرجع فيها ويكلفه قلع البناء والغرس۔

(الهداية ج۳ ص۲۸۱ كتاب العارية)

وَمِثْلُهٗ فى مجمع الضمانات، النوع الثالث ضمان العقار ص۶۶۔

والد کا عقد بیع کی اجازت سے انکار کے متعلق فیصلہ کا حکم

سوال :- ایک شخص کا سسر کراچی میں مقیم تھا اس نے اپنے داماد کو زمین کا کچھ حصہ مکان تعمیر کرنے کے لیے دینا چاہا لیکن اس نے یہ کہہ کر زمین لینے سے انکار کر دیا کہ جب تک سسر بیع قطعی پر مجھے زمین نہیں دیتے میں اس پر مکان تعمیر نہیں کروں گا، کچھ عرصہ بعد اس کا بیٹا کراچی سے آیا اور بہنوئی سے کہا کہ مجھے والد نے مکمل اختیار دیا ہے اور اجازت نامہ بھی پیش کیا ہے، اس لیے اگر آپ بیع قطعی پر زمین لینا چاہیں تو میں دینے کو تیار ہوں، چنانچہ بہنوئی نے دس ہزار روپے کے عوض زمین خرید لی اور بیع نامہ تحریر کیا جب سسر واپس آیا تو لوگوں نے اس کو اکسایا جس پر اس نے بیع پر زمین دینے سے انکار کر دیا، کیا از روئے شرع سسر زمین واپس لینے کا حق رکھتا ہے یا نہیں ؟

الجواب :- بشرط صحت سوال اگر واقعی والد نے اپنے بیٹے کو بیع کی اجازت دی ہو تو بیع نافذ ہے اور والد کو بیع رد کرنے کا اختیار نہیں لیکن مشتری کو اس پر گواہ پیش کرنے ہوں گے کہ واقعی والد نے بیٹے کو بیع کی اجازت دی تھی، اگر مشتری اس پر گواہ پیش نہ کر سکے تو اس کے مطالبہ پر بائع کے والد کو قسم دی جائے گی اگر اس نے قسم سے انکار کیا تو بیع نافذ ہو کر اس کو واپسی کا حق نہیں اور اگر وہ قسم کھائے تو پھر بیع فضولی کے حکم میں ہو کر والد کی اجازت پر موقوف ہے اگر وہ اجازت نہیں دیتا تو بیع نافذ نہیں۔

اخرج الامام البیہقیؒ: فکتب ابن عباسؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لو یعطی الناس بدعواھم لادعیٰ رجال اموال قوم ودماءھم ولکن البینة علی المدعی والیمین علی من انکر۔ (رواہ البیہقی ج ۱۰ ص۲۵۲ کتاب الدعوٰی) [1]

مشترکہ چشمہ پر ملکیت کے دعوٰی کے متعلق فیصلہ

سوال :- دو اشخاص کے مابین مشترکہ زمین تھی جس میں بعض حصہ بنجر اور بعض قابلِ کاشت تھا، دونوں اس سے فائدہ اٹھاتے رہے، اس زمین کے قریب پانی کا ایک چشمہ تھا جس سے

---

[1] وذکر الامام مسلمؒ: عن عمرو ابن شعیب عن ابیہ عن جدہ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: البینة علی المدعی والیمین علی المدعیٰ علیہ۔ (صحیح مسلم ج ۲ ص۷۴ کتاب الدعوٰی)
ومثلہٗ فی الھدایة ج ۳ ص۲۰۳ کتاب الدعوٰی۔

زمین سیراب ہوتی تھی، اب ان میں سے ایک شخص نے اس چشمہ پر ملکیت کا دعویٰ کیا ہے، کیا ایک جاری چشمہ پر ملکیت کا دعویٰ کرنا صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ چونکہ جاری پانی کے ساتھ عام لوگوں کے حقوق وابستہ ہوتے ہیں، تو اگر اس پر کسی کی ملکیت تسلیم کر لی جائے یا کسی کے زیرِ قبضہ رکھا جائے تو اس میں لوگوں کے حقوق تلف ہونے کا اندیشہ ہے، اس لیے شریعتِ مطہرہ نے لوگوں کے حقوق کے تحفظ کی خاطر ہر ایک کو اس سے فائدہ اٹھانے کا برابر اختیار دیا ہے اور کسی کو بھی ملکاً قبضہ کرنے کی اجازت نہیں دی، لہٰذا حسبِ بیان مذکورہ بالا صورت میں یہ شخص نہ اپنے شریک کو چشمہ سے روک سکتا ہے اور نہ اس پر ملکیت کا دعویٰ کر سکتا ہے۔

اخرج الامام ابو داؤدؒ: عن رجل من مہاجرین من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: غزوت مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم ثلاثا اسمعہ یقول المسلمون شرکاء فی ثلاث فی الماء والکلاء والنار۔ (ابوداؤد ج ۲ ص ۱۳۶ باب فی منع الماء) [1]

رنجش کی وجہ سے پانی کا قدیم راستہ روکنے کے متعلق فیصلہ

سوال:۔ دو بھائیوں نے اپنی مشترکہ زمین تقسیم کر کے ہر ایک نے اپنے حصہ پر قبضہ کیا، ایک بھائی نے اپنے حصہ کی زمین میں مکان بنایا اور تقریباً تیرہ ۱۳ سال اس میں رہا، بعد میں اس نے اپنا مکان کسی پر فروخت کر دیا، مشتری بھی تقریباً ۶ سال اس میں رہا اب اوّل مالک کے بھائی نے باہمی رنجش کی وجہ سے اس شخص کے مکان اور ساتھ والے دوسرے مکانات کے پانی کا راستہ بند کر دیا ہے، تو کیا کسی کی ملک میں ۶۶ سال سے قائم شدہ پانی کا راستہ کوئی بند کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جب مدتِ دراز سے لوگوں کے مکانات کے پانی کا راستہ قائم ہو تو ملک بدلنے سے اس میں تغیر نہیں آتی بلکہ ہر ایک کو دوسروں کے حقوق کی رعایت کرنی ہوگی تاکہ آپس میں الفت و محبت کی فضا قائم رہے، اگر ملک بدلنے سے ہر کوئی اس میں تصرف کرتا رہے کبھی

---

[1] قال العلامۃ سلیم رستم بازؒ: الماء والکلاء والنار مباحۃ والناس فی ھٰذہ الاشیاء الثلاثۃ شرکاء۔ (شرح مجلۃ الاحکام، المادۃ ۱۳۳۴ ص ۶۷۶ الباب الرابع فی شرکۃ الاباحۃ۔ الفصل الاول)
ومثلہٗ فی الھدایۃ ج ۴ ص ۴۸۳ کتاب الشرکۃ۔

بند کرے اور کبھی کھلا رکھے تو اس سے اہلِ محلہ کو تشویش لاحق ہوگی اور بے چینی کا شکار ہو جائیں گے، اس لیے اگر واقعی پانی کا یہ راستہ پہلے ہی سے قائم ہے تو پھر اس آدمی کو راستہ بند کرنے کا اختیار نہیں۔ اگر یہ معلوم نہ ہو کہ پانی کا یہ راستہ مدتِ دراز سے قائم ہے تو پھر مشتری اور دوسرے مکانات والوں کو گواہوں سے اسی راستے سے پانی گذارنے کا حق ثابت کرنا ہوگا۔

قال العلامة الحصکفیؒ: اذا کان لرجلٍ ارض وللاٰخر فیہا نہر واراد رب الارض ان لا یجری النہر فی ارضہ لم یکن لہٗ ذٰلک ویترک علیٰ حالہ۔

(الدر المختار علیٰ ہامش ردّ المحتار ج ۵ ص ۳۱۴ کتاب احیاء الموات)[1]

حصہ دار کی اجازت کے بغیر اس کی زمین فروخت کرنے کا حکم

سوال:۔ ایک قطعہ زمین مشترکہ شاملاتِ دیہہ ہے جس میں سرکاری کاغذات کی رُو سے تین سو افراد شریک ہیں، ان میں سے ایک شریک نے دیگر شرکاء کی اجازت کے بغیر زمین کسی پر فروخت کر دی، شرکاء کی بار بار تنبیہ کے باوجود مشتری نے اس زمین پر مکانات تعمیر کیے، اب دیگر شرکاء زمین خالی کرنے کا مطالبہ کر رہے ہیں کہ یہ ہماری ملکیت ہے جبکہ مشتری زمین خالی کرنے سے انکار کرتا ہے اُس کا کہنا ہے کہ یہ زمین چونکہ میں نے خریدی ہے اس لیے یہ میری ملکیت ہے، تو اس بارے میں اب فیصلہ کس طرح کیا جائے گا؟

الجواب:۔ اگر یہ قطعہ زمین جو کہ شاملاتِ دیہہ ہے حکومت کی طرف سے گاؤں کے لوگوں کو دی گئی ہو تو جن لوگوں کو اس میں حصہ دیا گیا ہے وہ سب اس کے مالک ہیں اس لیے یہ زمین ان سب کی مشترکہ ہوگی اور مشترکہ مال میں ہر ایک شریک دوسرے کے حصہ کے بارہ میں اجنبی کی حیثیت رکھتا ہے اور اجنبی شخص کسی کی مملوکہ زمین میں اس کی اجازت کے بغیر تصرف کا حق نہیں رکھتا اسلئے صورتِ مسئولہ میں شرکاء کی اجازت کے بغیر ان کے حصّہ کی زمین فروخت کرنا جائز نہیں، لہٰذا ان کے مطالبہ پر ان کے حصہ کی زمین خالی کرا کر ان کے حوالہ کی جائے گی۔

کما قال العلامۃ سلیم رستم بازؒ: کل من الشرکاء فی شرکۃ الملک اجنبی فی حصّۃ

---

[1] قال العلامۃ ابن نجیمؒ: رجل لہ ارض وللاٰخر نہر یجری فیہا فاراد رب الارض ان یمنع النہر ان یجری فی ارضہ لم یکن لہ ذٰلک۔ (البحر الرائق ج ۸ ص ۲۱۵ کتاب احیاء الموات)
وَمِثْلُہٗ فی مجلۃ الاحکام، المادۃ ۱۲۲۸ ص ۶۷۳ کتاب احیاء الموات۔

سائرهم فليس احدهم وكيلاً عن الآخر ولا يجوز له من ثم ان يتصرف في حصة شريكه بدون اذنه - (شرح مجلة الاحكام، المادة ۱۰۷۵ ص۶۰۱ الباب الاوّل في شركة الملك. الفصل الثاني)[1]

متوفّٰی بھائی کے بیٹوں کی موجودگی میں اسکی ذاتی جائیداد باپ کے ترکہ میں شامل کرکے تقسیم کرنے کا حکم

سوال :- ایک شخص فوت ہوگیا اور اس کے ورثاء میں چار بیٹے اور دو بیٹیاں رہ گئے، ان چار بھائیوں میں سے ایک نے والد کے ترکہ کے علاوہ ایک قطعہ زمین کسی اور شخص سے خریدا جو کہ کسی کی شرکت کے بغیر وہ زمین اس کی ملکیت میں آئی، والد کے ترکہ کی تقسیم سے قبل ہی وہ وفات پا گیا اور اس کے ورثاء میں ۲ معصوم بچے رہ گئے، مرحوم کے بیٹے جب بالغ ہوئے تو انہوں نے اپنے چچوں سے دادا کے ترکہ کی تقسیم کا مطالبہ کیا، اب تک ان کو اپنے والد کی اپنی زرِ خرید زمین کے بارے میں معلومات نہیں ہو سکیں اور نہ ہی کسی نے اس بارے میں انہیں بتایا لہٰذا دادا کے ترکہ کی تقسیم کے وقت وہ قطعہ زمین ایک چچا کے حصہ میں آ گیا، دادا کے ترکہ کے تین حصے کرکے مرحوم کا حصہ اس کے بیٹوں کو دے دیا گیا، تقسیم کے تقریباً ۱۲ سال بعد مرحوم کے بیٹوں کو معلوم ہوا کہ جو قطعۂ زمین ان کے فلاں چچا کے حصہ میں آ چکی ہے وہ ان کے باپ کی زرِ خرید اپنی ذاتی ملکیت تھی، اور اس درمیانی عرصہ میں ان کے چچا نے وہ زمین اپنے دوسرے بھائی پر فروخت کر دی، مرحوم کے بیٹوں کو جب علم ہوا تو انہوں نے دعویٰ کیا کہ جو زمین ہمارے والد کی زرِ خرید ملکیت ہے وہ ہمیں والد کے ترکہ میں دادا کے ترکہ کے علاوہ الگ ملنی چاہیئے۔

اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا شریعت کی رُو سے ان کا دعویٰ درست ہے؟ جبکہ مدعیٰ علیہم اس قطعہ زمین کے مُدعی کے والد کے ترکہ سے نہ ہونے اور دادا کے ترکہ سے ہونے کے قائل ہیں، مرحوم کے بیٹوں کے پاس ہر قسم کا ثبوت موجود ہے، اگر شہادت کی ضرورت پڑی تو گواہ کس کے معتبر ہونگے؟

الجواب :- محض مدتِ دراز کے گذرنے سے کسی کا حق باطل نہیں ہوتا خاصکر ایسی حالت میں جبکہ اس کو اپنے حق کا علم بھی نہ ہو اور لاعلمی کی صورت میں چاہے جتنی بھی تاخیر ہو جائے پھر سماعتِ دعوے

---

[1] قال العلامة الحصكفيؒ: وكل من شركاء الملك اجنبي في الامتناع عن تصرف مضر في مال صاحبه لعدم تضمنها الوكالة - (الدر المختار على هامش رد المحتار ج۳ ص۳۶۵ كتاب الشركة)
ومثله في بدائع الصنائع ج۶ ص۶۵ كتاب الشركة -

کے لیے مانع نہیں، چونکہ علم نہ ہونے کو فقہاء نے شرعی عذر قرار دیا ہے اور وراثت میں تو اطلاع کے باوجود بھی تاخیر ہو جانے سے دعویٰ کا حق ساقط نہیں ہوتا اس لیے صورتِ مسئولہ میں میت کے بیٹوں کا دعویٰ صحیح ہے۔

قال العلامة ابن عابدینؒ :- ویتخصص بزمان ومکان وخصومة حتی لو امر السلطان بعدم سماع الدعوی بعد خمسة عشر سنة فسمعها لم ینفذ الافی الوقف والارث ووجود عذر شرعی وبه افتی المفتی ابو السعود۔ (رد المحتار ج ۴ ص ۳۸۰ کتاب القضاء) [1]

جب دونوں کے پاس گواہ موجود ہوں تو میت کے بیٹے چونکہ قطعہ اراضی کے زرخرید ہونے کے مدعی ہیں اور ان کے چچا اس کے زرخرید ہونے کی نفی کرتے ہیں، اور دعویٰ میں جب اثبات اور نفی کا تقابل آجائے تو اثبات میں چونکہ زیادت کا معنیٰ پایا جاتا ہے اور زیادت کے گواہ چونکہ نقصان کے گواہ پر مقدم ہوتے ہیں اس لیے اثبات کے گواہوں کو نفی کے گواہوں پر ترجیح دی جائے گی اسلیے صورتِ مذکورہ میں میت کے بیٹوں کے گواہ مقدم ہوں گے اور فیصلہ ان کے گواہوں پر کیا جائے گا۔

لما قال العلامة الکاسانی رحمه الله : فالاصل فیه ان البینة المظهرة للزیادة اولیٰ۔
(بدائع الصنائع ج ۶ ص ۲۴۱ کتاب الشرکة) [2]

حکومت کی طرف سے دی گئی زمین پر فریقین کے دعویٰ ملکیت میں اختلاف کے متعلق فیصلہ

سوال :- افغان حکومت نے ۱۳۴۲ھ کو یہ فیصلہ کیا کہ جن لوگوں کے پاس زمین نہیں ہے حکومت انہیں زمین دے گی، ایک قوم نے کسی کی وکالت سے حکومت کو درخواست دی، حکومت نے درخواست منظور کرلی اور اس قوم کو مالکانہ حقوق کے ساتھ زمین دے دی گئی اور باقاعدہ اسناد جاری کی گئیں، ۱۹۸۴ء تک یہ قوم

---

[1] قال العلامة سلیم رستم باز : لاتسمع دعوی الدّین والودیعة والعقار المملوك والمیراث بعد ان ترکت خمس عشرة سنة۔ (شرح المجلة، المادة ۱۶۶۰ ص ۹۸۴ الباب الثانی فی مرور الزمان)
وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج ۷ ص ۲۲۸ باب التحالف۔

[2] قال العلامة سلیم رستم باز : بینة الزیادة اولیٰ۔ (شرح المجلة، المادة ۱۷۶۲ ص ۱۱۳۱ الباب الرابع)
وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج ۳ ص ۵۱۲ الباب التاسع فی الشهادة علی النفی والبینات الخ۔

بطور کاشت کار اس سے فائدہ حاصل کرتی رہی، جب اس قوم نے پاکستان ہجرت کی تو مذکورہ بالا زمین ایک اور قوم کو اجارہ پر دے دی، اب اس قوم نے اس زمین پر ملکیت کا دعویٰ کیا ہے کہ یہ ہماری زمین ہے اور ہم سے غصب کی گئی تھی، شرعاً اب یہ زمین کس کی ملکیت میں رہے گی؟

الجواب:۔ جو زمین کسی کی مملوکہ نہ ہو اور موات کے حکم میں ہو یا وہ زمین جو بیت المال کے زیرِ تصرف ہو اس کے بارے میں حاکمِ وقت کو مکمل اختیار حاصل ہے کہ وہ جس طریقہ سے بھی چاہے مسلمانوں کی خیر خواہی کے لیے استعمال کر سکتا ہے، اس لیے اگر وہ کسی قوم کو اس میں سے کچھ دینا چاہے تو اس کو اختیار حاصل ہے اور جس کو بھی حاکمِ وقت کی طرف سے کچھ زمین مل جائے وہ اس کا مالک تصور کیا جائے گا اور یہ زمین شرعی قواعد و ضوابط کے تحت اس کے مرنے کے بعد ورثاء میں بھی تقسیم ہوگی لہٰذا حاکمِ وقت کی طرف سے غیر مملوکہ زمین کسی کو دینے کے بعد کسی کو بھی اسے واپس لینے یا اس پر قبضہ کرنے کا حق حاصل نہیں۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: وللامام ان یقطع کل موات وکل ما لیس فیه ملك لاحد ویعمل بما یریٰ انه خیر للمسلمین واعم نفعاً۔ (رد المحتار ج ۳ ص۲۹ فی احکام الاقطاعات من بیت المال۔ باب العُشر والخراج والجزیة) [1]

کسی غیر کے نام مندرج زیرِ قبضہ زمین میں فریقین کے اختلاف کا فیصلہ

سوال: سرکاری کاغذات میں ایک شخص کے نام زمین درج ہے اور اس زمین پر ۱۹۳۰ء سے کسی دوسرے شخص نے قبضہ کر رکھا ہے اس زمین میں ایک بہت بڑا درخت تھا جو کہ قابض کاٹ کر گھر لے گیا، زمین کی ملکیت جس شخص کے نام درج ہے اب اس نے زمین پر قبضہ کر کے قابض پر زمین کی ملکیت اور درخت کا دعویٰ کیا، تو مذکورہ صورت میں فیصلہ کس کے حق میں ہوگا؟

الجواب: اگر سرکاری کاغذات صحیح ہوں ان میں دھوکہ، جعل سازی اور جھوٹ کا احتمال نہ ہو تو ان کے مطابق عمل کیا جائے گا، ان کاغذات کے موافق زمین جس کے نام درج ہو اس کی

---

[1] قال العلامة الکاسانیؒ: فالامام یملك اقطاع الموات من مصالح المسلمین لما یرجع ذٰلك الیٰ عمارة البلاد والتصرف فیما یتعلق بمصالح المسلمین للامام۔ (بدائع الصنائع ج ۶ ص۱۹۴ کتاب الاراضی)
وَمِثْلُهٗ فی شرح مجلة الاحکام، المادة ۱۲۷۲ ص۶۸۸۔

ملکیت تصور کی جائے گی اور درخت بھی اسی کا ہوگا لیکن اگر اس میں جھوٹ وفریب کا احتمال ہو تو متعلقہ زمین پر ملکیت کا دعویٰ کرنے والا خارج ہے اور قابض ذوالید ہے، اس لیے اگر فریقین گواہ قائم کریں تو خارج کے گواہ مقدم ہوں گے اور فیصلہ اس کے گواہوں پر کیا جائے گا، اگر خارج کے پاس گواہ نہ ہوں تو پھر ذوالید کے گواہوں پر فیصلہ ہوگا، اگر طرفین میں سے کسی کے پاس بھی گواہ نہ ہوں تو پھر ذوالید کو قسم دی جائے گی، اگر قسم سے انکار کرے تو زمین پر خارج کی ملکیت ثابت ہوگی۔

لما قال العلامة الکاسانیؒ: فان قامت علیٰ ملك مطلق عن الوقت فبینة الخارج اولیٰ۔

(بدائع الصنائع ج۶ ص۲۳۲ کتاب الدعوٰی، فصل فی حکم تعارض الدعوتین) [1]

حکومت کی اجازت سے موات اراضی آباد کرنے کا حکم

سوال:۔ ایک دفعہ صوبائی حکومت نے اعلان کیا کہ جو کوئی غیر آباد زمین کو آباد کرے گا تو وہ اس کا مالک بن جائے گا، چنانچہ ایک علاقہ میں غیر آباد بنجر پہاڑ کے کچھ حصہ پر بعض لوگوں نے محنت کرکے قابلِ کاشت بنایا اور بعض حصہ میں گھر بنائے، لیکن وہاں کے بعض با اثر لوگوں نے جبراً ان لوگوں کی زمینیں چھین لیں اور مکانات بھی خالی کرا لیے۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ حکومتِ وقت کے باقاعدہ اعلان کے بعد اگر کوئی شخص غیر آباد زمین کو آباد کرے تو وہ اس کا مالک بن سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر مذکورہ بالا پہاڑ پہلے سے کسی کا مملوکہ نہ ہو اور نہ قریبی لوگ اس کو اپنے مفادات میں استعمال کرتے ہوں تو حکومتِ وقت کی اجازت کے بعد جو بھی اس کو آباد کرے چاہے کاشت کے قابل بنانے سے آباد کرے یا مکانات تعمیر کرنے سے آباد کرے تو آباد کرنے والا اس کا مالک بن جائے گا، اس لیے اس زمین پر ملکیت ثابت کیے بغیر محض طاقت کے بل بوتے پر غریب لوگوں سے زمین خالی کرانا سراسر ظلم وزیادتی ہے اس سے اجتناب کرنا ضروری ہے۔

قال العلامة سلیم رستم بازؒ: من احیا ارضًا من الاراضی الموات بالاذن السلطان

---

[1] قال العلامة علاؤالدین التمرتاشیؒ: تقدم حجة خارج فی ملك مطلق علیٰ حجة ذوی الید۔

(تنویر الابصار علیٰ صدر رد المحتار ج۴ ص۴۸۶ باب دعوٰی الرجلین)

وَمِثْلُهٗ فی شرح مجلة الاحکام، المادة ۱۷۵۷ ص۱۱۱۶ کتاب الدعوٰی۔

صادما لگا لہا۔(شرح مجلۃ الاحکام، المادۃ ۱۲۷۲ ص۶۸۸ الباب الرابع فی شرکۃ الاباحۃ) ۱؎

موات کو آباد کرنے کی وجہ سے چشمہ کا پانی دوسری اراضی پر بند کرنے کے متعلق فیصلہ

سوال:۔ایک زمین مدتوں سے ایک شخص کے زیر تصرف چلی آرہی ہے اس کے قریب ایک غیر آباد پہاڑ میں چشمہ تھا جس سے زمین سیراب ہوتی تھی، اب اس غیر آباد پہاڑ کو کسی نے آباد کرکے قرب وجوار میں واقع آباد زمین پر پانی بند کر دیا ہے، تو کیا اس شخص کا دوسروں کی اراضی پر پانی بند کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔جب ایک غیر آباد زمین جاری چشمہ سے مدتِ دراز تک سیراب ہوتی رہی ہے تو اس غیر آباد زمین پر قبضہ کرکے اس کو آباد کرنے سے قرب وجوار میں واقع اراضی پر اس چشمہ کا پانی بند کرنا جائز نہیں کیونکہ موات اراضی کو آباد کرنے سے اس کے قرب وجوار میں واقع اراضی پر کچھ اثر نہیں پڑتا بلکہ اس زمین کے متعلقہ حقوق بدستور قائم رہیں گے، جس طرح موات میں پہلے سے قائم شدہ راستہ موات آباد کرنے کی وجہ سے کوئی نہیں روک سکتا اسی طرح موات میں پہلے سے قائم دوسری اراضی کے پانی کا راستہ روکنا جائز نہیں۔

وفی الھندیۃ: رجل احیا ارضاً میتۃ ثم جاء انسان واحیا اراضی حولھا حتی احاط الاحیاء بجوانبھا الاربعۃ کان لہ ان یتطرق الی ارضہ من الارض التی احیاھا آخر۔

(الفتاوی الھندیۃ ج۵ ص۳۸۶ کتاب احیاء الاموات، الباب الاول) ۲؎

مشترکہ زمین میں دوسرے شرکاء کی اجازت کے بغیر تصرف کرنے کا حکم

سوال:۔ایک علاقہ میں

۱؎ قال العلامۃ ابوبکر الکاسانیؒ: فالملک فی الموات یثبت بالاحیاء باذن الامام عند ابی حنیفۃؒ۔

(بدائع الصنائع ج۶ ص۱۹۴ کتاب الاراضی)

وَمِثْلُہٗ فی رد المحتار ج۵ ص۳۰۷ کتاب احیاء الموات۔

۲؎ قال العلامۃ سلیم رستم بازؒ: اذا احیا رجل ارضاً من اراضی الموات ثم جاءہ آخرون ایضاً فاحیوا الاراضی التی فی اطرافھا الاربع یتعین طریق ذٰلک الشخص فی ارض المحی الاخیر یعنی ان طریقہ تکون منھا۔(شرح مجلۃ الاحکام، المادۃ ۱۲۷۴ ص۶۸۹ الباب الرابع فی شرکۃ الاباحۃ الفصل الثانی)

وَمِثْلُہٗ فی تنویر الابصار ج۵ ص۳۰۷ کتاب احیاء الموات۔

چھ سو ایکڑ زمین مشترکہ شاملات دیہہ ہے جس میں پانچسو افراد شریک ہیں، اب اس میں شریک چند اشخاص نے دوسرے شرکاء کی اجازت کے بغیر مکانات بنائے اور باغات لگائے دوسرے شرکاء ان کو اس تصرف سے منع کرتے جبکہ یہ اشخاص اس تصرف سے باز نہیں آتے، تو کیا دوسرے شرکاء ان اشخاص کو اس تصرف سے منع کر سکتے ہیں یا نہیں ؟

الجواب :۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ یہ زمین کسی کی مملوکہ نہیں اور موات کے حکم میں ہے تو حکومت کی اجازت سے آباد کرنے والا اس کا حقدار ہوگا، اس میں دوسرے شرکاء سے اجازت کی ضرورت نہیں بلکہ ان کی اجازت کے بغیر بھی اس میں تصرف جائز ہے، البتہ اگر یہ زمین حکومت نے ان پانچسو افراد کو دی ہو جیسا کہ عام طور پر مقامی لوگوں میں شاملات زمین قرب و جوار میں موجود اراضی کے تناسب سے دی جاتی ہے، تو یہ زمین سب میں مشترکہ ہوگی اور مشترکہ املاک میں تصرف کرنے سے اگر دوسرے شرکاء کی املاک کو نقصان پہنچنے کا خطرہ نہ ہو تو پھر اس میں بعض شرکاء کا تصرف جائز ہے لیکن اگر ان کے تصرف سے دوسرے شرکاء کی املاک کو نقصان پہنچتا ہو تو پھر ان شرکاء کا اس زمین میں تصرف جائز نہیں اور دوسرے شرکاء ان کو تصرف سے منع کرنے کا حق رکھتے ہیں۔

قال العلامة الحصکفیؒ : وکل من شرکاء الملك اجنبی فی الامتناع عن تصرف مضر فی مال صاحبه لعدم تضمنها الوکالة ۔ (الدر المختار ج ۳ ص۳۶۵ کتاب الشرکة)

عرصہ دراز تک آمد و رفت کی وجہ سے راستہ پر حقِ مرور کا دعوای کرنے کا حکم

سوال :۔ دو اشخاص کا ایک راستہ پر تنازعہ ہے ایک شخص یہ دعوای کرتا ہے کہ چونکہ ساٹھ سال سے اس راستہ پر میری آمد و رفت جاری ہے اس لیے اب کوئی بھی مجھے اس راستے پر گذرنے سے منع کرنے کا حق نہیں رکھتا، جبکہ دوسرا شخص یہ دعوای کرتا ہے کہ یہ راستہ میری ملکیت ہے اور محض تعلقات کی وجہ سے میں نے اس شخص کو اس راستہ پر سے گذرنے کی اجازت دی تھی لہٰذا مجھے یہ حق حاصل ہے کہ میں اس شخص کو راستے پر گذرنے سے روک دوں، تو کیا زمین کا مالک اس شخص

لہ قال العلامة سلیم رستم بازؒ : انتفاع الحاضر بالملك المشترك بوجه لایضر الغائب یعد رضی من الغائب۔ (شرح مجلة الاحکام، المادة ۱۰۷۹ ص۶۰۴ الباب الاول فی شرکة الملك)

ومثله فی بدائع الصنائع ج ۶ ص۶۵ کتاب الشرکة۔

راستے پر گزرنے سے روک سکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب: محض آمد و رفت کی وجہ سے حقِ مرور کا دعویٰ کرنا صحیح نہیں بلکہ مدعی پر لازم ہے کہ مدعیٰ علیہ کی مملوکہ زمین میں اپنے لیے راستہ ثابت کرنے پر گواہ پیش کرے، اگر مدعی گواہ پیش کرنے سے عاجز ہو جائے تو پھر مدعیٰ علیہ کے قول پر اعتماد کرتے ہوئے اس کے مطابق فیصلہ کیا جائے گا۔

كما في الهندية: لو ادعىٰ على آخر حق المرور ورقبة الطريق في داره فالقول صاحب الدار ولو اقام المدعي البينة انه في هٰذه الدار لم يستحق بهٰذ اشيئًا كذا في الخلاصة۔ (الفتاوىٰ الهندية ج ۳ ص ۱۰۴ الباب التاسع فيما يجوز بيعه) [1]

ایک ہی شخص سے خریدی ہوئی زمین پر ملکیت کے دعویٰ میں تاریخ کی تقدیم و تاخیر کا حکم

سوال: ایک شخص نے اپنی زمین اپنے بھتیجے پر فروخت کی، پھر دوبارہ خفیہ طور پر وہی زمین اپنے بھائی پر فروخت کی، بائع کا بھتیجا اور بھائی دونوں اپنی اپنی ملکیت کا دعویٰ کرتے ہیں اور اپنے دعویٰ پر ثبوت بھی پیش کرتے ہیں جبکہ بائع لاپتہ ہے تو ان دونوں کے درمیان فیصلہ کس طرح کیا جائے گا؟

الجواب: ایک ہی وقت میں ۲ دو اشخاص پر زمین فروخت کرنا جائز نہیں یہ سراسر دھوکہ ہے اور اس دھوکہ اور فریب کی وجہ سے دونوں آپس میں دست و گریبان ہیں، صورتِ مذکورہ میں جب بائع نے زمین دو افراد پر فروخت کی تو اگر دونوں اپنے دعویٰ پر گواہ پیش کریں اور دونوں نے ایک ہی تاریخ پیش کی ہو اور ہر ایک اپنے دعویٰ کے اثبات پر گواہ پیش کرتا ہو تو زمین فی الحال جس کے قبضہ میں ہے اس کے گواہوں کو دوسرے گواہوں پر ترجیح دی جائے گی البتہ اگر

---

[1] قال العلامة طاهر بن عبد الرشيد البخاري: ولو ادعىٰ على آخر حق المرور ورقبة الطريق في داره القول قول صاحب الدار ولو اقام المدعي البينة انه كان يمر في هٰذه الدار لم يستحق بهٰذ اشيئًا ولو شهدوا ان له طريقا فيها وبينوا حدوده .... يقضىٰ له بذلك۔

(خلاصة الفتاوىٰ ج ۴ ص ۹۵ كتاب الدعوىٰ۔ الفصل الثاني)

وَمِثْلُهٗ في شرح المجلة للعلامة سليم رستم باز، المادة ۱۱۵۵ فصل في دعوى الحائط والطريق۔

دونوں نے مختلف تاریخیں بیان کی ہوں تو پھر جس کی تاریخ مقدم ہو اس کے گواہ بھی دوسرے کے مقابلے میں مقدم ہوں گے ۔

قال العلامة محمد علاؤالدین آفندیؒ: ولو ادعی الخارج وذوالید بسبب من الاسباب نحو شراء وارث وشبهه فلا یخلوا اما ان یدعیا تلقی الملك من جهة واحدا ومن جهة اثنین فلو ادعیاه من جهة واحد وبرهنا حکم به لذی الید لو لم یؤرخا او ارخا سواءً فلو ارخا وتاریخ احدهما اسبق فهو اولی۔ (تکملة رد المحتار ج ۲ ص ۱۸ باب دعوی الرجلین)[1]

مقتول کے وارث کی طرف سے قاتل کو معاف کرنے کے بعد قتل کے دعوے کا جائزہ

سوال:- ایک آدمی نے کسی شخص پر اپنے بیٹے کے قتل کا دعویٰ کیا جبکہ مُدعا علیہ قتل سے منکر ہے، گواہوں کی شہادت سے قبل مُدعیٰ علیہ نے دعویٰ کو ان الفاظ سے رفع کیا کہ مقتول کے باپ سے میرے بھائی نے قتل کے بارے میں پوچھا تو اس نے جواب دیا کہ میرے بیٹے کو مُدعیٰ علیہ نے قتل نہیں کیا اور اگر اس نے قتل کیا بھی ہو تو میں نے اس کو معاف کر دیا ہے، تو کیا یہ معافی دفع دعویٰ کیلئے کافی ہے یا نہیں؟

الجواب:- قصاص جاری کرنا چونکہ سنگین نوعیت کا حامل معاملہ ہے کیونکہ یہ کسی کی زندگی اور موت کا مسئلہ ہوتا ہے اس لیے اس باب میں شریعت نے مقتول کے ورثاء کے عفو و درگذر کو بڑی اہمیت دی ہے۔ اگر مقتول کے ورثاء میں سے کوئی بھی قاتل کو معاف کر دے تو اس سے قصاص ساقط ہو جاتا ہے۔ حسبِ بیان اگر شرعی طریقے سے ثابت ہو جائے کہ مقتول کے والد نے اعتراف کیا ہے کہ میرے بیٹے کو مدعیٰ علیہ نے قتل نہیں کیا اور اگر کیا بھی ہو تو میں نے معاف کیا ہے، تو اس کا یہ اعتراف اور معافی دعویٰ کے دفاع کے لیے کافی ہے اور اس سے قتل کا دعویٰ ساقط ہو جاتا ہے۔

---

[1] وفی الهندیة: ان کانت فی ید احدهما فهی لذی الید سواء ارخ اولم یؤرخ الا اذا ارخا وتاریخ الخارج اسبق فیقضی بها للخارج کذا فی الکافی۔ (الفتاوی الهندیة ج ۴ ص ۷۰ الباب التاسع، الفصل الثانی فی دعوی الملك فی الاعیان)

ومثله فی شرح مجلة الاحکام (۱۱۲۷) کتاب الدعوی۔

کمافی الهندیة: ومن عفا من ورثة المقتول عن القصاص رجلٌ او امرأةٌ او أم اوجدة ومن سواهن من النساء اوکان المقتول امرأة فعفا زوجها عن القصاص فلا سبیل الی القصاص۔ (الفتاوی الهندیة ج۶ ص۲ الباب السادس فی الصلح والعفو والشهادة فیه)[1]

بیٹے کو ہبہ کی ہوئی زمین پر ورثاء کے دعویٰ ملکیت کا جائزہ

سوال:۔ ایک شخص نے کچھ زمین خریدی، خریدنے کے بعد زمین کا کچھ حصہ اپنے بیٹے کے نام منتقل کر دیا اور اس کو باقاعدہ قبضہ بھی دے دیا اس کی وفات کے بعد جو زمین اس کے نام درج تھی وہ ورثاء میں تقسیم کر دی گئی اور جو زمین بیٹے کے نام درج تھی وہ اس کے قبضہ میں اپنے حال پر باقی رہی، اب ورثاء نے اس کی زمین میں بھی وراثت کا دعویٰ کیا ہے کہ وراثت کے تحت ہمارا بھی اس میں حصہ ہے جبکہ بیٹا اپنی زمین میں ان کو حصہ دینے سے انکار کرتا ہے۔ اندریں صورت کیا بیٹے کے حصہ کی زمین میں ورثاء کی ملکیت کا دعویٰ صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ درحقیقت حالتِ حیات میں باپ اپنی جائیداد میں سے جو حصہ اپنے کسی بیٹے کو دیتا ہے تو یہ اس کی طرف سے بیٹے کے لیے ہبہ ہوتا ہے اور ہبہ کی تمامیت کے لیے قبض شرط ہے اگر موہوب لہ ہبہ کی ہوئی چیز پر قبضہ نہ کرے تو بغیر قبضہ کے ہبہ تام نہیں ہوتا اس لیے حسب بیان اگر واقعی والد نے اپنی زندگی میں اپنے بیٹے کے نام زمین منتقل کر دی ہو اور اس کی زندگی میں بیٹے نے اس پر قبضہ کر لیا ہو تو یہ زمین محض اس کی ملکیت ہوگی اس میں دوسرے ورثاء کا حق نہیں اس لیے اس زمین پر دوسرے ورثاء کا ملکیت کا دعویٰ کرنا صحیح ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: ومنها ان یکون الموهوب مقبوضاً حتیٰ لا یثبت الملك للموهوب له قبل القبض وان یکون مقسوماً اذا کان مما یحتمل القسمة۔ (تنقیح الفتاوی الحامدیة ج۲ ص۹۳ کتاب الهبة)[2]

---

[1] لما قال العلامة الکاسانیؒ: فاما اذا کان اثنین او اکثر فعفا احدهما سقط القصاص عن القاتل لانه سقط نصیب العافی بالعفو فیسقط نصیب الآخر ضرورة انه لا یتجزأ۔ (بدائع الصنائع ج۷ ص۲۴۷ کتاب الدعوی)
وَمِثْلُهٗ فی الهدایة ج۴ ص۵۵۶ کتاب الدعوی۔

[2] لما قال العلامة سلیم رستم بازؒ: یملك الموهوب له الموهوب بالقبض۔ (شرح مجلة الاحکام۔ المادة ۸۶۱ ص۴۷۳ الباب الثالث)
وَمِثْلُهٗ فی بدائع الصنائع ج۶ ص۱۳۲ فصل حکم الهبة، کتاب الهبة۔

ہلاک شدہ مال کے بارے میں قرض اور مضاربت کے اختلاف کا فیصلہ

سوال: ایک شخص جو کہ اسلحہ کا کاروبار کرتا تھا اور وہ اپنے ایک ساتھی سے چار ہزار روپے دوسرے سے دو ہزار روپے اور تیسرے سے ایک ہزار روپے لے کر چلا، اس نے کل سات ہزار روپے ایک دلال کو دیئے، دلال نے کہا کہ فلاں تاریخ کو فلاں مقام پر میں آپ کو کارتوس دوں گا، یہ شخص جب طے شدہ مقام پر پہنچا تو اس کی موجودگی میں پولیس نے دلال کو گرفتار کر لیا اور کارتوس وغیرہ ضبط کر لیے، یہ شخص خالی ہاتھ وہاں سے واپس آگیا، بعد میں اس کو پتہ چلا کہ یہ سب دلال کا اپنا چکر تھا اور واقعہ بناوٹی تھا، اس لیے اس نے دلال سے اپنی رقم کا مطالبہ کیا لیکن دلال نے رقم واپس کرنے سے انکار کر دیا، وہاں سے ناکام واپس لوٹا، جب ساتھیوں کو اطلاع ملی تو انہوں نے اس سے اپنی اپنی رقم کا مطالبہ کیا، اس وقت اس شخص نے کہا کہ تم پرواہ نہ کرو تمہاری رقم میں واپس کروں گا، بعد میں اس نے اپنے ساتھیوں سے یہ کہا کہ چونکہ آپ لوگوں نے رقم مجھے مضاربت پر دی تھی اس لیے اس ہلاکت کے بعد میں رقم کا ضامن نہیں، جبکہ ساتھی کہتے ہیں کہ ہم نے یہ رقم قرضِ حسنہ کے طور پر دی تھی۔ فریقین میں سے کسی کے پاس گواہ موجود نہیں، تو اب فیصلہ کس کے حق میں ہوگا؟

الجواب: صورتِ مسئولہ کو مدنظر رکھتے ہوئے یوں معلوم ہوتا ہے کہ ساتھیوں نے یہ رقم اسے بطور قرضِ حسنہ دی تھی کیونکہ مدعیٰ علیہ نے جب یہ کہا کہ تم پرواہ نہ کرو میں تمہاری رقم واپس کروں گا تو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ قرضِ حسنہ کا قائل تھا، اب یہ تینوں ساتھی مدعی ہیں اور وہ شخص مدعیٰ علیہ چونکہ ساتھیوں کے پاس گواہ موجود نہیں اس لیے البینة للمدعی والیمین علیٰ من انکر کے تحت اس شخص کو قسم دی جائے گی اور اگر وہ قسم کھائے کہ میں نے رقم مضاربت پر لی تھی تو مضاربت ثابت ہونے کے بعد وہ ضمان سے بری الذمہ ہوگا کیونکہ مضاربت میں مال مضارب کے ہاتھ میں امانت ہوتا ہے اور امانت میں اگر مال ہلاک ہو جائے تو موجبِ ضمان نہیں اس لیے یہاں بھی ضمان لازم نہیں آئے گی۔

لما قال العلامة المرغینانی رحمہ اللہ: فان ذاد الھالك علی الربح فلا ضمان علی المضارب لانه یمین۔

(الھدایة ج ۳ ص ۲۶۴ کتاب المضاربة، فصل فی العزل والقسمة) [1]

---

[1] قال العلامة سلیم رستم باز رحمہ اللہ: اذا تجاوز مقدار الربح سری الیٰ راس المال فلا یضمنه المضارب سواء کانت المضاربة صحیحة او فاسدة۔ (شرح المجلة۔ المادة ۱۴۲۷ ص ۷۵۷ الباب الرابع۔ الفصل الثالث)

ومثله فی خلاصة الفتاوىٰ ج ۴ ص ۱۸۸ کتاب المضاربة۔

غیر اختیاری کاموں میں کسی کی ذمہ داری قبول کرنے کے متعلق فیصلہ

سوال: ایک شخص سعودی عرب میں ایک کمپنی میں ملازم تھا اور اس کی نگرانی میں تقریباً ۳۵ آدمی کام کرتے تھے، یہ سارے آدمی چونکہ غیر قانونی طور پر وہاں مقیم تھے اس لیے حکومت نے ان کو گرفتار کرلیا، اب ان آدمیوں میں سے ایک نے اپنے نگران پر دعویٰ کردیا کہ اس نے ہماری ذمہ داری لی تھی کہ تم یہاں سے نہ جاؤ اور جو بھی نقصان ہوگا میں اس کا ذمہ دار ہوں، جبکہ نگران انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے ان سے کہا تھا کہ تم بھاگ جاؤ لیکن یہ خود نہیں بھاگ سکے اس لیے میں ان کے نقصان کا ذمہ دار نہیں ہوں۔ اب مذکورہ بیانات کے تحت فیصلہ کس کے حق میں ہوگا؟

الجواب: دراصل جس شخص نے ان لوگوں کی ذمہ داری قبول کی تھی وہ ان کی طرف سے کفیل بن گیا تھا اور کفالت کے لیے فقہاء کرام نے یہ شرط لگائی ہے کہ صرف ان امور میں کفالت معتبر ہے جو کفیل کے دائرہ اختیار میں ہو اور جو کام اس کے دائرہ اختیار سے باہر ہو اس کے بارے میں کفیل ... نہیں، تو غیر قانونی طور پر مقیم لوگوں کو حقِ سکونت فراہم کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے یہ کفیل کے دائرہ اختیار میں نہیں اس لیے اس بارہ میں اس آدمی کا اپنی طرف سے وکیل بننا صحیح نہیں، تو جب کفالت ہی صحیح نہیں تو نقصان کی ذمہ داری بھی اس پر عائد نہیں ہوتی۔

لما قال العلامة المرغیناني: وکل حق لا یمکن استیفاءه من الکفیل لا یصح الکفالة به کالحدود والقصاص۔ (الهدایة ج ۳ ص ۱۲۰ کتاب الکفالة)[1]

کسی کے عقد پر دوبارہ عقدِ بیع کرنے کے متعلق فیصلہ

سوال: ۱۹۶۶ء سے ایک شخص نے دوکان کرایہ پر لے رکھی ہے اور حسبِ دستور دوکاندار مالکِ دوکان کو کرایہ ادا کرتا رہا، مالکِ دوکان کے فوت ہونے کے بعد اس کا بیٹا مسلسل کرایہ وصول کرتا رہا، ۱۹۷۶ء میں موجودہ مالک دوکان نے اپنی دوکان فروخت

---

[1] قال العلامة الکاساني: ان یکون المکفول به مقدور الاستیفاء من الکفیل لیکون العقد مفیداً فلا تجوز الکفالة بالحدود والقصاص لتعذر الاستیفاء من الکفیل فلا تفید الکفالة فائدتها۔
(بدائع الصنائع ج ۶ ص ۹ کتاب الکفالة ۔ فصل شرائط الکفالة)
ومثله فی مجلة الاحکام، المادة ۶۳۲ ص ۳۴۴ الفصل الثانی فی شرائط الکفالة۔

کرنے کا اظہار کیا تو کرایہ دار نے اس سے پچاس ہزار کے عوض بات کی، رجسٹری کرانے میں تین دن باقی تھے کہ اس دوران ایک شخص نے دلال کی وساطت سے مالکِ دوکان کے پاس جاکر مذکورہ رقم ادا کرتے ہوئے دوکان اپنے نام رجسٹری کرالی اور اس کے ساتھ دوسری دوکان بھی خرید کر اپنے بھائی کے نام رجسٹری کرالی، اب وہ دوکان فی الحال کرایہ دار کے قبضہ میں ہی ہے اور دوسرا شخص دوکان خالی کرانے کے لیے دباؤ ڈال رہا ہے، اندریں حالات اب یہ دوکان کس کا حق بنتی ہے؟ اس بارے میں شریعتِ مقدسہ کی روشنی میں فیصلہ صادر فرمائیں؟

الجواب:۔ اگر کرایہ دار اور مالکِ دوکان کے مابین بیع قطعی ہوئی ہو تو کرایہ دار اس مذکورہ عقد سے مالک بن گیا اگرچہ ابھی تک رجسٹری نہ کرائی ہو کیونکہ عقدِ بیع کی تمامیت کے لیے رجسٹری کرانا شرعاً ضروری نہیں۔ جب بیع قطعی سے کرایہ دار مالک بن گیا تو جو دوکان اسکی دوکان کے ساتھ متصل ہے اگر اس دوکان کا کوئی شریک موجود نہ ہو اور نہ اس کے حقوق میں شریک موجود ہو تو پڑوسی ہونے کے ناطے وہ اس دوکان پر شفعہ کا حق رکھتا ہے تو حق شفعہ کی رو سے وہ اس دوکان کو واپس کرا سکتا ہے۔

لما قال العلامۃ المرغینانیؒ: الشفعۃ واجبۃ للخلیط فی نفس المبیع ثم للخلیط فی حق المبیع کالشرب والطریق ثم للجار۔ (الھدایۃ ج ۴ ص ۳۷۷ کتاب الشفعۃ) [۱]

باپ کی وفات کے بعد بیٹوں کا اس کے عقدِ بیع سے انکار

سوال:۔ ایک شخص نے تیس سال قبل اپنی زمین شاملاتِ دیہہ سمیت کسی پر فروخت کی، بعد میں مشتری نے بائع سے کچھ رقم قرض پر لی مگر قرض کی ادائیگی سے عاجز ہونے کی وجہ سے مشتری نے قرض کی رقم کے بدلے زمین بائع پر دوبارہ فروخت کردی اور واپس کرنے کا وعدہ کیا لیکن واپسی سے قبل ہی وہ وفات پاگیا، اب بائع اس کے بیٹوں سے زمین کی واپسی کا مطالبہ کرتا ہے لیکن بیٹے زمین واپس کرنے سے انکار کرتے ہیں کہ ہمارے باپ نے زمین دوبارہ بائع پر فروخت نہیں کی، اب عقدِ بیع پر مدعی کے پاس گواہ موجود نہیں

---

[۱] قال العلامۃ سلیم رستم بازؒ: الثالث ان یکون جاراً ملاصقاً للعقار المبیع۔
(شرح مجلۃ الاحکام، المادۃ ۱۰۰۸ ص ۵۶۳ کتاب الشفعۃ)
وَمِثْلُہٗ فی خلاصۃ الفتاوٰی ج ۴ ص ۴۵۴ کتاب الشفعۃ۔

تو فیصلہ کس طرح کیا جائے گا؟

الجواب:۔ اگر شاملات موات کے حکم میں ہو اور شرعی اصول کے موافق اس شخص نے اس زمین پر قبضہ کر کے اُسے آباد کیا ہو تو اس زمین پر اس کی ملکیت ثابت ہونے کی وجہ سے بیع نافذ ہے، جب بعد میں مشتری نے بائع سے کچھ رقم قرض لے لی اور اس کی ادائیگی سے عاجز ہونے کی وجہ سے زمین واپس بائع پر فروخت کی تو بائع کو اس عقد کے تحت زمین واپس لینے کا حق حاصل ہے، اب بائع چونکہ عقدِ بیع کا دعویٰ کرتا ہے اس لیے مشتری کے مرنے کے بعد بائع کو اس عقد پر گواہ پیش کرنے ہوں گے اور اگر گواہ موجود نہ ہوں تو مشتری کے بیٹوں کو ان کے علم پر قسم دی جائے گی کہ ان کو معلوم نہیں کہ ان کے والد نے رقم کی ادائیگی سے عاجز ہونے کی وجہ سے زمین واپس بائع پر فروخت کی تھی، اگر وہ اس پر قسم کھالیں تو فیصلہ بیٹوں کے حق میں ہوگا اور اگر انکار کریں تو زمین بائع کو واپس کی جائے گی۔

کما قال العلامۃ التمرتاشی رحمہ اللہ: والتحلیف علیٰ فعل غیرہ یکون علی العلم ای انہ لایعلم انہ کذٰلک لعدم علمہ بما فعل غیرہ۔ (تنویر الابصار علیٰ ہامش رد المحتار ج۴ ص۴۷۳ کتاب الدعویٰ)[1]

عقدِ مضاربت کے متعلق ایک فیصلے کی تصحیح

سوال:۔ دو آدمیوں نے مضاربت پر کاروبار شروع کیا، رب المال نے ۲ لاکھ روپے مضارب کو دے دیئے اور مضارب نے اس رقم سے کپڑے کی دوکان کھول لی اور اس پر اپنے ایک دوست کو بٹھا دیا اکثر اوقات وہی دوکان چلاتا رہا، رب المال نے اس پر ناراضگی ظاہر کی لیکن اس کے باوجود مضارب نے اپنے دوست کو دوکان سے نہیں ہٹایا، نتیجتاً اس کاروبار میں تیرہ ۱۳ ہزار روپے کا نقصان ہوا، رب المال نے دعویٰ کیا کہ مضارب نے اپنے دوست کے ساتھ مل کر تیرہ ۱۳ ہزار روپے کی چوری کی ہے، جب رب المال نے اپنی رقم کی واپسی کا مطالبہ کیا تو مضارب نے رقم واپس کرنے سے انکار کر دیا اور یہ دعویٰ کیا کہ اس دوکان پر

---

[1] قال العلامۃ قاضی سماوۃ رحمہ اللہ: ولو وقع الدعوی علیٰ فعل الغیر من کل وجہ یحلف علی العلم حتیٰ لو ادعیٰ علیٰ وارث ان اباک اتلفہ او سرقہ او غصبہ منی یحلف علی العلم وھٰذا مذھبنا۔
(جامع الفصولین ج۱ ص۱۹۴ الفصل الخامس عشر فی التحلیف)
ومثلہٗ فی فتاویٰ قاضی خان علیٰ ہامش الہندیۃ ج۲ ص۴۱۴ فصل ما یتعلق بالنکاح من المھر والولد وغیر ذٰلک۔

میرے ۴۵ ہزار روپے خرچ ہوئے ہیں، ان دونوں نے ثالث مقرر کیا، اُس نے یہ فیصلہ کیا کہ دوکان رب المال کے پاس رہے گی اور مضارب ۴۵ ہزار روپے خرچہ ادا کرے گا، ثالث کے اس فیصلے کے مطابق رب المال کو ۵۸ ہزار روپے کا نقصان ہوتا ہے۔ از روئے شریعت یہ فیصلہ درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ دراصل مضارب کاروبار میں رب المال کی طرف سے وکیل کی حیثیت رکھتا ہے اس لیے رب المال جن شرائط کے تحت مضارب کو تصرف کا اختیار دے اُن شرائط کی پابندی مضارب پر لازم ہے اگر ان شرائط کی خلاف ورزی کرے اور کوئی نقصان ہو جائے تو اس کی ضمان مضارب پر لازم آئے گی، اسی طرح صورتِ مسئولہ میں جب رب المال نے مضارب کے دوست کو دوکان پر بٹھانے سے روکا تو اس کے لیے جائز نہیں کہ اپنے دوست کو بدستور دوکان پر بٹھائے رکھے لہٰذا اگر رب المال شہادت سے یہ ثابت کرے کہ مضارب نے واقعی خیانت کی ہے تو تجارت کے سامان کو فروخت کرکے رب المال کی رقم پوری کی جائے گی اور جو رقم اس سے بچ جائے اس کو دونوں میں مساوی طور پر تقسیم کیا جائے گا، مضارب نے اپنے خرچہ کے لیے جو رقم لی ہے وہ مضارب کی کمائی سے جُدا کی جائے گی۔

لما قال العلامة الکاسانیؒ: فاذا خالف شرط رب المال صار بمنزلة الغاصب ویصیر المال مضمونا علیه۔ (بدائع الصنائع ج۶ ص۸۷ کتاب المضاربة۔ فصل فی حکم المضاربة) [1]

ٹیوب ویل کی نوکری پر فریقین کے تنازعہ کا فیصلہ

سوال:۔ ایک شخص جو کہ اسی ۸۰ سال سے زمین میں تصرف کر رہا ہے اس نے اپنی زمین کا کچھ حصہ حکومت کو ٹیوب ویل لگانے کے لیے اس شرط پر دیا کہ ٹیوب ویل کی نوکری میری ہو گی، ٹیوب ویل لگنے کے بعد اس نے نوکری کے لیے کسی اور شخص کو خرچہ وغیرہ دے دیا، اس شخص نے مالک زمین کو دھوکہ میں رکھا اور ٹیوب ویل کی نوکری اپنے نام منظور کرالی، مالک زمین نے

---

[1] قال العلامة سلیم رستم باز: واذا تجاوز المضارب حد ما ذونیته وخالف الشرط کان غاصبًا وفی هٰذه الحال یعود الربح والخسار فی تجارته له وعلیه واذا تلف مال المضاربة کان ضامنًا۔
(شرح مجلة الاحکام۔ المادة ۱۴۲۹ ص۷۵۴ کتاب المضاربة)
وَمِثْلُهٗ فی الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۴ ص۵۴۲ کتاب المضاربة۔

اس پر دعوٰی کیا کہ یہ نوکری میرا حق ہے کیونکہ میں نے اس شرط پر حکومت کو زمین دی ہے۔ دوسرے شخص نے یہ دعوٰی کیا کہ نوکری میرا حق بنتا ہے کیونکہ یہ زمین مشترکہ ہے اور شاملات ہے جس میں میرا بھی حصہ ہے اگرچہ متعین نہیں کہ ٹیوب ویل کی جگہ میری ہے یا کسی اور کی، مالکِ زمین نے یہ جواب دیا کہ یہ زمین مجھے اسّی۸۰ سال قبل پوری قوم نے دی تھی۔ تو مذکورہ بالا صورت میں ٹیوب ویل کی نوکری کا حقدار کون ہے؟

سوال:۔ اگر یقینی طور پر یہ معلوم ہو جائے کہ یہ زمین شاملاتِ وہبہ ہے اور پوری قوم نے اس شخص کو دی ہے تو یہ شخص اس پر قبضہ کرنے اور تصرف کرنے سے مالک بن گیا ہے، تو جب اسّی۸۰ سال اُس نے اس زمین میں تصرف کیا اور کسی نے اس پر ملکیت کا دعوٰی نہیں کیا تو اس کی زمین میں کسی اور کو تصرف کا حق نہیں۔ لہٰذا جب اس نے اپنی زمین ٹیوب ویل لگانے کے لیے دے دی تو یہ زمین وقف ہو گئی اور وقف زمین میں واقف جو شرط لگائے اس کی رعایت کی جائے گی۔ تو جس طرح موقوفہ زمین کا منافع واقف اپنے لیے خاص کر سکتا ہے، اسی طرح اگر مالکِ زمین موقوفہ زمین میں ٹیوب ویل کی نوکری اپنے لیے خاص کرے تو یہ اس کا حق ہے اس لیے اس کے ہوتے ہوئے کوئی اور شخص اس نوکری کا حقدار نہیں۔

لما قال العلامة عالم بن العلاء الانصاریؒ: وذكر الفقيه ابوجعفر انه لوشرط لنفسه ان يأكل من الغلة يجوز عند محمد وكذالك لوشرط الغلة لابيه فهو كاشتراطها لنفسه۔
(الفتاوٰی التاتارخانية ج۵ ص۷۲۲ الفصل الرابع فيما يتعلق بالشرط الوقف)[1]

بیٹے کا باپ کے ترکہ میں سے اپنے لیے زمین کا کچھ حصہ ہبہ کرنے کے دعوٰی کا جائزہ

فریق اوّل ـــــــ فریقِ ثانی

حقِ تحکیم: مندرجہ بالا فریقین بذاتِ خود تو حاضر نہیں ہوئے لیکن انہوں نے اپنے نمائندے یعنی وکیل بھیج دیئے اور قرآن وسنت کے تحت فیصلے کے لیے تیار ہوئے لہٰذا

---

[1] قال العلامة الحصكفیؒ: وجاز جعل غلة الوقف اوالولاية لنفسه عند الثانی وعليه الفتوٰی۔ (الدر المختار علٰی هامش رد المحتار ج۳ ص۴۲۴ كتاب الوقف)
ومثله فی الهندية ج۲ ص۳۹۸ الباب الرابع فيما يتعلق بالشرط الوقف۔

ان کے نمائندوں کے واسطے سے فریقین کے بیانات سن لیے گئے۔

تنقیحات:۔ مندرجہ بالا فریقین کے نمائندوں کے واسطے سے بیانات سن لیے گئے، ان بیانات سے چند امور سامنے آئے:۔

(۱) دونوں فریق آپس میں حقیقی بھائی ہیں اور ان کے بیان سے اتفاقی طور پر واضح ہوتا ہے کہ دونوں فریق اپنی بہنوں کو جائیداد سے محروم رکھتے ہیں، جائیداد کی تقسیم کو صرف فریقین تک محدود رکھا جاتا ہے، فریقین کے والد کے تصرفات مابعد کے ورثاء کے عملی اقدامات سے اپنی بہنوں کا کوئی تذکرہ نہیں کرتے۔

(۲) فریقِ اول اس بات کا دعویدار ہے کہ اس کے والد نے اپنی حینِ حیات میں جائیداد تقسیم کی تھی، دیگر حصص کے علاوہ خسرہ نمبر آٹھ سو سات ۸۰۷ جو کہ ارتل کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جس کی مقدار اسی ۸۰ کنال آٹھ ۸ مرلے ہے یہ مجھے دی گئی ہے جو کہ سنہ ۱۹۶۶ء و سنہ ۱۹۶۷ء کی بندوبست میں بحال رکھی گئی ہے، فریقِ مذکورہ کے بیان کی رُو سے فریقِ ثانی نے یہ جائیداد اپنے نام منتقل کرائی ہے جس کے خلاف فریقِ اول نے عدالت سے درخواست کی لیکن اس دوران ایک شخص نے ان میں مصالحت کرا دی۔

(۳) فریقِ اول مصالحت میں ایک ہزار روپے کی رقم دینے کا تذکرہ کرتا ہے جو فریقِ ثانی نے برضاء و رغبت وصول کی ہے اور بطور بینہ سند تحریری سٹامپ پیش کرتا ہے۔

(۴) فریقِ ثانی کا بیان ہے کہ اس کے باپ نے اپنی زندگی میں زمین اپنے بیٹوں کے درمیان تقسیم کر دی تھی تاہم اچھی، اسکے [illegible] ایک بیٹے کو اچھی زمین اور دوسرے کو بیکار زمین زیادہ دی تھی، فریقِ اول نے سازباز کر کے خسرہ نمبر آٹھ سو سات ۸۰۷ جعلی طور پر اپنے نام انتقال کرا لیا ہے جو کہ ہمارے رجوع کرنے پر عدالت نے بحال کر دیا ہے۔

(۵) فریقِ ثانی کا دفاعی بیان یہ ہے کہ اس نے فریقِ اول کے ساتھ جو مصالحت کی ہے وہ نافذ نہیں کیونکہ فریقِ ثانی نے اپنی تمام جائیداد اپنے بیٹوں کے درمیان تقسیم کی تھی اور جس جائیداد سے فریقِ ثانی نے مصالحت کرائی یہ اس کی جائیداد نہیں تھی بلکہ اس کے بیٹوں کی جائیداد تھی یہی وجہ ہے کہ فریقِ ثانی نے ایک ہزار روپیہ فریقِ اول کو واپس کر کے مصالحت کو کالعدم قرار دیا ہے۔

حقیقتِ حال :- ان نکات پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ فریقین بہنوں کو جائیداد سے محروم کرنے پر متفق ہیں، یہ ایک جاہلانہ اور غیر شرعی اقدام کی تائید کے مترادف ہے، اگر باپ نے دیدہ دانستہ طور پر بیٹوں کے نام جائیداد منتقل کرکے بیٹیوں کو میراث سے محروم رکھا ہو تو یہ ناجائز اور حرام حرکت ہے اگرچہ قضاءً ایسے اقدامات نافذ ہوتے ہیں لیکن عنداللہ اس جرم سے خلاصی اور نجات کے لیے واحد ذریعہ یہ ہے کہ ورثاء مورث کی ذمہ داری کی فراغت کیلئے ہر صاحبِ حق کو اس کے حق کی ادائیگی کریں ورنہ حقوق العباد کی حق تلفی سے اس کا گرفتار ہونا یقینی امر ہے تاہم قضاءً والد کے تصرفات نافذ رہیں گے۔

شرعی فیصلہ : جہاں تک متنازعہ جائیداد کے بارے میں فریقین کے بیانات کا تعلق ہے تو واضح رہنا چاہیئے کہ سرکاری کاغذات میں محض انتقال کا ہونا نہ تو کسی کی ملکیت کی شرعی دلیل ہے اور نہ اس پر ملکیت موقوف ہے اسلئے فریقین کے والد کے مالکانہ تصرفات کے نفاذ کیلئے سرکاری کاغذات میں انتقال ضروری نہیں، جو بھی باقاعدہ گواہوں سے ثابت ہوجائے اس کو اعتبار دیا جائے گا۔

قال العلامة سلیم رستم بازؒ: ولا یعمل بالخط والختم وحدهما الا اذا کان سالماً من شبهة التزویر والتصنیع فیعمل به یعنی انه یکون مداراً للحکم ولا یحتاج الی الثبوت بوجهٍ آخر۔ (مجلة الاحکام، المادة ۱۷۳۶، ص ۱۰۹۰)

لیکن بعد ازاں جہاں تک فریقین کے تنازعہ کا مسئلہ ہے اور پھر اس میں مصالحت کی صورت ہے تو مصالحت کا ثبوت باقاعدہ اقرار یا عادل گواہوں کی گواہی پر موقوف ہے، اس لیے اگر فریقِ ثانی کی رضا و رغبت سے مصالحت ایک دفعہ ثابت ہوجائے تو باقاعدہ ماننے کے بعد نہ خود فریقِ ثانی اور نہ اس کے ورثاء اس سے انکار کرسکتے ہیں لیکن ایسی مصالحت کے لیے یہ ضروری ہے کہ فریقِ ثانی جس جائیداد پر مصالحت کر رہا ہو وہ اس کی ملکیت میں ہو ورنہ اگر اس نے واقعی یہ جائیداد اپنے بیٹوں میں باقاعدہ تقسیم کرکے قبضہ دے کر ہبہ کیا ہو تو پھر قبضہ سے ہبہ تام ہوکر فریقِ ثانی کی ملکیت باقی نہیں رہتی اس لیے کوئی شخص کسی دوسرے شخص کی متنازعہ جائیداد پر مصالحت نہیں کرسکتا اور نہ کسی دوسرے کو اس کی جائیداد دے سکتا ہے اگرچہ باپ بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔

قال العلامة الکاسانیؒ: ومنها ان یکون مملوکاً للمصالح حتی انه اذا صالح علی مالٍ ثم استحق من ید المدعی لم یصح الصلح لانه تبین انه لیس مملوکاً للمصالح فتبین ان الصلح لم یصح۔

(بدائع الصنائع ج ۶ ص ۴۸ کتاب الصلح، فصل فی ما شرائط التی المصالح علیه)

تاہم مصالحت کرتے وقت مذکورہ جائیداد کا فریقِ ثانی کی ملکیت کے ثبوت کے لیے باقاعدہ

گواہوں کی گواہی ضروری ہے ورنہ فریقِ ثانی کو اس پر قسم دی جائے گی۔ اگر فریقِ اول کی ملکیت پر گواہ پیش ہو جائیں تو پھر مصالحت قائم رہے گی جس کی پابندی دونوں کے لیے ضروری ہو گی ورنہ پھر فریقِ اول کے مطالبہ پر فریقِ ثانی کو ملکیت سے انکار کرنے پر قسم دی جائے گی اگر فریقِ ثانی قسم کھالے تو مصالحت کا دعویٰ کالعدم رہے گا اور اصل فیصلہ فریقین کے قدیم دعاوی پر ہو گا جس میں مدعی کے لیے گواہ اور گواہ میسر نہ ہونے کی صورت میں مدعیٰ علیہ کو قسم دی جائے گی۔[1]

عقدِ بیع میں اختلاف کے متعلق فیصلہ

سوال :۔ بیاناتِ فریقین

فریقِ اول :۔ میں یہ دعویٰ کرتا ہوں کہ میں نے فلاں محدودہ ۱۳ جریب زمین فریقِ ثانی سے مبلغ ساٹھ ہزار روپے کے عوض خریدی، بیع کے وقت دو ہزار روپے میں نے ادا کیے باقی رقم دو قسطوں میں ادا کرنی تھی، ایک قسط مبلغ تیس ہزار روپے میں نے ادا کر دیئے اور باقی رقم بھی ادا کرنا چاہتا ہوں لہٰذا مجھ سے رقم لے کر میری خریدی ہوئی زمین مجھے دی جائے۔

فریقِ ثانی :۔ میں اقرار کرتا ہوں کہ مذکورہ قطعہ اراضی جو کہ میرے اور میرے بھائی کے درمیان مشترک ہے اپنے بھائی کی اجازت سے فریقِ اول پر فروخت کی ہے لیکن فروخت کرتے وقت میں نے یہ شرط لگائی تھی کہ اگر فلاں قطعہ اراضی جو کہ ایک دوسرے شخص کی ملکیت میں ہے مجھ پر فروخت کرے تو میں بھی یہ زمین فروخت کروں گا، اب چونکہ اُس شخص نے مجھ پر اپنی زمین فروخت نہیں کی لہٰذا میں بھی فروخت نہیں کرتا۔

الجواب :۔ دعویٰ متعلقہ ۱۳ جریب قطعہ اراضی ــــ مُدعی: مشتری (فریقِ اول) مُدعیٰ علیہ: بائع (فریقِ ثانی) فریقین کی بیان کردہ تفصیل کے مطابق اگر مُدعیٰ علیہ کا بھائی کے حصہ میں وکیل بالبیع ہونا میرہن ومسلّم

---

[1] قال العلامة ابن عابدینؒ : فالحاصل ان المدار علی انتفاء الشبهة ظاهرًا وعليه فما يوجد فی دفاتر التجار فی زماننا اذا مات احدهم وقد حرّر بخطه ما عليه فی دفتره الذی يقرب من اليقين انه لا يكتب فيه علی سبيل التجربة والهزل يعمل به۔ (تنقيح الفتاوی الحامدية ج۲ ص۲۱ كتاب الدعوی)

ومثلهٗ فی تقريرات الرافعی ج۲ ص۹۲ كتاب الدعوی۔

[2] لما قال العلامة سليم رستم بازؒ : يشترط ان يكون المصالح عليه مال المصالح وملكه فلو اعطی المصالح مال غيره ليكون بدلًا للصلح فلا يصح صلحه (شرح مجلة الاحكام، المادة ۱۵۴۵ ص۸۳۴ الباب الثانی)

ومثلهٗ فی الهداية ج۳ ص۲۴۲ كتاب الصلح۔

ہو تو تمام قطعہ اراضی کی بیع درست ہے اور اگر یہ ولایت ثابت نہ ہو تو پھر بائع کا اپنے حصے میں بیع درست ہو کر بھائی کے حصے کی بیع بیع فضولی کے حکم میں ہو کر اُس کی اجازت پر موقوف ہے، اگر مذکورہ شرط موجود ہو تو تمام زمین کی بیع درست ہو کر بائع بیع توڑنے کا حق نہیں رکھتا کیونکہ بیع میں مذکورہ شرط نہ تو مقتضیاتِ عقد اور نہ مدعاتِ عقد میں سے ہے کہ جس کا ایفاء ضروری ہے اور نہ اس میں بائع مشتری، مبیعہ کو فائدہ ہے کہ جس کی وجہ سے عقد فاسد ہو جائے۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: المراد بالنفع ما شرط من احد العاقدین علی الآخر فلو علی اجنبی لایفسد ویبطل الشرط لما فی الفتح عن الوجیه بعتك الدار بالف علی یقرضنی فلان الاجنبی عشرة دراهم فقبل المشتری لایفسد البیع لانه لایلزم الاجنبی ولاخیار للبائع۔

(رد المحتار ج ۵ ص۸۵ باب البیع الفاسد، مطلب فی الشرط الفاسد اذا ذکر الخ) [1]

شفعہ کے دعوٰی میں راستہ کا شریک پڑوسی پر مقدم ہے | فریق اوّل۔ فریق ثانی۔ فریق ثالث

تنازعہ: ایک عورت کی طرف سے فریق اوّل پر فروخت شدہ مکان محدود بحدود اربعہ غرباً جائیداد والدہ فریق اوّل، شرقاً راہ خاص فریق اوّل وثالث وغیرہ شمالاً مکان فریق ثالث وجنوباً جائیداد والد فریق اوّل واقع ہے۔

حق تحکیم: مندرجہ بالا فریقین اپنے علاقہ کے معززین کی نگرانی میں دارالعلوم حقانیہ حاضر ہوئے، مذکورہ جملہ فریقین تنازعہ کے تصفیہ کے بارے میں قرآن وحدیث کی روشنی میں فیصلے کے لیے سرِ تسلیم خم کر کے تیار ہوئے اور تحریری طور پر حلفیہ بیان دے کر قرآن وحدیث کی روشنی میں فیصلہ ماننے کے لیے تیار ہوئے۔

تنقیحات: جملہ فریقین سے فرداً فرداً بحضور فریق آخر بیان لیا گیا اور تحریر میں لاکر ہر ایک سے دستخط لیے گئے، فریقین کے بیانات کی روشنی میں جو تنقیحات سامنے آئیں

---

[1] قال العلامہ ابن نجیمؒ: وفی المنتقی قال محمدؒ کل شئ یشترطه المشتری علی البائع یفسد به البیع فاذا شرطه علی اجنبی فهو باطل ای فالشرط باطل کما اذا اشتری دابة علی ان یهبه فلان الاجنبی کذا فهو باطل کما اذا شرط علی البائع ان یهبه وکل شئ یشترطه علی البائع لایفسد به البیع فاذا شرطه علی اجنبی فهو جائز وهو بالخیار۔ (البحر الرائق ج ۶ ص۸۶ باب بیع الفاسد)

ومثله فی شرح المجلة للعلامة سلیم رستم باز اللبنانیؒ تحت المادة ۱۸۹ ص۸۹۔

وہ مندرجہ ذیل ہیں :۔

(۱) فریق اوّل جس نے یہ مکان خریدا ہے وہ خریدے ہوئے مکان کے راستہ میں شریک ہے جبکہ فریق ہذا اور ثالثان کے بیان کے مطابق راہ عام سے جو خاص راستہ جدا ہو کر آگے آتا ہے تو فریق ثالث وغیرہ کے مکان سے گذر کر متنازعہ فروخت شدہ مکان اور فریق اوّل کے گھر کی طرف جاتا ہے جس میں فریق ثالث بھی آمدورفت رکھتا ہے لیکن ثالثان کے بیان کے مطابق یہ صرف تین اشخاص کا مخصوص راستہ ہے، بایں معنیٰ یہ کسی عام شخص کو اس راستہ پر آمدورفت کا حق حاصل نہیں گویا یہ ایک خاص راستہ ہے۔

(۲) فریق ثانی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مکان ھٰذا میں کسی قسم کی شرکت کا دعویٰ نہیں رکھتا اور نہ اس مکان کا پڑوسی ہے بلکہ محض اس وجہ سے شفعہ کا دعویٰ کرتا ہے کہ مکان ھٰذا میرے بھائی کی ملکیت تھا جس کا میں وارث ہوں، یہ مکان میرے بھائی کو باپ دادا سے وراثت میں ملا تھا جو کہ فروخت ہوتے وقت صرف اور صرف میرا حق ہے اس لیے میری اجازت کے بغیر کسی دوسرے کو مکان لینے کا حق حاصل نہیں۔

(۳) فریق ثالث کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مکان مذکورہ میں شفعہ کا دعویٰ ہمسایہ ہونے کی وجہ سے کرتا ہے جس کے لیے طلبِ مواثبت اور طلبِ اشہاد کے جملہ مراحل کی تکمیل کا دعویدار ہے اگرچہ فریق اوّل موصوف کے مکان اور متنازعہ مکان کے درمیان مسجد کیلئے باقاعدہ وقف راستہ بیان کر کے ہمسایہ ہونے سے انکار کرتا ہے لیکن فریق ثالث اس پر قائم ہے کہ میں نے اس راستہ پر گذرنے کی ان لوگوں کو عارضی اجازت دی تھی لیکن جب انہوں نے مجھ سے باقاعدہ وقف کا مطالبہ کیا اور میں نے انکار کیا تو اس کے بعد اس راستہ کو فریق اوّل یا کسی دوسرے نے استعمال نہیں کیا چنانچہ موصوف اس راستہ کے نہ ہونے پر مُصر ہے اور یوں اپنا مؤقف مضبوط کر رہا ہے کہ فروخت شدہ مکان سے میرے گھر کی دیوار متصل ہے جس سے مجھے ہمسایہ ہونے کی حیثیت سے زیادہ حق حاصل ہے۔

<u>حقیقتِ حال</u> :۔ مذکورہ تنقیحات کی روشنی میں یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ فروخت شدہ مکان جس کے جنوب میں فریق ثالث کا مکان واقع ہے، اس کے بیان کے مطابق وہ جار ملاحق یعنی جُڑا اور ملا ہوا پڑوسی ہے جبکہ فریق اوّل متنازعہ مکان کے راستہ میں شریک ہے بایں معنیٰ کہ یہ راستہ عام نہیں بلکہ خاص راستہ ہے جس میں صرف اس گلی میں رہنے والے شرکاء کو آمدورفت کا حق حاصل ہے

کوئی عام شخص اس راستہ کو اُن کی اجازت کے بغیر استعمال کرنے کا مجاز نہیں ۔

فقہی نظائر :۔ حدیث کی رُو سے جہاں کسی کو شفعہ کا حق دیا گیا ہے تو اس میں راستے کی شرکت کو بڑی اہمیت دی گئی ہے کہ راستہ میں شریک کو دوسرے پڑوسی پر سبقت حاصل ہوگی اسلئے کہ وہ بیع کے حقوق میں شریک ہے لہٰذا جب تک شریک فی حقوق المبیعہ دعویدار ہو تو پڑوسی کو شفعہ کا حق نہیں دیا جاتا ۔

کما فی الحدیث: عن جابر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الجار احق بشفعتہ ینتظر لھا وان کان غائباً اذا کان طریقھما واحداً۔ رواہ الترمذی۔ (مشکوٰۃ ج ۱ ص ۲۵۷ باب الشفعۃ)

خاص کر وہ راستہ جو خاص افراد کے لیے مخصوص ہو جس راستہ پر گلی میں رہنے والوں کی اجازت کے بغیر کسی دوسرے عام اشخاص کو آمدورفت کا حق حاصل نہ ہو تو وہ خاص راستہ کہلاتا ہے ۔

لما قال العلامۃ سلیم رستم باز : الطریق الخاص ھو الزقاق الذی لاینفذ ای کما انہ لوفتح اصحاب الطریق الخاص منفذاً وَوَصَلُوْہُ بالطریق العام کان لھم ان یمنع غیرھم من المرور فیہ ۔ (شرح المجلۃ مادۃ ۹۰۷ ص ۵۳۷ کتاب الشفعۃ)

اس حالت میں جو لوگ گلی کے شروع میں رہتے ہوں ان کا استحقاق ختم ہوجاتا ہے جبکہ گلی کے آخر میں رہائش رکھنے والے کو پوری گلی میں آمدورفت کا حق حاصل ہوتا ہے ۔

لما قال العلامۃ المرغینانی: فان کانت سکۃ غیرنا فذۃ ینشعب فیھا سکۃ غیر نافذۃ وھی مستطیلۃ فبیعت داراً فی السفلیٰ فلاھلھا الشفعہ خاصۃ دون اھل العلیا ۔

(الھدایۃ ج ۴ ص ۳۸۹ کتاب الشفعۃ)

پڑوسی بلاشک وشبہ شفعہ کا حق دار ہے لیکن یہ تب ہے کہ اس میں حق رکھنے والا شریک فی حقوق المبیعہ نہ ہو جیسا کہ شریک فی نفس المبیعہ کو شریک فی حقوق المبیع پر سبقت حاصل ہے ۔

لما قال العلامۃ سلیم رستم باز :۔ حق الشفعۃ اولاً للمشارک فی نفس المبیع ثانیاً للخلیط فی حق المبیع ثالثاً للجار الملاصق وما دام الاول طالباً لیس للآخرین حق الشفعۃ وما دام الثانی طالباً فلیس للثالث حق الشفعۃ ۔ (مجلۃ الاحکام ۔ المادۃ ۱۰۰۹ ص ۵۶۴ کتاب الشفعۃ)

شرعی فیصلہ :۔ ان تنقیحات، حقیقتِ حال اور فقہی نظائر کی روشنی میں یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ فریق اوّل جس نے یہ مکان باقاعدہ بیع قطعی سے خریدا ہے یہ سکۃ غیر نافذہ یعنی خاص راستہ میں اس گھر کی شرکت کا حق رکھتا ہے اور فریق ثالث نے اگرچہ اپنا پڑوس ثابت کرتے ہیں

کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا لیکن پڑوسی ثابت ہونے کے باوجود خاص راستہ میں شرکاء کا حق اس سے زیادہ ہے جبکہ فریقِ ثانی کا محض بھائی ہونے کے ناطہ سے شفعہ کا دعویٰ بے بنیاد ہے اس کا کوئی حق نہیں، اس لیے فریقِ اوّل کے معاملہ خرید کو درست تسلیم کر کے مکان اس کے قبضہ میں رکھا جائے یہی فریقِ اوّل اس کا زیادہ حقدار ہے [۱]

فریقین میں سے ہر ایک کا زمین پر ملکیت اور قبضہ کے دعویٰ کا جائزہ

دعویٰ بابت اراضی

بیان فریقِ اوّل: میرے والد نے یہ زمین فریقِ ثانی کے والد سے خریدی ہے اس لیے یہ میری ملکیت ہے اور فی الحال میں نے فریقِ ثانی کو اجارہ پر دی ہے جبکہ اس کا قبضہ میرے پاس ہے۔

بیان فریقِ ثانی: میرے والد نے یہ زمین فریقِ اوّل کے والد پر فروخت نہیں کی پہلے ہی سے اس پر میری ملکیت چلی آرہی ہے اور زمین میرے قبضہ میں ہے، یہاں تک کہ ہائیکورٹ نے بھی میری ملکیت تسلیم کی ہے۔

تنقیحات: دونوں فریق مذکورہ زمین پر ملکیت اور قبضہ کا دعویٰ کرتے ہیں، فریقِ اول تو اس وجہ سے ملکیت کا دعویٰ کرتا ہے کہ اس کے والد نے یہ زمین فریقِ ثانی کے والد سے خریدی ہے اور فی الحال محض اجارہ پر دی ہے۔ فریقِ ثانی اس وجہ سے زمین پر ملکیت کا دعویٰ کرتا ہے کہ یہ زمین اس کو اپنے والد سے وراثت میں ملی ہے اور وہ فریقِ اول پر فروخت کرنے سے انکار کرتا ہے، مزید برآں اپنے دعویٰ کے اثبات کے لیے ہائی کورٹ کا فیصلہ بھی پیش کرتا ہے۔

طریقِ فیصلہ: اگر واقعی ہائی کورٹ نے فریقِ ثانی کی ملکیت تسلیم کی ہو تو اس فیصلے پر

---

[۱] (۱) قال العلامة المرغینانیؒ: فالطریق الخاص ان لا یکون نافذاً۔ (الهدایة ج ۴ ص ۳۸۸ کتاب الشفعة)

(۲) قال العلامة ابن نجیمؒ: ولذا لو بیعت دار فی القصوی لم یکن لاهل الاولیٰ شفعة بخلاف اهل القصوی۔ (البحر الرائق ج ۷ ص ۳۱ باب التحکیم)

(۳) قال العلامة المرغینانیؒ: الشفعة واجبة للخلیط فی نفس المبیع ثم للخلیط فی حق المبیع کالشرب والطریق ثم للجار۔ (الهدایة ج ۴ ص ۳۸۷ کتاب الشفعة علی الصفحة الاولیٰ من المجلد الرابع)

عملدر آمد کیا جائے گا اس لیے اگر قبضہ فریقِ ثانی کے پاس نہ ہو تو حقِ قبضہ بھی اس کو دیا جائے گا اور اگر ہائی کورٹ نے فریقِ ثانی کی ملکیت تسلیم نہ کی ہو تو اگر فریقِ اوّل کے پاس گواہ موجود ہوں تو اس کے مطابق فیصلہ فریقِ اول کے حق میں کیا جائے گا اور اگر فریقِ اوّل گواہ پیش کرنے سے عاجز ہو جائے تو فریقِ ثانی چونکہ والد کے شراء سے انکار کرتا ہے اس لیے فریقِ ثانی کو اس کے علم پر قسم دی جائے گی کہ اُسے یہ معلوم نہیں کہ اس کے والد نے یہ زمین فروخت کی ہے یا نہیں، اگر اس نے قسم اٹھالی تو زمین پر اس کی ملکیت ثابت ہو جائے گی اور قبضہ بھی اس کو دیا جائے گا اور اگر اس نے قسم اٹھانے سے انکار کیا تو فیصلہ فریقِ اول کے حق میں کیا جائے گا۔

لما قال العلامة التمرتاشیؒ : والتحلیف علیٰ فعل غیرہ یکون علی العلم ای انہ لا یعلم کذٰلک لعدم علمہ بما فعل غیرہ۔ (تنویر الابصار علیٰ ہامش رد المحتار ج۴ ص۴۳۷ کتاب الدعویٰ) [۱]

فریقین میں سے ہر ایک کا دوسرے کی مقبوضہ جائیداد میں ملکیت کے دعویٰ کا جائزہ

دعویٰ بابت الاراضی

بیان مُدعی: میں دعویٰ کرتا ہوں کہ مذکورہ اراضی محدود بحدود اربعہ جو کہ شرقاً زرد مٹھی تک، غرباً سبز درخت تک، جنوباً زیتون کے درخت تک اور شمالاً ندی سے نیچے تک ہے یہ میری ملکیت ہے جس نے اس پر قبضہ کیا ہے یہ ظالمانہ قبضہ ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ چار اشخاص نے میری زمین کی تحدید کے وقت اس پر قسم کھائی ہے اور خود مجھ سے بھی اس پر قسم لی گئی ہے۔

بیان مُدعیٰ علیہ: میں کہتا ہوں کہ مدعی دعویٰ کا کوئی حق نہیں رکھتا بلکہ اس نے میری زمین کو ظالمانہ طور پر قبضہ میں رکھا ہوا ہے جو مشترکہ پہاڑی تک میرا حق ہے اور میری طرف سے اس پر چار اشخاص نے قسم بھی کھائی ہے اور مجھ سے بھی اس پر قسم لی گئی ہے۔

فریقِ اول : مُدعی ——— فریقِ ثانی : مُدعیٰ علیہ

---

[۱] قال العلامة قاضی سماوۃؒ : لو وقع الدعوٰی علیٰ فعل الغیر من کل وجہ یحلف علی العلم حتیٰ لو ادعیٰ علیٰ وارث ان اباک اتلفہ او سرقہ او غصبہ متی یحلف علی العلم ہٰذا مذہبنا۔

(جامع الفصولین ج۱ ص۱۴۰ الفصل الخامس عشر فی التحلیف وما یتعلق بہ)

وَ مِثْلُہٗ فی فتاویٰ قاضی خان ج۲ ص۴۱۴ کتاب الحدود۔

حقِ تحکیم:۔ مندرجہ بالا فریقین نے علاقہ کے معززین کی سرپرستی میں دارالعلوم حقانیہ حاضر ہو کر اپنے فیصلے کے لیے علماء کی ایک کمیٹی تشکیل دینے کی درخواست کی اور اپنے تنازعہ کے تصفیہ کے بارے میں قرآن وسنت کی روشنی میں فیصلے کے لیے تیار ہو کر سرِ تسلیم خم کر کے علماء کی کمیٹی کو موقع دکھلانے کی خاطر اپنے علاقہ میں لے گئے، علماء کی کمیٹی نے موقع پر جا کر متنازعہ اراضی کا معائنہ کیا، چونکہ فریقین نے پہلے ہی سے ایک ثالث کو اپنے بیانات قلم بند کرائے تھے اس لیے اپنے سابقہ بیانات پر اکتفاء کرتے ہوئے مزید نئے بیانات دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی، کمیٹی نے فریقین سے بیانات کے متعلق کچھ اہم سوالات پوچھے تاکہ فریقین کی طرف سے بیانات سمجھنے میں ممد ومعاون ہو سکے۔

تنقیحات:۔ دونوں فریقوں کے بیانات سے چند امور معلوم ہوئے:۔

(۱) فریق اول نے اپنے بیان کی رُو سے جس محدودہ زمین کا دعویٰ کیا ہے اس میں کچھ زمین ایسی ہے جس پر فریق مخالف کا قبضہ ہے۔

(۲) فریق ثانی کے بیان کی رُو سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے صرف یہ نہیں کہ مُدعی کے دعویٰ کا رَد کیا ہے بلکہ اس کے ساتھ ایسی زمین کا دعویٰ بھی کیا ہے جس پر فریق اول یعنی مُدعی قابض ہے، گویا اندریں صورت دونوں فریق ایک دوسرے کے دعوؤں کے رَد کے علاوہ کچھ زائد ایسی زمین کا دعویٰ کر رہے ہیں جس پر دوسرا فریق قابض ہے، اگرچہ موقع دیکھنے سے یہ معلوم ہوا کہ فریقین کے دعاوی میں وسعت سے کام لیا گیا ہے۔

حقیقتِ حال:۔ دونوں فریق ایک دوسرے کے قبضہ کو غاصبانہ اور ظالمانہ جیسے الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں جبکہ فریقین کے درمیان نسبتی قرابت بھی قائم ہے، چونکہ فریقین قریبی نسل میں ایک جد پر ملتے ہیں، قرب وجوار کے حالات، موقع دیکھنے اور دوسرے قرائن پر نظر ڈالتے ہوئے یہ حالات سامنے آتے ہیں کہ فریقین کے درمیان یہ تنازعہ کسی خانگی دشمنی کا نتیجہ ہے ورنہ دونوں فریق کچھ عرصہ قبل تک ایک دوسرے کے ساتھ امن وامان کے ساتھ رہ رہے تھے یہاں تک کہ دونوں فریقوں کے مُردے بھی ایک ہی قبرستان میں دفن ہوتے تھے، غم اور خوشی میں ایک دوسرے سے باہمی مشارکت قائم تھی، فریقین کے دعوؤں کو دیکھ کر یہ کہا جاتا ہے کہ ہر فریق اپنے اپنے ارث کا دعویٰ کر رہا ہے، گویا ہر ایک فریق اس بات پر اصرار کرتا ہے کہ یہ زمین مجھے میرے باپ دادا سے وراثت میں ملی ہے اور دُوسرے

فریق کا اس میں کوئی حق نہیں۔

فقہی نقطہ نگاہ سے اختلاف کا جائزہ:۔ از روئے شرع ایسی حالت میں جہاں دو فریق کسی جائیداد پر قابض ہو کر ایسی جائیداد پر وراثت کی وجہ سے ملکیت کا دعویٰ کرے کہ وہ مخالف فریق کی ملکیت میں ہو تو اس دعویٰ کو دعویٰ رجلین سے تعبیر کیا جاتا ہے، ایسی حالت میں طرفین سے گواہ طلب کیے جاتے ہیں لیکن مذکورہ تنازعہ میں بظاہر گواہوں کی گواہی مشکل ہے کیونکہ احوال سے معلوم ہوتا ہے کہ علاقہ کی تمام قوم قولاً یا فعلاً دونوں فریقوں کی طرفداری میں بھٹک گئی ہے، یہاں تک کہ قرب وجوار میں رہنے والے اور حالات سے واقف لوگ حقیقتِ حال کے اظہار سے چشم پوشی پر مجبور رہیں۔ اور جو قوم ثالث کی حیثیت سے کردار ادا کر رہی ہے اس کو صحیح حالات کا علم نہیں، علاوہ ازیں اس علاقہ میں کوئی غیر قوم جو کہ دعویٰ میں شریک نہ ہو کسی دوسری قوم کے لیے گواہی دینے کے لیے تیار نہیں ہوتی کیونکہ اس سے آپس میں دشمنی کی بنیاد پڑتی ہے، خاص کر جب گواہی میں قسم کھا کر بیان دینا ہو تو اس کے لیے عام لوگوں میں سے کوئی بھی تیار نہیں ہوتا جبکہ قسم کھا کر بیان دینے کا دوسرا نام گواہی ہے، اس لیے جب گواہ میسر نہ ہو تو پھر دوسرے کے دعویٰ کو دفع کرنے کے لیے مدعی کے مطالبہ پر مدعیٰ علیہ کو قسم دی جاتی ہے۔

لما قال العلامة المرغینانیؒ، وان عجز عن ذٰلك وطلب یمین خصمه استحلف علیها لما روینا ولا بد من طلبه لان الیمین حقه انه کیف اضیف الیه بحرف اللام فلا بد من طلبه۔ (الهدایة ج۳ ص۲۰۱ کتاب الدعوٰی)

اور خاص کر ایسی صورت میں جب دونوں قابض بھی ہوں اور ایک دوسرے کی مقبوضہ جائیداد کا دعویٰ کر رہے ہوں تو ایسی حالت میں ہر ایک قسم کھانے کے بعد دوسرے کو اپنے اپنے حصہ پر بحال رکھا جاتا ہے۔

لما قال العلامة سلیم رستم بازؒ: ادعیا ملکاً ارثاً من ابیهما والعین فی ایدهما وفیه ایضاً ان لم یوء رخا یقضی بینهما او ارخا تاریخاً واحداً یقضی بینهما۔

(شرح مجلة الاحکام۔ المادة ۱۷۶۱ ص۱۱۲۵ الفصل الثانی)

آخری فیصلہ:۔ ان حالات کی روشنی میں یہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ دونوں فریقوں کی قوموں سے پانچ پانچ افراد منتخب کیے جائیں اور طرفین سے منتخب شدہ افراد دوسرے فریق

کے حق نہ ہونے پر قسم اٹھائیں اور جو جائیداد دونوں قوموں کے قبضہ سے باہر ہو تو قسم اٹھانے کے بعد وہ فریقین کے درمیان مساوی طور پر تقسیم کی جائے گی اور جو نقصانات ہوئے ہوں اس کا جبیرہ کیا جائے گا۔[1]

قدیم راستہ میں تنازعہ کے متعلق فیصلہ

سوال: (بیانِ فریقِ اول) ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہمارے پڑوسی کے مشرقی جانب اخیر میں ہمارے کھیتوں اور مکانات کا ایک قدیم راستہ تھا جس پر لوگوں کی آمد و رفت ہوتی تھی، اس کے مغربی جانب ایک بڑی ندی بھی تھی اور اس راستے کے کنارے درختوں کا ایک جھاڑ بھی تھا جو کہ اب بھی موجود ہے۔ یہ راستہ ندی کے ساتھ ساتھ پڑوسی کی زمین سے گذر کر جنوب کی طرف ایک بڑے کنوئیں سے گذرتا تھا، کچھ عرصہ سے لوگوں کی اس راستہ پر آمد و رفت کم ہونے کی وجہ سے پڑوسی نے رفتہ رفتہ اس راستہ کو ختم کرنا شروع کیا، یہاں تک کہ راستہ بالکل بند ہوگیا، اس پر ہم نے راستے پر آمد و رفت اور اس کی وسعت کا مطالبہ کیا لیکن پڑوسی نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا، اس لیے ہمیں اپنے قدیم راستے پر گذرنے اور اس کو وسیع کرنے کا حق دیا جائے۔

(بیانِ فریقِ ثانی) میری زمین میں کوئی قدیم راستہ نہیں البتہ کچھ عرصہ قبل میری زمین میں ایک راستہ تھا اور اس پر لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی لیکن میں نے بطور احسان ان کو یہاں سے گذرنے کی اجازت دی تھی، کیونکہ زمین خریدتے وقت مجھے نہ تو یہاں قدیم راستے کی نشاندہی کی گئی اور نہ اس میں کسی قدیم راستے کے نشانات موجود تھے، لہٰذا میری زمین میں قدیم راستے کا دعویٰ بے جا ہے، اس لیے مجھے یہ حق حاصل ہے کہ اپنی زمین میں لوگوں کو

---

[1] قال العلامة سلیم رستم بازؒ: فاذا ظهر المدعی العجز عن اثبات دعواه حلف المدعیٰ علیه بطلبه۔ (شرح مجلة الاحکام۔ المادة ۱۷۴۲/۱۰۹۳ الفصل الثالث فی التحلیف)

وفی الهندیة: دارٌ فی یدی رجل ادعاها رجلان کل واحد منهما یدعی انها داره ورثها عن ابیه فلانٌ واقام علیٰ ذٰلك بینةً فان لم یؤرخا او ارخا وتاریخهما علی السواء یقضیٰ بها بینهما۔ (الفتاوی الهندیة ج ۴ ص۷۷ الباب التاسع، الفصل الثانی فی دعوی الملك فی الاعیان)۔

گذرنے سے روک لوں۔

الجواب:- مندرجہ بالا فریقین کے بیاناتِ موقعہ اور معززینِ قوم کی شہادت کی روشنی میں یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ فریقِ اول جس راستے کا دعویٰ کرتا ہے وہ راستہ چند مہینوں اور سالوں کا بنایا ہوا نہیں ہے بلکہ یہ قدیم مُدت سے قائم ہے، بلکہ بعض معمر افراد کے بیانات کے مطابق پچاس ساٹھ سال یہ لوگ اس راستے کو استعمال کرتے رہے بلکہ فریقِ اوّل جس راستہ کی نشاندہی کر رہا ہے اس پر درختوں کی باڑ بھی قائم ہے خاص کر ندی سے گذر کر قدیم راستے کی نشاندہی جس مقام سے ہو رہی ہے وہاں درخت کھڑے ہیں اور اس سے آگے گذر کر جس کنوئیں کے قرب وجوار سے راستہ گذرنے کا کہا جا رہا ہے وہاں پر بھی موجودہ وقت میں کسی قدیم راستے کی نشاندہی نہیں ہوتی، اس کے مقابلے میں مطلوبہ راستہ پر آمدورفت کا اقرار خود فریقِ ثانی کچھ مدت سے کر رہا ہے، اگرچہ یہ لوگ (فریقِ ثانی) یہ بھی کہتے ہیں کہ اس زمین کے خریدنے کے وقت ہمیں کسی قسم کے راستہ کی نشاندہی نہیں کی گئی، لیکن از رُوئے شرع جو راستہ پہلے سے قائم ہے اس کو اپنی اصلی حالت پر رکھا جائے گا اور اس راستے سے منع کرنے کا حق فریقِ ثانی کو حاصل نہیں جبکہ ابھی تک یہ راستہ آمدورفت کے لیے استعمال ہو رہا ہے اس کو اپنی اصلی حالت پر چھوڑ کر آئندہ کیلئے بھی آمدورفت کیلئے استعمال کیا جائے گا۔

قال العلامة سلیم رستم باز: اذا کان لرجلٍ نهر فی ارض رجلٍ او میزاب فی دار رجلٍ فاختلفا فی ذلك وانکر صاحب الارض والدار ثبوت حقه فالقول قوله وعلی المدعی البینة ان له حق السیل الاجراء الماء فیه الا اذا کان الماء جاریا زمان الخصومة فحینئذٍ القول قول صاحب الماء. (شرح المجلة، المادة ۱۷۷۷ ص۱۱۵۰ کتاب الدعوی۔ الفصل الثالث)[1]

تاہم موجودہ راستہ سے مغربی جانب فریقِ ثانی کی زمین کی طرف تصرف نہیں کیا جائے گا اگر راستہ میں وسعت کی ضرورت پڑے تو مشرقی جانب ندی کو استعمال میں لایا جائے گا۔

---

[1] قال العلامة برهان الدین المرغینانیؒ: اذا کان نهر لرجلٍ یجری فی ارض غیره فاراد صاحب الارض ان لا یجری النهر فی ارضه ترك علی حاله لانه مستعمل له باجراء مائه فعند الاختلاف یکون القول قوله۔ (الهدایة ج۴ ص۴۸۶ کتاب احیاء الموات۔ فصل فی الدعوی والاختلاف)

ومثلُهُ فی الهندیة ج۵ ص۴۰۲ الباب الرابع فی الدعوی فی الشرب۔

گواہوں پر جرح کے متعلق قاضی کے فیصلے کا جائزہ

سوال: (بیانِ مدعی) میں یہ دعویٰ کرتا ہوں کہ فلاں شخص نے میرے گھاس کے ڈھیر میں عمداً زہریلی دوائی ڈالی جس سے میری ایک بھینس، ایک گائے اور ایک بچھڑا ہلاک ہو گئے، اور اس شخص نے لوگوں کے سامنے اقرار بھی کیا ہے کہ میں نے مدعی کے گھاس کے ڈھیر میں زہریلی دوائی ڈالی ہے۔

(بیانِ مدعیٰ علیہ) میں نے مدعی کے گھاس میں نہ زہریلی دوائی ڈالی ہے اور نہ لوگوں کے سامنے اقرار کیا ہے۔

فیصلہ قاضی: مدعی نے اپنے دعویٰ پر دو گواہ پیش کئے اور انہوں نے گواہی دی کہ ہمارے سامنے مدعیٰ علیہ نے اقرار کیا ہے کہ میں نے مدعی کے گھاس کے ڈھیر میں زہریلی دوائی ڈالی ہے اور مدعی کے مویشی میں نے ہلاک کئے ہیں۔ اس کے بعد مدعیٰ علیہ نے چار گواہ پیش کیے لیکن قاضی صاحب نے یہ کہا کہ جرح کے گواہ شریعت میں منع ہیں، اس لیے فیصلہ مدعی کے گواہوں پر ہوگا۔ تو کیا قاضی صاحب کا یہ فیصلہ درست ہے یا نہیں؟

الجواب: قضاء کا معاملہ چونکہ حساس نوعیت کا حامل ہے اس لیے قاضی کو پورے احساسِ ذمہ داری کے ساتھ ہر مسئلے کو حل کرنا چاہیئے، چنانچہ ہر فیصلہ کی حقیقتِ حال تک پہنچنے کے لیے شریعت نے زرّین اصول مرتب کیے ہیں تا کہ اس بارے میں ہر کسی کی تسلّی ہو جائے اور کوئی بھی فریق عدمِ اطمینان کا شکار نہ ہونے پائے۔ چونکہ فریقین کے درمیان کسی تنازعہ کے فیصلہ میں مدعی کے گواہوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے، اس لیے اس کے گواہوں کا شریعتِ مطہرہ کی بیان کردہ صفات کا حامل ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا مذکورہ بالا صورت میں اگر قاضی کے ہاں مدعی کے گواہوں کی تعدیل ثابت ہو چکی ہو اور وہ پُر اعتماد ہوں تو ان گواہوں پر مدعیٰ علیہ کو جرح وغیرہ کا حق نہیں ہے بلکہ قاضی ان گواہوں کی گواہی کے موافق فیصلہ کرے گا، اور اگر پہلے سے مدعی کے گواہوں کی تعدیل ثابت نہ ہوئی ہو تو پھر مدعیٰ علیہ کو گواہوں پر جرح کا حق حاصل ہے۔

لما قال العلامة علاؤ الدین الحصکفی رحمه الله: لا تقبل الشهادة علیٰ جرح مجرد من اثبات حق للہ تعالیٰ او للعبد بعد التعدیل ولو قبله قبلت ای الشهادة

بل الاخبار ولو من واحد علی الجرح المجرد ۔ (الدر المختار علیٰ ہامش رد المحتار ج ۴ ص ۴۲۸ کتاب الشہادات، باب القبول وعدمہ) [1]

سوال — نوے سال سے قابض زمین پر ملکیت کے دعویٰ کے متعلق فیصلہ
دعویٰ بابت اراضی

بیان فریق اوّل: ۔میں یہ دعویٰ کرتا ہوں کہ فریقِ ثانی نے ساٹھ ستر سال سے ہماری پدری جائیداد کے ایک قطعہ اراضی پر ناجائز قبضہ کر رکھا ہے اور اس قطعہ اراضی کا کچھ حصہ کسی اور شخص پر فروخت کر دیا ہے، لہٰذا فروخت شدہ قطعہ اراضی اور فریقِ ثانی کے زیرِ تصرّف زمین میری ہے ۔

بیان فریقِ ثانی: یہ قطعہ اراضی ہمارے دادا نے فریقِ اوّل کے دادا سے خریدا تھا جو کہ نوے سال سے ہمارے قبضہ میں ہے اور اس سے فائدہ حاصل کر رہے ہیں، چالیس سال قبل اس سے کچھ حصہ ہم نے ایک شخص پر فروخت کیا اور بیع پر خبردار ہونے کے باوجود مدعی نے کوئی دعویٰ نہیں کیا ۔

ان بیانات کو مدنظر رکھتے ہوئے فیصلہ کس طرح کیا جائے گا؟

الجواب: ۔شرعی اصول کے تحت اوّلاً یہ معلوم کیا جانا چاہیئے کہ فریق اوّل نے دعویٰ کرنے میں اتنی تاخیر کیوں کی ہے؟ اگر اس نے دیدہ دانستہ بلا عذر دعویٰ میں اتنی تاخیر کی ہو تو اس کا دعویٰ ناقابلِ سماعت ہے، اور اگر اس نے لاعلمی، خوف یا کسی اور شرعی عذر کی وجہ سے تاخیر کی ہو تو پھر اس کا دعویٰ صحیح ہے ۔چونکہ فریقِ ثانی بیع قطعی کا دعویٰ کرتا ہے اسلیئے اس پر لازم ہے کہ اپنے دعویٰ کے اثبات کے لیے سو سالہ دو معتمد گواہ پیش کرے، اگر فریقِ ثانی گواہ پیش کرنے سے عاجز ہو جائے تو پھر فریقِ اوّل کو اس علم پر قسم دی جائے گی کہ کیا تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے دادا نے فریقِ ثانی کے دادا پر زمین فروخت کی تھی؟ اگر

---

[1] قال العلامۃ ابن نجیم المصری رحمہ اللہ: لا تقبل الشہادۃ علی الجرح المجرد اذا اقام البینۃ علی العدالۃ اما اذا لم یقم للبینۃ علیہا فاخبر مخبر ان الشہود فساق او اکلوا الربوا فان الحکم لا یجوز قبل ثبوت العدالۃ لاسیما اذا اخبر مخبر ان الشہود فساق ۔ (البحر الرائق ج ۷ ص ۱۰۱ کتاب الشہادۃ)

وَ مِثْلُہٗ فی شرح المجلۃ للعلامۃ سلیم رستم باز، المادۃ ۱۷۲۴ ص ۱۰۷۱ الفصل السادس ۔

فریق اول قسم اٹھائے تو اس کی قسم پر فیصلہ اس کے حق میں کیا جائے گا اور اگر وہ قسم سے انکار کرے تو پھر فیصلہ فریق ثانی کے حق میں کیا جائے گا۔

قال العلامۃ محمود بن اسماعیل الشہیر بقاضی سماوۃ ؒ: ولو وقع الدعوی علی فعل الغیر من کل وجہ یحلف علی العلم حتی لو ادعی علی وارث ان اباك اتلفہ او سرقہ او غصبہ منی یحلف علی العلم ھذا مذھبنا۔ (جامع الفصولین ج ۱ ص ۱۴۱ الفصل الخامس عشر فی التحلیف ومتعلقہ) لہ

آباؤ اجداد کی شرکت کی وجہ سے ورثاء کا شریک کی جائیداد میں کچھ حصہ پر ملکیت کے دعویٰ کا جائزہ

فریقِ اوّل ـــــ فریقِ ثانی

حقِ تحکیم: فریقین بالا نے برضاء و رغبت اپنے متنازعہ متعلقہ قطعہ اراضی تقریباً ایک سو پچاس جریب مع سرکاری کاغذات شرعی فیصلہ کرانے کیلئے دار العلوم حقانیہ کے دار الافتاء میں پیش ہوئے، ایک معزز شخص کے توسط سے فریقین کو فیصلہ کا پابند رکھنے کے لیے ہر ایک فریق سے تین تین سو روپے بطور ضمانت لئے گئے جو اس معزز شخص کے پاس بطور امانت رکھے گئے اور فیصلہ پر عملدر آمد یقینی ہونے پر طے شدہ تاریخ کے مطابق واپس کر دیئے جائیں گے۔

تنقیحات: فریقین کے بیانات سننے کے بعد مندرجہ ذیل امور سامنے آئے:۔

(۱) فریق ثانی زیر تنازعہ قطعہ اراضی کا قابض ہو کر فریق اوّل اس میں ۴/۱ حصہ کی ملکیت کا دعویدار ہے اور بیان کرتا ہے کہ مدعیٰ علیہ کے آباؤ اجداد سے ہمارے آباؤ اجداد کا مشترکہ کاروبار تھا اور متنازعہ جائیداد مشترکہ کھاتہ سے خریدی گئی ہے جس میں ہمارے باپ مدعیٰ علیہم کے باپ وغیرہ سے ۴/۱ حصہ کا حقدار ہے۔

(۲) فریق اوّل اپنے دعویٰ کے اثبات کے لیے ایک تحریر پیش کر رہا ہے جو مدعیٰ علیہم کے باپ کے نام منسوب ہے جس کے مطابق وہ تسلیم کرتا ہے کہ مدعی کا باپ ہمارے ساتھ اس خریدی ہوئی جائیداد میں برابر کا حصہ دار ہے، اگرچہ سرکاری کاغذات میں نام کا اندراج رہ گیا ہے لیکن وقت مقررہ پر اس کا

لہ قال العلامۃ تمرتاشی ؒ: والتحلیف علی فعل غیرہ یکون علی العلم ای انہ لا یعلم کذلك لعدم علمہ بما فعل غیرہ۔ (تنویر الابصار علی ہامش رد المحتار ج ۴ ص ۴۷۳ کتاب الدعوی) ومثلہ فی فتاوی قاضی خان ج ۲ ص ۴۱۴ کتاب الحدود۔

نام درج کیا جائے گا تاہم تحریر پر موقعہ کی تاریخ ڈالی گئی ہے البتہ بعد میں ۱۹۷۵ء کا سال لکھا ہؤا نظر آرہا ہے جبکہ توثیق ۱۹۸۶ء میں کی گئی ہے۔

(۳) فریق اوّل علاوہ ازیں حاصلات کی وصولی کا بحیثیت مالک ہونے اور اس کی حصہ داری کا دعوٰی کرتا ہے کہ ہم نے مُدتِ دراز تک اس کے حاصلات لیے ہیں جبکہ فریق ثانی محض تبرّع و احسان اور خریداری کے وقت ایک معاہدہ کے تحت کچھ وقت تک اس کی ادائیگی کے قائل ہیں لیکن مُدعیٰ علیہم کے باپ کی موت سے یہ مراعات بھی ختم ہوگئیں، یعنی فریق ثانی کا بیان ہے کہ یہ مراعات ان کو اس معاہدہ کے تحت دی گئی تھیں کہ خریدنے کے بعد زمین کے قبضہ کی وصولی تک وہ اس سے فائدہ اٹھاتے رہے کیونکہ فریق اول کے باپ کے پاس یہ جائیداد اس وقت رہن تھی۔

فیصلہ: از روئے شرع فریق اوّل مُدعی ہے اس لیے دعوٰی کے اثبات کے لیے اُس سے گواہ مانگے گئے لیکن وہ اپنے دعوٰی ملکیت کے اثبات کے لیے گواہ پیش کرنے سے قاصر رہا کیونکہ تحریری بیان پر جن گواہوں کے نام ثبت ہیں ان میں سے حسب بیان مُدعی ایک گواہ مخالف فریق سے تعلقات کی وجہ سے ہمارے لیے گواہی نہیں دیتا جبکہ دوسرا گواہ اکیلے ناکافی ہے اس لیے فریق اوّل یعنی مُدعی کے مطالبہ پر فریق ثانی کو قسم دی گئی، چونکہ یہ دوسرے کے فعل پر قسم ہے اس لیے فریق ثانی کو قسم بالعلم دی گئی[1] قسم کھانے کے بعد جائیداد مذکورہ فریق ثانی کے پاس رہ کر فریقِ اوّل اپنے دعوٰی کے اثبات میں ناکام ہؤا۔

قال العلامة التمرتاشیؒ: والتحلیف علیٰ فعل غیرہ یکون علی العلم ای انه لایعلم انه کذٰلك لعدم علمه بما فعل غیرہ۔ (تنویر الابصار علیٰ ہامش رد المحتار ج ۴ ص۴۷۳ کتاب القضاء)

---

[1] لما قال العلامة محمود بن اسماعیل الشهیر بقاضی سماوہ رحمه الله: ولو وقع الدعوٰی علیٰ فعل الغیر من کل وجه یحلف علی العلم حتیٰ لو ادعیٰ علیٰ وارث ان اباك اتلفه اوسرقه او غصبه منی یحلف علی العلم وهٰذا مذهبنا۔ (جامع الفصولین ج ۱ ص۱۴۰ الفصل الخامس عشر فی التحلیف ومتعلقه)

وَمِثْلُهٗ فی فتاوٰی قاضی خان علیٰ هامش الهندیة ج ۳ ص۴۱۴ باب مایکرہ من الثیاب والحلی والزینة۔

فیصلہ شرعی درباب شفعہ

دعوٰی

مفتاح الدین ولد عبدالمالک سابق سپہ سالار دیر سکنہ مینگلور تحصیل مینگورہ ضلع سوات

بنام

(۱) رحمت اللہ جان ولد نورا جان سکنہ محلہ رحمانیہ نزد رحمانیہ مسجد عیدگاہ میدان مٹھیان کالونی منگھو پیر روڈ کراچی۔

(۲) خان بہادر ولد عبدالمالک سابق سپہ سالار دیر سکنہ مینگلور تحصیل مینگورہ ضلع سوات (مدعا علیہم)

دعوٰی دخلیابی بہ نفاذ حق شفعہ اراضی زرعی مشتمل بہ پانچ قطعات معروف بہ ۱۔ اکس ۲۔ شوتگرہ ۳۔ للمہ ۴۔ جماعت باڑئی ۵۔ ناغہ غبر آباد بحدود ذیل !

قطعہ ۱۔ اکس: شرقاً: اراضی مدعی۔ غرباً: اراضی گل محمود۔ شمالاً: اراضی عبدالظاہر، جنوباً: اراضی محمد ظاہر شاہ برادر مدعی۔

قطعہ ۲۔ شوتگرہ: شرقاً اراضی مفتاح الدین (مدعی)، غرباً: اراضی محمد ظاہر شاہ، شمالاً: اراضی مدعی۔ جنوباً اراضی مدعی۔

قطعہ ۳۔ للمہ: شرقاً: اراضی مدعی۔ غرباً: بارانی ندی نالہ۔ شمالاً: اراضی محمد ظاہر شاہ۔ جنوباً: اراضی محمد ظاہر شاہ۔

قطعہ ۴۔ جماعت باڑئی: شرقاً: اراضی نیک محمد۔ غرباً: اراضی گل اعظم خان۔ شمالاً: اراضی محمد ظاہر شاہ۔ جنوباً: اراضی گل اعظم خان۔

قطعہ ۵۔ ناغہ (غبر آباد) شرقاً: اراضی و مکان مدعی۔ غرباً: اراضی محمد ظاہر شاہ۔ شمالاً: راہ عام۔ جنوباً: اراضی عبدالظاہر واقع شگہ مجد رقبہ سیرائی تحصیل و ضلع دیر بہ ادائیگی اصل زر ثمن مبلغ ایک لاکھ روپے یا جو بھی درست قیمت فاضل عدالت مقرر کرے۔

مالیت دعوٰی بغرض کورٹ فیس و اختیار سماعت مبلغ -/۱۰۰۰۰۰ روپے

بنائے دعوٰی ۹۸/۹/۱۸ کو بیع کا علم و اعلان بر شفعہ اندر حدود تحصیل دیر پیدا ہوئی۔

جناب عالی! گذارشں حسب ذیل ہے :۔

(۱) یہ کہ مُدعا علیہ ۱ نے ہر پانچ قطعات اراضیات متدعویہ ازاں مدعا علیہ ۲ بعوض مبلغ ایک لاکھ روپے (۱۰۰۰۰۰) خفیہ طور پر بیع کی ہوئی ہے اور جملہ لین دین کو اخفاٗ میں رکھ کر حسب قانونِ مروّجہ مُدعی کو قبل از بیع کوئی نوٹس نہ دیا ہے ۔

(۲) یہ کہ مدعا علیہم نے مُدعی کے حقوق کو نقصان پہنچانے کے لیے اگر اپنے خانگی بیع نامہ میں زیادہ رقم درج کی ہو تو وہ فرضی ہو گی، حالانکہ بیع اصل میں ایک لاکھ روپے کے عوض ہوئی ہے اور یہی اراضیات متدعویہ کی بازاری قیمت ہے ۔

(۳) یہ کہ مُدعی کو مذکورہ بیع کا علم مؤرخہ ۹۸/۸/۱۸ کو بوقتِ صبح آٹھ بجے گھر خود بمقام دیر ہو کر اطلاع دہندہ مسمّی عبدالظاہر سکنہ شگی کے رُوبرو فی الفور اور برموقع اپنے حقِ شفعہ کا اعلان کیا، اور ساتھ ہی اسی روز ہمراہ اطلاع دہندہ اراضیات متدعویہ پر جا کر کاشتکارانِ اراضیات مشفوعہ مسمّیان عبدالحمید اور محمد طیب ساکنان شگی کے علاوہ گواہان عباس خان، اجمیر خان وحمید اللہ خان ساکنان سیرائی کی موجودگی میں اپنے حقِ شفعہ کا پھر اعلان کیا ۔

(۴) یہ کہ بعد ازاں بروئے تحریر مؤرخہ ۹۸/۸/۲۲ کو مدعا علیہ ۱ بذریعہ رجسٹری اے ڈی نوٹس بھیج کر جملہ طلباتِ اسلامی پورے کئے ۔ (نقل رسید نوٹس   کارڈ لف ہیں)

(۵) یہ کہ مدعی کا حقِ شفعہ بمقابل مدعا علیہ ۱ ہر لحاظ سے فائق تر ہے ۔

(الف) یہ کہ اراضی متدعویہ خاندانی اراضی ہے ۔

(ب) یہ کہ اراضی متدعویہ کے پیوست مُدعی کی اراضیات ہیں ۔

(ج) یہ کہ اراضیاتِ مشفوعہ کے ساتھ مُدعی کے جملہ حقوق آب نالش و راہ   ہیں ۔

اراضی متدعویہ و مدعی کی اراضیات ایک ہی نالہ سے سیراب ہوتی ہیں ۔

(د) یہ کہ مدعا علیہ ۱ علاقہ میں غیر مالک و نیز غیر باشندہ ہے اور اس کا کوئی بھی وصف حقِ شفعہ نہ ہے ۔

(ہ) یہ کہ مدعی کے حقوق ہر لحاظ سے فائق و برتر ہیں ۔

(۶) یہ کہ ہر چند مدعا علیہم سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ حقوقِ مُدعی کو تسلیم کر کے اراضیاتِ متدعویہ سے بحقِ مدعی بہ ادائیگی اصل زرِ ثمن دستبردار ہو جائے مگر وہ انکاری ہیں جس کی بناء پر

دعویٰ ہذا کی ضرورت لاحق ہوئی۔

(۷) بنائے دعویٰ و مالیت دعویٰ مندرجہ عنوان عرض دعویٰ ہے۔

(۸) یہ کہ اراضیات متدعویہ تحصیل دیر میں واقع ہے اس لیے عدالت ہذا کو اختیارِ سماعت حاصل ہے۔ لہٰذا استدعا ہے کہ ڈگری دخلیابی بہ نفاذ حق شفعہ بہ ادائیگی اصل زرِ ثمن مبلغ ایک لاکھ روپے یا جو بھی قیمت فاضل عدالت ہذا مقرر کرے بہ حق مدعی بمع خرچہ صادر فرمایا جائے۔

العارض

مفتاح الدین ولد عبدالمالک سابق سپہ سالار سکنہ دیر (مدعی)

بیانِ حلفی:۔ حلفاً عرض ہے کہ جملہ مراتب بر عرض دعویٰ درست ہیں۔

جوابِ دعویٰ منجانب مدعا علیہم

جناب عالی! جوابِ دعویٰ ذیل عرض ہے:۔

تمہیدی عذرات:۔

(۱) مدعی کو بہ خلاف مدعا علیہ کوئی بنائے دعویٰ حاصل نہ ہے۔

(۲) دعویٰ مدعی مبہم اور ناقص ہے۔

(۳) دعویٰ مدعی سازشی ہے اور بدنیتی و ایذاء رسانی پر مبنی ہے۔

(۴) حدودات غلط درج کئے گئے ہیں۔

(۵) اراضی متدعویہ مدعا علیہ ۲ و برادر خورد (بہادر زیب) جو کہ فالج کا مریض تھا کا حصہ رسدی ملکیت تھا، مدعی و دوسرے برادران کے خرید نے سے انکار پر مجبوراً علاج کی غرض سے مسمی متذکرہ پر نزد مدعا علیہ ۱ بہ عوض مبلغ تین لاکھ ساٹھ ہزار (۳۶۰۰۰۰ روپیہ) فروخت کی تھی اور یہی اُس وقت اس کی بازاری قیمت تھی۔

(۶) دعویٰ مدعی بوجہ عدم اشتمال ضروری فریق نا قابلِ سماعت و قابلِ اخراج ہے۔

(۷) مدعی کو مبیعہ کا خوب علم تھا اور بر وقت حسب قانون دعویٰ نہ کیا اور اب دعویٰ ھٰذا بہ ایماء عبدالظاہر سازش اور ایذاء رسانی کی خاطر کیا گیا ہے۔

(۸) مدعی نے حسبِ قانونِ شفعہ پورے نہیں کئے ہیں۔

(۹) مدعی بوجہ قول وفعل میں تضاد کے خود مانع دعویٰ ھٰذا ہے۔
(۱۰) بوجہ عدم چسپانگی کورٹ فیس بھی دعویٰ مُدعی ناقابلِ پیش رفت و قابلِ اخراج ہے۔
(۱۱) دعویٰ مُدعی از خود زائد المیعاد ہے۔

واقعاتی عُذرات

(I) فقرہ ۱ جیسا کہ مرتب کردہ ہے غلط اور من گھڑت ہے اور انکار ہے۔ بجواب عرض ہے کہ اراضی متدعویہ مدعا علیہ ۲ و برادر مسمّی بہادر زیب کی حصّہ رسدی ملکیت تھی، مسمّی بہادر زیب فالج کا مریض تھا، کے علاج معالجہ کے لیے بعد از اطلاع و خرید نے سے مُدعی و دیگر برادران کے انکار پر مجبوراً نزد مدعا علیہ ۱ بعوض مبلغ تین لاکھ ساٹھ ہزار روپیہ (۳،۶۰،۰۰۰) فروخت کی گئی، نقل بیعنامہ لف ہٰذا ہے۔
(II) فقرہ ۲ غلط، بلا جواز اور جھوٹ پر مبنی ہے اس لیے انکار ہے، اراضی متدعویہ کی قیمت اُس وقت -/۳،۶۰،۰۰۰ روپے تھی اور یہی اُس وقت اس کی بازاری قیمت تھی۔
(III) فقرہ ۳ بھی غلط، خلافِ قانون و خلافِ شرع ہے، بیانِ حلفی دریں بارہ لف ہے۔
(IV) فقرہ ۴ غلط، خلافِ قانون ہے، مدعی نے حسبِ قانون طلباتِ اسلامی پورے نہیں کیے ہیں۔
(V) فقرہ ۵ کا بہ تفصیل جواب ذیل عرض ہے:۔

(ا) جُز ھٰذا غلط اور بلا جواز ہے۔
(ب) جُز ھٰذا بھی غلط ہے، حدودات غلط درج کیے گئے ہیں۔
(ج) جُز (ج) بھی غلط اور بلا جواز ہے۔
(د) جُز (د) بھی غلط ہے۔
(ہ) جُز (ہ) غلط ہے، مدعی بوجہ تضاد قول وفعل خود مانع عذر ھٰذا ہے۔

(VI) فقرہ ۶ غلط، خلافِ قانون و خلافِ شرع ہے اس لیے انکار ہے اور مدعی کو کوئی بنائے دعویٰ حاصل نہیں۔
(VII) متدعویہ کی قیمت لاکھوں روپے ہے ــــــــــــ اور کورٹ فیس دعویٰ مُدعی ناقابلِ سماعت و قابلِ اخراج ہے۔
(VIII) فقرہ ۸

فیصلہ

اسلامی قانون میں شفعہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے جس کی مشروعیت کسی کے ضرر سے بچنے کے لیے کی گئی ہے۔ اس کا حق صرف تین اشخاص یعنی شریک فی نفس المبیع، شریک فی حق المبیع اور پڑوسی کو حاصل ہے۔

لما قال المرغینانیؒ: الشفعة واجبة للخلیط فی نفس المبیع ثم للخلیط فی حق المبیع کالشرب والطریق ثم للجار۔ (الهدایة ج۴ ص۳۸۷ کتاب الشفعة)

(۱) ان تینوں کو تب حقِ شفعہ حاصل ہوگا کہ علم ہوتے ہی طلب المواثبہ اور ایسے الفاظ کہے جس سے حقِ شفعہ کا مطالبہ کرنا ظاہر ہوتا ہو، اس طلب پر گواہ بنانا ضروری نہیں تاہم بہتر ضرور ہے۔

لما فی الهدایة: اذا علم الشفیع اشهد فی مجلسه ذٰلك علی المطالبة واعلم ان الطلب علیٰ ثلاثة أوجه طلب المواثبة وهو ان یطلبها کما علم حتّٰی لو بلغ الشفیع البیع ولم یطلب شفعته بطلت الشفعة۔ (الهدایة ج۴ ص۳۹ کتاب الشفعة)

آگے لکھتے ہیں: والاشهاد فیه لیس بلازم انما لنفی التجاحد۔ (الهدایہ ج۴ ص۳۹۱ کتاب الشفعة)

قال العلامة البابرتیؒ: والاشهاد فی ذٰلك لیس بشرط۔ العنایة شرح الهدایة

وفی شرح المجلة: ویلزم الشفیع ان یقول کلاماً یدل علی طلب الشفعة فی المجلس الذی سمع فیه عقد البیع فی الحال کقوله انا شفیع المبیع او اطلبه بالشفعة ویقال لهٰذا طلب المواثبة۔ (درر الحکام شرح مجلة الاحکام ج۲ ص۷۸۹ الفصل الثالث)

(۲) طلب المواثبۃ کے بعد شفیع پر طلب التقریر والاشہاد کرنا ضروری ہے، اس کی صورت یہ ہے کہ شفیع بائع یا مشتری یا مشفوعہ زمین وغیرہ کے پاس اپنا طلبِ شفعہ ظاہر کرے اگرچہ خط کے ذریعہ ہی کیوں نہ ہو، مگر بلا عذر شرعی زیادہ تاخیر کرنا مبطل الشفعہ ہے۔

لما فی شرح المجلة: ومدة هٰذا الطلب لیس علی الفور کطلب المواثبة بل هی مقدرة بمدة التمکن من الاشهاد وهٰذا الطلب لا بد منه بعد طلب المواثبة حتّٰی لو تمکن ولو بکتاب او رسول ولم یشهد بطلت شفعته۔ اھ

(شرح المجلة لرستم باز ص۵۹۱ المادة ۱۰۳۰)

اس طلب التقریر پر گواہ بنانا ضروری ہے تاکہ خصم کوئی بات نہ کر سکے۔

لما فی شرح المجلۃ: ویجب علی الشفیع بعد طلب المواثبۃ ان یطلب التقریر وان یشهد بان یقول فی حضور رجلین عند العقار المبیع۔ (درر الحکام شرح مجلۃ الحکام ج۲ ص۷۹۵ کتاب الشفعۃ)
ورنہ دراصل دونوں طلبات میں گواہ بنانا کوئی شرط نہیں۔

لانہ قد جرح فی الخانیۃ والبدائع بان الاشهاد لیس شرطاً فی صحۃ الطلب المذکور بل انما یجب الاشهاد للتمکن من الاثبات باقامۃ الشهود فیما اذا انکر الخصم الذی هو المشتری وقوع طلب التقریر والاشهاد حتی ان الشفیع لو اجری طلب التقریر بلا اشهاد واقر به المشتری وصدقه او نکل المشتری عن الیمین المکلف بها فیثبت ویتحقق طلب التقریر۔
(درر الحکام شرح مجلۃ الحکام ج۲ ص۷۹۵ کتاب الشفعۃ)

(۳) اس سے فراغت کے بعد شفیع پر طلب الخصومۃ ضروری ہے کہ قاضی یا علاقائی مجسٹریٹ کے پاس شفعہ کا دعویٰ دائر کرے، لیکن یہ طلب اس وقت ضروری ہے جب مشتری شفیع کو مشفوعہ زمین دینے سے انکاری ہو، اگر مشتری بغیر عدالتی کارروائی کے شفیع کو مشفوعہ شئے حوالہ کردے تو اس طلب کی کوئی ضرورت نہیں۔

کما فی شرح المجلۃ، ویلزم ان یطلب الشفیع و یدعی فی حضور الحاکم بعد طلب التقریر والاشهاد ویقال لهذا طلب الخصومۃ والتملک یجب علی الشفیع اذا لم یسلمه المشتری العقار المشفوع بعد طلب التقریر والاشهاد ان یطلب الشفعۃ و یدعی فی حضور الحاکم ۔۔۔۔ لو سلم المشتری العقار المشفوع برضائه للشفیع بناء علی شفعته فلا حاجۃ لطلب الخصومۃ بعد۔ (درر الحکام شرح مجلۃ الاحکام ج۲ ص۷۹۶)
اس طلب میں ایک ماہ سے کم تک بلا عذر تاخیر کرنا جائز ہے جبکہ ایک ماہ تک بلا عذرِ شرعی تاخیر مبطلِ شفعہ ہے اور عذرِ شرعی کی وجہ سے کوئی تحدید نہیں۔

لما فی شرح المجلۃ: واخر الشفیع طلب الخصومۃ بعد طلب التقریر والاشهاد من دون عذر شرعی ککونه فی دیار یسقط حق شفعته۔ (درر الحکام شرح مجلۃ الاحکام ج۲ ص۸۰۴ م ۱۰۳۴)

قال البابرتیؒ: معناه اذا ترکها من غیر عذر لانهم اجمعوا علی انه اذا ترک بمرض او حبس او غیر ذلك ولم یمکنه التوکیل بهذا الطلب لا تبطل شفعته وان طالت المدۃ۔ (العنایۃ شرح الهدایۃ .)
لہٰذا مثل کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسمی مفتاح الدین ولد عبدالمالک سابق سپہ سالار دیر نے

درباب شفعہ جملہ شرعی تقاضے پورے کئے ہیں۔

(۱) زمین کی بیان کردہ حدودات سے معلوم ہوتا ہے کہ مسمّی مفتاح الدین ان اراضی میں حق الشرب والطریق کا اشتراک رکھتا ہے اور ساتھ ہی ان اراضی کا جار یعنی پڑوسی بھی ہے، اور یہ تو مذکورہ بالا تصریحات کی روشنی میں حقِ شفعہ کے اسباب ہیں۔

(۲) اور پھر موصوف نے طلب المواثبہ بھی بروقت علم ہوتے ہی کیا ہے اور ساتھ ہی طلب التقریر والاشہاد پر مشفوعہ زمین کے ساتھ کاشتکاران اراضی کے سامنے مسمّی اجمیر خان، عباس اور حمید اللہ خان کو گواہ بنا کر حقِ شفعہ کا اظہار کیا ہے۔ لہٰذا اگر مدعا علیہ رحمت اللہ خان ان طلبات کا منکر ہو اور مذکورہ گواہان مسمّی مفتاح الدین ولد عبدالمالک (مدعی) کی اس طلب التقریر کی گواہی دیں تو دعویٰ قابلِ سماعت ہے۔

(۳) اور طلب الخصومۃ کی دعویٰ میں تاخیر زائد المیعاد نہیں اس لیے کہ ایک ماہ سے کم کی مدت تک بلا عذرِ شرعی تاخیر کرنا بھی مبطلِ شفعہ نہیں جبکہ موصوف نے ایک ماہ سے بھی کم مدت کی تاخیر کی ہے اور باہمی اصلاح وغیرہ کے لیے بھی کی گئی ہے جیساکہ تحریری نوٹس اور علاقائی جرگہ کے بیانِ تحریری سے معلوم ہوتا ہے۔

(۴) اور ساتھ ہی آپ کا یہ مطالبہ مدعا علیہ مسمّی رحمت اللہ خان نے علاقائی جرگہ کے سامنے تسلیم کیا ہے اور جرگہ والوں نے فیصلہ بھی مدعی مفتاح الدین کے حق میں کیا ہے جس پر مرسولہ بیان کی تحریر شاہد ہے۔

لہٰذا ان وجوہات کی بناء پر شریعتِ اسلامی کی روشنی میں اس اراضی کا حقِ شفعہ مدعی مسمّی مفتاح الدین ولد عبدالمالک کو حاصل ہے۔

تاہم اگر مدعیٰ علیہ اس بات پر گواہ پیش کردے کہ مدعی مفتاح الدین ولد عبدالمالک کو ان اراضی کی بیع کی اطلاع طلب المواثبۃ کی تاریخ سے پہلے ہو چکی تھی اور وہ اس پر خاموش رہا یا انکار کیا تو پھر مفتاح الدین کو شفعہ کا حق حاصل نہیں ہے کیونکہ وہ اس کی خاموشی یا انکار سے باطل ہو چکا ہے جیساکہ ماقبل کی تصریحات سے معلوم ہوا ہے۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم۔

راضی نامہ کے بعد دعویٰ کرنا اور مدعا علیہ سے قسم لینا

سوال:۔ غلام رسول، غلام حسین اور بخت رسول تین بھائی ہیں، ان کے مابین کاروباری تنازعہ تھا، مؤرخہ ۱۴ اپریل ۲۰۰۰ء کو ان کے درمیان رُوبرو گواہان یہ فیصلہ بطور راضی نامہ طے پایا کہ آئندہ کے لیے ہم تینوں میں سے جس کے پاس نقد رقم، پنشن اور زرخرید اراضی میں سے جس کے نام پر بیع نامہ ہو وہ سب کچھ اسی کا ہوگا اور ہم میں سے کوئی بھی ایک دوسرے پر کسی قسم کا اعتراض یا دعویٰ وغیرہ نہیں کرے گا، راضی نامہ پر تینوں بھائیوں کے علاوہ گواہوں کے دستخط بھی موجود ہیں۔ اب راضی نامہ کے آٹھ ماہ بعد بخت رسول نے راضی نامہ سے اعراض کرتے ہوئے اپنے بھائی غلام حسین کے خلاف سول جج کی عدالت میں دعویٰ دائر کر دیا ہے کہ غلام حسین کے پاس ہماری مشترکہ رقم اور زرخرید اراضی ہے اگر وہ نہیں مانتا تو قسم اٹھائے کہ میرے پاس مشترکہ رقم اور زرخرید اراضی نہیں ——— اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ بخت رسول کا یہ دعویٰ شرعاً درست ہے؟ اور اس کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ دعویٰ کرکے اپنے بھائی غلام حسین سے حلف لے لے، جبکہ وہ یہ تمام کاروائی صرف اپنے بھائی کو ذلیل و رسوا کرنے کے لیے کر رہا ہے۔ برائے مہربانی قرآن و سنت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں؟

الجواب:۔ قانونِ شرعی کے مطابق جب کسی نزاع کے فیصلہ کا حل درکار ہو تو البینۃ علی المُدعی والیمین علیٰ من انکر (الحدیث) کی رُو سے مُدعی کے ذمّہ اپنے دعویٰ کے اثبات کے لیے گواہوں کا پیش کرنا لازم ہوتا ہے اور اگر مُدعی گواہ پیش کرنے سے قاصر ہو تو مُدعی کے مطالبہ پر مُدعا علیہ سے قسم لی جائے گی۔ یہ کاروائی تب صحیح اور درست ہوگی اور اس طریقے پر فیصلہ تب کیا جائے گا جب دعویٰ قابلِ سماعت ہو۔

صورتِ مسئولہ میں راضی نامہ کے جملہ کاغذات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بخت رسول کا اپنے بھائی غلام حسین کے خلاف یہ دعویٰ اُس صلح اور راضی نامہ کے بعد کا ہے جو ۱۴ اپریل ۲۰۰۰ء کو گواہوں کے سامنے ہوا تھا اس لیے کہ بخت رسول نے اپنا دعویٰ سول جج کی عدالت میں دائر کیا ہے۔ اس لیے شرعاً اس دعویٰ کی کوئی حیثیّت نہیں اور نہ ہی مُدعی کے لیے اپنے دعویٰ کے اثبات کے لیے گواہ پیش کرنے کی ضرورت ہے اور نہ مُدعیٰ علیہ غلام حسین وغیرہ سے یمین (قسم) لینے کی، بشرطیکہ مذکورہ صلح نامہ

شرعی قوانین کے مطابق ثابت کیا جائے۔ اس لیے کہ جب کسی نزاع سے متعلق شرعی قواعد و ضوابط کے مطابق فریقین میں ایک بار صلح ہو جائے تو پھر بدون رضاء فریقین کوئی ایک فریق از خود اس کو فسخ (ختم) نہیں کر سکتا۔ لہٰذا بخت رسول کا راضی نامہ کے بعد غلام حسین پر دعویٰ کرنا شرعاً غیر مسموع اور ناقابل اعتبار ہے اور غلام حسین کو حلف دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

قال العلامة خالد اتاسیؒ: اذا تم الصلح فلیس لواحد من الطرفین فقط الرجوع ویملك المدعی بالصلح بدله ولا یبقی له حق فی الدعوی ولیس للمدعی علیه ایضاً استرداد بدل الصلح۔

(شرح المجلة لخالد اتاسی ج۴ ص۵۶۹ المادة ۱۵۵۶) [1]

مدعیٰ بہ کی مقدار میں غلطی ہو جانا مسقطِ دعویٰ نہیں

سوال:۔ ایک صاحب نے علاقہ دیر میں قاضی کے سامنے ایک قطعہ زمین پر دعویٰ کیا جس میں اس نے حدودِ اربعہ تو صحیح بیان کیا مگر بدقسمتی سے مقدارِ زمین میں غلطی کر گیا، کاغذات میں وہ زمین پانچ ایکڑ ہے اور مدعی نے دعویٰ میں چار ایکڑ کا ذکر کیا، اس پر قاضی نے اُسے جھوٹا قرار دے کر اس کے دعویٰ کو ناقابلِ سماعت قرار دیا ہے، تو کیا واقعی یہ دعویٰ شرعاً ناقابلِ سماعت ہے؟

الجواب:۔ ایسا دعویٰ کرتے وقت مدعیٰ بہ کا حدودِ اربعہ صحیح بیان کرنا ضروری ہوتا ہے مقدار کا بیان کرنا ضروری نہیں ہوتا، اس لیے اگر کوئی مُدعی بوقتِ دعویٰ مقدار کے بیان کرنے میں غلطی کر جائے اور حدودِ اربعہ درست بیان کیا ہو تو دعویٰ قابلِ سماعت ہوتا ہے۔ صورتِ مسئولہ میں قاضی صاحب نے بلا تحقیق و بلا عذرِ شرعی دعویٰ کو ناقابلِ سماعت قرار دیا ہے۔

لما فی مجلة الاحکام: اذا اصاب المدعی فی بیان الحدود واخطاء فی بیان مقدار ذراع العقار او دونه لا یمنع صحة دعواه۔ (مجلة الاحکام العدلیة۔ المادة ۱۶۲۴)

---

[1] قال العلامة سلیم رستم بازؒ: تحت ھٰذہ القاعدۃ: سواء کان الصلح عن اقرار او انکار او سکوت حتی لو ادعیٰ علیه شیئاً فانکر فصالحه علیٰ شئ ثم اقر المدعیٰ علیه لا یلزمه ما اقربه وکذا لو برھن المدعی بعد صلحه لا یقبل لان الصلح عقد لازم لیس لاحدھما نقضه الخ

(شرح مجلة الاحکام لسلیم رستم باز ص۸۲۵ الباب الرابع)

دعویٰ ہبہ کے لیے معتبر شہادت ضروری ہے

سوال :۔ زید کا ایک قطعۂ اراضی پر قبضہ اور تصرف ہے اور اس کا دعویٰ ہے کہ یہ زمین مجھے بکر نے ہبہ کی تھی، جبکہ بکر کے بیٹے کا دعویٰ ہے کہ یہ زمین میرے والد کی میراث ہے لہٰذا یہ میرا حق ہے، دریافت طلب امر یہ ہے کہ شرعاً یہ زمین کس کا حق ہے؟

الجواب :۔ اگر زید اپنا دعویٰ ہبہ معتبر شہادت سے ثابت کرے تو یہ زمین اس کا حق ہے ورنہ بکر کے بیٹے کو حلف علی العلم دیا جائے گا۔

قال العلامة محمد کامل الطرابلسیؒ : سئلت فی رجل ادعیٰ علیٰ اٰخر عقاراً انه ملکهٗ تلقاه بالارث من ابیه فاجابه المدعیٰ علیه بانی اشتریته منٗ ابیك حال حیاته وانهٗ فی حوزی وتصرفی فی مدة تزید علیٰ خمسین سنة مع حضورك وعلمك وسکوتك بلاعذر شرعی هل یکون جواب المدعیٰ علیه من باب الاقرار بالتلقی من ابیه فیحتاج الیٰ بیّنة تشهد لهٗ بالشراء ولا ینفعه وضع الید والتصرف المدة المذکورة ولا تکون الحادثة من قبیل ما مضی علیه خمس عشرة سنة فاجبت نعم جواب المدعیٰ علیه من قبیل دعوی التلقی من مورث المدعی ودعوی التلقی من مورثه اقرار لهٗ بالملك ثم دعواه الانتقال الیه منه تحتاج الیٰ بیّنة لان کل مدع یحتاج الی البینة ولا ینفعه الید المدة المذکورة مع الاقرار المذکور ولیس هٰذا من باب ترك الدعوی بل من باب المواخذة بالاقرار ومن اقر لشیٔ لغیره اخذ باقراره ولوکان فی یده احقاباً کثیرة لا تعد افاده المحقق الرملی فی فتاویٰ الخیریة۔ والله تعالیٰ اعلم۔ (فتاوی کاملیة ص۱۲۳ کتاب الدعوی) [1]

الحق لایسقط بتقادم الزمان کا مطلب

سوال :۔ ایک شخص نے آج سے ۳۶ سال پہلے کچھ زمین اپنے بیٹوں کے نام منتقل کی اور وہ اس میں مالکانہ تصرفات کرتے رہے، اب اس کی وفات کے بعد دیگر ورثاء حقداری کا

---

[1] قال العلامة سلیم رستم بازؒ : اذا اراد الرجل ان یحلف علیٰ فعل نفسه یحلف علیٰ البتات یعنی یحلف علیٰ القطع بان هٰذا الشیٔ کذا ولیس بکذا اما اذا اراد ان یحلف علیٰ فعل غیره یحلف علیٰ عدم العلم یعنی یحلف علیٰ عدم علمه بذالك الشیٔ۔ (شرح المجلة ص۱۱۰۱ المادة ۱۷۴۸)

دعویٰ کرتے ہیں تو کیا ان کا یہ دعویٰ صحیح ہے یا نہیں؟ جبکہ فتاویٰ انقرویہ جلد ۲ ص۵۸ میں ہے کہ:۔
وفی المبسوط رجل ترك الدعوی ثلاثاً وثلاثین سنة ولم یکن لهٔ مانع من الدعوی ثم ادعیٰ لهٔ لاتسمع دعواه لان ترك الدعوی مع التمکن علیه یدل علیٰ عدم الحق ظاهراً۔ انتہیٰ
جناب مفتی صاحب! مسئلہ ھٰذا کا شریعتِ مقدسہ کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں؟

الجواب:۔ شرح المجلہ میں ہے کہ: اذا ترك المورث الدعوی مدة وترکها الوارث ایضاً مدة وبلغ مجموع المدتین حد مرور الزمان فلاتسمع۔ (ج۵ ص۱۸۷ المادة ۱۶۷)
اس سے معلوم ہوا کہ مورث اور اس کے وارث نے جب اپنا دعویٰ ۳۶ سال تک چھوڑا ہو اور کوئی شرعی عذر بھی نہ ہو تو ایسا دعویٰ نا قابل سماعت ہے، البتہ جب مدعیٰ علیہ یہ مانتا ہو کہ مدعی کا حقِ ارث ہمارے ذمہ باقی ہے تو پھر سینکڑوں سال گذرنے کے باوجود بھی دعویٰ مسموع ہوگا اور حق دینا ہوگا، اور یہی معنیٰ ہے فقہاء کے اس قول کا کہ الحق لایسقط بتقادم الزمان[1].....

دعویٰ کب تک قابلِ سماعت ہے

سوال:۔ ایک آدمی ایک قطعہ اراضی پر ۵۰ سال یا اس سے زیادہ عرصہ سے قابض اور اس میں مالکانہ تصرفات کرتا چلا آرہا ہے، اب ایک دوسرا شخص اس قطعہ زمین پر ارث کا دعویٰ کرتا ہے، تو کیا شرعاً اس شخص کا یہ دعویٰ قابلِ سماعت ہے یا نہیں؟ اور کیا اس تاخیر سے اس شخص کا استحقاق باطل ہو جاتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ سماعِ دعویٰ کے لیے ضروری ہے کہ اس میں اتنی تاخیر نہ ہوئی ہو جو ۳۶ سال تک پہنچتی ہو، اسی طرح مدعیٰ علیہ کسی طرح مقر بھی نہ ہو اور نہ ہی مدعی اس مدت میں غائب، بچہ اور پاگل بغیر ولی کے ہو۔ اور اگر دعویٰ کرنے میں ۳۶ سال یا اس سے زیادہ مدت گذر جائے، اسی طرح دیگر شرائط بھی قبولِ دعویٰ کی مفقود ہوں تو دعویٰ قابلِ سماعت نہ رہے گا۔ اس لیے صورتِ مسئولہ میں بھی اس دوسرے شخص کا ۵۰ سال یا اس سے زیادہ عرصہ کے بعد دعویٰ ارث

---

[1] لما فی مجلة الاحکام، لایسقط الحق بتقادم الزمان فاذا اقر المدعیٰ علیه واعترف صراحة فی حضور الحاکم بان حق المدعی عنده فی الحال علی الوجه الذی یدعیه وکان قد مر الزمان علی الدعوی فلا یعتبر مرور الزمان ویحکم بموجب اقرار المدعیٰ علیه۔ (شرح المجلہ ص۹۹۶ المادة ۱۶۷۴)

قابلِ سماعت نہیں، تاہم مرورِ زمانہ کی وجہ سے استحقاق باطل نہیں ہوتا، کیونکہ الحق لایسقط بتقادم الزمان۔

قال العلامة خالد اتاسی رحمہ اللہ: قال المتاخرون من اھل الفتویٰ لاتسمع الدعویٰ بعد ست وثلثین سنة الا ان یکون المدعی غائباً او صبیاً او مجنوناً ولیس لھما ولی او المدعیٰ علیه امیرا جابراً۔ (شرح المجلة ج۵ ص۱۷۷ المادة ۱۶۶۳)

اذا ترك المورث الدعوی مدة یترکھا الوارث ایضاً مدة وبلغ مجموع المدتین حد مرور الزمان فلا تسمع۔ (شرح المجلة ج۵ ص۱۸۷ المادة ۱۶۷۰) [1]

پاگل کے دعویٰ کا حکم

سوال:۔ ایک پاگل نے کسی شخص کی شرارت اور ایما پر گاؤں کے ایک معزز اور شریف آدمی پر دس ہزار روپے کا دعویٰ کر دیا جبکہ اس پاگل کے پاس اتنے پیسے بھی نہیں کہ وہ اپنے بال بچوں کا پیٹ پال سکے، تو کیا اس کا یہ دعویٰ شرعاً صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ قوانینِ شرع کے تحت وہ دعویٰ قابلِ سماعت اور صحیح ہوتا ہے جو عاقل بالغ آدمی کسی پر دائر کرے۔ اور اگر مُدعی عاقل بالغ نہ ہو تو شرعاً اس کا دعویٰ غیر مسموع اور غیر صحیح ہوتا ہے۔ لہٰذا بشرط صحتِ سوال اگر تو اس پاگل شخص نے بلا کسی تحریک کے خود دعویٰ کیا ہو اور اس کا کوئی ولی اس کی ولایت کر کے دعویٰ کی پیروی نہیں کرتا ہو تو شرعاً یہ دعویٰ ناقابلِ سماعت اور صحیح نہیں ہے۔

لما فی مجلة الاحکام: یشترط ان یکون المُدعی والمُدعیٰ علیه عاقلین فدعوی المجنون والصبی غیر الممیز لیست بصحیحة ولکن ان یکون اولیاؤھما واوصیاؤھما مدعین او مُدعیٰ علیھم فی محلھما۔

[شرح المجلة لخالد اتاسی ج۵ ص۹
الباب الاوّل فی شروط الدعویٰ]

---

[1] قال العلامة ابن عابدین: اذا ترك الدعوی ثلاثاً وثلاثین سنة ولم یکن مانع من ترك الدعوی الخ۔ (رد المحتار علی الدر المختار ج۴ ص۳۴۲ مطلب اذا ترك الدعوی ثلاثة وثلاثین سنة لاتسمع)

ومِثْلُهٗ فی فتاویٰ کاملیة ص۱۱۳ کتاب الدعویٰ۔

نابالغ بیٹے کی جگہ باپ کو قسم دینے کا حکم

سوال:- زید نے بکر پر چوری کا دعویٰ کیا جبکہ بکر چوری سے انکار کرتا ہے اور قسم کھانے کے لیے تیار ہے مگر وہ نابالغ ہے، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا نابالغ پر شرعاً قسم آسکتی ہے یا نہیں، اگر نہیں تو پھر اس کا والد اس کی جگہ قسم کھاسکتا ہے یا نہیں؟ اور اگر دونوں پر قسم نہیں آتی تو کیا پھر مُدعی قسم کھاسکتا ہے؟

الجواب:- صورتِ مسئولہ میں اگر مُدعی (زید) کے پاس اثباتِ دعویٰ کے لیے گواہ نہ ہوں تو پھر بکر ہی کو حلف وقسم دیا جائے گا اُس کے باپ کو نہیں، اس لیے کہ قسم کھانے کے لیے بلوغ شرط نہیں اور نہ ہی مدعی کا قسم کھانا شرعاً معتبر ہے۔

قال العلامة علی حیدر : (تحلیف الصبی) اذا کان المدعیٰ علیه صبیًا وکان غیر ماذون له یتوجه علیه الیمین فاذا وجه ولکل فلا یحکم علیه بل یجب تحلیفه بعد البلوغ اما اذا کان ماذونًا فیتوجه الیمین علیه عند بعض الفقهاء ویحکم بیمینه وبنکوله عن الیمین وهٰذا هو المفتی به الخ - (دُرر الحکام شرح مجلة الاحکام ج۴ ص۳۸۹ الباب الثالث فی بیان التحلیف)[1]

مصالحت کے بعد ارث کا دعویٰ کرنا

سوال:- جناب مفتی صاحب! ہمارے والد صاحب نے اپنی حینِ حیات میں ہی جائیداد کی تقسیم کا فیصلہ کر دیا تھا کہ میرا آباد گھر میرے تین بیٹوں یعنی حبیب خان، قادر خان، افضل خان کا ہے اور سفید ڈاگہ (خالی پلاٹ) رقبہ تعدادی ایک کنال ۹ مرلے دوسرے دو بیٹوں (غلام خان، محمد طفیل) کو دے دیا اور اس کے ساتھ یہ شرط بھی لگائی کہ مستی غلام خان اپنے چھوٹے بھائی محمد طفیل کو دو کمروں کا گھر بنا کر دیتے اور اس کی شادی کرنے کے بعد بقیہ ڈاگہ (پلاٹ) کا مالک ہوگا والد صاحب کی وفات کے بعد غلام خان نے اپنے بھائی محمد طفیل کو دو کمروں کی بجائے تین کمروں کا گھر بنا کر دیا اور اس کی شادی بھی کردی، بعد ازاں والدہ صاحبہ اور جملہ بھائیوں نے مشترکہ فیصلہ بھی کر دیا جسے سب نے قبول کیا (جس کا اسٹامپ لف ہذا ہے) اور اس پر گواہ بھی موجود ہیں،

---

[1] وفی الهندیة: الصبی الماذون یحلف کالبالغ وبه ناخذ - (الفتاویٰ الهندیة ج۴ ص۲۵ کتاب الدعویٰ - الباب الثالث فی الیمین وفیه ثلاثة فصول)

مگر اس فیصلہ کے بعد بھائیوں نے انکار کر دیا اور پھر علاقائی جرگہ نے دوبارہ فیصلہ کیا جس پر سب بھائیوں نے رضامندی ظاہر کر دی جس کا تحریری ثبوت بھی لف ہٰذا ہے اور اس پر گواہ بھی موجود ہیں۔ اس سب کچھ کے باوجود تینوں بھائیوں (حبیب خان، قادر خان، افضل خان) نے پھر اس سفید ڈاگہ (خالی پلاٹ) پر دعویٰ ارث کر دیا ہے، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ بیان مذکورہ کی روشنی میں تینوں بھائیوں کا دعویٰ ارث صحیح ہے یا نہیں؟ شریعتِ اسلامی کا اس بارے میں کیا حکم ہے؟

الجواب:- مذکورہ بالا بیان اور ملفوف اسٹامپ سے معلوم ہوتا ہے کہ باپ نے اپنی زندگی میں بیٹوں میں جائیداد کی تقسیم کا جو فیصلہ کیا تھا اُس وقت سب بھائی اس فیصلہ پر رضامند تھے اور بعد ازاں علاقائی جرگہ کا فیصلہ قبول کر کے آپس میں سب بھائی صلح بھی کر چکے ہیں، لہٰذا مصالحت کے بعد کسی بھی وارث کو اپنی صلح سے رجوع کرنے کا شرعاً کوئی حق حاصل نہیں، اس لیے مذکورہ سفید ڈاگہ (خالی پلاٹ) میں محمد طفیل کا گھر بن جانے کے بعد باقی حصہ صرف مسمیٰ غلام خان کا ہے اس کے علاوہ دوسرا کوئی بھی وارث اس میں شراکت کا دعویٰ نہیں کر سکتا بلکہ یہ قطعہ زمین غلام خان کی ملکیت متصوّر ہوگا۔

لما فی مجلة الاحکام تحت المادة ۱۵۵۶ : اذا تم الصلح فلیس لواحد فقط من الفریقین الرجوع عنه۔ قال الشیخ سلیم رستم باز تحته سواء کان الصلح عن اقرار او انکار او سکوت حتی لو ادعی علیه شیئًا فانکر فصالحه علی شیٔ ثم اقر المدعی علیه لا یلزمه ما اقر به وکذا لو برهن المدعی بعد صلحه لا یقبل لان الصلح عقد لازم لیس لاحدهما نقضه۔ (شرح المجلہ ص۸۴۵ الباب الرابع فی احکام الصلح) [1]

دعوٰی کے ثبوت کے لیے شرعی ضابطہ

سوال: زید سے عمرو نے چوری کی ہے، اب زید عمرو پر دعویٰ (مقدمہ) کرنا چاہتا ہے تو اس

---

[1] وفی الهندیة: فوقوع الملك فی البدل وثبوت الملك فی المصالح عنه ان کان مما یحتمل التملیك کالمال ووقوع البراءة عنه للمدعی علیه ان کان لا یحتمل التملیك کالقصاص هذا اذا کان الصلح علی الاقرار الخ۔

(الفتاوی الهندیة ج۴ ص۲۲۹ کتاب الصلح)

کے لیے اُسے کیا کرنا چاہیئے ؟ اور اگر زید شرعی تقاضوں کے مطابق عمرو کو چور ثابت کر دے تو جتنا مال اس کا چوری ہوا ہے اس سے زیادہ عمرو سے لے سکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب: دعویٰ کے اثبات کے لیے شرعی ضابطہ یہ ہے کہ مدعی (دعویٰ کرنے والا) قاضی کے سامنے معتبر شہادت پیش کرے اور مُدعیٰ علیہ (منکر) کے ذمہ حلف یعنی قسم کھانا لازم ہے، مگر یہ تب ہے جب مُدعی گواہ پیش نہ کر سکے اور وہ مُدعیٰ علیہ سے قسم کا مطالبہ کرے۔ حدیث میں ہے: البینۃ علی المدعی والیمین علیٰ من انکر (صحیح مسلم ج ۲ ص۷۴ کتاب الاقضیۃ)[1] اور فعل الغیر پر قسم کرنے کی صورت میں قسم علی العلم کی جائے گی۔ اور شہادت یا نکول یعنی قسم کھانے سے انکار کی صورت میں مُدعی کے لیے صرف وہ چیز ثابت ہو گی جس کا وہ دعویدار ہے اس سے زائد مال لینا اس کے لیے شرعاً درست نہیں۔

ہبۂ تام کے بعد دعویٰ ارث ناقابلِ سماعت ہے

سوال: جناب مفتی صاحب! ہماری والدہ صاحبہ نے اپنی زندگی میں ہی اپنا جملہ ترکہ اپنے ایک بیٹے کے نام کر دیا تھا جس کے گواہان اور سرکاری اسٹامپ لف ہٰذا ہے، تو اب ان کی وفات کے بعد ان کے دوسرے بیٹے والدہ کے ترکہ میں اپنے حصہ کے دعویدار ہیں، تو کیا ان کا دعویٰ ارث صحیح ہے یا نہیں ؟

الجواب: ہر شخص کو شرعاً یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی عینِ حیات میں ہی اپنی جائیداد وغیرہ اپنی اولاد میں سے کسی ایک کو تملیکاً ہبہ کر سکتا ہے، اس کی وفات کے بعد اس تملیک شدہ جائیداد میں کسی بھی وارث کا دعویٰ اِرث قابلِ سماعت نہیں، صورتِ مسئولہ میں جب آپ کی والدہ نے اپنی زندگی ہی میں اپنی جملہ جائیداد ایک بیٹے کو تملیکاً دے دی ہے اور اس پر مروجہ قانون کے مطابق تحریر اور گواہ بھی موجود ہیں تو اب ان کی وفات کے بعد دیگر ورثاء کا اس میں کوئی حق باقی نہیں رہا۔

لما فی الهندیۃ: رجل وهب فی صحتہ کل المال للولد جائز

---

[1] عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال البینۃ علی المدعی والیمین علی المدعیٰ علیہ۔ رواہ الترمذی۔ (مشکوٰۃ ص۳۲۷ باب الاقضیۃ والشہادات الفصل الثانی)

فی القضاء ویکون آثما فیما صنع ۔ (الفتاوٰی الہندیہ ج ۴ ص ۳۹۱ کتاب الہبۃ) [له]

بیان مُدعی! | **تنازعہ تقسیم ترکہ میراث الحاج نواب خان مرحوم، پلوسی، پشاور**

ہم نے اپنے حق میں ایک عدد وصیت نامہ + ہبہ نامہ منسلک کیا ہے اور اس کے ساتھ پورا بیان بھی دیا ہے، لہٰذا میں اپنے بیان میں مزید یہ شامل کرنا چاہتا ہوں کہ :۔

(۱) یہ زمین خریدتے وقت میرے بھائی عالم زیب کی عمر ۹ سال تھی، زمین ۱۰ اکتوبر ۱۹۶۷ء کو خریدی گئی اور عالم زیب کی تاریخ پیدائش ۱۰ اکتوبر ۱۹۵۸ء ہے، لہٰذا اس سے میرا بڑا بھائی ۴، ۵ سال بڑا ہوگا، دونوں بھائی زمین خریدتے وقت بغیر کمائی کے تھے اور سکول میں پڑھتے تھے جس کا ثبوت بھی منسلک ہے ۔

(۲) یہ کہ اٹامشین میری والدہ صاحبہ کی ہے جو کہ والد صاحب نے انہیں حق مہر میں دی تھی، لیکن اس کا ذکر پہلے والے بیان میں نہیں کیا گیا ہے کیونکہ مجھے کہا گیا تھا کہ یہ تنازعہ صرف اور صرف خریدی گئی زمین تک محدود ہے ۔

(۳) مزید کوئی ثبوت یا گواہ میرے بیان کے بارے میں درکار ہوں تو آپ کے کہنے پر پیش کردوں گا ۔

(۴) کوئی بھی فیصلہ جرگے کے ممبران جناب سعید جان صاحب اور عبدالحمید کاکا صاحب کا دستخط شدہ ہو میں قبول کروں گا ۔

میں اپنی والدہ صاحبہ اور چھوٹے بہن بھائیوں اور اپنی طرف سے اقرار کرتا ہوں کہ جو کوئی فیصلہ شریعت کی رُو سے ہوگا مجھے قابلِ قبول ہوگا ۔ (عطاء الرحمٰن ولد حاجی نواب خان ساکن پلوسی، پشاور)

بیان مُدعیٰ علیہ! ہم دونوں بھائی عالم زیب و اورنگزیب پسران حاجی

[له] قال العلامة قاضی خان رحمه الله : رجل وهب فی صحته كل المال للولد جاز فی القضاء و یكون آثماً فیما صنع ۔

{ الفتاوٰی قاضی خان علی هامش الهندیة ج ۳ ص ۲۷۹
فصل فی هبة الوالد لولده الخ }

نواب خان مرحوم ساکنان بلوسی ضلع پشاور یہ بیان کرتے ہیں کہ ہمارے والد محترم نے ۱۹۶۷ء میں تہکال I نزد تاج آباد میں واقع ۲۲ کنال ۷½ مرلہ زمین اپنے نقد پیسوں سے خریدی تھی۔ والد محترم نے الاضی مذکورہ کا یہ حصّہ مساوی انتقال کچھ اس طرح کرایا کہ ۱۔ حاجی نواب خان ولد سربلند کا حصّہ ۷ کنال ۹½ مرلے ۲۔ عالم زیب ولد حاجی نواب خان کا حصّہ ۷ کنال ۹ مرلے ۳۔ اورنگزیب ولد حاجی نواب خان ۷ کنال ۹ مرلے کے باقبضہ مالکان ہیں۔

زمین کے انتقال کے وقت ہماری دو سگی بہنیں، سوتیلی والدہ اور دو سوتیلی بہنیں موجود تھیں، اس کے بعد ۱۳ سال والد صاحب زندہ رہے، اور اس عرصہ میں ہماری سوتیلی والدہ سے سات بھائی اور چار بہنیں پیدا ہوئے۔ (یعنی کل سات بھائی اور چھ بہنیں) بعدازاں ہمارے والد صاحب نے کچھ اور زمین خریدی جس کا انتقال و رجسٹری وغیرہ انہوں نے اپنے نام پر کرایا ہے۔

ہمارے نانا محترم نے ہماری والدہ صاحبہ کو کچھ زمین دی تھی جس پر والد صاحب نے آبادی کر کے وہاں آٹا پیسنے کی مشین لگائی جو کہ ہم دو بھائیوں اور دو بہنوں کی ملکیت ہے۔

مندرجہ بالا بیان کے مطابق ہمارے سوتیلے بہن بھائیوں کے حصّے کے بارے میں شرعی حکم صادر فرمایا جائے۔

(نوٹ) اس سے پہلے بیان میں ہم اپنے والد صاحب کی جائیداد اور مکانات کے بارے میں تفصیلاً ذکر کر چکے ہیں۔

اورنگزیب ـــــــــ عالم زیب

فیصلہ شرعیہ

(۱) فریقِ اوّل : عالم زیب خان و اورنگ زیب خان پسران حاجی نواب خان

(۲) فریقِ ثانی : عطاء الرحمٰن مع برادران پسران حاجی نواب خان۔

۱ : فریقین کے بیان کے مطابق حاجی نواب خان مرحوم نے ۱۹۶۷ء میں تاج آباد تہکال (پشاور) میں ۲۲ کنال ۷½ مرلے زمین خریدی، اس میں سے ۷ کنال ۹½ زمین حاجی نواب خان نے اپنے نام انتقال کرالی اور ۷ کنال ۹ مرلہ زمین اپنے پسر عالم زیب خان ولد حاجی نواب خان کے نام انتقال کرادی اور ۷ کنال ۹ مرلہ زمین اپنے پسر اورنگ زیب خان ولد حاجی نواب خان کے نام انتقال کرادی۔

چونکہ حاجی نواب خان نے خرید کردہ زمین سے ۴ کنال ۸ امرے اپنے دونوں بیٹوں کے نام انکی صغرسنی میں مالکانہ حقوق کے ساتھ انتقال کرادی ہے لہٰذا اب اس کے یہ دونوں بیٹے (اورنگزیب خان، عالمزیب خان) اس انتقال شدہ زمین کے باقاعدہ مالکان ہیں اور انتقال شدہ زمین ان کی ملکیت متصور ہوگی، اس لیے کہ صغرسنی میں شئے موہوبہ پر صغیر کا قبضہ ضروری نہیں ہے، باپ کے قبضہ ہی سے ہبہ تام ہو جاتا ہے۔ اور اس کے بالمقابل عطاء الرحمٰن و برادران نے اپنے باپ حاجی نواب خان کا جو خط پیش کیا ہے شریعت کی رُو سے اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

(۱) لما فی الفتاوی الخیریۃ علی هامش العقود الدریۃ ج۲ ص۱۰۶۔ (

(۲) اس لیے کہ اس خط کے ثبوت میں گواہان نہیں ہیں۔

(۳) یہ پیش کردہ خط وصیت نامہ ہے، اس میں صاف لکھا ہوا ہے کہ میں وصیت کرتا ہوں کہ میرے بعد میری جائیداد مندرجہ ذیل طریقے سے تقسیم ہو، اور شرعی اعتبار سے اپنے وارث کے حق میں وصیت کرنا جائز نہیں، دلائل حسب ذیل ہیں:۔

(۱) قال العلامۃ قاضی خانؒ، رجل وهب فی صحتہ کل المال للولد جاز فی القضاء ویکون اثما فیما صنع، رجل قال جعلت هٰذا لولدی فلان کانت هبۃ، رجل وهب لابنہ الصغیر دارًا وهی مشغولۃ بمتاع الاب۔ قال ابو نصرؒ جاز ولا یحتاج الی التفریغ لانها مشغولۃ بمتاع القابض وهو الاب ۔ (فتاوی قاضی خان علی هامش الهندیۃ ج۳ ص۲۷۹ کتاب الهبۃ۔ فصل فی هبۃ الوالد لولدہ والهبۃ للصغیر)

(۲) قال العلامۃ الزیلعیؒ: وهبۃ الاب لطفلہ تتم بالعقد لانہ فی قبض الاب فینوب عن قبض الصغیر لانہ ولیہ۔ (تبیین الحقائق ج۵ ص۹۵ کتاب الهبۃ)

(۳) لما فی الهندیۃ: رجل اتخذ لولدہ او لتلمیذہ ثیابًا ثم اراد ان یدفع الی ولدہ الاخر او تلمیذہ الاخر لیس لہ ذٰلک الا اذا بین وقت الاتخاذ انها عاریۃ ۔

(الفتاوی الهندیۃ ج۴ ص۳۹۲ کتاب الهبۃ الباب السادس فی الهبۃ للصغیر)

(۴) قال العلامۃ الزیلعیؒ: قال وانما یصح الرجوع بتراضیهما او بحکم الحاکم لأن ملک الموهوب لہ ثابت فی العین فلا یخرج عن ملکہ الا بالرضاء او بالقضاء ۔

(تبیین الحقائق ج۵ ص۱۰۱ کتاب الهبۃ)

(۵) قال العلامة ابن نجیمؒ: وکتبنا فی القضاء من الفوائد انہ یعمل بدفتر البیاع والسمسار والصیاف فالخط فیہ حجۃ۔ (الاشباہ والنظائر ج۲ ص۱۲۵)

(۶) قال العلامۃ قاضی خانؒ: رجل کتب صک وصیۃ وقال للشھود اشھدوا بما فیہ ولم یقرأ وصیتہ علیھم قال علماؤناؒ لا یجوز للشھود ان یشھدوا بما فیہ وقال بعضھم وسعھم ان یشھدوا والصحیح انہ لایسعھم ان یشھدوا۔ (فتاوی قاضیخان علی ھامش الھندیۃ ج۲ ص۴۸۲ کتاب الشھادات، فصل فی الشاھد یشھد بعد ما اخبر بزوال الحق)

(۷) قال العلامۃ فخر الدین الزیلعیؒ: واما الثالث فلقولہ علیہ الصلوٰۃ والسلام: ان اللہ تعالیٰ اعطی کل ذی حق حقہ فلا وصیۃ لوارث۔
(تبیین الحقائق ج۶ ص۱۸۲ کتاب الوصایا)

(۸) قال العلامۃ برھان الدین المرغینانیؒ: ولا تجوز لوارثہ لقولہ علیہ السلام ان اللہ تعالیٰ اعطی کل ذی حق حقہ الا ولا وصیۃ لوارث۔
(الھدایۃ ج۴ ص۶۵۷ کتاب الوصایا، باب فی صفۃ الوصیۃ الخ)

(۲) حق مہر (۳) آٹا مشین

جناب الحاج نواب خان مرحوم نے مسماۃ حسن آرا دختر اوّل خان سے عقد نکاح کرتے وقت حق مہر میں جو ایک عدد رہائشی مکان اور ایک آٹا مشین مسمی کیا ہے اس کی ادائیگی نواب خان مرحوم پر لازم ہے، اگر انہوں نے اپنی زندگی میں ادا نہیں کیا ہو تو اب اس کے جملہ ترکہ سے ادا کیا جائے گا، حق مہر ادا کرنے کے بعد باقی ترکہ ورثاء میں تقسیم کیا جائے۔ تاہم عالم زیب اور اورنگ زیب جو دعویٰ کرتے ہیں کہ اس آٹا مشین کی زمین ہمارے نانا محترم نے ہماری والدہ صاحبہ کو دی ہے، اس پر آبادی اور آٹا مشین ہمارے والد صاحب نے بنائی ہے، اگر انہوں نے اس دعویٰ کا صحیح ثبوت شرکاء جرگہ کے سامنے پیش کیا ہو تو شرکاء جرگہ صرف اس زمین کی قیمت طے کریں، پھر اگر اورنگزیب و عالم زیب اس زمین کی قیمت لینے پر راضی ہوں تو نواب خان مرحوم کے کل ترکہ سے زمین کی قیمت منہا کر کے ان کے حوالہ کر دیں اور آٹا مشین مع زمین حاجی نواب خان کو حق مہر میں دے دیں، اور اگر عالم زیب اور اورنگزیب زمین کی قیمت لینے پر راضی نہ ہوں تو اس زمین کو خالی کر دیں، کیونکہ یہ انکی

سوتیلی والدہ کا حق ہے، اور کسی شخص کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کسی کا حق اس کی اجازت کے بغیر کسی اور کے حوالے کردے۔ لیکن جب اورنگزیب، عالم زیب کی والدہ اپنے شوہر سے پہلے فوت ہوئی ہے تو اس کی ملکیت میں چاہے آٹا مشین کی زمین ہو یا دیگر اشیاء، ان میں ۴/۱ حصہ اس کے شوہر نواب خان کو بھی میراث میں ملے گا اور باقی ۴/۳ حصے اس کی اولاد (عالم زیب وغیرہ) کو میراث میں ملیں گے، اب چونکہ شوہر بھی فوت ہو چکا ہے اس لیے اس ۴/۱ حصہ میں بھی (جو کہ بیوی کی طرف سے اس کو میراث میں ملا ہے) نواب خان کے جملہ ورثاء (عالم زیب اور اس کے سگے بہن بھائی مع سوتیلی والدہ و سوتیلے بہن بھائی) شریک ہونگے، اور اگر مدعی معتبر شہادت سے اپنا دعویٰ ثابت نہ کرسکے تو مدعیٰ علیہ (منکر) کو حلف و قسم دیا جائے گا۔ البیّنة علی المدعی والیمین علی المدعیٰ علیه۔ (مشکوٰة ص۳۲۷ باب الاقضیة والشهادات)

حوالہ حسب ذیل ہے:۔

لما فی الهندیة: واذا تزوجها علی هٰذا العبد وهو ملك الغیر أو علی هٰذه الدار وهی ملك الغیر فالنکاح جائز والتسمیة صحیحة فبعد ذٰلك ینظر أن أجاز صاحب الدار وصاحب العبد ذٰلك فلها عین المسمیٰ وان لم یجز المستحق لایبطل النکاح ولا التسمیة حتیٰ لایجب مهر المثل وانما تجب قیمة المسمیٰ کذا فی المحیط۔

(الفتاوٰی الهندیة ج۱ ص۳۰۳ کتاب النکاح۔ الباب السابع فی المهر)

وقال ایضاً: ولو تزوجها علیٰ شئ بعینه وهلك قبل التسلیم أو استحق فان کان ذٰلك من ذوات الامثال رجعت علی الزوج بالمثل والا فبالقیمة کذا فی المحیط۔

(الفتاوٰی الهندیة ج۱ ص۳۱۶ الباب السابع فی المهر۔ الفصل التاسع)

(۴) تقسیم ترکہ میراث

صغرسنی میں عالم زیب و اورنگزیب کے نام مالکانہ طور پر انتقال شدہ زمین اور نواب خان مرحوم کی بیوی کے حق مہر کے علاوہ نواب خان مرحوم کی ملکیت میں جتنا اثاثہ ہو، منقولہ ہو یا غیر منقولہ جائیداد، سب ورثاء اس میں شریک ہوں گے اور تقسیم میراث اس طرح ہوگی کہ سارے ترکہ میراث میں ۸/۱ حصہ اس کی بیوہ کو ملے گا اور باقی سات حصے نواب خان مرحوم کی دونوں بیویوں کی تمام اولاد میں بایں طور تقسیم ہوگی کہ ہر ایک بھائی کو دو دو حصے اور ہر ایک بہن کو ایک ایک حصہ ملے گا۔

ارشادِ ربانی ہے: يُوصِيكُمُ اللهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ -
(سورۃ النساء آیت ۱۲)

وفی الھندیۃ: واذا اختلط البنون والبنات عصب البنون والبنات فیکون للابن مثل حظ الانثیین - (الفتاوی الہندیہ ص۴۴۸ ج۶ کتاب الفرائض، الباب الثانی)

فیصلہ شرعی مابین سید یوسف شاہ و سلطان شاہ پسران حیات شاہ

فریقِ اوّل: سید یوسف شاہ ولد حیات شاہ ساکن بلند کوٹ، بٹگرام، مانسہرہ
فریقِ ثانی: سید سلطان شاہ ولد حیات شاہ ساکن بلند کوٹ، بٹگرام، مانسہرہ
نمائندہ فریقِ اوّل: گل علی شاہ ولد سید یوسف شاہ
نمائندہ فریقِ ثانی: سید فرمان شاہ ولد سید سلطان شاہ

مندرجہ بالا فریقین کا بیان ان کے نمائندوں کے واسطے سے سنا گیا، دونوں نمائندوں کے بیانات سے چند امور سامنے آئے:-

(۱) فریقین کے بیانات سے اتفاقی طور پر واضح ہوتا ہے کہ حیات شاہ کی بیٹیوں کو اس کی جائیداد سے محروم رکھا گیا ہے، جائیداد کی تقسیم صرف اسکے بیٹوں تک محدود رکھی گئی، والد کے اپنے تصرفات یا بعد کے ورثاء کے عملی اقدامات سے بیٹیوں کا کوئی تذکرہ فریقین نہیں کرتے بلکہ اس سے پہلو تہی کرتے ہیں۔

(۲) فریقِ اوّل سید یوسف شاہ اس کا دعویدار ہے کہ اس کے والد نے حینِ حیات میں جائیداد تقسیم کی تھی اس میں دیگر حصص کے علاوہ خسرہ ۸۰۷ جو کہ "ارتل" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جس کا رقبہ اسّی کنال آٹھ مرلہ ہے، یہ سید یوسف شاہ کو دی گئی ہے جو کہ ۱۹۶۶ء/۱۹۶۷ء کی بندوبست اراضی میں بحال رکھی گئی ہے۔ فریق مذکورہ کے بیان کی رُو سے سلطان شاہ نے یہ زمین اپنے نام منتقل کرالی ہے جس کے خلاف یوسف شاہ نے عدالت سے درخواست کی لیکن اس دوران شاد علی خان نے دونوں میں مصالحت کرادی۔

(۳) فریقِ اوّل مصالحت میں ایک ہزار روپے نقد دینے کا تذکرہ کرتا ہے جو کہ فریقِ ثانی نے برضا و رغبت وصول کیے ہیں اور بطور سند تحریری سٹامپ پیش کرتے ہیں۔

(۴) فریقِ ثانی سلطان شاہ کا بیان ہے کہ حیات شاہ نے اپنی زندگی میں زمین اپنے بیٹوں کے

درمیان تقسیم کی تھی، تاہم اس میں اچھی اور کمزور زمین کی رعایت کرتے ہوئے ایک بیٹے کو اچھی زمین کم اور دوسرے کو بیکار زمین زیادہ دی تھی۔ فریقِ اول سید یوسف شاہ نے سازباز کر کے خسرہ ۴۰۷ کا بوگس طریقے سے اپنے نام انتقال کرا لیا ہے جو کہ عدالت نے میری درخواست پر میرے حق میں بحال کر دیا ہے۔

(۵) فریقِ ثانی کا دفاعی بیان ہے کہ سلطان شاہ نے سید یوسف شاہ کے ساتھ جو مصالحت کی ہے وہ نافذ نہیں کیونکہ سلطان شاہ نے اپنی تمام جائیداد اپنے بیٹوں کے درمیان تقسیم کر دی ہے اور جس جائیداد سے سلطان شاہ نے مصالحت کی ہے یہ اس کی اپنی نہیں بلکہ اس کے بیٹوں کی جائیداد ہے، یہی وجہ ہے کہ سلطان شاہ نے ایک ہزار روپے فریقِ اوّل کو واپس کر کے مصالحت کالعدم کر دی ہے۔

نتیجہ بیانات

ان نکات پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ فریقین کسی نہ کسی طریقے سے بیٹیوں کو جائیداد سے محروم کرنے پر متفق ہیں جو کہ ایک جاہلانہ اور غیر شرعی اقدام کی تائید کے مترادف ہے، اگر والد نے دیدہ دانستہ طور پر اپنی جائیداد بیٹوں کے نام منتقل کر کے بیٹیوں کو میراث سے محروم رکھا ہو تو یہ ایک ناجائز اور حرام حرکت ہے، اگرچہ قضاءً یہ اقدامات نافذ ہوتے ہیں لیکن عند اللہ اس جرم سے خلاصی اور نجات کے لیے یہ ضروری ہے کہ ورثاء مورث کے فراغتِ ذمہ کے لیے ہر صاحبِ حق کو اس کے حق کی ادائیگی کریں ورنہ حقوق العباد کی حق تلفی سے انسان کا عذابِ الٰہی میں گرفتار ہونا یقینی امر ہے۔ تاہم والد کے تصرفات قضاءً نافذ رہیں گے۔ (الفتاوی الہندیہ ج ۴ ص ۱۴۹)

اصل دعویٰ کے بارے میں شرعی فیصلہ

جہاں تک متنازعہ جائیداد کے بارے میں فریقین کے بیانات کا تعلق ہے تو واضح رہنا چاہیئے کہ سرکاری کاغذات میں اس کا محض انتقال و رجسٹری ہونا شرعاً نہ کسی کی ملکیت کی دلیل ہے اور نہ اس پر حقِ ملکیت موقوف ہے، اس لیے حیات شاہ کے اپنی جائیداد میں مالکانہ تصرفات کے نفاذ کے لیے سرکاری کاغذات میں انتقال ضروری نہیں جو باقاعدہ گواہان سے ثابت ہو جائے اس کو اعتبار دیا جائے گا۔ لیکن جہاں تک بعد ازاں یوسف شاہ اور سلطان شاہ میں تنازعہ کا مسئلہ ہے اور پھر اس میں مصالحت بھی ہوئی ہے تو اس کا ثبوت باقاعدہ اقرار یا عادل گواہان کی گواہی پر موقوف ہے، اس لیے اگر سلطان شاہ کی رضا و رغبت سے

مصالحت ایک دفعہ ثابت ہو جائے تو باقاعدہ تسلیم کر لینے کے بعد خود سلطان شاہ اور نہ اس کے ورثاء اس سے انکار کر سکتے ہیں، لیکن اس مصالحت کے نفاذ کے لیے یہ ضروری ہے کہ سلطان شاہ جس جائیداد پر مصالحت کر رہا ہے یہ اس کی اپنی ملکیت میں ہو، ورنہ اگر اس نے واقعی یہ جائیداد اپنے بیٹوں میں تقسیم کر کے باقاعدہ قبضہ دے کر ہبہ کیا ہو تو پھر قبضہ سے ہبہ تام ہو کر اس جائیداد پر سلطان شاہ کی ملکیت باقی نہیں رہتی، اس لیے کہ کوئی شخص کسی دوسرے کی جائیداد پر مصالحت نہیں کر سکتا اور نہ کسی دوسرے کو اس کی جائیداد دے سکتا ہے اگرچہ باپ بیٹا ہی کیوں نہ ہوں۔ تاہم مصالحت کرتے وقت مذکورہ جائیداد کا سلطان شاہ کی ملکیت میں ہونے کے ثبوت کے لیے باقاعدہ گواہان کی گواہی ضروری ہے ورنہ فریقِ ثانی کو اس پر قسم دی جائے گی، اگر فریقِ اوّل سلطان شاہ کی ملکیت پر گواہ قائم کرے تو پھر مصالحت قائم رہے گی جس کی پابندی دونوں کے لیے ضروری ہوگی ورنہ پھر ان کے مطالبہ پر فریقِ ثانی پر ملکیت سے انکار کرنے کے اس پر قسم دی جائے گی، اگر فریقِ ثانی قسم کھائے تو مصالحت کا دعویٰ کالعدم رہے گا اور اصل فیصلہ فریقین کے قدیم دعاوی پر ہوگا جس میں مدعی کے لیے گواہ اور گواہ میسر نہ ہونے کی صورت میں مدعیٰ علیہ کو قسم دی جائے گی۔

اس لیے متعلقہ حاکم فریقین سے گواہان کا مطالبہ کرے یا ان کی قسم پر فیصلہ کرے۔

مدعی اور مدعیٰ علیہ میں سے قسم کس پر ہے؟

سوال:۔ خالد نے واجد پر دعویٰ کیا ہے کہ تم نے مجھ سے گیارہ ہزار روپے قرض لیے ہیں جبکہ واجد اس کا انکار کرتا ہے اور مدعی کے پاس کوئی گواہ بھی نہیں ہے، لہٰذا اب قسم مدعی کو دی جائے گی یا مدعیٰ علیہ کو؟

الجواب:۔ قسم شرعاً مدعیٰ علیہ کے ذمے ہوتی ہے اور مدعی کے اختیار میں دعویٰ کے اثبات کے لیے گواہ پیش کرنا لازم ہوتا ہے، صورتِ مسئولہ میں اس تنازع کے حل کے لیے مدعی سے گواہ طلب کیے جائیں اگر وہ گواہ پیش نہ کر سکے تو مدعیٰ علیہ کو قسم دی جائے بشرطیکہ مدعی اس کا طالب بھی ہو۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: البینۃ علی المدعی والیمین علیٰ من انکر۔ وفی روایۃ والیمین علی المدعیٰ علیہ۔ (جامع الترمذی ص۱۶۱ ابواب الاحکام۔ باب ما جاء فی ان البینۃ علی المدعی والیمین علی المدعیٰ علیہ)[1]

---

[1] عن ابن عباسؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لو یعطی الناس بدعواھم ادعی ناس دماء رجال واموالھم ولکن الیمین علی المدعیٰ علیہ۔ (سنن ابن ماجہ ص۱۶۸ ابواب الاحکام۔ باب البینۃ علی المدعی والیمین علی المدعیٰ علیہ) ومثلہٗ فی صحیح المسلم ج۲ ص۷۴ کتاب الاقضیۃ، باب الیمین علی المدعیٰ علیہ

زمین کے تنازعہ پر فریقین میں شرعی فیصلہ

سوال:- کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ زمین کا ایک ٹکڑا دو فریقوں کے مابین متنازعہ ہے۔
فریقِ اول امیر حمزہ وغیرہ نے دعویٰ کیا ہے کہ یہ متنازعہ زمین ہماری ہے، جبکہ فریقِ ثانی دلبر و دین محمد وغیرہ نے فریقِ اول کے دعویٰ کے رد میں یہ کہا ہے کہ یہ زمین تمہارے باپ نے ہمارے باپ کو اس مشترکہ مال کے حق کے بدلے میں جو مشترکہ اموال میں اس کو ملتا، دیدی ہے یعنی ہمارے والد پر بیچدی ہے۔
لہذا آپ حضرات سے درخواست کی جاتی ہے کہ فریقین کے درمیان قرآن وسنت کی روشنی میں اس تنازعہ کا فیصلہ فرمایا جائے؟

الجواب:- صورتِ مسئولہ میں فریقِ اول امیر حمزہ وغیرہ مدعی ہے، اور فریقِ ثانی دلبر و دین محمد مدعیٰ علیہ ہے، فریقِ ثانی نے فریقِ اول کے دعویٰ کے رد میں یہ کہا ہے کہ زمین کا یہ متنازعہ ٹکڑا تمہارے مورث (والد) نے ہمارے والد کے حق کے بدلے میں (یعنی ہمارے والد کے اُس مال کے بدلے جو مشترکہ اموال میں اس کو ملتا اور جسے تمہارے مورث (والد) نے خرچ کر لیا تھا) دیدیا ہے (یعنی بیچدیا ہے)۔ تو اب شرعی ضابطہ کے مطابق فیصلہ کی صورت یہ ہوگی کہ دافع اپنے دفع کو معتبر شہادت سے ثابت کرے گا، اثباتِ دفع کی صورت میں فیصلہ مدعیٰ علیہ کے حق میں کیا جائے گا، بصورت دیگر مدعی دفریقِ اول کو حلف علی العلم دیا جاوے گا۔

قال العلامة محمد کامل الطرابلسیؒ: سئلت فی رجل ادعی علی اٰخر عقاراً انہٗ تلقاہ بالارث من ابیہ فاجابہ المدعیٰ علیہ بانی اشتریتہٗ من ابیک حال حیاتہ بکذا وکذا من القروش وانہ فی حوضی وتصرفی مدۃ تزید علیٰ خمسین سنۃ مع حضورک وعلمک وسکوتک بلاعذر شرعی ھل یکون جواب المدعیٰ علیہ من باب الاقرار بالتلقی من ابیہ فیحتاج الیٰ بیّنۃ تشھد لہٗ بالشراء ولا ینفعہ وضع الید والتصرف المدۃ المذکورۃ ولا تکون الحادثۃ من قبیل ما مضی علیہ خمس عشرۃ سنۃ، فاجبت نعم جواب المدعیٰ علیہ من قبیل دعوی التلقی من مورث المدعی ودعوی التلقی من مورثہ اقرار لہٗ بالملک ثم دعواہ الانتقال الیہ منہ تحتاج الی بیّنۃ لان کل مدع یحتاج الی البیّنۃ ولاینفعہ وضع الید المدۃ المذکورۃ مع الاقرار

المذکور ولیس ھذا من باب ترک الدعوٰی بل من باب المواخذۃ بالاقرار ومن اقر لشئ لغیرہ اخذ باقرارہ ولوکان فی یدہٖ احقابًا کثیرًا لا تعد الخ
(الفتاوٰی الکاملیۃ ص۱۲۳ کتاب الدعوٰی)

وفی مجلۃ الاحکام : اذا ثبت من ادعی دفع الدعوٰی دفعہ تندفع دعوی المدعی ولا یحلف المدعی الاصلی بطلب صاحب الدفع۔ فان نکل المدعیٰ عن الیمین یثبت دفع المدعیٰ علیہ وان حلف تعود دعواہ الاصلیۃ۔
(المجلۃ الاحکام العدلیۃ المادۃ ۱۶۳۲ کتاب الدعوٰی الفصل الثانی فی دفع الدعوٰی)

قال العلامۃ خالد اتاسی رح : وان کان فعل غیرہ۔ کما اذا کان بقولہ اودعنیہ الغائب او آجرنیہ الیٰ قولہ یحلفہ علی العلم ای علیٰ انہٗ لایعلم ان المدعی بہٖ ودیعۃ اورھن اومستاجر ـــ وھو ھذا الثانی ھوالمعنی یقول صاحب رد المحتار ویحلفہ علی العلم لانہ علیٰ فعل الغیر۔ (شرح المجلۃ ج ۵ ص۷۵ کتاب الدعوٰی الفصل الثانی فی دفع الدعوٰی)

قال العلامۃ علی حیدرؒ : واذا حلف المدعی تعود دعواہ الاصلیۃ وفی ھذہ الحال یکون فی اصل الدعوٰی احتمالان۔ الاحتمال الاول : ان تثبت دعوی المدعی نظرًا لکون دفع المدعیٰ علیہ یتضمن الاقرار وفی ھذا الحال یحکم باصل الدعوٰی کما ھو فی المثال المذکور آنفًا حیث ان دفع المدعی علیہ بقولہٖ انتی ادیت المبلغ المدعی بہٖ ھو اقرار بالمبلغ المذکور فاذا لم یثبت المدعیٰ علیہ الاداء وحلف المدعی الیمین علیٰ عدم الاداء یحکم علی المدعیٰ علیہ باداء المبلغ المدعی بہٖ للمدعیٰ۔
(درر الحکام شرح مجلۃ الاحکام ج۴ ص۲۲۴ کتاب الدعوٰی الفصل الثانی)

درر الحکام کی عبارت مسطورہ سے معلوم ہوا کہ مُدعی فریق کے حلف اٹھانے کی صورت میں جبکہ مُدعیٰ علیہ اپنے دفع کے اثبات سے عاجز آجائے تو جیت مُدعی فریق کی ہوگی یعنی اس صورت میں فیصلہ اس کے حق میں کیا جاوے گا۔

مُدعی مُدعیٰ علیہ کو قسم دینے کے بعد گواہ پیش کرے

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ دو آدمیوں کے درمیان ایک متنازعہ زمین تھی، مدعی گواہوں کو کسی وجہ سے حاضر نہ کرسکا تو مدعیٰ علیہ کو قسم دینے کے بعد فیصلہ کیا گیا، بعدازاں مدعی کو گواہ مل گئے، تو کیا مدعی اب گواہ پیش کرسکتا ہے یا نہیں اور ان کی شہادت قبول ہوگی یا نہیں؟

الجواب: نزاع کے حل کے لیے گواہ اصل اور بنیادی حیثیت رکھتا ہے، اگر مدعی کسی وجہ سے مقدمہ میں گواہ پیش نہ کرسکے اور قاضی مدعیٰ علیہ کو قسم دے کر فیصلہ کر جائے اور بعدازاں مدعی کو گواہ مل جائیں اور وہ ان کو پیش کرنا چاہے تو کرسکتا ہے شرعاً ان کی گواہی قبول ہوگی اور گذشتہ فیصلہ کالعدم ہوگا۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: (سوال) هل تقبل البيّنةُ لو اقامها المدّعی بعد يمين المدعیٰ عليه؟

(الجواب) تسمع البيّنة وتقبل علیٰ ماهو الصواب كما صرح به فی شرح الملتقیٰ والتنوير وغيرهما من الدعوىٰ۔

قال فی التنوير: وتقبل البيّنةُ لو اقامها المدعی بعد يمين المدعیٰ عليه عند العامة وهو الصحيح۔ (العقود الدرّية فی تنقيح الفتاوىٰ الحامدية ج۲ ص۲۱/۲۲ كتاب الدعوىٰ) [1]

مدعیٰ علیہ کے تصرفات پر اظہارِ رضامندی کے بعد دعویٰ کرنا

سوال:۔ ایک آدمی کا مسجد سے متصل ایک

---

[1] قال العلامة الحصكفیؒ: وتقبل البيّنة لو اقامها المدعی وان قال قبل اليمين لا بيّنة لی بعد يمين المدعیٰ عليه كما تقبل البيّنة بعد القضاء بالنكول عند العامة وهو الصحيح ...... ولان اليمين كالخلف عن البيّنة فاذا جاءَ الاصل انتهیٰ حكم الخلف كانهٗ لم يوجد اصلاً۔ (الدر المختار علیٰ هامش ردّ المحتار ج۴ ص۴۷۲ كتاب الدعوىٰ)

ومثلهٗ فی البحر الرائق ج۷ ص۲۰۶ كتاب الدعوىٰ۔

کمرہ ہے، اہلِ محلہ نے اس سے کہا کہ یہ کمرہ ہم کو دے دو ہم آپ کو اس کی قیمت دے دیں گے اور اس کمرے کو مسجد میں شامل کردیں گے اس میں لوگ نمازیں پڑھیں گے، اس پر کمرے کے مالک نے کہا کہ میں روپے نہیں لیتا بلکہ اس کمرے کو مسجد کے لیے بنام خدا وقف کرتا ہوں، اس پر اہلِ محلہ نے اس کمرے کو مسجد میں شامل کرلیا، تقریباً دو سال تک محلہ کے لوگوں نے، خود اس کمرے کے مالک اور اس کے دوسرے بھائیوں نے اس میں نمازیں ادا کیں، مسجد میں باقاعدہ امام بھی مقرر کیا گیا، اب دو سال کے بعد کمرے کے مالک کے دوسرے بھائی نے دعوٰی کیا ہے کہ یہ کمرہ جو مسجد میں شامل کیا گیا ہے میرا ہے اور اپنے بھائی سے بھی اور اہلِ محلہ سے بھی جھگڑتا ہے اور لوگوں کو مسجد میں نماز بھی نہیں پڑھنے دیتا، حالانکہ اس آدمی نے خود بھی تقریباً دو سال تک اس مسجد میں نمازیں پڑھی ہیں اور اپنے بھائی کے فیصلے پر راضی تھا اور اس پر کسی قسم کا اعتراض بھی نہیں کیا۔ تو اب اس آدمی کا دو سال کے بعد مقدمہ چلانا کیسا ہے؟ کیا شرعاً اس کا یہ دعوٰی قابلِ سماعت ہے؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ کے مطابق جب اہلِ محلہ نے کمرے کو مسجد میں شامل کرلیا اور مالک نے اس کو بنام خدا مسجد کے لیے وقف کردیا جس پر اس کے سب بھائی بھی راضی تھے اور دو سال تک کسی نے کوئی اعتراض نہیں بھی نہیں کیا تو اس رضامندگی کی وجہ سے ان کا حق دعوٰی ختم ہوگیا ہے اسلئے اب اگر ان میں سے کوئی دعوٰی کرتا ہے تو اس کا دعوٰی ناقابلِ سماعت ہے۔

لما قال العلامة محمد کامل الطرابلسیؒ: سئلت فیمن باع عقاراً وسلمه للمشتری وتصرف فیه زماناً وجاره اوغیره حاضر یری البیع والتسلیم والتصرف وھوساکت بلامانع ثم یقوم ویدعی انه کله او بعضه ھل لاتسمع دعواه ھذه؟ ـــــ فالجواب: لاتسمع لما تقرر ان من یری غیره یبیع ارضاً او داراً فتصرف فیه المشتری زماناً والرائی ساکت تسقط دعواه۔ (الفتاوی الکاملیة ص۱۱۴ کتاب الدعوی۔ مطلب لاتسمع دعوی من رأی البیع والتصرف)[1]

---

[1] قال العلامة خیرالدین الرملیؒ: (سئل) فیما لو باع شیئاً وبعض اقاربه یطلع علی بیعه وقبضه وتصرف المشتری فیه زماناً ثم ادعی فیه ملکاً ھل تسمع دعواه ام لا ـــــ (اجاب) قال کثیر من علمائنا اذا باع شخص عقاراً اوحیواناً او ثوباً او نحو ذلک وقبضه المشتری وتصرف فیه تصرف الملاک وبعض اقاربه مطلع علی ذلک ثم ادعاه او ادعی بعضه انه ملکه لاتسمع دعواه لان ذلک اقرار منه بانه ملک البائع قطعاً للاطماع الفاسدة وسد الباب التزویر والتلبیس الخ۔ (الفتاوی الخیریة علی هامش تنقیح الحامدیة ج۲ ص۷۱ کتاب الدعوی ومطالبه۔ مطلب لو باع شیئاً الخ)
ومثله فی فتاوی تنقیح الحامدیة ج۲ ص۱۵ کتاب الدعوی۔ باع داراً وقریبه حاضر تترک الدار ..... الخ

کاغذی ثبوت پیش کرنے کے بعد مدعیٰ علیہ کا انکار کرنا

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ فریقین (فریقِ اوّل محمد خان وغیرہ اور فریقِ ثانی اجمل خان وغیرہ) نے تحریری طور پر لکھ کر دیا کہ ہم متفقہ طور پر شرعی فیصلہ کروائیں گے، پھر ایک دینی مدرسہ میں آکر علماء کو یہ تحریر کر کے دے دیا کہ فریقِ اوّل محمد خان وغیرہ چھ ماہ تک اپنے حق کے ثبوت میں کاغذات پیش کرے گا اور اگر کاغذی طور پر اپنا حق ثابت نہ کر سکا تو اپنا قبضہ چھوڑ دے گا۔ فریقِ ثانی (اجمل خان وغیرہ) نے بھی اس بات پر رضامندی کا اظہار کر دیا کہ ٹھیک ہے اگر اس (فریقِ اوّل) نے ثبوت پیش کر دیا تو ہم اس کو یہ حق چھوڑ دیں گے۔ اس کے بعد فریقِ اوّل (محمد خان وغیرہ) نے چھ ماہ تک کاغذی طور پر اپنا حقِ ثبوت پیش کیا تو اس کے مخالف فریق اجمل خان وغیرہ نے کہا کہ اب ہم بھی اپنا حق ثابت کرنے کی کوشش کریں گے، یہ کہہ کر بات کو ٹال دیا اور اپنے تحریری وعدہ سے منحرف ہو گیا، اب آنجناب شریعتِ مطہرہ کی رُو سے مسئلہ کی وضاحت فرمائیں کہ ایسے شخص کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ اس شخص کا حکم یہ ہے کہ حاکم اس کو مقدمہ چلانے پر مجبور کرے گا، پھر دیکھا جائے گا کہ فیصلہ کس فریق کے حق میں کیا جاتا ہے۔

قال العلامۃ خالد الاتاسی رحمہ اللہ: اذا اصر المدعیٰ علیہ علی سکوتہ الخ فیحبس حتی یقر او ینکر۔ (شرح المجلۃ تحت المادۃ ۱۸۲۲ ج ۶ ص ۱۱۹ باب فی بیان احکام کتاب القاضی) [۱]

---

[۱] قال العلامۃ الحصکفیؒ: واذا قال المدعیٰ علیہ لا اقر ولا انکر لا یستحلف بل یحبس لیقر او ینکر الخ۔ (الدر المختار ج ۴ ص ۱۴۷ کتاب الدعویٰ)
وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج ۷ ص ۲۰۳ کتاب الدعویٰ۔

مدعی بہ کے سامنے ہونے کی صورت میں اشارہ ہی کافی ہے

سوال :- امارتِ اسلامی افغانستان کے صوبہ خوست میں ایک متنازعہ زمین پر دو فریقین کے مابین دعویٰ ہے۔ فریق اول (مدعی) محمد قاسم ہے اور فریقِ ثانی (مدعیٰ علیہ) محمد قیوم ہے، اس دعویٰ کے تصفیہ کے لیے دونوں نے مشترکہ طور پر دو حکمین مقرر کرلیے، ایک محکم مولانا نورالحق صاحب اور دوسرے محکم مولانا سید گلزار صاحب ہیں۔ مدعی اور مدعیٰ علیہ دونوں نے محکمین علماء کو متنازعہ زمین پر لے جاکر اپنے ہاتھوں سے اشارہ کرکے دکھائی اور محکمین حضرات نے خود مشاہدہ کرکے دیکھ لی۔ اس کے بعد موقعہ پر ہی مدعی محمد قاسم نے اپنا دعویٰ لکھا اور اسی جگہ پر محکمین حضرات کو دے دیا تاکہ وہ اس کو پڑھ کر کوئی فیصلہ کرسکیں۔ تحریری دعویٰ دیکھ کر محکمین میں سے مولانا سید گلزار صاحب نے کہا کہ یہ دعویٰ قابلِ سماعت ہی نہیں، اس لیے کہ اس میں زمین مدعی بہا کا حدود اربعہ نہیں لکھا گیا، حدود اربعہ کا لکھنا ضروری ہے اور دلیل اس کی یہ ہے کہ:

معلوم ان المدعی بہ ان کان عقاراً تعیین ببیان حدودہ۔ (شرح المجلۃ لخالد اتاسی ج۵ ص۱۴)

اس پر دوسرے محکم مولانا نورالحق صاحب نے کہا کہ صورتِ دعویٰ درست ہے، اس لیے کہ اس متنازعہ زمین پر ہم کھڑے اور حاضر ہیں اور اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں لہٰذا حدود لکھنے کی ضرورت نہیں رہی، دلیل اس کی یہ ہے: والتعریف بالاشارۃ یکون صحیحاً فی کل نوع من المدعی بہ الموجود منقولاً اوکان عقاراً والوصف والتعریف یکون فی المدعی بہ الغائب وغیرالموجود۔ (دررالحکام ج۴ ص۱۶۱)

اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ (۱) اگر کسی متنازعہ زمین کو قاضی یا محکم خود حاضر ہوکر مشاہدہ کرلے تو پھر حدود لکھنا ضروری ہے یا نہیں؟

(۲) اوپر دی گئی صورت میں کون سا محکم فقہ حنفی کے موافق ہے؟ اور جو صورتِ دعویٰ اوپر دی گئی ہے وہ درست ہے یا نہیں؟

الجواب :- کوئی متنازعہ چیز جب مجلسِ قضاء میں برائے تصفیہ حاضر ہو تو اس کے تعین کے لیے صرف اشارہ ہی کافی ہوتا ہے، اس کے دیگر صفات اور حدود اربعہ وغیرہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں رہتی، صرف اشارہ کردینے سے مدعیٰ بہ کا تعین ہوجاتا ہے، تاہم اگر متنازعہ چیز مجلسِ قضاء میں حاضر نہ ہو تو حکمین یا عدالت میں قاضی یا جج کے سامنے اس چیز کی تعریف بالاوصاف اور حدود اربعہ بیان کرنا ضروری ہوگا تاکہ نزاع ختم کرنے کے لیے

مدعیٰ بہ سب پر واضح ہوجائے۔

صورتِ مسئولہ میں چونکہ حکمین مدعی بہ زمین کے پاس کھڑے ہیں اور اشارہ کے ساتھ اس کی تعیین ممکن ہے، اس کے بعد کوئی جہالت وغیرہ باقی نہیں رہتی، اس لیے حکم مولانا نورالحق صاحب کی بات درست ہے۔

لما فی شرح المجلۃ: معلومیۃ المدعی بہ تکون بالاشارۃ اوالوصف والتعریف هو اذا کان عیناً منقولاً وکان حاضراً فی مجلس المحاکمۃ فالاشارۃ کافیۃ۔ (المادۃ ۱۶۲۰۔ درالحکام ج۴ ص۱۸۵ کتاب الدعویٰ)

وفیہ ایضاً: کذلك لایشترط بیان حدود العقار اذا کان مستغنیاً عن التحدید لشھرتہ۔ (المادۃ ۱۶۲۳۔ درالحکام ج۴ ص۱۹۶ کتاب الدعویٰ)

وفیہ المسئلۃ الثانیۃ لایشترط عند الامامین بیان حدود العقار اذا کان مستغنیاً عن التحدید لشھرتہ لان الشھرۃ مغنیۃ عن التحدید وقد حصل المقصود بلا تحدید۔ (درالحکام ج۴ ص۱۹۹ کتاب الدعویٰ)

مقدار مدعیٰ بہ میں غلطی ہوجانا

سوال: جناب مفتی صاحب! زمین کے ایک تنازعہ میں فریقین نے بندہ کو حکم بنایا ہے۔ اب مدعی نے جس زمین پر دعویٰ کیا ہے اس میں اس نے حدود اربعہ تو صحیح بیان کیا ہے مگر مقدارِ زمین کے بیان میں غلطی کر گیا ہے اس زمین کی اصل مقدار ۲۰ کنال ہے جبکہ مدعی نے ۱۶ کنال کا ذکر کیا ہے۔ مدعیٰ علیہ کے وکیل ایک مولوی صاحب ہیں، ان کا کہنا ہے کہ متنازعہ زمین کی مقدار ۲۰ کنال ہے اور مدعی نے ۱۶ کنال ذکر کی ہے اس لیے یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے۔ تو کیا واقعی یہ دعویٰ صحیح نہیں؟ اگر نہیں تو کیوں؟

الجواب: شرعاً دعویٰ کی صحت کے لیے مدعی کا مدعیٰ بہٖ صحیح اور درست حدود اربعہ بیان کرنا ضروری ہے، اگر مدعی سے مقدارِ رقبہ بتانے میں غلطی ہوجائے تو اس سے دعویٰ کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، دعویٰ درست ہوگا۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں مدعی کا دعویٰ صحیح ہے اور مدعیٰ علیہ کے وکیل کا دعویٰ کو رد کرنا صحیح نہیں۔

لما فی مجلۃ الاحکام: اذا اصاب المدعی فی بیان الحدود واخطاء فی بیان مقدار ذراع العقار او دونہ لایمنع صحۃ دعواہ۔

(مجلۃ الاحکام المادۃ ۱۶۲۴)

فیصلہ شرعی بین الفریقین

فریق اوّل : فاروق شاہ ولد احمد شاہ
فریق ثانی : عرب خان ولد شیر علی خان
ساکنان پانٹی متنی

فقہاء اسلام کے تعریف مدعی اور مدعی علیہ : المدعی من یلتمس خلاف الظاهر و المدعی علیہ من یلتمس بظاهر (شرح المجلۃ لخالد اتاسی - ۵/۵)

وفی الهدایۃ المدعی من یتمسک بغیر الظاهر والمدعی علیہ من یتمسک بظاهر الی آخرہ (۳/۳۰۰)

وقال محمد المدعی علیہ هو المنکر (الهدایۃ ۳/۳۰۰)

سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس تنازع میں دونوں فریقین مدعیان ہیں۔ لہذا ہم اولاد دونوں کے دعاوی کا جائزہ لیں گے کہ کونسا دعوی اصول شرع کے موافق اور براہین کے ساتھ اپنے مقصد کو ثابت کرتا ہے۔

فاروق شاہ کا دعوی یہ ہے کہ نعیم شاہ نے اپنے جملہ جائیداد کو میرے والد احمد شاہ ولد انبالی اپنے بھائی کے نام کئی سال پہلے کر دیا تھا۔ اور اس کا سٹام میرے پاس موجود ہے۔

جائزہ یہ دعوی کئی وجوہات کی بنا پر اپنے مقصد کو ثابت کرنے میں ناقص ہے۔

(۱) جس اسٹام کا حوالہ مدعی دعوی میں دے چکا ہے اور بیان کے ساتھ وہ اسٹام منسلک ہے اس میں گواہ درج نہیں، جب کہ صرف اسٹام اثبات دعوی کے لیے قابل قبول نہیں ہے۔ فقہاء کرام کا فیصلہ ہے کہ صرف تحریر پر اعتماد نہیں کیا جائے گا۔

کما قال ابن عابدین : لا یعتمد علی الخط ولا یعمل بمکتوب الوقف الذی علیہ خطوط القضاۃ الماضین۔ (رد المختار - ۵/۴۳۵) وہ اس لیے کہ الخط یشبہ الخط کی وجہ سے تحریر خبر واحد کے حکم میں ہو کر نا قابل احتجاج ہے۔

۲۔ مدعی فاروق شاہ اپنے دعوی ارث کے اثبات کے لیے گواہان بھی پیش نہ کر سکا جب کہ مدعی کے ذمہ قانون شرعی کے مطابق اثبات دعوی کے لیے گواہان کا پیش کرنا لازمی ہے۔ لقولہ علیہ السلام : البینۃ علی المدعی والیمین علی من انکر۔ (الحدیث)

(۳) اگر نعیم شاہ نے اپنا جملہ جائداد اپنے بھائی احمد شاہ کو ہبہ بھی کیا ہو لیکن انہوں نے بھائی کو موهوبہ اراضی قبضے میں نہیں دیا تھا جب کہ ہبہ تام ہونے کے لیے قبضہ شرعی کا ہونا ضروری ہے

بدون اس کے ہبہ صحیح نہیں ہوتا۔ چوں کہ مدعی بھی قبضہ نہ دینے کا مُقر ہے لہٰذا ہبہ تام نہ ہوا۔ اس لیے مدعا علیہ کو حلف دینے کی حاجت نہ رہی۔

کما قال ابراھیم حلبی: الھبۃ ھی تملیک عین بلا عوض وتصح بایجاب و قبول وتتم بالقبض الکامل۔ فان قبض فی المجلس بلا اذن صح وبعدہ لابد من الاذن۔ (ملتقی الابحر علی صدر مجمع الانھر ۳/ ۴۸۹ تا ۴۹۲ کتاب الھبۃ)

قال المرغینانی: الھبۃ عقد مشروع وتصح بالایجاب والقبول والقبض۔ اما الایجاب والقبول فلانہ عقد والعقد ینعقد بالایجاب والقبول۔ والقبض لابد منہ لثبوت الملک...... ولنا قولہ علیہ السلام: لا یجوز الھبۃ الا مقبوضۃ ..... فان قبضھا الموھوب لہ فی المجلس بغیر اذن الواھب جاز استحساناً وان قبض بعد الافتراق لم یجز۔ (الھدایۃ -۳/ ۲۸۱ کتاب الھبۃ)

وفی مجلۃ الاحکام: تنعقد الھبۃ بالایجاب والقبول وتتم بالقبض قال سلیم رستم باز تحتھا: الکامل لانھا من التبرعات والتبرع لایتم الا بالقبض۔ (شرح المجلۃ - ۴۶۲)

۴۔ مکتوب (اسٹام) میں ذکر ہے کہ احمد شاہ ولد انبالی نعیم شاہ ولد انبالی کا اکیلا وارث ہے۔ جب کہ احمد شاہ ولد انبالی نعیم شاہ سے قبل فوت ہو چکا ہے اور وراثت کا تعلق موت کے بعد سے ہوتا ہے۔ لہٰذا جب احمد شاہ نعیم شاہ کا خود وارث نہ بن سکا تو اس کی اولاد بدرجہ اولی وارث نہیں بن سکتی۔ اس لیے کہ نعیم شاہ کا بھائی شیر علی ولد انبالی زندہ ہے۔ لہٰذا نعیم شاہ کے مرنے کے بعد اس کی جائیداد شیر علی کے نام ہوگی۔

<u>دعویٰ عرب خان ولد شیر علی</u>: موصوف کا دعویٰ ہے کہ نعیم شاہ ولد انبالی نے اپنے ہوش و حواس کی سالمیت کے ہوتے ہوئے ۱۵ مرلہ مارکیٹ جو بارہ دکانوں پر مشتمل ہے اور تین کنال اراضی مع پانی کے قیمتاً میرے ہاتھ فروخت کی ہے اور میرے پاس گواہ اسٹام پیپر سرکاری انتقالات کی فوٹو کاپیاں اور نعیم شاہ کی اپنی آواز کی کیسٹ موجود ہے۔

<u>جائزہ</u>۔ قانون شرعی کے مطابق کسی تنازع کے حل کے لیے اصول یہ ہے کہ مدعی خلاف ظاہر کے اثبات کے لیے گواہ پیش کرے گا اور اگر اس کے پاس گواہ نہ ہو تو پھر مدعی کے مطالبہ پر مدعی علیہ سے قسم لی جائے گی۔ لما قال علیہ الصلاۃ والسلام: البینۃ علی المدعی

والیمین علی من انکر (الحدیث)

اس لیے عرب شاہ ولد شبیر علی کے ذمہ اثبات دعویٰ کے لیے گواہ پیش کرنا ہے جو کہ انہوں نے پیش کیے۔

(۱) چمن خان (۲) عبدالرحمٰن۔ پسران قدرت اللہ ساکنان پانی۔

نے کلمہ پڑھ کر گواہی دی کہ نعیم شاہ (مرحوم) نے ۵ امرلے مارکیٹ اور تین کنال اراضی مسمی عرب خان ولد شبیر علی کے ہاتھ فروخت کی ہے ہم اس کی گواہی دیتے ہیں۔

ان دونوں گواہوں کے علاوہ واحد شاہ، راحت شاہ اور گل نبی نے بھی گواہی دی۔ کہ نعیم شاہ نے اپنی مارکیٹ اور تین کنال اراضی کا عرب خان کو مالک بنایا ہے۔ اور نعیم شاہ نے ہمیں گواہ بنایا تھا۔ ہم بھی اس کی گواہی دیتے ہیں کہ نعیم شاہ اپنی زندگی میں اس مذکورہ جائیداد کا مالک عرب خان کو ٹھہرایا ہے۔ اس کے ساتھ اقرارنامہ نمبر ۲۰۷۰۱۶ تحریر کردہ ۹۸/۴/۳۔ گواہان کے امضاآت کے ساتھ پیش کیا جس میں تحریر ہے۔ من مسمی نعیم شاہ ولد انبالی خان عمر ۷۵ سال ..... بذریعہ تحریر ہذا مقر ہوں کہ میری ذاتی ملکیتی مارکیٹ واقع چوک پانی ۵ امرلہ جس میں ۱۲ دکان بعوض ۲۵۰۰۰ ہزار روپے فی دکان جن کی کل قیمت تین لاکھ ہوتی ہے اور علاوہ ازیں ایک کھیت تعدادی تین کنال آبی و فصلی بعوض ڈھائی ہزار فی مرلہ جس کی کل قیمت ڈیڑھ لاکھ ہوتی ہے اور ۴۰ منٹ پانی از ٹیوب ویل نمبر ۱۱ پانی برائے سیرابی اراضی جس کی قیمت مبلغ ۷۰۰۰۰ ہزار روپے ہوتی ہے بطریقہ قطعی فروخت کرتا ہوں یہ کل رقم ۵۲۰۰۰۰ لاکھ نقد بوقت سپردگی مارکیٹ و کھیت و پانی وصول کر چکا ہوں مندرجہ بالا مملوکا جائیداد بدست مسمی عرب خان ولد شبیر علی سکنہ پانی فروخت کر دی ہے۔ تحریر ہذا من مقر نے بہ عقل سلیم اپنی مرضی سے حوالہ کرتا ہوں یہ ملکیت بلا شرکت غیرے میری ذاتی ہے۔ اگر کوئی دعویٰ کرے تو میں ہر قسم سے اس کا ذمہ دار ہوں گا۔

العبد نعیم شاہ ولد انبالی۔ راقم الحروف ملک سردار احمد نمبردار۔ گواہ مسلم علی، امیر زیب ولد ظہور علی، چمن خان ولد قدرت اللہ، عبدالرحمٰن ولد قدرت اللہ۔

اس کے علاوہ سرکاری انتقالات کے تصدیق شدہ کاغذات کی فوٹو کاپیاں بھی پیش کیے۔

اور اس کے ساتھ وہ کیسٹ بھی پیش کی جس میں نعیم شاہ ولد انبالی نے اپنی مارکیٹ، تین کنال اراضی مع پانی نمبر عرب خان کے ہاتھ فروخت کرنے کا اقرار کیا ہے اور کئی لوگوں کو مخاطب کر کے گواہ بنایا ہے۔

قانون شرعی یہ ہے کہ جب کوئی مدعی اپنا دعویٰ پر بینہ پیش کرنے تو شرعاً قاضی پر لازم ہے کہ اس کے حق میں فیصلہ کرے کما فی مجلۃ الاحکام ۔ (المادۃ ۱۸۱۸) ان أثبت المدعی دعواہ بالبینۃ حکم القاضی لہ بذلك ۔ قال علی حیدر تحت ھذہ المادۃ ان اثبت المدعی دعواہ بالبینۃ ای : اذا شھد شھود وجرت تزکیھم سرا وعلانیۃ فظھر انھم عدول و مقبولۃ الشھادۃ حکم القاضی بذلك ۔ (درر الحکام ۔ ۴/ ۶۴۵)

لہٰذا گواہان کی گواہی اور بطور تائید اسٹام میں تحریر شدہ اقرار نامہ جس پر گواہوں کے دستخط موجود ہے ۔سرکاری انتقالات کے تصدیق شدہ فوٹو کاپیاں اور ٹیپ شدہ بیان سے وضاحت کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ نعیم شاہ ولد انبالی سکنہ پانئی نے بقائمے ہوش و حواس اپنی ذاتی ملکیت ۱۵ مرلہ مارکیٹ جو ۱۲ عدد دکانوں پر مشتمل ہے اور تین کنال اراضی مع پانی نمبر کے عرب خان ولد شیر علی سکنہ پانئی کے ہاتھوں فروخت کی ہے اور اس کو اپنی حیات ہی میں قبضہ دیا ہے جو آج تک عرب خان کے قبضہ میں ہے ۔شریعت مقدسہ میں جب دو فریق کے باہمی رضامندی سے ایک بار ایجاب قبول ہو کر عقد بیع ہو جائے تو پھر کسی کو بھی شرعاً اس عقد کے فسخ کا اختیار نہیں ہے ۔

کما فی الھدایۃ : واذا حصل الایجاب والقبول لزم البیع ولا خیار لواحد منھما الخ (۳/ ۲۵)

وفی ملتقی الابحر واذا وجد الایجاب والقبول لزم البیع بلا خیار (بحوالہ مجمع الأنھر ۔ ۳/ ۱۰)

وھکذا فی الھندیۃ (۳/ ۸) وکذا فی فتح القدیر (۵/ ۴۶۴)

اس لیے جملہ مدعی بہ (تین کنال اراضی مع پانی نمبر اور پندرہ مرلہ مارکیٹ) عرب خان ولد شیر علی کی زرخرید املکیت ہے ۔کسی کا اس پر دعویٰ ارث وغیرہ کرنا شرعاً صحیح نہیں ۔

فیصلہ شرعی

فریق اوّل : فاروق شاہ بن احمد شاہ مدعی ۔

فریق ثانی : شیر علی، نعیم شاہ، وغیرہ پسران انبالی ۔

فریق اول : فاروق شاہ ولد احمد شاہ کا دعویٰ ہے کہ انبالی (جو شیر علی، نعیم شاہ وغیرہ کا باپ ہے) اور اس کے بھائی میر علی نے آج سے تقریباً ۵۰ ، ۶۰ سال قبل میرے والد احمد شاہ ولد انبالی کی زوجہ اول امرو بی بی (مرحومہ) جو ۵۰ ، ۶۰ سال قبل فوت ہو چکی ہے کے جائیداد کو باہمی تقسیم کیا ہے ، جب کہ اس جائیداد کا حقدار میرا والد صاحب ہے اس لیے وہ مجھے واپس دیا جائے ۔جبکہ

مدعا علیہان مدعی کے اس دعویٰ ارث کے منکر ہیں۔

جائزہ : قانونی شرعی کے اندر ارث، وقف وغیرہ کے دعویٰ کے سماع کے لیے ضروری ہے کہ ۳۶ سال کے اندر اندر کیا جائے اگر بلاضرورت شرعی ۳۶ سال تک تاخیر کیا جائے تو شرعاً وہ دعویٰ قابل سماعت نہیں۔ اتنی مدت کی تاخیر سے سمجھا جائے گا کہ مدعی بہ مدعی کا حق نہیں ورنہ وہ اتنی تاخیر نہ کرتا۔

کما قال ابن عابدین : عن المبسوط اذا ترک الدعوی ثلاثا وثلاثین سنة ولم یکن مانع من الدعوی ثم ادعی لا تسمع دعواه لان ترک الدعوی مع التمکن یدل علی عدم الحق ظاهرا وفی الجامع الفتوی لا تسمع الدعوی بعد ستة وثلاثین سنة الا ان یکون المدعی غائبا او صبیا او مجنونا ولیس لهما ولی او المدعی علیه امیرا جائرا الی اخره (ردالمختار ۶/۴۲۲)

وقال العلامة سلیم رستم باز : اذا مضی علی الدعوی ثلاثون سنة بلا عذر فلا تسمع وان امر السلطان بسماعها۔ (شرح المجلة ۹۸۳)

وقال علی حیدر : لذلك فالدعوی التی تترك ستة وثلاثین سنة بلا عذر لا تسمع مطلقاً حیث ان ترك الدعوی تلك المدة مع الاقتدار علیها وفقدان العذر یدل علی عدم الحق۔

(درر الحکام شرح المجلة ۴/۲۹۵)

• وقال العلامة الخالد اتاسی : عن جامع الفتاوی ان المتاخرین من اهل الفتوی قالوا لا تسمع بعد ستة وثلاثین سنة الا ان یکون المدعی غائبا او صبیا او مجنوناً ولیس لهما ولی او المدعی علیه امیرا جائرا یخاف منه وعللوا ذلك بأن ترك الدعوی جمیع هذه المدة مع تمکن منها دلیل علی عدم الحق ظاهراً۔ (شرح المجلة ۵/۱۶۷)

لہٰذا ان دلائل کے پیش نظر فاروق شاہ ولد احمد شاہ کا دعویٰ ارث چوں کہ ۶۰ سال گذر جانے کے بعد ہو رہا ہے۔ جب کہ اس دوران کوئی عذر شرعی جو دعویٰ سے مانع ہو موجود نہیں تھا۔ اس لیے شرعاً ان کا یہ دعویٰ قابل سماعت نہیں ہے۔ مدعی بہ انبالی اور اس کے بھائی میر علی کا منصور ہے اور ان کے بعد ان کے ورثاء کا حق ہے۔

باب التحکیم
(ثالثی کے احکام و مسائل)

ثالث مقرر کرنے کی شرعی حیثیت

سوال:۔ کسی تنازع کے تصفیہ کے لیے ثالث مقرر کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ چونکہ ہر مستحق کو اس کا حق دلانا شریعت میں مطلوب و مقصود ہے اور حق دار کو جہاں کہیں سے بھی اپنے حق کے حصول کا اطمینان حاصل ہو جائے چاہے قاضی کے ذریعے سے ہو یا کسی اور کے ذریعے سے ہو تو اس میں شریعت نے فریقین کو اختیار دیا ہے کہ جس طرح ہر شخص کو دوسرے معاملات میں اپنے اوپر ولایت حاصل ہے اسی طرح تنازعات میں بھی اگر وہ اپنی ولایت کو بروئے کار لاتے ہوئے کسی تنازعہ کے تصفیہ کے لیے کسی شخص کو حَکَم مقرر کرے تو یہ جائز ہے لیکن اس میں فریقین کی باہمی رضامندی اور اتفاق رائے ضروری ہے، اگر کوئی بھی فریق ثالث مقرر کرنے سے انکار کرے تو صرف ایک فریق کی رائے سے ثالث مقرر کرنا جائز نہیں۔

کما قال اللّٰہ تبارک وتعالیٰ: وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَیْنِہِمَا فَابْعَثُوْا حَکَمًا مِّنْ اَھْلِہٖ وَحَکَمًا مِّنْ اَھْلِھَا اِنْ یُّرِیْدَا اِصْلَاحًا یُّوَفِّقِ اللّٰہُ بَیْنَہُمَا۔ (سورۃ النساء آیت ۳۵) [1]

کسی فاسق کو ثالث مقرر کرنے کی شرعی حیثیت

سوال:۔ شرعی امور میں غفلت کے مرتکب شخص کو کسی تنازعہ کے تصفیہ کے لیے ثالث مقرر کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ کسی شخص سے اس وقت صحیح انصاف کی توقع کی جا سکتی ہے جب وہ زہد و تقویٰ کی زینت سے آراستہ ہو کہ اس کے ہوتے ہوئے لوگوں کے تصفیہ طلب معاملات میں احتیاط سے کام لے گا اور کسی کی حق تلفی نہیں کرے گا، اور جو شخص زہد و تقویٰ سے خالی ہو اس سے

---

[1] قال العلامۃ برھان الدین المرغینانیؒ: اذا حکّم رجلان رجلاً فحکم بینھما ورضیا بحکمہ جاز۔ (الھدایۃ ج۳ ص۱۴۳ باب التحکیم۔ کتاب آداب القاضی)

ومثلہ فی مجلۃ الاحکام، المادۃ ۱۸۴۱ ص۱۱۹۳ الباب الرابع فی المسائل المتعلقۃ بالتحکیم۔

صحیح انصاف کا تصور بھی ممکن نہیں، اس لیے ثالث تب صحیح فیصلہ کر سکے گا جب وہ شرعی امور کا پابند ہو اور احکاماتِ شرعیہ کی بجاآوری میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتا ہو لہٰذا ابتداءً فاسق کو ثالث مقرر کرنا درست نہیں لیکن اگر فریقین نے باہمی رضامندی سے مقرر کر لیا ہو اور اس کا فیصلہ شرعی قواعد وضوابط کے موافق ہو تو وہ شرعاً نافذ العمل ہوگا، چونکہ فریقین میں سے ہر ایک کو فیصلے سے قبل رجوع کا حق حاصل ہے اس لیے کوئی بھی فریق فیصلے سے قبل اس کو زائل کر سکتا ہے۔

لما قال العلامة ابن نجیم المصریؒ: وافاد بقوله لوصلح قاضیاً جواز تحکیم المرأة والفاسق لصلاحیتهما للقضاء والاولیٰ ان لا یحکما فاسقاً۔

(البحرالرائق ج ۷ ص ۲۶ باب التحکیم) [1]

دینی امور سے ناواقف شخص کو ثالث مقرر کرنے کا حکم

سوال:۔ کیا دینی امور سے ناواقف شخص کو ثالث مقرر کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: دراصل فریقین کے تنازعہ کا حل نکالنا اور ہر ایک کو اپنا حق دلانا ثالث کی اہم ذمہ داری ہے اور ثالث یہ ذمہ داری اس وقت صحیح طریقے سے نبھا سکتا ہے جب وہ دینی امور سے واقف ہو کیونکہ قرآن وسنت کی تعلیمات سے واقفیت کے بغیر ان حقوق کے تحفظ کا تصور بھی ممکن نہیں، اس لیے دینی امور سے واقف عالم کے ہوتے ہوئے کسی غیر عالم کو ثالث مقرر کرنا مناسب نہیں، البتہ اگر غیر عالم کو ثالث مقرر کیا گیا تو جائز ہے لیکن اس پر لازم ہے کہ تنازعات کے تصفیہ میں ذاتی رائے قائم کرنے سے گریز کرے اور مسائل میں علماء سے رجوع کرے اس لیے کہ اگر اس کا فیصلہ شرعی اصول وضوابط کے موافق ہو تو نافذ ہوگا ورنہ نہیں۔

لما قال العلامة المرغینانی رحمہ اللہ: انه یمکنه ان یقضی بفتوٰی غیره ومقصود القضاء

---

[1] قال العلامة المرغینانی رحمہ اللہ:۔ والفاسق اذا حکم یجب ان یجوز عندنا کما مر فی المولّی۔ (الھدایة ج۳ ص ۱۴۳ باب التحکیم، کتاب آداب القاضی)
وَمِثْلُهٗ فی ردّ المحتار ج۴ ص ۳۸۶ کتاب القضاء، باب التحکیم۔

يحصل به وهو ايصال الحق الى مستحقه۔ (الهداية ج ۳ ص ۱۳۲ ادب القاضی) [1]

ثالث کا شرعی اصول کے خلاف فیصلہ کرنے کا حکم

سوال:۔ دو بھائیوں نے مشترکہ مال سے ۵۰۰ کنال زمین خریدی ان میں سے ایک بھائی کا انتقال ہوگیا، اس کے وارثوں میں ایک نابالغ بیٹا موجود ہے، بھائی کے انتقال کے بعد دوسرا بھائی اس کی زمین میں تصرف کرتا رہا، جب متوفی کا بیٹا بالغ ہوا تو اس نے اپنے حصے کی زمین کا مطالبہ کیا، دونوں نے فیصلے کے لیے ایک ثالث مقرر کیا، اس نے یہ فیصلہ کیا کہ ۱۵ کنال زمین متوفی بھائی کے بیٹے کو دی جائے گی اور باقی زمین دوسرے بھائی کی ملک میں رہے گی، اس وقت اس فیصلے پر دونوں راضی تھے لیکن متوفی کے بیٹے نے بعد میں انکار کیا، تو کیا شریعت کی رُو سے ثالث کا یہ فیصلہ شرعاً نافذ ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ شریعتِ مطہرہ نے اگر ثالث کو کسی متنازعہ معاملہ میں فریقین میں فیصلے کا اختیار دیا ہے تو اس میں یہ شرط لازمی قرار دی ہے کہ اس کا فیصلہ قرآن و سنت اور اجماع کے خلاف نہ ہو، اگر اس کا فیصلہ ان امور میں سے کسی کے بھی خلاف ہو تو اس کا فیصلہ نافذ نہیں ہوگا، تاہم فریقین میں سے کوئی ایک فریق اپنا حق معاف کر کے ثالث کے فیصلہ کو دوام بخش سکتا ہے، اس لیے حسبِ بیان مذکورہ بالا ثالث کا فیصلہ شرعی اصول کے منافی ہے کیونکہ اگر متوفی اور زندہ موجود بھائی نے مشترکہ مساوی مال سے زمین خریدی ہو تو اس زمین میں متوفی نصف حصے کا حقدار ہے اور اس کا یہ نصف حصہ اس کے وارثوں میں وراثت کے شرعی اصول کے تحت تقسیم کیا جائے گا، صورتِ مسئولہ میں ثالث کا فیصلہ چونکہ قرآنِ کریم اور سُنت کے اصول کے منافی ہے اس لیے شرعاً نافذ نہیں، جب نافذ ہی نہیں تو فریقین میں سے ہر کوئی اس کو رد کر سکتا ہے۔

لما قال العلامة ابوبکر بن مسعود الکاسانیؒ: فان وقع فی فصل فیه نص مفسر من الکتٰب او الخبر المتواتر او الاجماع فان وافق قضاءهٗ ذٰلك نفذ ولا یحل له النقض

---

[1] قال العلامة الکاسانیؒ: لانه یمکنه ان یقضی بعلم غیره بالرجوع الی فتوٰی غیره من العلماء۔ (بدائع الصنائع ج ۷ ص ۳ فصل التحکیم، کتاب آداب القاضی)
وَمِثْلُهٗ فی خلاصة الفتاوٰی ج ۴ ص ۳ کتاب القضاء۔

لانه وقع صحیحاً قطعاً وان خالف شیئاً من ذٰلک یردہ لانہٗ وقع باطلاً قطعاً۔

(بدائع الصنائع ج ۷ ص۱۴ کتاب آداب القاضی ۔ فصل واما بیان ماینقض من القضایا .... منهاہ ۱

قاضی اور حَکَم کا فرق

سوال:۔ بعض علاقوں میں لوگ باپ دادا کے قانون کے موافق اپنے فیصلے عدالتوں سے کراتے ہیں، اس میں حکومت کی طرف سے مقرر کردہ قاضی نہیں ہوتا، اور بعض لوگوں نے شریعت کے مطابق فیصلے کے لیے باقاعدہ ایک عالم مقرر کیا ہوتا ہے جو اُن کو جمعہ اور عیدین کی نمازیں بھی پڑھاتا ہے، تو کیا شرعاً اس کو قاضی تصوّر کیا جائے گا یا نہیں ؟

الجواب:۔ قاضی کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ فیصلوں کے بارے میں بااختیار ہو اور ہر خاص وعام پر اس کو یکساں ولایت حاصل ہو کیونکہ اختیارات میں معمولی سی کمی بیشی کے باعث لوگوں میں صحیح فیصلے کرنے سے قاصر رہے گا جس کی وجہ سے قضاء کا مقصد پورا نہیں ہوسکے گا، اور قاضی کو یہ مکمل اختیارات تب حاصل ہوں گے جب اس کو حکومتِ وقت نامزد کرے کیونکہ قاضی حکومت کی طرف سے وکیل کی حیثیت رکھتا ہے اور فریقین اپنی مرضی سے جس کو فیصلوں کے لیے مقرر کریں اس کو تو صرف ان لوگوں پر اختیارات حاصل ہوں گے جنہوں نے اس کو مقرر کیا ہو، ان کے علاوہ دوسروں پر اس کو اختیارات حاصل نہیں، اس لیے اگر لوگ اپنے فیصلوں کے لیے کسی کو مقرر کریں تو وہ حَکَم ہوگا قاضی نہیں ؟

لما قال العلامة اکمل الدین محمد بن محمود البابرتیؒ: ان المحکم ادنیٰ مرتبة من القاضی لاقتصار حکمه علیٰ من رضی بحکمه وعموم ولایة القاضی۔ (العنایة علیٰ هامش فتح القدیر ج ۶ ص۴۰۲ باب التحکیم ۔کتاب آداب القاضی) ۲

---

۱ قال العلامة ابن قاضی سماوةؒ، قضایا القضاة ثلاثة اقسام (۱) حکم بخلاف نص او اجماع وهذا باطل فلکل من القضاة نقضه اذا رفع الیه ولیس لاحد ان یجیزه ۔ (جامع الفصولین ج ۱ ص۳۳ الفصل الثانی فی القضاء فی المجتهد فیه)

وَمِثْلُهٗ فی البحرالرائق ج ۷ ص۱۱ کتاب ادب القضاء ۔ باب التحکیم ۔

۲ لما قال العلامة الحصکفیؒ: عرفاً تولیة الخصمین حاکماً یحکم بینهما ورکنه علیه مع قبول الآخر۔ (الدرالمختار علیٰ هامش ردالمحتار ج ۴ ص۳۸۶ ۔ باب التحکیم ۔کتاب القضاء)

وَمِثْلُهٗ فی البحرالرائق ج ۷ ص۲۴ کتاب آداب القاضی ۔ باب التحکیم ۔

معزول ثالث کا فیصلہ نافذ نہیں ہوگا

سوال:۔ فریقین نے دو آدمیوں کو زمین کے تنازعہ میں ثالث مقرر کیا، بعد میں کسی وجہ سے ایک فریق کا دونوں ثالثوں پر اعتماد باقی نہ رہا اور اس نے فیصلے سے پہلے ان دونوں کو معزول کرنے کا باقاعدہ اظہار کیا لیکن اس کے باوجود ثالثوں نے فیصلہ کر دیا، تو کیا ثالثوں کا فیصلہ نافذ العمل ہوگا یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں ان دونوں آدمیوں کو فریقین نے چونکہ اپنی طرف سے ثالث مقرر کیا ہے لہٰذا فریقین میں سے اگر کوئی بھی ان کو معزول کرنا چاہے تو فیصلے سے قبل ان کو یہ اختیار حاصل ہے، جب ایک فریق نے دونوں ثالثوں پر عدم اعتماد یا ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے ان کو معزول کر دیا تو اب ان کی تحکیم کالعدم ہوگی اور ان کا فیصلہ نافذ العمل نہیں ہوگا۔

لما قال العلامۃ طاھر بن عبد الرشید البخاریؒ: لو عزل احد الخصمین قبل الحکم لم ینفذ حکمہ علیہ۔ (خلاصۃ الفتاوٰی ج۴ ص۲۹ الفصل الخامس فی التحکیم۔ کتاب القضاء) [1]

فریقین کا تحکیم سے رجوع کے بعد حَکَم کیلئے اُجرت لینا جائز نہیں

سوال: فریقین فیصلہ کے لیے ایک قاضی کے پاس گئے، اُس نے فیصلے پر پندرہ (۱۵) روپے اُجرت پیشگی وصول کی، فریقین کی سُستی کی وجہ سے ابھی تک فیصلہ نہیں ہوسکا، اب فریقین قاضی سے اُجرت واپس کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں لیکن قاضی اُجرت واپس کرنے سے انکار کرتا ہے اور اس کا کہنا ہے کہ سُستی تمہاری طرف سے ہوئی ہے اس لیے میں پیشگی لی ہوئی اُجرت واپس نہیں کروں گا، تو کیا قاضی کے لیے فیصلے سے قبل اُجرت وصول کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مذکورہ قاضی شرعی قاضی نہیں کیونکہ قاضی تو حکومت کی طرف سے مقرر

---

[1] قال العلامۃ ابن نجیمؒ: وقال انہ یخرج عن الحکومۃ باحد اسباب ثلاثۃ بالعزل او بانتہاء الحکومۃ نہایتہا بان کان موقتاً فمضی الوقت او بخروجہ من ان یکون اھلاً للشہادۃ۔
(البحر الرائق ج۷ ص۲۸ باب التحکیم)
وَمِثْلُہٗ فی الدر المختار علی ہامش ردّ المحتار ج۴ ص۳۸۷ کتاب القضاء۔ باب التحکیم۔

ہوتا ہے، جب فریقین فیصلے کے لیے کسی کو مقرر کریں تو وہ مُحکّم ہوتا ہے اور تحکیم میں چونکہ فیصلے سے قبل فریقین کو رجوع کا حق حاصل ہے اس لیے ان میں سے اگر ایک فریق یا دونوں رجوع کر لیں تو یہ تحکیم فسخ ہو جائے گی، جب تحکیم فسخ ہو جائے تو محکم اجرت کا مستحق نہیں رہتا، ان کے مابین اجارہ تحکیم پر ہوتا ہے، جب فریقین رجوع کر لیں تو اجارہ بھی فسخ ہو جاتا ہے کیونکہ اجارہ محض عقد سے لازم نہیں آتا بلکہ جو شرط اس میں لگائی گئی ہو اس کا پورا ہونا ضروری ہے لہٰذا صورتِ مسئولہ میں حَکَم کو یہ رقم لینا جائز نہیں۔

قال العلامة التمرتاشیؒ: والاجرة لا یلزم بالعقد فلا یجب تسلیمه بل بتعجیله او شرطه فی الاجارة۔ (تنویر الابصار علی هامش رد المحتار ج ۵ ص ۷ کتاب الاجارة) [1]

علاقائی اصلاحی کمیٹی کی شرعی حیثیت

سوال: مروجہ اصلاحی کمیٹیوں کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کیا اس کے کسی فیصلے سے انکار جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ علاقائی اصلاحی کمیٹیاں جو کہ اکثر علاقہ کے معززین پر مشتمل ہوتی ہیں جو کہ لوگوں کے تنازعات ختم کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں لیکن فیصلوں کے لیے حکومت کی طرف سے مقرر نہیں ہوتیں بلکہ فریقین جب ان سے فیصلہ کرانا چاہتے ہیں تو اپنی طرف سے فیصلے کا اختیار دیتے ہیں اور جس فیصلے میں بھی اختیار حکومت کی بجائے عوام کی طرف سے ملتا ہے تو ان اختیارات کے تحت فیصلے کرنے والے کی شرعی حیثیت مثل حَکَم کے ہوتی ہے، تو جس طرح فریقین کو حَکَم کے فیصلے سے پہلے رجوع کا حق حاصل ہے اسی طرح جب حَکَم فیصلہ کر دے تو پھر فریقین کے لیے اس کا تسلیم کرنا لازم ہو جاتا ہے، اسلئے اگر کسی اصلاحی کمیٹی کا فیصلہ شرعی اصول کے منافی نہ ہو تو اس سے انکار جائز نہیں۔

قال العلامة المرغینانی رحمه الله: اذا حکم لزمهما لصدور حکمه عن ولایة علیهما۔

(الهدایة ج ۳ ص ۱۴۳ باب التحکیم کتاب آداب القاضی) [2]

---

[1] قال العلامة سلیم رستم باز: لا تلزم الاجرة بالعقد المطلق یعنی لا یلزم تسلیم بدل الاجارة حالاً بمجرد انعقادها۔ (شرح مجلة الاحکام، المادة ۴۶۶ ص ۲۶۱ الفصل الثانی فی المسائل المتعلقة الخ)
وَمِثْلُهٗ فی الهدایة ج ۳ ص ۲۹۲ کتاب الاجارة، باب الاجر متی یستحق۔

[2] قال العلامة الکاسانیؒ: اذا حکم صار لازماً۔ (بدائع الصنائع ج ۷ ص ۳ کتاب آداب القاضی)
وَمِثْلُهٗ فی شرح مجلة الاحکام۔ المادة ۱۸۴۸ ص ۱۱۹۸ الباب الرابع فی المسائل المتعلقة بالتحکیم۔

کسی فریق کی عدم موجودگی میں ثالثوں کے فیصلے کا حکم

سوال:۔ فریقین میں سے ایک فریق غائب ہے اور ثالثوں نے اس کی عدم موجودگی میں فیصلہ دوسرے فریق کے حق میں کر دیا، تو کیا ثالثوں کا یہ فیصلہ نافذ ہوگا یا نہیں ؟

الجواب:۔ اگر فریقین نے ثالثوں کو باقاعدہ فیصلے کا اختیار دیا ہو اور فیصلے سے قبل کسی ایک فریق نے بھی ان سے رجوع نہ کیا ہو تو ثالثوں کے لیے ضروری ہے کہ ان دونوں کے بیانات وغیرہ حاصل کریں اور اس کے مطابق فیصلہ کریں، اگر ثالثوں نے طرفین سے بیانات وغیرہ حاصل نہ کیے ہوں اور محض ایک فریق کے بیانات پر فیصلہ کیا ہو تو وہ فیصلہ جائز نہیں، کیونکہ جس طرح قضاء میں یہ ضروری ہے کہ مدعیٰ علیہ قضاء کے وقت عدالت میں حاضر ہو، اگر وہ خود حاضر نہیں ہوتا اور اپنی طرف سے وکیل وغیرہ مقرر کیا ہو تو اس کا حاضر ہونا ضروری ہے کیونکہ مدعیٰ علیہ یا اس کی طرف سے مقرر شدہ خصم کی عدم موجودگی میں مقدمہ کی صورتحال کی پوری وضاحت مشکل ہے تو جب قضاء میں مدعیٰ علیہ کا موجود ہونا ضروری ہے تو تحکیم جو کہ اس سے کم درجہ رکھتی ہے اس میں بطریق اولیٰ اس کی موجودگی ضروری ہے لہٰذا ایک فریق کی عدم موجودگی میں ثالثوں کا یکطرفہ فیصلہ نافذ العمل نہیں ہوگا۔

قال العلامة المرغيناني رحمه الله: ولا يقضي القاضي على غائب الا ان يحضر من يقوم مقامه۔ (الهداية ج ۳ ص ۱۴۲ باب كتاب القاضي الى القاضي) [۱]

ثالث کے فیصلے سے انکار کا حکم

سوال:۔ دو اشخاص کے درمیان زمین کی حدود پر تنازعہ ہوا، ان دونوں کے درمیان جرگہ نے فیصلہ کیا اور دونوں اس فیصلے پر راضی ہوئے، ان میں سے ایک نے قسم کھا کر اقرار کیا کہ مجھے یہ فیصلہ منظور ہے اور اس کی حدود نہیں توڑوں گا لیکن تین چار ماہ گذرنے کے بعد وہ اپنے وعدے سے منحرف ہوگیا اور فیصلہ کو ماننے سے انکار کر دیا اور حدود بھی توڑ دیئے، تو کیا جرگہ کے فیصلہ کے بعد اس سے انکار کرنا

---

[۱] قال العلامة الكاساني رحمه الله: اما الذي يرجع الى المقضي عليه فحضرته حتى لا يجوز القضاء على الغائب اذا لم يكن عنه خصم حاضر وهذا عندنا۔
(بدائع الصنائع ج ۷ ص ۸ كتاب آداب القاضي۔ فصل واما شرائط القضاء فانواع الخ)
ومثله في البحر الرائق ج ۷ ص ۱۷ باب كتاب القاضي الى القاضي۔

درست ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ اگر ان دونوں نے اپنی مرضی سے ثالث مقرر کیے ہوں اور مدتِ تحکیم کے اندر ان ثالثوں نے فیصلہ کیا ہو اور ان کا فیصلہ شریعت کے موافق ہو تو وہ نافذ العمل ہے، کیونکہ تحکیم کی وجہ سے ثالثوں کو ان دونوں پر مکمل اختیار حاصل ہے اس لیے ان کا فیصلہ دونوں فریقوں پر تسلیم کرنا لازم ہے، لہٰذا فیصلہ کے بعد کسی بھی فریق کا اس سے انکار کرنا درست نہیں، اسی قسم توڑنے کے بدلے اس پر کفارہ لازم آئے گا۔

لما قال العلامة المرغینانیؒ: اذا حکم لزمهما لصدور حکمه عن ولاية عليهما۔
(الهداية ج ۳ ص ۱۴۳ باب کتاب القاضی الی القاضی) ؎۱

ثالث معزول کرنے کا حکم

سوال:۔ اگر فریقین کسی کو ثالث مقرر کریں تو ان میں سے کوئی فریق اس کو معزول کرسکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ جب فریقین اپنی مرضی سے کسی کو ثالث مقرر کریں اور اس کو فیصلے کا اختیار دیدیں تو ثالث کو چونکہ فیصلے کا اختیار ان دونوں کی وجہ سے ملا ہے، اس لیے اگر ثالث کے فیصلے سے قبل کسی بھی فریق کو اس پر اعتماد باقی نہ رہے یا کسی اور وجہ سے اس کو معزول کرنا چاہے تو جیسا کہ قاضی کو فیصلوں کا اختیار حکومت سے مل جاتا ہے اور حکومت کو ہر وقت اس کے معزول کرنے کا اختیار حاصل ہے اسی طرح فریقین میں سے ہر ایک کو ثالث معزول کرنے کا اختیار حاصل ہے۔

قال العلامة سليم رستم باز اللبنانیؒ: لکل من الخصمين عزل الحکم قبل الحکم لانه مقلد من جهتهما فکان لکل منهم عزله وهو من الامور الجائزة فينفرد احدهما بنقضه کما ينفرد احد العاقدين فی مضاربة وشرکة ووکالة۔ (شرح مجلة الاحکام، المادة ۱۸۴۷ ص ۱۱۹۷ الباب الرابع فی المسائل المتعلقة بالتحکيم) ؎۲

؎۱ قال العلامة الکاسانیؒ: واذا حکم صار لازماً۔ (بدائع الصنائع ج ۷ ص ۳ کتاب ادب القاضی)
وَمِثْلُهٗ فی مجلة الاحکام، المادة ۱۸۴۸ ص ۱۱۹۸۔ کتاب الدعوٰی۔

؎۲ قال العلامة علاؤ الدين الحصکفیؒ: (وينفرد احدهما بنقضه) ای التحکيم بعد وقوعه (کما) ينفرد احد العاقدين (فی مضاربة وشرکة ووکالة) بلا التماس طالب۔
(تنوير الابصار علی هامش رد المحتار ج ۴ ص ۳۸۷ باب التحکيم)
وَمِثْلُهٗ فی خلاصة الفتاوٰی ج ۴ ص ۲۹ کتاب القضاء۔

فیصلے کے لیے مقرر کردہ کمیٹی کے ارکان کے باہمی اختلاف کا حکم

سوال:۔ فریقین نے تنازعہ کے فیصلے کا اختیار چند افراد پر مشتمل کمیٹی کو دیا، فیصلے کے بارے میں کمیٹی کے ارکان میں اختلاف پیدا ہوگیا، بعض ارکان نے مخالفت کے ہوتے ہوئے اپنی طرف سے ایک فریق کے حق میں فیصلہ سُنا دیا، تو کیا ان کا یہ فیصلہ نافذ ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ چونکہ تنازعہ کے بارے میں کمیٹی کو فیصلے کا اختیار فریقین کی طرف سے ملا ہے اس لیے اس کمیٹی کی حیثیت حکم کی طرح ہے اور فریقین فیصلہ کا اختیار دیتے وقت ثالث پر جو بھی شرائط عائد کریں ثالث پر ان کی پابندی کرنا لازمی ہے، اگر ثالث ان شرائط میں سے کسی بھی شرط کی خلاف ورزی کرے تو کوئی بھی فریق اس کے فیصلے کو رد کرنے کا اختیار رکھتا ہے، اسی طرح مذکورہ صورت میں جب فریقین نے اپنے فیصلے کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ فریقین نے کمیٹی کے تمام ارکان کو فیصلے کا اختیار دیا اور فیصلے میں کمیٹی کے تمام افراد کے اتفاق رائے کو شرط قرار دیا اور یہی وجہ ہے کہ فقہاء کرام نے تصریح کی ہے کہ اگر متعدد ثالثوں میں سے ایک بھی فیصلہ کی مخالفت کرے تو فیصلہ نافذ نہیں ہوگا ــــــ لہٰذا بشرطِ صحتِ سوال جب کمیٹی کے ارکان میں اختلاف پیدا ہوا تو اختلاف کے ہوتے ہوئے بعض ارکان کا اپنے طور پر فیصلہ کرنا جائز نہیں اس لیے فیصلہ نافذ العمل نہیں۔

لما قال العلامة سليم رستم باز اللبنانيؒ: اذا تعدد المحكمون على ما ذكر آنفاً يلزم انفاق رأي كلهم وليس لواحد منهم ان يحكم وحده۔[1]

[1] شرح مجلة الاحكام، المادة ۱۸۴۴ ص۱۱۹۶ الباب الرابع فى المسائل المتعلقة بالتحكيم

□ □

---

[1] قال العلامة ابن نجيم المصري رحمه الله: ولو حكما رجلين فحكم احدهما لم يجز ولا بد من انفاقهما على المحكوم به فلو اختلفا لم يجز۔

(البحر الرائق ج ۷، ص۲۶ باب التحكيم)

اِسلامی قوانین ○ جامعیّت واہمیّت

دنیا کے اندر ملکی نظام کو چلانے، شاندار حکومت کرنے اور ملک وملت میں امن وامان پیدا کرنے کے لیے مختلف نظریات کے تحت قوانین بنائے گئے اور ان کے اجراء ونفاذ کے لیے ہر ممکن اقدامات کیے گئے لیکن اس کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا بلکہ بدامنی اور لاقانونیت میں پہلے سے زیادہ اضافہ ہوا۔ کسی کی جان، مال اور عزت وآبرو نہ پہلے محفوظ تھی نہ اب ہے۔ اس بارے میں غور وفکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ یہ قوانین انسانی ذہن کی اختراع ہیں اس لئے آئے دن ان میں کوئی نہ کوئی تبدیلی سامنے آتی رہتی ہیں جس سے امن ومسائل مزید پیچیدہ ہوجاتے ہیں۔

اسلامی قوانین چونکہ منزّل من اللہ ہیں اس لئے انسانی فطرت کے عین مطابق ہیں اور ان پر عمل کرکے ہی امن وامان، دہشت گردی جیسے بین الاقوامی مسائل حل کئے جاسکتے ہیں۔ اسی اہمیت کے پیش نظر جامعہ حقانیہ کے مفتی اور استاذ الحدیث حضرت مولانا مفتی غلام الرحمٰن صاحب نے ایک مقالہ بعنوان "اسلامی قوانین، جامعیت واہمیت" لکھا جسے شائع کرنے کا اعزاز بھی ماہنامہ الحق نے حاصل کیا۔ اب اس مقالہ کو فقہ اور فتاویٰ کی مناسبت سے افادۂ عوام وخواص کے لیے فتاویٰ دارالعلوم حقانیہ میں شامل کیا جاتا ہے۔

(از مرتب)

اسلامی قوانین / جامعیّت و اہمیّت

مولانا مفتی غلام الرحمٰن مدظلہٗ

انسان مَدَنی الطبع ہونے کی وجہ سے معاشرہ سے اس کا تعلق لازمی ہے۔ تجرد، انفرادیت اور رہبانیت شرعاً اور عقلاً ہر لحاظ سے قبیح سمجھی جاتی ہے۔ انسان کائناتِ عالم کی خوبصورتی اور زینت ہے، یہ خوبصورتی ایک اچھے معاشرہ کی صورت میں باقی رہے گی، انسان کی ضروریات اور حوائج کو دیکھ کر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان اپنی جملہ ضروریات بذاتِ خود پورا نہیں کر سکتا بلکہ معاشرہ میں رہ کر ایک دوسرے سے فائدہ اور استفادہ کی ضرورت ہوگی۔

قانون کی حقیقت

فائدہ اور استفادہ میں اگر انسان کو کھلے طور پر اجازت دی جائے اور اس پر کوئی پابندی نہ لگائی جائے تو اس سے انسان کی زندگی تباہ ہو گی۔ ایسی صورت میں جبر و تشدد، حرص و لالچ، ظلم و ستم اور لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہوگا۔ انسانی زندگی گذارنے کے لیے، انسانی معاشرہ کے لیے ضابطۂ حیات ضروری امر ہے کہ جس میں معاشرہ بربادی سے محفوظ ہو، انسان کی زندگی کا کوئی مرحلہ ایسا نہیں جس میں اس کو کسی قانون کی ضرورت نہ ہو، مثلاً اگر انسان کی ابتدائی زندگی یعنی بچپن میں اس کا تحفظ قانونی ذریعہ سے نہ ہو تو اس سے اس کی تربیت و تعلیم کا پیارا مرحلہ ضائع ہو سکتا ہے۔ اگر جوانی میں کسی ضابطۂ حیات کی پابندی کا احساس نہ ہو تو اس سے انسان شباب کے وقت ایسی راہ پر چل سکتا ہے جس سے اس کے تباہ ہونے کا خطرہ ہے، اگر بڑھاپے اور ناتوانی کی حالت میں انسان کو مکمل تحفظ میسر نہ ہو تو اس سے خودکشی جیسے قبیح امور کے ارتکاب کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے، غرضیکہ انسان زندگی کے ہر مرحلہ میں کسی نہ کسی ضابطۂ حیات کا محتاج ہے۔

انسانی زندگی کے سنوارنے کے لیے اس ضابطۂ حیات کا دوسرا نام ”قانون“ اور ”آئین“ ہے۔ علماء قانون کی نظر میں اس کی جامع تعریف یوں کی گئی ہے:۔

”قانون ایسے مجموعہ کا نام ہے جس میں مروجہ مسلمہ، سماجی، معاشی، تہذیبی اور سیاسی قدروں کا تحفظ کیا جائے“۔

قانون کی ضرورت

اسلام کی نظر میں تو مکلف انسان قانون اور ضابطے کا پابند ہے۔

حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "الدنیا سجن المؤمن"۔ دنیا مسلمان کے لیے ایک جیلخانہ ہے جہاں اس کی ہر ایک حرکت قانون اور ضابطہ کے تحت ہوگی۔ مذہب کے لحاظ سے یہ پابندی لازمی امر ہے۔ آج کے نام نہاد جمہوریت پسند اور حریت پسند لوگ بھی قانون کے بغیر ایک قدم نہیں چل سکتے، ان کے ہاں بھی قانون کی پابندی لازمی امر ہے، اگرچہ زبان پر آزادی کا خوشنما نعرہ ہر وقت دھوکہ دینے کے لیے جاری رہتا ہے لیکن ان کی آزادی کی حقیقت صرف اور صرف مذہب اور عقیدہ سے آزادی سے عبارت ہے۔ آج اگر یورپی ممالک کی مثال لی جائے تو وہاں پر قانون کی ضرورت سب سے زیادہ محسوس ہو رہی ہے۔ مثلاً لاکھوں لوگ مغربی ممالک میں رہائش چاہتے ہیں لیکن قانونی پیچیدگیوں کی وجہ سے وہاں رہائش نہیں رکھ سکتے، اس لیے کہ قانون ہی ان لاکھوں افراد کی خواہشات کی تکمیل کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ اگر انسانی خواہشات کو پابند رکھنا جرم ہو تو پھر سب سے بڑے مجرم آج ترقی یافتہ ممالک ہیں جنہوں نے غریب ممالک کے لوگوں پر اپنے ملک کے دروازے بند کر دیئے ہیں۔ ان ممالک میں تاجر و مالک، کارخانہ دار اور مزدور کے درمیان تعلقات بنانے کا واحد ذریعہ قانون سمجھا جاتا ہے، جب ترقی یافتہ ممالک کی کشتی قانون کے بغیر نہیں چل سکتی تو ترقی پذیر ممالک میں قانون کی ضرورت اس سے بھی زیادہ ہونی چاہیئے۔

قانون کی ابتداء اسلامی نقطہ نظر سے قانون کی ابتداء ہبوطِ آدم سے شروع ہوئی ہے۔ گویا جب انسان کو خلیفہ بنا کر دنیا میں بھیجا گیا تو خلافت کے نظم و نسق کے لیے قانون کی ضرورت خود بخود محسوس ہوئی۔ موجودہ دور کے قانونی ماہرین کی رائے یہ ہے کہ خاندان اور قبیلہ کے وجود کے ساتھ ہی دنیا میں قانون کا ظہور ہوا۔

انسان نے حرص اور لالچ سے جب ہم نوع کے حقوق پر دست درازی شروع کی تو حقوق کی حفاظت کے فطری جذبہ نے لوگوں میں قانون کی ضرورت کا احساس ابھارا۔ چنانچہ غیر اختیاری طور پر خاندانوں اور قبیلوں میں عرف، رواج یا دوسرے ایسے قواعد و ضوابط پیدا ہوئے جن کے تحت زندگی گذارنی ضروری ہوئی۔ جوں جوں خاندان اور قبیلہ میں وسعت پیدا ہوتی گئی تو قانون کی ضرورت میں بھی شدت ہوتی رہی اور قانون کو معاشرہ کے تقاضوں اور حالات سے ہم آہنگ کرنے کیلئے جدت اور تبدیلی لازم قرار پائی، یہ قانون کے لیے اگرچہ طفولیت کے ادوار تھے، لیکن پھر ایک خاندان اور قبیلہ میں قانون لازمی امر رہا۔ خاندان اور قبیلہ سے انسانی معاشرہ جب ریاست کی شکل میں تبدیل ہوا تو قانون نے دوسرا قدم اٹھایا، اور جب ریاست سے سلطنت اور حکومت کی صورتیں سامنے آئیں تو اس سے

قانون میں اور بھی جدت پیدا ہوئی۔ گویا انسانی زندگی کے اول روز سے ہی قانون کو اہم حیثیت حاصل رہی ہے۔

قانون کی قسمیں

تاریخ کے مطالعہ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انسانی معاشرہ کی اصلاح کے لیے دو قسم کے قوانین وضع ہوئے۔ پہلی قسم کا قانون وہ ہے جو انسان نے خود اپنے لیے بنایا، مقنن خود بھی اس کا پابند رہا، اس قانون میں عموماً وقت اور حالات کی رعایت ہوتی رہی اور مقنن معاشرہ کے حالات کو مدنظر رکھ کر قانون مرتب کرتا رہا، جب حالات کی تبدیلی ایک لازمی امر تھا تو اس قانون میں بھی ترمیم و اضافے روزمرہ کا ایک معمول بن گیا۔ قانون کی اس قسم کو ہم "انسانی قانون" سے تعبیر کرتے ہیں کیونکہ اس کا بنانے والا خود انسان ہوتا ہے اور یہ انسانی دماغ کا اثر ہے۔

دوسری قسم کا قانون وہ ہے جس کا بنانے والا بالائی طاقت رہی، یعنی مقنن نے اپنی ضروریات کے لیے نہیں بلکہ دوسروں کی ضروریات کے لیے قانون وضع کیا، اس میں وقتی مصلحت یا حالات کی ضرورت کی رعایت نہیں رکھی گئی بلکہ ابدی ضرورت کو مدنظر رکھ کر قانون بنایا تھا اس لیے وقت اور ضرورت کی تبدیلی سے اس کی قانونی حیثیت پر کوئی اثر نہیں پڑا، یہ عمر بھر کے لیے قابلِ عمل رہا، اس قانون کو "رحمانی قانون" کہا جاتا ہے۔

انسانی قانون کی حقیقت

آج قانون کا لفظ بول کر معاشرہ میں اس سے اول الذکر قانون مراد لیا جاتا ہے، بلکہ بعض لوگ جو ذہنی جمود کا شکار ہوتے ہیں؛ ان کے نزدیک قانون صرف انسانی قانون سے عبارت ہے، مذہب یا عقیدہ کا قانون سے کوئی رشتہ نہیں، ان لوگوں کے نزدیک قانون اجتماعی زندگی کا محافظ ہے جبکہ مذہب انسان کا ذاتی معاملہ ہے۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ قانون ایک انسان کے دوسرے انسان سے تعلقات کا تعین کرتا ہے جبکہ مذہب خدا اور انسان کے تعلقات کا تعین کرتا ہے۔ یہ رائے حقیقت اور واقعات سے صریح مخالف ہے لہٰذا ایسی رائے کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی، تاہم اس سے بھی انکار نہیں کہ انسانی قانون نے کچھ اچھے ثمرات بھی دکھائے لیکن "واثمهما اكبر من نفعهما"، یعنی ثمرات سے مضرات زیادہ ہیں۔ قانون کی یہ شکل ہر دور میں مختلف رہی ہے۔ زمانہ قدیم میں قانون امیر یا خاندانی سربراہ کی زبان سے نکلی ہوئی بات ہوتی، خاندانی سربراہ جو قاعدہ یا ضابطہ مقرر کرتا اُسے قانون کا درجہ حاصل ہوتا، کسی کو اس سے مخالفت کی جرأت نہ ہوتی اور خلاف ورزی کی صورت میں بڑی شدت سے اس کا محاسبہ کیا جاتا۔

اٹھارہویں صدی کے آخر میں جب انسانی حقوق کے تحفظ کا نیا نعرہ لگا کر جمہوریت کی آواز بلند ہوئی تو اس سے قانون بنانے کے طریقہ کار میں کافی تبدیلی آئی۔ موجودہ وقت کے قانونی ذخائر اور حالات و واقعات خاص کر جمہوری اصول کو مدنظر رکھ کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ موجودہ دور میں انسانی قانون کے بنانے والے تین شعبے ہیں۔

مقننہ کے مختلف شعبے

انسانی قانون بنانے میں تین شعبوں کا بڑا دخل ہے، گویا یہ تینوں شعبے انسانی قانون کے ماخذ اور مراجع ہیں اور وہ یہ ہیں :۔

(۱) سربراہِ مملکت (۲) آئین ساز ادارے (۳) عدالتی نظائر

سربراہِ مملکت

یہ شعبہ قدیم دور کے خاندانی سربراہ کی ایک جدید شکل ہے، البتہ قدیم دور میں خاندانی سربراہ مختارِ کل ہوتا تھا جبکہ عصرِ حاضر میں اس شعبہ کو محدود اختیارات حاصل ہیں۔ سربراہِ مملکت مفادِ عامہ کے پیشِ نظر ہنگامی حالات میں نظریۂ ضرورت کے تحت کوئی نہ کوئی قانون "آرڈیننس" کی صورت میں نافذ کرسکتا ہے اگرچہ اس کی منظوری کے لیے کسی پارلیمنٹ کی طرف رجوع ضروری ہوتا ہے لیکن پھر بھی قانون بنانے میں سربراہ مملکت کافی دخل رکھتا ہے۔

آئین ساز ادارے

قانون بنانے والوں کا دوسرا اہم شعبہ "آئین ساز" ادارہ ہے اور جمہوری ممالک میں اس ادارہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے، ایسے ادارہ کی محنت اور سعی سے بنا ہوا قانون جدید ذہن والے صحیفہ آسمانی کے برابر سمجھتے ہیں، اس میں ترمیم و منسوخی کا حق بھی اسی ادارہ کو حاصل رہتا ہے، آجکل قومی اور صوبائی اسمبلیاں اور سینیٹ کے ادارے اس کے نمونے ہیں، ان اداروں میں کثرتِ رائے سے جو بات سامنے آتی ہے اسی کو ملک کا قانون سمجھا جاتا ہے، اس میں رؤس کی کثرت کا اعتبار رہتا ہے، جس بات کی حمایت میں زیادہ ووٹ نکل آئیں تو وہ قانون بن جاتی ہے، گویا کہ اس میں تمامتر فیصلے کثرتِ رائے پر ہوتے ہیں، اگرچہ اس کے قانونی شکل میں نفاذ کیلئے (B/۷۷) وغیرہ کے مراحل سے گذرنا پڑتا ہے لیکن حتمی منظوری کے بعد اس کو قانونی قالب میں ڈھال کر ملک کے قانون کا مستقل حصہ بنا دیا جاتا ہے۔

عدالتی نظائر

انسانی قانون کا تیسرا ماخذ عدالتی نظائر ہوتے ہیں، کسی جمہوری ملک کی عدالتِ عالیہ اپنی صوابدید کے مطابق قانون کی تشریح کرتے ہوئے جو فیصلہ کرتی ہے تو ماتحت عدالتیں بھی اس کی روشنی میں فیصلے کرتی ہیں۔ مثلاً ہمارے ملکِ عزیز پاکستان کی اعلیٰ عدالت "سپریم کورٹ" نے جب کوئی فیصلہ کیا تو "ہائیکورٹ"، یا ماتحت عدالتیں اس فیصلہ سے متاثر ہوتی ہیں اور وہ اپنے فیصلوں

اس کا لحاظ رکھتی ہیں تو یہ فیصلے مستقل قانون کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔

عہدِ حاضر میں انسانی قانون یا قانون سازی کو انسان کے بنیادی حقوق کا ایک حصہ سمجھا جاتا ہے۔

رحمانی قانون کی حقیقت

قانون کی دوسری قسم یعنی "رحمانی قانون" کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب حضرت آدمؑ کو جنت سے اتار کر زمین پر بھیجا تو اس وقت حضرت آدمؑ سے فرمایا: "فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ ھُدًی۔ (سورۃ البقرۃ آیت ۳۸) یعنی میری طرف سے تمہارے پاس ہدایت نامہ اور ضابطۂ حیات آئے گا، تیری اولاد کے لیے اس کی تابعداری ضروری ہو گی۔"

انسانی ہدایت کی یہ حقیقت دوسری جگہ یوں بیان کی گئی ہے "یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ اِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ رُسُلٌ مِّنْکُمْ یَقُصُّوْنَ عَلَیْکُمْ اٰیٰتِیْ۔ (سورۃ الاعراف آیت ۳۵) اے اولادِ آدم تمہارے پاس میرے رسول آئیں گے جو میری آیتیں بیان کریں گے۔"

ان دونوں آیتوں کو ملا کر پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اولادِ آدم کے لیے ضابطۂ حیات کی تفرری اور تعین کے لیے دو راہیں متعین کیں۔ ایک راہ "ھُدًی" یعنی ہدایت اور دوسری راہ "رسول" ہے۔ گویا رحمانی قانون کے ماخذ اور مراجع اصولی طور پر یہ دونوں ٹھہرائے گئے۔

رحمانی قانون کے ماخذ

حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے انسانی ہدایت کے لیے کتنی کتابیں نازل کیں؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک سو چار کتابیں اللہ تعالیٰ نے نازل کی ہیں، دس صحائف حضرت آدمؑ پر، پچاس صحائف حضرت شیثؑ پر، تیس صحائف حضرت ادریسؑ پر اور دس صحائف حضرت ابراہیمؑ پر اتارے اور چار بڑی کتابیں تورات، انجیل، زبور اور قرآن مجید نازل کیں۔

یہ ایک سو چار کتابیں حقیقت میں رحمانی قانون کے مختلف ایڈیشن اور نسخے ہیں، پھر قانون کا یہ اہم کام ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاءؑ سے لیا گیا، گویا ماضی میں یہ دو راہ یعنی ھُدًی اور رسول متعین تھیں، لیکن جب رحمانی قانون کا آخری کامل اور مکمل نسخہ قرآن کی شکل میں خاتم الرسل حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا اور آئندہ کے لیے سلسلۂ نبوت ختم کر کے اللہ تعالیٰ نے ان دونوں طریقوں کے ساتھ دوسرے دو طریقے اور بھی شامل کیے، جن کو "اجماعِ امت" اور "قیاس" کہا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا :۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ۔ (سورۃ النساء آیت ۵۹)

(ترجمہ) "اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول ؐ کی تابعداری کرو اور اولی الامر کی تابعداری کرو اور اگر کسی چیز میں جھگڑا پڑے تو اللہ اور رسول ؐ کے احکام کی طرف رجوع کرو۔"

اس آیت میں رحمانی ہدایت کے ماخذ اربعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اسلامی قانون اور رحمانی ہدایت کے چار ماخذ ہیں۔ اطیعوا اللہ سے کتاب اللہ، اطیعوا الرسول ؐ سے سنت الرسول، اولی الامر سے اجماع اور فردوہ الی اللہ والرسول ؐ سے قیاس کی طرف اشارہ ہے۔

گویا اسلامی قانون کبھی آدم ؑ اور مصحفِ آدم کی شکل میں آیا، کبھی شیث ؑ کے پچاس صحیفوں میں آیا، کبھی ادریس ؑ اور صُحفِ ادریس ؑ کی شکل میں، کبھی ابراہیم ؑ اور صُحفِ ابراہیم ؑ کی شکل میں وضع ہوا، کبھی داؤد ؑ اور زبور، کبھی موسیٰ ؑ اور توریت اور کبھی عیسیٰ ؑ اور انجیل کی شکل میں آیا، اور آخری ناقابلِ ترمیم مسودہ "قرآن" کی شکل میں اُترا جس کی تفصیل سنتِ رسول ؐ، اجماعِ اُمت اور قیاس سے کرائی گئی۔

اسلامی قانون کے بارے میں غیر مُسلموں کے تاثرات

اسلامی قانون کی خصوصیات اور امتیازات یا تقابلی مطالعہ کے بغیر ہمارے مسلمانوں کا یہ دعویٰ ہے کہ انسانی قانون کے مقابلے میں "رحمانی قانون" انسانی معاشرہ کیلئے زیادہ موزوں ہے۔ اور یہ صرف ہم نہیں بلکہ غیر مسلم بھی اس کا اقرار کیے بغیر نہ رہ سکے کہ اسلامی قانون سے زیادہ کوئی دوسرا قانون وقت اور حالات کیلئے مناسب نہیں۔

(۱) ڈاکٹر سیموئیل لکھتے ہیں کہ قرآن کے مطالب ایسے ہمہ گیر اور ہر زمانے کے لیے موزوں ہیں کہ تمام صدائیں خواہ مخواہ اس کو قبول کرتی ہیں اور محلوں، ریگستانوں، شہروں اور سلطنت میں گونجتے ہیں۔

(۲) مسٹر ولف کہتا ہے کہ وسیع جمہوریت، رشد و ہدایت، انصاف و عدالت، فوجی تنظیم و مالیات اور غرباء کی حمایت اور ترقی کے اعلیٰ آئین قرآن میں موجود ہیں۔

(۳) ڈاکٹر مولیس فرانسیسی لکھتا ہے کہ قدرت کی عنایتوں نے جو کتابیں انسان کو دیں قرآن ان سب سے افضل ہے۔ (علوم القرآن ص ۴۳)

اِسلامی قانون کے اہم شعبے

اگر چہ قانون کے شعبہ "دستوری قانون (Constitutional Law)" "انتظامی قانون" (Administrative Law) "خارجہ پالیسی" کا پورا تذکرہ قرآن و حدیث میں موجود ہے اور عملی تجربہ خلفائے راشدین کے دورِ خلافت میں نمایاں ہے۔ دستوری قانون اور انتظامی قانون اظہر من الشمس ہیں کہ ہمارا دستور قرآن و سنت ہے اور اس میں ہر ایک کے اختیارات محدود ہیں، اور خارجہ پالیسی بھی واضح ہو کہ تعلقات جوڑنے اور توڑنے کے لیے اسلام ہی بنیادی سبب قرار دیا گیا ہے تاہم غیر مسلم ممالک سے معاملات اور تعلقات رکھنے میں رخصت دے کر تمام دنیا سے خارجی پالیسی بنانے کی اجازت دی ہے لیکن دوستی کا ہاتھ صرف اسلامی ممالک کے ساتھ بڑھایا جائے گا۔

موجودہ وقت میں بین الاقوامی یا ملکی قوانین کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ قانون کے دو شعبے بہت اہم سمجھے جاتے ہیں۔ رعیت کی خوشحالی و ترقی اور امن و امان کا مسئلہ ان دونوں شعبوں سے تعلق رکھتا ہے جس میں پہلا شعبہ شخصی قانون (Personal Law) اور دوسرا شعبہ ملکی قوانین (Public Law) ہے۔ ہم پوری تفصیل بیان کیے بغیر ان دونوں شعبوں کا ایک طائرانہ جائزہ لیتے ہیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ انسانی معاشرہ کی خوشحالی کا راز صرف اسلامی قانون میں مضمر ہے۔

اِسلام کا شخصی قانون

شخصی قانون کا تعلق عموماً فرد اور خاندان سے ہوتا ہے! اسلام میں فرد کی اصلاح کیلئے تین چیزیں خصوصی طور پر بیان کی گئی ہیں جو نماز، روزہ اور حج ہیں، ان تینوں عبادات سے نفس کی اصلاح ہوتی ہے، مفسرین ان تینوں کو امور مصلحہ للنفس سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان تینوں عبادات میں باقاعدگی سے انسان میں اتباع قانون، ایثار اور ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ حدیث اور فقہ کی کتابوں میں ان کا تذکرہ ابتداء میں ہوتا رہتا ہے۔

ان تینوں امور کے بعد گھرانے اور خاندان کے جوڑنے کے لیے نکاح، مہر، نفقہ، حضانت، طلاق کی دفعات کتاب النکاح میں بیان ہوتی ہیں تاکہ اس سے انسان ایک خوشحال گھرانہ میں زندگی بسر کر سکے اور طلاق کے قانون پر سہولت دی گئی کہ بصورت ناچاقی خلاصی ممکن ہو۔ گذر اوقات کیلئے اسبابِ ملک میں بیع و شراء (خرید و فروخت) وصیت، ہبہ، شفعہ، وراثت وغیرہ قوانین معاملات میں بیان ہوئے ہیں تاکہ ملکیت کے اسباب متعین ہوں اور کسی کو دوسرے کی جائیداد پر ناجائز قبضہ جمانے کا موقع نہ مل سکے، وفات کی صورت میں میت کی جائیداد میں زور آزمائی، ظلم و ستم

اور زیادتی سے بچنے کے لیے وراثت کا عظیم قانون موجود ہے۔

اسلام کا ملکی قانون (Public Law) میں چند چیزوں کی رعایت ضروری سمجھی جاتی ہے اور ان چیزوں کی حفاظت کو قانون میں بنیادی اہمیت حاصل ہے اور وہ مندرجہ ذیل ہیں : (۱) حفاظتِ نفس (۲) حفاظتِ نسب (۳) حفاظتِ مذہب (۴) حفاظتِ مال (۵) حفاظتِ عقل (۶) حفاظتِ عزت ـــــ اسلامی قانون میں بحمداللہ ان چھ چیزوں کو جو تحفظ حاصل ہے وہ کسی دوسرے نظام میں میسّر نہیں۔

۱۔ حفاظتِ نفس حفاظتِ نفس کے لیے قرآنِ کریم نے دوٹوک اعلان کیا : "کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الۡقِصَاصُ فِی الۡقَتۡلٰی" اس سے قصاص کا منصفانہ قانون نافذ ہوا تاکہ کسی شخص کا خون رائیگاں نہ گرنے پائے۔ یہاں تک کہ دوسرے امور میں خطا کو اللہ تعالیٰ نے معاف فرمایا، یعنی حقوق اللہ میں اگر غلطی ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اُسے معاف کر دیتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے "رفع عن اُمتی الخطاء والنسیان۔ یعنی میری اُمت کی خطا اور بھول معاف ہے"

لیکن انسانی قتل میں خطا کی صورت میں کفارہ اور دیت واجب قرار دی، پھر بھی اگر قاتل کا علم نہ ہو سکے تو پھر محلہ والوں کے لیے "قسامت" کا قانون نافذ کر کے دیت کی وصولی کے لیے عام اہلِ محلّہ کو ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔ انسانی نفس تو کیا انسان کے ہاتھ کی چھوٹی انگلی کے ایک ایک پور کی حفاظت کی گئی کہ ایک پور کے بدلہ میں ۱/۳ حصہ دیت واجب ہو گی۔

۲۔ حفاظتِ نسب آج آپ ترقی یافتہ ممالک کی حالت دیکھیں کہ وہ جنسی خواہشات کے غلام بن گئے ہیں جس کی وجہ سے وہاں کا نسب محفوظ نہیں ہے، اسلام نے نسب کی حفاظت اس انداز میں کی کہ چند سال قبل ہندوستان کی اعلیٰ عدالت نے یہ فیصلہ سنایا کہ "چادر اور چار دیواری کی حفاظت اگر مقصود ہے تو مسلمانوں کے قانونِ رجم اور حد پر عمل کرنا پڑے گا"ـــــ زنا اور حرام کاری کی ممانعت کے علاوہ فسادِ نسب سے بچنے کے لیے نظر کی حفاظت لازمی قرار دی گئی کہ مسلمان مرد اور عورت کو چاہیئے کہ اپنی نظر نیچے رکھیں۔ پردہ کو لازمی قرار دیکر غیر محرم عورتوں سے خلوت اور ناجائز اختلاط ممنوع قرار دے کر فحش کاری کی بیخ کنی کی گئی، زنا کا جرم ثابت ہو جانے کی صورت میں شادی شدہ (مرد اور عورت) کو رجم اور غیر شادی شدہ کو سو سو کوڑے لگانے کا حکم دیا گیا، ارشادِ ربانی ہے :

اَلزَّانِيَۃُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۔ (سورۃ النور آیت ۲)
(ترجمہ) ''زناکار مرد اور عورت کو سو سو کوڑے لگا دیئے جائیں۔''

حفاظتِ مذہب [۳]
انسان کو عقیدہ اور مذہب سے بڑا پیار ہوتا ہے، اسلام میں "ذمی" کی حقیقت تسلیم کرنے کے بعد اس کے مذہبی اور اعتقادی مسائل میں دخل اندازی ممنوع قرار دی گئی لیکن اسلام جو کہ ابدی اور ازلی مذہب ہے اسکی مخالفت حدِ ارتداد سے کی گئی کہ ،۔
من بدل دینه فاقتلوه ۔ (جس نے دین تبدیل کیا اس کو قتل کر دو۔)

حفاظتِ مال [۴]
مال و دولت کی حفاظت عصرِ حاضر کا بڑا اہم مسئلہ ہے، آج دولت ہماری حفاظت نہیں کر سکتی بلکہ ہمیں دولت کی حفاظت کرنی پڑتی ہے اسلام میں پہلے انسان کو حلال خوری کی ترغیب دے کر اس کے حلال مال کی حفاظت یوں کی گئی کہ کسی مسلمان کا مال غیر شرعی طریقہ سے کھانا حرام ہے یہی وجہ ہے کہ ڈاکہ زنی، چوری اور دھوکہ دہی کو جرم قرار دیا گیا، اگر کوئی شخص کسی کے حلال مال پر دست درازی کرے تو اس پر "حد سرقہ" جاری کی جائے گی مستقل حکم یہ دیا گیا:۔
"اَلسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا اَيْدِيَهُمَا۔ (سورۃ النور آیت ۔) چور مرد اور عورت کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔

حفاظتِ عقل [۵]
عقل انسان کا وہ جوہر ہے جس کو محفوظ رکھنا وقت کی اہم ضرورت ہے عصر حاضر میں منشیات کی وباء عالمی سطح پر حکومتوں کے لیے ایک چیلنج بنی ہوئی ہے، امریکہ سمیت پوری دنیا حیران ہے کہ لاکھوں کروڑوں نوجوان اس مکروہ نشہ کا شکار ہو کر بالآخر خودکشی پر کیوں آمادہ ہو جاتے ہیں ۔ لیکن بحیثیت مسلمان میرا یہ عقیدہ ہے کہ اگر حدِ شربِ خمر کا مطالعہ کر کے صرف "کتاب الاشربۃ" کے باب کا قانون نافذ کر کے حدِ شربِ خمر کا اجراء کر دیا جائے تو پورے ملک میں ہیروئن کا نشہ کرنے والا ایک آدمی بھی نظر نہیں آئے گا ۔ اور عقل کی یہ حفاظت حدِ شربِ الخمر کے اجراء کی صورت میں ممکن ہو سکتی ہے۔

حفاظتِ عزت [۶]
انسان کا سب سے قیمتی جوہر اس کی عزت ہے، دنیا کے تقریباً ہر ملک میں ہتک عزت کا قانون ہے لیکن اسلام کی یہ دفعہ سب سے اہم اور نرالی ہے اس میں ایک شخص کسی دوسرے کو زانی یا چور جیسے قبیح الفاظ سے نہیں پکار سکتا ورنہ حدِ قذف کے لیے تیار رہنا پڑے گا۔ اس کے علاوہ ہر وہ کلمہ جس سے ایک مسلمان کی عزت و وقار پر حرف آتا ہو قابلِ مواخذہ جرم قرار دیا گیا ہے۔

غیر اسلامی ممالک میں قضاء کا طریقۂ کار

غیر اسلامی ممالک اپنی عدالتوں اور ان کے طریقۂ قضاء پر بہت نازاں ہیں اور اپنے طریقۂ قضاء کے لیے ہر کسی کو دعوت دیتے ہیں مگر یہ سب زبانی جمع خرچ ہے۔ اخبارات، رسائل و جرائد اور دیگر ذرائع ابلاغ سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ان کے طریقۂ قضاء میں صاحبِ ثروت اور اثر و رسوخ والے شخص کو ہر قسم کا تحفظ حاصل ہے جبکہ غریب، نادار، کمزور اور بے بس آدمی کو ذلت و رسوائی کے سواء کچھ نہیں ملتا۔ اسلام دینِ فطرت ہے اور اس کا طریقۂ قضاء فطرت کے عین مطابق ہے، جس میں ہر ایک کو پورے عدل و انصاف کے ساتھ اس کا حق اس کی دہلیز پر دیا جاتا ہے۔ غیر اسلامی ممالک کے اس پروپیگنڈے کے جواب میں دارالعلوم حقانیہ کے نائب مفتی حضرت مولانا مفتی غلام الرحمٰن صاحب نے ایک مضمون بعنوان "غیر اسلامی ممالک میں قضاء کا طریقۂ کار" لکھا جسے ماہنامہ الحق نے شائع بھی کیا تھا۔ اب افادۂ عام اور فقہ و فتاویٰ کی مناسبت سے فتاویٰ دارالعلوم حقانیہ میں شامل کیا جاتا ہے۔

(از مرتب)

غیر اسلامی ممالک میں قضا کا طریقہ کار

قضا اسلامی تشخص کی تکمیل کا ایک اہم حصہ ہے جس کے بغیر اسلامی زندگی ناقص اور ادھوری ہے۔ نظام قضا کے ذریعہ محاسبہ اور مواخذہ کی اس اہم دفعہ کی آبیاری ہوتی ہے جس پر اسلامی زندگی کی بنیاد قائم ہے۔ اگر انسان کے انفرادی یا اجتماعی افعال پر اپنی یا کسی قابل تعظیم شخصیت کی نظر نہ ہو یا اس کو آزاد چھوڑ کر اس کے کئے ہوئے افعال پر کوئی باز پرس نہ ہو تو اس سے قوت بہیمی کو حوصلہ افزائی کا ایسا موقع مل سکتا ہے جس سے انسانی اقدار مجروح ہوں۔

اسلام کے نظام قضاء و قانون کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ قضا صرف ایک معاشرتی ضرورت نہیں کہ جس کی حاجت اجتماعی معاشرہ میں محسوس ہو بلکہ یہ مسلمانوں کا ایسا دینی اور مذہبی فریضہ ہے جس کی ضرورت قدم بقدم محسوس ہوتی ہے۔ قضا دیگر عبادات کی طرح ایک مستقل عبادت ہے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ دو آدمیوں کے درمیان فیصلہ کرنے کے لیے بیٹھنا مجھے ستر سال کی عبادت سے زیادہ پسند ہے — چنانچہ علماء کرام اسے تقرب الٰہی کا ایک ذریعہ متصور کرتے ہیں۔

قال الشیخ وھبۃ الزحیلیؒ: قال بعضھم القضاء امر من امور الدین ومصلحۃ من مصالح المسلمین تجب العنایۃ بہ لان بالناس الیہ حاجۃ عظیمۃ وھو من انواع القربات الی اللہ عز وجل ولذا تولاہ الانبیاء علیھم السلام۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ ج ۶ ص ۴۸۲ کتاب القضاء)

(ترجمہ) "بعض علماء فرماتے ہیں کہ قضاء دین کے امور میں سے (ایک اہم) امر ہے اور مسلمانوں کی بہتری کا ایک شعبہ ہے، اس کا اہتمام ہونا چاہیئے کیونکہ لوگوں کو اس کی ضرورت ہے اور یہ اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کے ذرائع میں سے ہے، یہی وجہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام نے بھی یہ ذمہ داری قبول کی۔"

اس لیے اسلامی معاشرہ میں انفرادی اور اجتماعی غرضیکہ زندگی کے ہر شعبہ میں اس کی رعایت ضروری ہے اس کی ادائیگی کے بغیر مسلمان مسئولیت کی ذمہ داری سے بری الذمہ نہیں ہو سکتا ہے۔

نظام قضاء کیلئے قوت تنفیذی کی ضرورت

ایسی صورت میں نظام قضاء کا نفاذ اور اجراء کسی ولایت عامہ یا قوت تنفیذی کے وجود پر موقوف نہیں یہی وجہ ہے کہ تحکیم (پنچایت) یعنی کسی ثالث کو فیصلہ کرنے کا اختیار دینا نظام قضاء کا ایک شعبہ ہے اس میں

اگرچہ حَکَم یعنی ثالث کی ولایت ناقص ہو کر صرف طرفین تک محدود رہتی ہے، اس میں بھی طرفین فیصلہ کرنے سے قبل بغیر کوئی وجہ بتائے رجوع کا حق قضاءً محفوظ رکھتے ہیں، لیکن جب ایک دفعہ ثالث کا فیصلہ صادر ہو جائے تو یہ مستقل قضاء بن کر کسی دوسرے اعلیٰ قاضی کی عدالت میں مرافعہ کے وقت کسی خاص ضرورت کے بغیر اس کو فسخ کرنے کا حق نہیں رکھتا، طرفین حسب معاہدہ اس فیصلہ کے پابند رہیں گے۔

اس سے معلوم ہُوا کہ نظامِ قضاء جزوی طور پر کسی طاقت اور قوت کے استعمال پر موقوف نہیں، یہ الگ بات ہے کہ شرّ القرون کے ان ادوار میں انسان طبعی حرص ولالچ کی وجہ سے کسی دوسرے کے حق کی ادائیگی کے لیے آسانی سے تیار نہیں ہوتا اور اپنا حق منوانے کے لیے جملہ وسائل بروئے کار لانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتا۔ اس لیے نظامِ قضاء کے مثبت نتائج کے مشاہدہ کیلئے قوتِ تنفیذی کی ضرورت پڑتی ہے تاکہ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْہِ بَأْسٌ شَدِیْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ کی برکت سے شرعی فیصلہ کا تقدس اور عظمت بحال رہ سکے۔

غیر اسلامی علاقوں میں نظامِ قضاء کے چند نظائر

مسلمان ممالک کی طرح غیر اسلامی ممالک میں بھی جہاں پر کفّار کا غلبہ ہو اور مسلمان اقلیت میں رہ رہے ہوں مسلمان اپنا مذہبی تشخص قائم رکھنے کے پابند ہیں، جیسا کہ عبادات سے مسلمان بری الذمہ نہیں ہوسکتے ایسا ہی حسبِ طاقت مسلمان اپنے مسائل اسلامی طرزِ حیات میں طے کرنے کے پابند ہوں گے۔ اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں:۔

فَلَا وَرَبِّکَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَهُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا ۝ (سورۃ النساء آیت ۶۵) — ترجمہ "پس تیرے رب کی قسم وہ مومن نہ ہوں گے یہاں تک کہ آپؐ کو منصف نہ جانیں اس جھگڑے میں جو اُن میں اُٹھے پھر نہ پاویں اپنے جی میں تنگی تیرے فیصلہ سے اور قبول کریں خوشی سے۔"

مکی زندگی کے جائزہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہجرت سے قبل مسلمانوں کو یہاں پر غلبہ حاصل نہیں تھا بلکہ اقلیت کی حیثیت سے رہ رہے تھے لیکن اس کے باوجود مسلمان اپنے فیصلے اپنے درمیان کرتے تھے، کسی غیر اسلامی فیصلہ کرنے والے کے پاس جانے کی ضرورت کبھی محسوس نہیں کی۔

ایسا ہی مدنی زندگی میں اگرچہ خاص علاقوں پر مسلمانوں کا غلبہ تھا لیکن جو علاقے مسلمانوں کی دسترس سے باہر تھے وہاں کے کچھ باشندے جب اسلام کی نعمتِ عظمیٰ سے مشرف ہو جاتے تو اپنے فیصلے باہمی مشورہ سے طے کرتے۔

فقہی جزئیات کی تائید فقہاءِ کرام نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ جہاں کہیں کفّار کا غلبہ ہو اور مسلمان اقلیت میں رہ رہے ہوں تو وہ اپنے باہمی منازعات کا فیصلہ کرنے کے لیے کسی مسلمان قاضی کی تقرری کے پابند رہیں گے، علامہ کمال ابن ہمامؒ فرماتے ہیں :۔

ھٰذا اذا لم یکن سلطان ولا من یجوز منہ کما فی بعض بلاد المسلمین غلب علیھم الکفار کقرطبۃ فی المغرب الان وبنسیہ وبلاد الحبشۃ واقروا المسلمین عندھم علیٰ مال یؤخذ منھم یجب علیھم ان یتفقوا علیٰ واحدٍ منھم یجعلونہ والیا فیولّی قاضیاً ویکون ھو الذی یقضی بینھم وکذا ینصبوا لھم اماماً یصلی بھم الجمعۃ ۔ (فتح القدیر ج ۶ ص ۳۶۵ کتاب القضاء)

(ترجمہ) "یہ حکم اس وقت ہے جہاں کہیں حاکم نہ ہو یا کسی کافر سے قضاء قبول کرنے کی کوئی صورت نہ ہو جیساکہ بعض مغربی اور حبشہ کے ممالک میں ہے، تو جب مسلمان باقاعدہ مال کی ادائیگی کے معاہدہ پر رہ رہے ہوں اُن پر ضروری ہے کہ اپنے درمیان کسی ایک پر اتفاق کرکے اُسے قاضی مقرر کریں جو اُن کے درمیان فیصلے کرے اور ان کے لیے امام مقرر کرے تاکہ وہ ان کو جمعہ (اور عیدین) کی نماز پڑھائے۔"

مسلمانوں کے اتفاق سے قاضی کی تقرری ایسی حالت میں اگر مسلمان باہمی اتفاق سے کسی ایک معتمد شخص کو اپنا فیصل مقرر کریں تو اس کی حیثیت قاضی کی ہو گی، مسلمان اس کے فیصلوں کے پابند ہوں گے۔ چنانچہ رؤیتِ ہلال سے صوم و افطار میں اُس کا فیصلہ نافذ ہوگا اور جمعہ وعیدین دیگر شرائط کی رعایت کے بعد اس کی موجودگی میں ادا ہوں گے ۔۔۔ شیخ بدرالدین محمود بن اسماعیل الشہیر بابن قاضی سماوہؒ فرماتے ہیں :۔

واما فی بلاد علیھا ولاۃ کفار فیجوز للمسلمین اقامۃ الجمع والاعیاد ویصیر القاضی قاضیاً بتراضی المسلمین ۔ (جامع الفصولین ج ۱ ص ۱۴ الفصل الاوّل فی القضاء)

(ترجمہ) "وہ علاقے جہاں پر کفّار کا غلبہ ہو تو مسلمانوں کے لیے جمعہ وعیدین کا پڑھنا جائز ہے اور مسلمانوں کی باہمی رضامندی سے قاضی باقاعدہ قاضی ہوگا۔"

علامہ علاؤالدین الحصکفیؒ اس کی مزید اہمیت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

ولو فقد وال لغلبۃ الکفار وجب علی المسلمین تعیین وال ۔ (الدر المختار علیٰ ھامش ردّ المحتار ج ۴ ص ۳۰۸ کتاب القضاء)

(ترجمہ) "اگر کفّار غلبہ سے کہیں مسلمان ولایتِ عامہ سے محروم رہیں پھر بھی اپنے لیے والی کی تقرری ان پر ضروری ہے۔"

عصر حاضر میں غیر اسلامی ممالک میں قضاء کی چند صورتیں

آجکل دنیا مذہب وعقیدہ، رنگ ونسل اور سوچ وفکر کے حوالہ سے منقسم ہے، عام محاورہ میں جسے جمہوری دور کہا جاتا ہے، اس میں جہاں کہیں مسلمان اکثریت میں ہیں اور حکومت کر رہے ہیں تو اپنے جملہ وسائل بروئے کار لا کر اس ملک میں مکمل اسلامی نظام کا نفاذ اس ملک کے ہر مسلمان باشندہ کی ذمہ داری ہے، لیکن جہاں کہیں مسلمان اکثریت میں نہ ہوں بلکہ کسی غیر اسلامی نظام حیات کے تابع ہوں تو ان ممالک میں بھی بقدر استطاعت مسلمان اپنی مذہبی اقدار کی رعایت کرنے کے پابند ہوں گے، عقائد واعمال کی درستگی اور اسلامی طرز حیات کے مطابق زندگی بسر کرنا تو انفرادی معاملہ ہے جس میں ان کا کوئی عذر قابلِ سماع نہیں، خاص کر جن ممالک میں مذہبی آزادی ہو، لیکن باہمی جھگڑے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں طے کرنے کی بظاہر دو صورتیں نظر آتی ہیں:

پہلی صورت پہلی صورت یہ ہے کہ مسلمان اگر کہیں اجتماعی طور پر اس نظام کے قیام سے عاجز ہوں تو خود مذہبی جذبہ کی روشنی میں انفرادی طور پر اپنے معاملات قرآن وحدیث کی روشنی میں طے کریں، ایسی صورت میں کسی غیر اسلامی حکومت کے لیے کسی قسم کی قانونی پیچیدگی پیدا کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ کسی مروجہ قوانین تک نوبت پہنچنے سے قبل ہی مسلمان اپنے معاملات کسی ایسے عالم کے ذریعہ طے کریں جس میں اسلامی تعلیمات کے مطابق متنازعہ معاملات طے کرنے کی اہلیت ہو، اس سلسلہ میں کسی فعال اسلامی تنظیم کو بھی بروئے کار لایا جا سکتا ہے کہ وہ تنظیم خود مسلمانوں کے معاملات طے کرانے کا انتظام کرے یا کسی اور کے ذریعہ کرانے کا بندوبست کرے۔

انفرادی طریقۂ کار کی کمزوریاں اس طریقہ کار سے اچھے نتائج کی توقع کی جا سکتی ہے لیکن پھر بھی اس کا دائرہ بہت محدود ہوگا کیونکہ اس کی حیثیت "تحکیم" کے سوا اور کچھ نہیں اور "تحکیم" کا دائرہ بہت محدود ہے۔ علاوہ ازیں ایسی صورت میں سیاسی طور پر مسلمانوں کے لیے کئی مشکلات پیدا ہونے کا امکان ہے۔ اولاً یہ کہ مسلمانوں کے پاس ایسے نظام کی تنفیذ کے لیے جب تک کسی مروجہ قانون کا سہارا نہ ہو تو محض دینی جذبہ سے اس کے تابع رہنے کے نتائج بہت کم سامنے آئیں گے۔ انسان طبعی طور پر نقصان برداشت کرنے یا کسی معاملہ میں ہار ماننے کے لیے آسانی سے تیار نہیں ہوتا، عین ممکن ہے کہ کسی مسلمان کو اگر شرعی فیصلہ میں اپنا نقصان نظر آئے تو وہ کسی مسلمان فیصلہ کنندہ کے پاس جانے کی ضرورت محسوس نہیں کرے گا۔

بلکہ متبادل ذرائع تلاش کرکے رائج الوقت قانون میں اپنا سہارا ڈھونڈے گا۔ علاوہ ازیں شرعی طور پر بھی "محکم" کا اختیار چند مسائل تک محدود ہے، قصاص و دیت اور حدود جیسے مسائل نمٹانے کی اہلیت "محکم" میں نہیں۔ اور اگر کہیں کسی فعال اسلامی تنظیم یا دینی درد رکھنے والے مسلمانوں کی مساعی سے یہ نظام کامیابی سے ہمکنار ہوا اور اس کے اچھے نتائج محسوس ہوں تو یہ مسلمانوں کے سیاسی استحکام کی دلیل ہوگی اور اس سے رائج الوقت حکومت اپنے لیے مستقبل میں خطرہ محسوس کرے گی ممکن ہے کہ اس باہمی تعاون کی وجہ سے مسلمان بعض علاقوں میں اس درجہ میں منظم ہوں کہ ان کے پاس معاشرتی میدان میں عملی طور پر قوتِ تنفیذی حاصل ہو اور مسلمان جبری طور پر اسلامی فیصلہ ماننے کیلئے تیار ہوں۔ یہ صورت اگرچہ بذاتِ خود بہت اچھے نتائج کی حامل ہے لیکن سیاسی اعتبار سے مسلمانوں کی سرگرمیاں اس سے متاثر ہوسکتی ہیں جس سے غیر اسلامی اقتدار اعلیٰ ایسی کامیابی میں اپنے لیے خطرہ محسوس کرے گا۔

دوسری صورت | ایسے غیر اسلامی ممالک میں مسلمان اپنی ذمہ داری ایک دوسرے طریقے سے نباہ سکتے ہیں کہ وہ اسلامی نظام قضاء کے تحفظ کے لیے رائج الوقت قوانین کا سہارا لیں، اور یہ موجودہ وقت میں شخصی قوانین کے تحت قابلِ عمل بھی ہے۔ اس لیے اگر مسلمان محنت کرکے سیاسی میدان میں اتنا مقام پیدا کرلیں کہ حکومت وقت سے اپنے حقوق منوا سکیں، مسلمان ایسے قوانین کے بنانے پر زور دیں کہ رائج الوقت قوانین میں مسلمانوں کو اپنے مذہب کے مطابق فیصلہ کرنے کا حق دیا جائے، یعنی جو مسلمان ہوگا وہ اپنے مذہب کے مطابق فیصلہ کرے گا، ممکن ہے کہ اقتدارِ اعلیٰ ہر مسئلہ میں ایسے فیصلہ کرنے کی اجازت نہ دے لیکن بعض امور میں یہ حق ملنا بھی مسلمانوں کے لیے موقعہ غنیمت سے کم نہیں کیونکہ مالا یدرک کلہ لا یترک کلہ کے قاعدہ کو مدِنظر رکھتے ہوئے جو کچھ بھی ہوسکے اس سے روگردانی اور اعراض نہ کیا جائے، ایسی صورت میں علاقائی تحدید کی طرح اگر بعض مسائل تک قاضی کا دائرہ اختیار محدود ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ نظام قضا میں اس کی گنجائش ہے کہ کسی قاضی کا دائرہ اختیار ایام یا احکام کے اعتبار سے محدود ہو۔ چنانچہ علامہ الماوردیؒ فرماتے ہیں :۔

ویجوز ان تکون ولایۃ القاضی مقصورۃ علی حکومۃ بینھما بین خصمین ولا یجوز ان ینفذ النظر الی غیرھما من الخصوم وتکون ولایۃ علی النظر بینھما باقیۃ ما کان التشاجر بینھما باقیاً فاذا بت الحکم بینھما زالت ولایۃ .... فلولم یعین الخصوم وجعل مقصوراً علی الایام وقال فلانک النظر بین الخصوم فی یوم السبت وحدہ جاز نظرہ فیہ بین الخصوم فی جمیع الاعادی۔

(الاحکام السلطانیہ والولایات ص۷۳) ـــ (ترجمہ) "یہ جائز ہے کہ کسی

قاضی کا دائرہ اختیار کسی خاص افراد کے فیصلہ تک محدود ہو تو ان کے علاوہ دوسروں پر اس کو فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل نہیں، ان مخصوص افراد کے درمیان جب تک یہ معاملہ باقی ہو تو قاضی کو فیصلہ کرنے کا حق حاصل ہے جب ان کا فیصلہ ہو جائے تو اس کا اختیار ختم ہو گا..... اگر طرفین کا تعین نہ ہو بلکہ خاص ایام میں اس کو فیصلہ کرنے کا اختیار دیا جائے، مثلاً یہ کہ تجھے ہفتہ کے دن فیصلہ کرنے کا حق حاصل ہے، تو ہفتہ کے دن جملہ فیصلوں کا اختیار اس کو حاصل ہو گا۔"

غیر اسلامی حکومت سے عہدۂ قضا قبول کرنے کی شرعی حیثیت

اس پر یہ شبہ کیا جا سکتا ہے کہ کسی غیر اسلامی حکومت سے قضاء کا عہدہ قبول کرنا کہاں تک جائز ہے، کیونکہ اس میں غیر اسلامی حکومت کو دوام بخشنے اور اس سے تعاون کی ایک صورت ہے جو تعاون علی المعصیت کے مترادف ہے؟ لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ جب تک کسی مذہبی عقیدہ اور تشخص کے مجروح ہونے کا اندیشہ نہ ہو تو پھر ایسا عہدہ قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ جہاں کہیں (غیر اسلامی) حکومت میں مسلمان اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں تو اپنے حالات کے مطابق فیصلہ کر کے شرکت کر سکتے ہیں۔ اور اگر کسی غیر اسلامی قانون کے ذریعہ جب اسلامی قضاء کو دوام بخشا جائے تو ایسے قاضی کا فیصلہ مسلمانوں کے حق میں واجب العمل ہو گا۔ چنانچہ علامہ ابن عابدینؒ فرماتے ہیں:۔

ولکن اذا ولی الکافر علیھم قاضیًا ورضیہ المسلمون صحت تولیتہ بلا شبہ۔

(رد المحتار علی الدر المختار ج ۴ ص ۳۰۸ کتاب القضاء)

(ترجمہ) "اگر کسی کافر نے مسلمانوں کے لیے ان کی مرضی کے مطابق قاضی مقرر کیا تو اس کی یہ تولیت بلا شبہ جائز ہے۔"

ایسا قاضی مسلمانوں کے لیے وہ تمام امور جاری کر سکتا ہے جو دار الاسلام میں ایک قاضی کے دائرہ اختیار میں ہو۔ چنانچہ شیخ بدر الدینؒ فرماتے ہیں:۔

وکل مصر فیہ وال مسلم من جھۃ الکفار تجوز فیہ اقامۃ الجمع والاعیاد واخذ الخراج وتقلید القضاء وتزویج الایامی لاستیلاء المسلم علیھم۔ (جامع الفصولین ج۱ ص۱۴ الفصل الاول فی القضاء)

(ترجمہ) "وہ علاقہ جس میں کسی کافر بادشاہ کی طرف سے مسلمان گورنر ہو تو اس میں جمعہ و عیدین کی اقامت، خراج، قضاء کی تقرری اور یتیم بچیوں کی شادی کرانے کا حق حاصل ہے کیونکہ ان پر مقامی طور پر مسلمان کی حکومت ہے۔"

بہرحال کفار کے غلبہ کے وقت ان کی قوت تسلیم کرنا شریعت میں ناجائز نہیں لیکن اگر مسلمانوں کے ترکِ موالات سے کہیں کافرانہ نظام حکومت متزلزل ہو کر اپنی زندگی پوری کرنے کی حالت میں ہو تو پھر کفر کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو سہارا دینا تعاون علی المعصیت کے مترادف ہے، ایسی حالت میں یہ کشتی کسی سنجیدہ اور باوفا ملاح کے حوالے کرنی چاہیئے تاکہ وہ ان کی بہتری کے بارے میں سوچ سکے۔

انصاف کی رعایت نہ ہونے کے وقت عہدۂ قضاء قبول کرنا جائز نہیں

لیکن یہ طریقہ کسی ایسے غیر اسلامی ملک میں اپنانا اُس وقت مرخص ہے جب تک حکومتِ وقت ان کے مذہبی معاملات میں دخل اندازی نہ کرتی ہو، اگر کہیں ایسی حالت میں مسلمان انصاف قائم نہ رکھ سکتے ہوں تو پھر ظلم وستم کے لیے آلۂ کار نہیں بننا چاہیئے ورنہ اپنا مذہبی تشخص ضائع کرنے کے سوا اور کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔ چنانچہ علامہ ابن نجیم المصریؒ فرماتے ہیں:۔

ماذکر المصنف من جواز التقلید من الجائر مقید بما اذا کان یمکنہ من القضاء بالحق اما اذا لم یمکنہ فلا کما فی الھدایۃ لان المقصود لا یحصل بہ۔

(البحرالرائق ج ۶ ص ۲۷۴ کتاب القضاء)

(ترجمہ) "مصنفؒ نے ظالم سے قضاء قبول کرنے کا جو مسئلہ بیان کیا ہے، یہ اُس وقت ہے جب قاضی انصاف کے ساتھ فیصلہ کرسکتا ہو، جب یہ ممکن نہ ہو تو پھر قضاء قبول کرنا جائز نہیں جیسا کہ ھدایہ میں ہے کیونکہ ایسی صورت میں مقصود حاصل نہیں ہوتا۔"

اسلام کا نظام عدل وانصاف

مولانا مفتی غلام الرحمٰن مدظلہ

ہر دور میں دنیا کے ہر ملک کے حکمرانوں کی طرف سے یہ آواز اٹھائی جاتی ہے کہ ہم ہر ایک کو انصاف فراہم کریں گے اور ہمارے فیصلے عدل وانصاف کے تقاضوں کے عین مطابق ہوں گے، اس آواز میں مسلم اور غیر مسلم ممالک سب شامل ہیں لیکن آج تک کسی نے بھی عدل وانصاف کے جملہ تقاضے پورے نہیں کیے بلکہ الٹا نظام عدل وانصاف سے تمسخر کیا۔ دنیا بھر کے تمام نظامہائے قوانین میں ایک اسلام کا واحد نظام قانون ہے جس میں امیر وفقیر، آقا وغلام، بادشاہ ورعایا، چھوٹے بڑے اثر ورسوخ والے کو ایک نظر سے دیکھا جاتا ہے، اسلامی قانون کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس میں تمام فیصلے عدل وانصاف کے تقاضوں کے عین مطابق ہوتے ہیں۔ اسلامی اور غیر اسلامی نظام عدل وانصاف کی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے جامعہ دارالعلوم حقانیہ کے سابق نائب مفتی حضرت مولانا مفتی غلام الرحمٰن صاحب مدظلہ نے ایک جامع اور پر مغز مضمون تحریر فرمایا جسے دارالعلوم کے ترجمان ماہنامہ الحق نے شائع کیا، اب اس مضمون کو اسلامی قانون وفقہ سے مناسبت کی بناء پر عمومی فائدہ کے لیے "فتاوٰی حقانیہ" میں شامل کیا جاتا ہے۔ (از مرتب)

لفظ عدل قرآن وحدیث میں مختلف مقامات پر مستعمل ہوا ہے جس کے مقابلہ میں ظلم آتا ہے، اہلِ لغت کے ہاں ظلم "گذشتن چیزے در غیر محل آں"[1] کو کہتے ہیں۔ ظلم کے اس مفہوم کے اعتبار سے اس میں بہت وسعت موجود ہے جو ادنیٰ سے ادنیٰ گناہ سے لے کر کبائر اور شرک تک کو شامل ہے، مثلاً خداوند عالم نے جس مقصد کے لیے انسان کو زبان اور قوتِ گویائی دی ہے اگر زبان کا استعمال اس میں نہ ہو تو یہ ظلم ہے، تو ظلم کے مفہومی اعتبار سے اس کے مقابلہ میں بھی اس جیسی وسعت موجود ہے۔

---

[1] غیاث اللغات ص ۲۷۸۔

عدل کی ہمہ گیری | اعضاءِ انسانی اور انعاماتِ خداوندی کو اپنے محل میں استعمال کرنا عدل ہے۔ قرآن مجید میں جہاں قیام عدل کا مطالبہ بنی آدم سے ہوا ہے وہاں عدل سے یہی عمومی معنیٰ مراد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنی معرکۃ الآراء تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں :۔

"انصاف قائم کرنا اور اس پر قائم رہنا صرف عدالت اور حکومت کا فریضہ نہیں ہے، بلکہ ہر انسان اس کا مکلف اور مخاطب ہے کہ وہ خود بھی انصاف پر قائم رہے اور دوسروں کو بھی انصاف پر قائم رکھنے کیلئے کوشش کرے، ہاں انصاف کا ایک درجہ حکومت اور حکام کے ساتھ مخصوص ہے، وہ یہ کہ شریر اور سرکش انسان جب انصاف کے خلاف اڑ جائیں، نہ خود انصاف پر قائم رہیں اور نہ دوسروں کو انصاف کرنے دیں تو حاکمانہ سزا اور تعزیر کی ضرورت ہے، یہ اقامتِ عدل و انصاف ظاہر ہے کہ حکومت ہی کر سکتی ہے جس کے ہاتھ میں اقتدار ہے۔ آج کی دنیا میں جاہل عوام کو چھوڑ دیئے لکھے پڑھے، تعلیمیافتہ حضرات بھی سمجھتے ہیں کہ انصاف کرنا صرف حکومت اور عدالت کا فریضہ ہے عوام اسکے ذمہ دار نہیں ہیں، اور یہ وہ سب سے بڑی وجہ ہے جس نے ہر ملک اور سلطنت میں حکومت اور عوام کو دو متضاد فریق بنا دیا ہے۔" (معارف القرآن ج ۲ ص ۵۷۲، ۵۷۱)

قیام عدل کے مطالبہ کا تعلق انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر ایک شعبہ سے ہے اور انسان کے اخلاق و کردار (Character) ظاہر و باطن، عبادات و معاملات، سیاست و مذہب، غرض ہر ایک شعبہ میں عدل کا ہونا ضروری ہے۔ اس تعلقِ عامہ کے پیشِ نظر خداوندِ عالم نے جب انبیاء و رسل کو دنیا میں بھیج کر ان کی وجہ سے رُشد و ہدایت کا درس نوعِ انسان کو دینا چاہا تو انبیاء کرام علیہم السلام کی وساطت سے قیام عدل کا مطالبہ بھی کیا جس کی تکمیل کتبِ سماویہ سے کی گئی ہے قرآن حکیم میں ارشادِ ربانی ہے:۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (سورۃ الحدید آیت ۲۵)	ہم نے بھیجے ہیں اپنے رسول نشانیاں دے کر اور اتاری ان کے ساتھ کتاب اور ترازو تاکہ لوگ سیدھے رہیں انصاف سے۔

شیخ الاسلام والمسلمین مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:۔

"یعنی کتاب اس لیے اتاری کہ لوگ عقائد اور اخلاق و اعمال میں سیدھے انصاف

کی راہ پر چلیں، افراط اور تفریط کے راستہ پر قدم نہ ڈالیں"۔ (تفسیر عثمانی ص ۱۰۱)
الغرض بعثتِ انبیاء کے دیگر مقاصد کے علاوہ ایک اہم مقصد قیامِ عدل بھی رہا ہے۔

مروّجہ بین الاقوامی قوانین اور ان کے نتائج

آج دنیا کی جس قوم پر بھی آپ نظر ڈالیں تو قیامِ عدل کا یہ مطالبہ مختلف نعروں اور مختلف انداز سے سُنیں گے۔ کہیں مساوات اور برابری، کہیں انصاف اور حقوق کی بحالی کے عنوان سے عوام و خواص رطب اللسان ہیں مگر عملاً یہ عنقا کے مترادف ہے بلکہ دن بدن جرائم اور مظالم میں روز افزوں ترقی ہو رہی ہے، قانون عملاً معطل ہے۔ آج ہر ملک میں قانون سازی کے لیے پارلیمنٹ اور اسمبلیاں قائم ہیں، جرائم کے انسداد کے لیے مختلف قوانین وضع کیے جا رہے ہیں لیکن جرائم میں بجائے کمی کے زیادتی ہی ہو رہی ہے ؎

نگاہِ خلق میں دنیا کی رونق بڑھتی جاتی ہے
میری نظروں میں پھیکا رنگِ محفل ہوتا جاتا ہے

آپ حضرات دومنٹ کے لیے خالی الذہن ہو کر عالمی سطح پر جرائم کے معیار کو دیکھیں تو یہ حقیقت آپ پر واضح ہو جائے گی۔ ۱۹۸۰ء میں اقوام متحدہ کی ایک رپورٹ کے مطابق بین الاقوامی سطح پر گذشتہ چھ سالوں میں راہزنی میں ۹۷ فیصد، چوری میں ۴۷ فیصد اور قتل میں ۲۰ فیصد اضافہ ہوا ہے۔ (روزنامہ جنگ ۱۵ نومبر ۱۹۸۰ء)

اگر ایک طرف سائنسی دور میں انسدادِ جرائم کے لیے سائنسی آلات استعمال کیے جا رہے ہیں تو دوسری طرف مجرم بھی نت نئے طریقے اختیار کر کے بڑی صفائی سے جرم کرتے ہیں۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ایسے امور ضرور ہونے چاہئیں جو جرائم کی بیخ کنی کرتے ہوئے امن کا معاشرہ (Peaceful Society) مہیا کریں، آپ اقوامِ عالم کے مذاہب اور عقائد کو بھی دیکھ لیں، نام نہاد ترقی یافتہ اقوام کے قوانین کا مطالعہ کریں، مگر یقین کیجئے کہ اس کا واحد علاج آپ کو آج سے چودہ سو سال پہلے کوہِ صفا پر یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ قُوْلُوْا لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ تُفْلِحُوْا کے داعی کے دیئے ہوئے نسخۂ کیمیا میں ملے گا جہاں مجرم جرم کرنے کے بعد خود اپنے جرم کا اعتراف اور اعلان کر کے قانون اور انصاف کا مطالبہ کرتا نظر آئے گا۔

نظامِ عدل کا مرکزی نکتہ

اسلام میں قیامِ عدل کا بنیادی نکتہ (Basic Point) خوفِ خداوندی ہے جس کا تعلق فرد سے لے کر معاشرہ تک

اور رعیت سے لیکر بادشاہ تک ہے، اگر دل و دماغ میں خوفِ خدا موجود ہو اور نظریہ یہ ہو کہ آج میں جو کام کر رہا ہوں کل قیامت کے روز دربارِ خداوندی میں مجھ سے اس کی بازپرس ہوگی اور مجھے ضرور حساب دینا ہوگا۔ تو اس عقیدہ کے بعد ہر انسان قدم بقدم خیال رکھے گا کہ کہیں مجھ سے ایسی غلطی سرزد نہ ہو جائے جو قیامت میں خسارہ اور ذلت و رسوائی کا باعث ہو۔

عدالت میں عدل کی کرسی پر بیٹھے ہوئے حاکم اور مجسٹریٹ کا اگر یہ عقیدہ ہو اور سامنے ندامت اور پشیمانی کے عالم میں کھڑے ہوئے مجرم بھی خوفِ خداوندی کے ہتھیار سے مسلح ہوں تو یقین کیجئے کہ ظلم و ناانصافی کا نام ہی عالم سے فنا ہو جائے گا۔ مگر یاد رہے کہ یہ صرف خیالی یا فرضی تصوّر نہیں ہے بلکہ اسلام اور ہمارے اسلاف کی تاریخی زندگیوں میں اس کے واضح ثبوت موجود ہیں۔

حضرت ماعزؓ کا واقعہ

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے دور کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ماعزؓ بن مالک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ یارسول اللہ! مجھے پاک کیجئے، آپؐ نے فرمایا اے ماعز لوٹ جا اور اللہ کے حضور توبہ و استغفار کر، راوی کہتا ہے کہ ماعزؓ قدرے دُور گئے تھے کہ پھر لوٹ آئے اور پھر عرض کی کہ اے اللہ کے رسول مجھے پاک کیجئے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر وہی جواب دیا، تین بار ایسا ہی ہوا، چوتھی مرتبہ آپؐ نے فرمایا میں تجھے کس چیز سے پاک کروں؟ عرض کی زنا سے، حضور نبی کریمؐ نے لوگوں سے دریافت کیا کہ یہ شخص پاگل تو نہیں ہے؟ آپؐ کو بتایا گیا کہ وہ پاگل نہیں ہے۔ آپؐ نے پھر دریافت فرمایا کہ کیا اس نے شراب پی رکھی ہے؟ اس پر ایک شخص نے اٹھ کر ماعزؓ کے منہ کو سونگھا تو اسے اس سے شراب کی بُو نہ آئی۔ آپؐ نے ماعزؓ سے پھر پوچھا کیا واقعی تم نے زنا کیا ہے؟ ماعزؓ نے عرض کی ہاں مجھ سے زنا ہوا ہے۔ تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے حضرت ماعزؓ کو سنگسار کر دیا گیا۔ اس واقعہ کو ابھی تین ہی دن گذرے ہوں گے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور ارشاد فرمایا ماعز بن مالکؓ کے لیے مغفرت کی دعا کرو، اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر اسے پوری امت پر تقسیم کیا جائے تو سب کیلئے کافی ہے۔ (ترجمۃ العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام ص ۲۸۸، ۲۸۹)

اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس دور میں ہی قبیلہ ازد کے بطن غامد کی ایک عورت نے بھی اقرارِ جرم کیا تھا جس کے باعث آپؐ کے حکم سے اُسے بھی سنگسار کر دیا گیا۔

رات کی تاریکی میں خوفِ خدا کا اثر

خلیفۂ راشد حضرت عمر رضی اللہ عنہ رات کو گشت کرتے ہوئے جب ایک ایسے مکان کے قریب سے گذرے

جہاں والدہ اس بات پر اصرار کر رہی تھی کہ میں دودھ میں پانی ملاؤں گی لیکن بیٹی انکار کر رہی تھی اور کہہ رہی تھی کہ حضرت عمرؓ کا حکم ہے کہ دودھ میں ملاوٹ نہ کرو، والدہ کہتی ہے کہ عمرؓ اس وقت کون سا یہاں ہے؟ بیٹی جواب دیتی ہے کہ اگرچہ عمرؓ اس وقت یہاں موجود نہیں ہے لیکن اس کا خدا جو کہ علیم وخبیر ہے وہ تو موجود ہے۔

اسلامی تاریخ نے خوفِ خداوندی کے اس جذبہ سے شدتِ احساس کے اتنے نمونے اکھٹے کر رکھے ہیں کہ ان کا بالاستیعاب احصاء کرنا انسانی بس کی بات نہیں ہے۔

عرض کرنے کا واحد مقصد یہ ہے کہ قیامِ عدل کے لیے خوفِ خداوندی ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ آخر رات کی تاریکی میں گھر کی چار دیواری کے اندر اس خدا ترس لڑکی کو دودھ میں ملاوٹ کرنے سے باز رکھنا، ماعز بن مالکؓ کا اپنے کیے ہوئے پر پشیمان ہو کر بارگاہِ نبوت سے بار بار واپس کرنے کے باوجود لوٹ لوٹ کر اپنے جرم کا اقرار کرنا، آخر کون سے جذبہ سے یہ لوگ سرشار تھے؟ یہ وہی جذبہ ہے جسے ہم خوفِ خداوندی سے تعبیر کرتے ہیں۔

موانع عدل | عدل کی اسی اہمیت کے پیشِ نظر قرآنِ مجید نے واضح طور پر ان امور کی نشاندہی کر دی ہے جو قیامِ عدل کے لیے سب سے بڑے موانع اور رکاوٹیں ہیں، خاص کر شہادت اور قضا میں یہ امور انسان کو انصاف سے ہٹا کر ظلم پر آمادہ کرنے کی ترغیب دیتے ہیں اور وہ درج ذیل ہیں؛

(۱) قرابت Relation (۲) عداوت ENMITY (۳) مال و دولت Wealth

<u>قرابت</u>: بسا اوقات ایک انسان تعلقات، قرابت اور رشتہ داری کے ماحول سے متاثر ہو کر درست اور صحیح فیصلہ کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ مثلاً گواہ اپنی شہادت میں ان تعلقات کی بنا پر جھوٹ بول کر ناجائز اور غیر مشروع امور کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے، افسر مجاز اپنے بالا افسران کے رعب سے غلط کام پر آمادہ ہو جاتا ہے اور اس طرح عدل کو چھوڑ کر ظلم کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے۔

قرآن مجید میں اس امر کی نشاندہی یوں کی گئی ہے :-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ۔ (سورۃ ـــــ)	اے ایمان والو! قائم رہو انصاف پر گواہی دو اللہ کی طرف اگرچہ نقصان ہو تمہارا یا ماں باپ کا یا قرابت والوں کا۔

شہادتِ حق اور قرابتیں

خدا وند عالم نے ایمان والوں کو مخاطب کر کے فرمایا :۔ "اے ایمان والو! تمام معاملات میں ادائے حق کے وقت بھی اور فیصلہ کے وقت بھی انصاف پر خوب قائم رہنے والے اور اللہ کی خوشنودی کے لیے سچی گواہی دینے والے رہو اگرچہ وہ گواہی اور اظہار اپنی ہی ذات کے خلاف ہو یا والدین اور دوسرے رشتہ داروں کے مقابل ہو"۔ (بیان القرآن)

گویا قانون اور انصاف کے سامنے رشتہ داری اور قرابت کوئی روک نہیں، والدیت اور ولدیت کے محبوب رشتوں کو بھی قربان کرنا ہوگا، خود رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ میں اس کے راہنما اصول اور عملی نشانِ راہ موجود ہیں۔

حضرت اُسامہؓ کی سفارش پر دربارِ نبوت کا ردِ عمل

ام المؤمنین سیدہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ قریش کے قبیلہ مخزومی کی ایک عورت سے چوری سرزد ہوگئی، قریش نے باہمی مشورہ کیا کہ اس عورت کو ہاتھ کاٹنے کی سزا سے بچانے کے لیے حضورؐ کی خدمت میں سفارش کر دینی چاہیئے، اس کام کے لیے سب نے حضرت اسامہؓ کو منتخب کیا (کیونکہ وہ رسول اللہ کے محبوب رفیق

تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس نظرِ شفقت سے حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کو دیکھتے تھے حضرت اسامہؓ بھی اسی طرح آپؐ کے منظورِ نظر تھے) حضرت اسامہؓ نے جب سفارش کی تو بارگاہِ نبوت سے جلال آمیز ارشاد صادر ہوا۔

اتشفع فی حد من حدود اللہ ثم قام فاختطب فقال یاایھا الناس انما اھلک الذین قبلکم انھم کانوا اذا سرق فیھم الشریف ترکوہ واذا سرق فیھم الضعیف اقاموا علیہ الحد وایم اللہ لوان فاطمۃ بنت محمد سرقت لقطعت یدھا۔

(دعواتِ حق جلد اول ص۹۵)

کیا تم اللہ کی حدود میں سفارش کرتے ہو پھر کھڑے ہو کر خطبہ ارشاد فرمایا کہ اے لوگو! بیشک تم سے پہلے لوگ اس لیے ہلاک ہوئے کہ جب ان میں سے کوئی شریف چوری کرتا تو اسے چھوڑ دیتے اور جب کوئی نادار چوری کرتا تو اس پر حد قائم کرتے، خدا کی قسم اگر میری بیٹی فاطمہؓ بھی (معاذ اللہ خدانخواستہ) چوری کرتی تو میں ضرور اس کے ہاتھ کاٹتا۔

ایک انسان جب کسی اعلیٰ عہدہ اور مقام پر فائز ہو جاتا ہے تو اس کے تعلقات اور رشتہ داری بڑھ جاتی ہے، اجانب اقارب بن جاتے ہیں، مدتوں سے ٹوٹے ہوئے رشتے پھر جڑ جاتے ہیں، لیکن

مسلمان سے مذہبِ اسلام کا یہی مطالبہ ہے کہ قانونِ شریعت کے مقابلہ میں کسی کو بھی ترجیح نہ دی جائے۔

عدل فاروقی کی ایک جھلک

خلفائے راشدین میں سے حضرت عمرؓ کے مبارک دور میں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ حکمرانوں کے اعزا اور اقربا کو رعیت کے دوسرے افراد کے مقابلہ میں امتیازی مقام حاصل ہو۔ چنانچہ آپ کے صاحبزادے حضرت عبدالرحمٰنؓ نے جب شراب پی لی تو اس پر بھی حد جاری کرنا لازمی قرار دیا گیا۔ العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام ص۲۴۴ نیز حضرت عمرؓ نے اپنے ایک قریبی رشتہ دار قدامہ بن مظعون (جو آپ کے سالے اور معزز صحابی تھے) کو بھی شراب نوشی کے جرم میں اسّی کوڑے لگوائے۔ (تاریخ اسلام ص۲۰۷)

ایک دفعہ آپ نے ایک آدمی سے گھوڑے کا سودا طے کیا، پھر آزما کر دیکھنے کی خاطر اس پر سوار ہونے لگے تو گھوڑا ٹھوکر کھا کر گرا اور زخمی ہو گیا، حضرت عمرؓ نے چاہا کہ گھوڑا اس کے مالک کو واپس کر دیں، لیکن مالک نے واپس لینے سے انکار کر دیا، دونوں مقدمہ لیکر قاضی شریح کی عدالت میں گئے، قاضی نے فریقین کے دلائل سننے کے بعد فرمایا:۔

"امیر المؤمنین! جو چیز آپ نے خریدی ہے اُسے لے لیجئے ورنہ جس حال میں خریدی تھی اُسی حال میں واپس کیجئے۔"

یہ سنکر حضرت عمرؓ بول اٹھے "اسے کہتے ہیں فیصلہ کرنا"۔ پھر آپ نے شریح کو عدل و انصاف سے فیصلہ کرنے کے بدلے کوفہ کا قاضی مقرر کر دیا۔ (تاریخ اسلام ص۳۴۴)

امیر المؤمنین قاضی کی عدالت میں

ایسے ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک مقدمہ میں فریق بن کر عدالت میں حاضر ہوئے، فیصلہ امیر المؤمنین کے خلاف ہوا اور آپ اسے محسوس نہیں کرتے، جس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے کہ:۔

ایک دفعہ حضرت علیؓ کی زرہ گر گئی جو ایک نصرانی کے ہاتھ لگ گئی، حضرت علیؓ نے اسے دیکھ کر پہچان لیا اور قاضی شریح کی عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا، نصرانی کا دعویٰ تھا کہ یہ اس کی اپنی زرہ ہے، قاضی شریح نے حسبِ قاعدہ حضرت علیؓ سے دریافت کیا کہ آپ کے پاس اپنے اس دعویٰ کے اثبات کے لیے کوئی گواہ ہے؟ تو حضرت علیؓ نے دو گواہ ایک اپنا بیٹا اور دوسرا اپنا آزاد کردہ غلام قنبر کو حاضر کیا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے میں بیٹے کی گواہی والد کے لیے درست تھی، لیکن قاضی شریح

نے فرمایا کہ آپ کے بیٹے کی گواہی آپ کے لیے درست نہیں ہے، اور دوسرا گواہ جو کہ آزاد کردہ غلام ہے اور اس ایک گواہ کی گواہی سے آپ کا دعویٰ ثابت نہیں ہوتا۔

چنانچہ زرہ کا فیصلہ نصرانی کے حق میں ہوا، اس فیصلے کا نصرانی پر اس قدر اثر ہوا کہ وہ اسی وقت مسلمان ہو گیا اور زرہ حضرت علیؓ کو واپس کردی، لیکن حضرت علیؓ نے دوبارہ زرہ اُسے دیدی اور اس کے ساتھ ایک گھوڑا بھی اسے عنایت فرمایا۔ (نور الانوار ص۲۲۳)

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ نظام عدل کے قیام میں انسان کو کسی سے متاثر نہیں ہونا چاہیئے بلکہ آقا اور غلام، امیر اور غریب، حاکم اور محکوم سب کو ایک ہی نظر سے دیکھا جائے گا، لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ آج اگر کوئی افسر بالا ماتحت افسر کے خلاف فیصلہ صادر کرے تو معلوم نہیں اس انصاف کی وجہ سے اس فیصلہ کرنے والے کو کیا کیا سزائیں ملیں گی۔ اگر کسی خوف کی وجہ سے معزول نہ کرے لیکن انتقام کی آگ ہر وقت محکوم علیہ کے ذہن میں سلگتی رہے گی اور فیصلہ کرنے والا انتظار کی گھڑیاں شمار کرتا رہے گا۔

انصاف کی نظر میں عمر فاروق اور ایک عام آدمی برابر ہیں

لیکن اسلام کے شیدائیوں کو جہاں حق بات نظر آئی وہاں اپنے خلاف فیصلہ پر بھی راضی اور خوش رہے۔

چنانچہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ کا حضرت ابی بن کعبؓ سے کچھ نزاع ہو گیا، حضرت ابی بن کعبؓ نے زید بن ثابتؓ کے یہاں مقدمہ دائر کر دیا، حضرت عمرؓ مدعا علیہ کی حیثیت سے عدالت میں پیش ہوئے تو حضرت زیدؓ نے آپ کی تعظیم کی، اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا یہ تمہارا پہلا ظلم ہے، یہ کہہ کر اپنے فریق ابی بن کعبؓ کے ساتھ بیٹھ گئے۔ حضرت ابی بن کعبؓ کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا اور حضرت عمرؓ کو دعویٰ سے انکار تھا۔ ابی بن کعبؓ نے قاعدہ کے موافق حضرت عمرؓ سے قسم لینی چاہی تو زید بن ثابتؓ نے آپ کا لحاظ کرتے ہوئے ابی بن کعبؓ سے کہا کہ امیر المؤمنین کو قسم سے معاف رکھو۔ حضرت عمرؓ اس ترجیحی سلوک پر آزردہ خاطر ہوئے اور فرمایا کہ جب تک تمہارے نزدیک ایک عام آدمی اور عمرؓ دونوں برابر نہ ہوں اُس وقت تک تم منصب قضا کے قابل نہیں ہو سکتے۔ (کنز الاعمال جلد ۳ ص۱۷۴)

اسلامی نظام عدل نے شاہانِ وقت کو بھی معاف نہیں کیا

ان مثالوں اور واقعات کا تعلق صرف خلفائے راشدینؓ کے مبارک دور سے خاص نہیں ہے بلکہ حقانیت اور حق گوئی کا یہ جذبہ ہمیشہ اسلاف اور بزرگانِ دین

کا شیوہ رہا ہے، جہاں حق بات نظر آئی وہاں بادشاہِ وقت کو بھی معاف نہیں کیا۔

قاضی ابو یوسفؒ عدالت کی کرسی پر بیٹھے ہیں، ایک شخص ان کے سامنے مقدمہ پیش کرتا ہے کہ عباسی بادشاہ ہادی سے ایک باغ کے بارے میں میرا جھگڑا ہے۔ قاضی ابو یوسفؒ رائے قائم کرتے ہیں کہ حق اسی شخص کے ساتھ ہے مگر مشکل یہ ہے کہ گواہ بادشاہ کے پاس ہیں، انہوں نے کہا مُدعی کا مطالبہ ہے کہ ہادی قسم کھائے کہ اس کے گواہ سچے ہیں، ہادی نے قسم کھانے کو اپنی توہین سمجھتے ہوئے اس سے انکار کیا اور باغ اپنے مالک کو واپس کر دیا۔

عداوت: دوسری چیز جو نفاذِ عدل کے لیے مانع ہے اور انسان کو ظلم اور ناانصافی کی طرف لے جاتی ہے وہ عداوت اور آپس میں دشمنی ہے، قرآن مجید نے اس امر کی نشاندہی یوں فرمائی ہے:۔

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰٓ أَلَّا تَعْدِلُوا ۚ اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ○

(سورۃ المائدہ آیت ۸)

کسی قوم کی دشمنی کے باعث انصاف کو ہرگز نہ چھوڑو اور عدل کرو، یہی بات زیادہ نزدیک ہے تقویٰ سے، اور ڈرتے رہو اللہ سے، بے شک اللہ کو خوب خبر ہے جو تم کرتے ہو۔

اہلِ اسلام کا طرۂ امتیاز

شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:۔

"عدل کا مطلب ہے کسی شخص کے ساتھ بدون افراط و تفریط کے وہ معاملہ کرنا جس کا وہ واقعی مستحق ہے، عدل اور انصاف کا ترازو ایسا صحیح اور برابر ہونا چاہیئے کہ عمیق سے عمیق محبت اور شدید سے شدید عداوت بھی اس کے دونوں پہلوؤں میں سے کسی پہلو کو جھکا نہ سکے"۔ (تفسیر عثمانی ص ـــ)

اور یہی وہ رسم ہے جس کو اہلِ اسلام نے ہمیشہ کے لیے قائم رکھا، مفتوحہ علاقوں میں اسلام کا برتاؤ ہمیشہ کے لیے انسانیت پر مبنی رہا، معاملات اور دیگر حقوق میں غیر مسلموں کو پورا پورا حق دیا گیا ہے۔

اہلِ مغرب کا سفاکانہ کردار

ہم جب اقوامِ عالم اور ایامِ ماضیہ کے تاریخی واقعات پر نظر ڈالتے ہیں تو آسانی سے اس نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں کہ دیگر مذاہب اور ادیان والے غیر مذہب والوں سے چوپایوں جیسا سلوک بھی روا نہیں رکھتے، اور صرف یہ نہیں

بلکہ اسلام کا مقابلہ اگر دورِ حاضر کی مغربی تہذیب سے کیا جائے تو یقیناً اسلام اپنی تاریخ کے ہر دور میں زیادہ وسیع اور بلند و پاکیزہ نظر آئے گا۔

اہلِ مغرب آج جس مذہبی آزادی کا دم بھرتے ہیں اس سے پہلے ان کے یہاں وہ دور بھی گذر چکا ہے جس میں اندلس کی "تحقیقاتی عدالتوں" کی بہیمانہ سزائیں اور مشرق میں صلیبی جنگوں کی سفاکیاں ملتی ہیں۔

اہلِ مغرب نے اپنے نظریات سے اختلاف کرنے والوں کو آگ میں جلانے تک کی سزا کو جائز رکھا، اور یہی وجہ تھی کہ مذہبی دشمنوں سے انتقام لینے کے لیے احتساب کی عدالتیں قائم ہوئیں جنہوں نے دشمنوں کو بلا وجہ وہ سزائیں دیں جس کی نظیر رہتی دنیا تک نہیں مل سکے گی۔

ان عدالتوں اور احتساب کے محکموں نے ایک اندازے کے مطابق ۳۲ ہزار انسانوں کو زندہ جلایا جن میں ہیئت اور طبیعات کے مشہور عالم برونو (Brunoe) اور گلیلو (Galilio) کو بھی یہی سزا دی گئی۔ (انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر ص ۲۶۴، ص ۲۶۵)

اہلِ مغرب نے کسی مفتوحہ علاقہ میں مخالفین کے وجود کو دیکھنا بھی برداشت نہیں کیا جس علاقہ میں فاتحانہ انداز سے داخل ہوتے وہاں اعلان کرتے کہ جو ہمارے خیالات اور نظریات سے متفق نہیں وہ ہمارے ملک سے نکل جائے۔ جیسا کہ فرانسیسی جنرل کاسترو نے ۱۹۴۰ء میں دمشق کے گذشتہ انقلاب کے موقع پر اعلان کیا تھا کہ "ہم صلیبی مجاہدین کے پوتے ہیں جس کو ہماری حکومت پسند نہ ہو وہ یہاں سے نکل جائے"۔

اور اس سے ملتی جلتی بات جنرل کاسترو کے ایک ہم مشرب نے ۱۹۴۵ء میں الجزائر میں کہی تھی۔ (العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام ص ۳۲۵)

روسی کمیونسٹوں کا مسلم اقلیت سے ظالمانہ سلوک

موجودہ دور میں دوسری عظیم طاقت روس کا کمیونسٹ بلاک تو غیر کمیونسٹوں کے وجود کو مٹانے کی کوشش کر رہا ہے، مذہبی رسوم اور عبادت خانوں کو ختم کرنے کا خواہاں ہے، اقلیت کے ساتھ نازیبا سلوک کا اندازہ آپ روسی مسلمانوں کی مساجد اور مدارس سے کیے ہوئے حشر سے لگا سکتے ہیں۔ روس میں کمیونسٹ انقلاب سے قبل ایک اندازے کے مطابق مسلمانوں کے ۲۵ ہزار مدارس تھے لیکن کمیونسٹ انقلاب کے بعد یہ مدارس بند کر دیئے گئے اور اساتذہ کو گرفتار کر لیا گیا، مدارس کی وہ عمارتیں جن میں قال اللہ و قال الرسول کی صدائیں بلند ہوتی تھیں بعض کو مسمار اور بعض کو ضبط کر کے اصطبلوں میں تبدیل کر دیا گیا، اور پچیس سال کے عرصہ میں ایک بھی مذہبی مدرسہ نہ رہا۔

یہی حال مساجد کا تھا، ۳۱ ہزار مساجد آباد تھیں لیکن ۱۹۴۲ء کی ایک رپورٹ کے مطابق اب پورے روس میں صرف ۱۳۱۲ مساجد رہ گئی ہیں باقی سب کو شہید کر دیا گیا۔ (تاریخ میں مسلمان قومیں ص ـــ)

برطانوی دور کے مظالم

روس اور یورپ تو در کنار خود اس پاک و ہند کی تاریخ کو دیکھئے برطانوی گورنمنٹ نے مسلمانوں اور ہندوؤں کے مذہب کے ساتھ کیا کچھ نہیں کیا؟

کراچی کے مقدمہ میں رئیس الاحرار حضرت مولانا محمد علی صاحب مرحوم اور شیخ الاسلام والمسلمین حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمتہ اللہ علیہ اور دیگر اکابرین کا آخر جرم کیا تھا؟ صرف اس قدر کہ مذہب اسلام کے مطابق مسلمان سپاہیوں کو ترکی کی مسلمان افواج کے مقابلہ میں استعمال نہ کیا جائے۔

ان واقعات اور حالات کو پیش کرنے سے میرا واحد مقصد یہ ہے کہ اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب نے اقلیت اور دشمنوں سے وہ کون سا ناروا سلوک ہے جو روا نہ رکھا ہو، عداوت اور دشمنی کی بناء پر وہ کونسی بے انصافی ہے جو استعمال نہ کی گئی ہو۔

دشمنوں سے اسلام کا روادارانہ سلوک

مگر اسلام نے اپنے مخالفوں اور اقلیت سے جو حسن سلوک کیا اس کا اندازہ آپ خلفائے راشدینؓ کے طرزِ عمل اور کردار سے کر سکتے ہیں۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آخر وقت تک غیر مسلموں اور ذمیوں کے حقوق کی حفاظت کی بڑی تاکید فرمائی تھی، ذمیوں کے لیے باقاعدہ حقوق مقرر کئے گئے اور خلافتِ راشدہ کے دور میں بھی اسی اصول کو اپنایا گیا، یہاں تک کہ خلیفۃ الرسول سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں ان کو وہی حقوق دیئے جو ان کیلئے تاجدارِ حرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر کیے تھے۔

حقوق کی اقسام

کسی قوم کے حقوق صرف تین چیزوں سے متعلق ہوتے ہیں۔ جانؔ، مالؔ اور مذہبؔ۔ ان کے سوا اور جتنے بھی حقوق ہیں وہ سب ان ہی کے تحت آجاتے ہیں۔

حضرت عمرؓ کے عادلانہ دور میں، بیت المقدس کے عیسائیوں کے ساتھ ہونے والے معاہدہ میں انہیں جو حقوق دیئے گئے تھے وہ یہ ہیں:۔

"یہ وہ امان ہے جو خدا کے غلام امیرالمؤمنین عمرؓ نے اہلِ ایلیا کو دی۔ یہ امان جان ومال، گرجا، صلیب، تندرست، بیمار اور ان کے تمام اہلِ مذہب کے لیے ہے، نہ ان کے گرجا میں سکونت اختیار کی جائے گی نہ وہ ڈھائے جائیں گے نہ ان کے احاطہ کو نقصان

پہنچایا جائے گا، نہ ان کی صلیبوں اور ان کے مال میں کمی کی جائے گی، مذہب کے بارے میں ان پر جبر نہ کیا جائے گا، نہ ان میں سے کسی کو نقصان پہنچایا جائے گا۔"

(طبری، فتح بیت المقدس۔ بحوالہ تاریخ اسلام ص۲۲۲)

اور یہ حقوق صرف ایلیا والوں سے مخصوص نہیں تھے بلکہ پوری دنیا میں مسلمان جہاں بھی فاتحانہ انداز میں داخل ہوئے تو وہاں کے رہنے والوں کو یہ حقوق دیئے۔ اہلِ جرجان کے ساتھ جو معاہدہ کیا گیا تھا اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

"ان کی جان، مال، مذہب و شریعت سب کو امان ہے ان میں سے کسی شے میں کوئی تغیر نہیں کیا جائے گا۔" (طبری، فتح بیت المقدس بحوالہ تاریخ اسلام ص۲۲۲)

آذر بائیجان کے معاہدہ میں بھی اسی قسم کے الفاظ تھے:۔

"انکی جان و مال اور مذہب و شریعت کو امان ہے۔" (طبری، فتح بیت المقدس بحوالہ تاریخ اسلام ص۲۲۲)

دورِ صدیقیؓ کے عہد نامے

سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں بھی حیرہ کے عیسائیوں کو از روئے معاہدہ یہ حقوق دیئے گئے:۔

"ان کی خانقاہیں اور گرجے نہ منہدم کیے جائیں اور نہ ان کا کوئی قصر گرایا جائے گا جن میں وہ ضرورت کے وقت دشمن کے مقابلہ میں قلعہ بند ہوتے ہیں، ناقوس بجانے کی ممانعت نہ ہوگی اور نہ مذہبی تہوار کے موقع پر صلیب نکالنے سے روکے جائیں گے۔" (طبری، فتح بیت المقدس بحوالہ تاریخ اسلام ص۲۲۲)

اور یہ بات صرف کاغذی کارروائی تک محدود نہ تھی بلکہ خلفائے راشدین ہمیشہ کیلئے ماتحت گورنروں کو اس کے متعلق ہدایات جاری فرمایا کرتے تھے، غیر مسلموں سے وہی سلوک برتا جاتا تھا جو سلوک مسلمانوں سے روا رکھا جاتا تھا۔

چنانچہ حضرت عمرؓ نے شام کے سفر میں ایک مقام پر دیکھا کہ ذمیوں پر سختی کی جارہی ہے، جب سبب دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ جزیہ ادا نہیں کیا گیا، پوچھا گیا کیوں؟ جواب ملا سبب ناداری ہے، حضرت عمرؓ نے فرمایا انہیں چھوڑ دو، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے آپؐ نے فرمایا کہ لوگوں کو تکلیف نہ دو، جو لوگ دنیا میں دوسروں کو عذاب دیتے ہیں خدا انہیں قیامت

کے دن عذاب میں مبتلا کرے گا۔ (کتاب الخراج للقاضی ابو یوسفؒ)

نادار، مفلس اور معذور ذمی جزیہ سے مستثنیٰ تھے بلکہ بیت المال سے ان کی کفالت کی جاتی تھی، چنانچہ حیرہ کے معاہدہ میں اس کی تصریح موجود ہے:۔

"اگر کوئی بوڑھا ذمی کام کرنے سے معذور ہو جائے یا کوئی آفت آئے یا دولتمندی کے بعد غریب ہو جائے اور اس کے اہل مذہب اسے خیرات دینے لگیں تو اس کا جزیہ موقوف کر دیا جائے گا اور اس کی اولاد کو بیت المال سے خرچ دیا جائے گا۔"
(کتاب الخراج للقاضی ابو یوسفؒ)

حضرت عمرؓ کا ایک لطیف استدلال

یہ معاہدہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور میں ہوا تھا اور عہد فاروقی میں اس پر باقاعدہ عمل جاری رہا بلکہ حضرت عمرؓ نے تو قرآنی استدلال سے اس کو اور زیادہ مؤکد کر دیا۔ چنانچہ ایک دفعہ آپ نے ایک ضعیف ذمی کو بھیک مانگتے دیکھا تو پوچھا بھیک کیوں مانگتے ہو؟ اس نے کہا کہ مجھ پر جزیہ لگایا گیا ہے اور میں ادا نہیں کر سکتا، یہ سنکر حضرت عمرؓ اسے اپنے گھر لے گئے اور کچھ نقد رقم دیکر داروغہ کو پیغام بھیجا کہ اس قسم کے معذوروں کے لیے بیت المال سے وظیفہ مقرر کر دیا جائے۔ اور فرمایا کہ کلام اللہ کی یہ آیت اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ میں فقراء سے مراد مسلمان اور مساکین سے مراد اہل کتاب ہیں، اور فرمایا خدا کی قسم یہ انصاف نہیں ہے کہ ان کی جوانی سے تو ہم فائدہ اٹھائیں اور بڑھاپے میں ان کو نکال دیں۔ (کتاب الخراج للقاضی ابو یوسف)

حفاظتِ نفس کا یہ عالم تھا کہ جہاں کہیں کوئی مسلمان کسی ذمی کو قتل کر دیتا تو حضرت عمرؓ باقاعدہ اس سے قصاص لینے کا حکم فرماتے۔ چنانچہ ایک دفعہ قبیلہ بکر بن وائل کے ایک شخص نے حیرہ کے ایک عیسائی کو قتل کر دیا تو آپ نے قاتل کو مقتول کے ورثاء کے حوالے کر کے اس سے قصاص لیا۔ (الدرایۃ بحوالہ تاریخ اسلام)

حفاظتِ مال کے بارے میں اگر کوئی مسلمان کسی ذمی کی کسی جائیداد یا مال کو نقصان پہنچاتا تو حضرت عمرؓ اس کا معاوضہ بیت المال سے دلاتے۔ جیسا کہ ایک دفعہ اسلامی لشکر نے شام کے ایک ذمی کی زراعت کو پامال کیا تو حضرت عمرؓ نے اس ذمی کو بیت المال سے دس ہزار درہم کا معاوضہ دلایا۔ (کتاب الخراج للقاضی ابو یوسف)

ذمیوں کے بارے میں حضرت عمرؓ کی خصوصی ہدایت

حضرت عمرؓ جس طرح خود ذمیوں کے حقوق کی نگہداشت کرتے تھے ایسے ہی ماتحت گورنروں سے بھی کرواتے، چنانچہ فاتح شام حضرت ابو عبیدہ بن الجراحؓ کو لکھا کہ:-

"مسلمانوں کو ذمیوں پر ظلم کرنے، ان کو نقصان پہنچانے اور بے وجہ ان کے مال کھانے سے روکو اور ان سے جو شرطیں طے کی گئی ہیں انہیں پورا کرو"۔

(کتاب الخراج للقاضی ابو یوسف)

بلکہ حضرت عمرؓ دنیا سے جاتے وقت آئندہ خلیفہ کے لیے جو ہدایات لکھتے ہیں ان میں ذمیوں کے حقوق اور ان کی نگہداشت کا خصوصی تذکرہ موجود ہے:۔

"میں ان لوگوں کے حق میں جن کو خدا اور رسول کا ذمہ دیا گیا ہے یہ وصیت کرتا ہوں کہ ان سے جو عہد کیا گیا ہے اسے پورا کیا جائے، اس کی حمایت میں لڑا جائے اور ان کی طاقت سے زیادہ انہیں تکلیف نہ دی جائے"۔ (تاریخ اسلام ص ۲۲۶)

یہی وہ اسلامی عدل وانصاف ہے جس میں دوست اور دشمن کو ایک ہی نظر سے دیکھا گیا ہے وہ دشمن جو بدترین دشمن تھے، جو مذہب اور عقیدہ کے دشمن تھے اُن سے جب اس قدر انصاف قائم رکھا گیا تو اور کون ہو سکتا ہے جس کے ساتھ اسلام نے ظلم کی گنجائش رکھی ہو؟ ان واقعات سے بآسانی یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ خلفائے راشدینؓ نے اس فرمانِ خداوندی پر "کسی قوم کی دشمنی تم کو ظلم پر آمادہ نہ کرے"۔ کما حقہ، عمل کیا ہے اور امتِ محمدیہ کے لیے قیامت تک ایک عملی نمونہ چھوڑا ہے۔

وہ دشمن جو اپنے کیے ہوئے افعال وکردار کی وجہ سے بڑی بڑی سزاؤں کے مستحق ومنتظر تھے، ندامت اور پشیمانی کی وجہ سے ان کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور اپنی جانیں خطرے میں دیکھتے تھے۔ لیکن اسلام نے اس کے برعکس ان کی جان کی حفاظت کے علاوہ مال ومذہب کو بھی محفوظ رکھا اور معاشرہ میں ان کو انسانیت کی نظر سے دیکھا گیا۔

<u>مال ودولت</u>:- تیسری چیز جو قیام عدل وانصاف میں مانع ہے وہ مال ودولت کی فراوانی یا فقدان ہے۔ مثلاً ایک انسان بسا اوقات کسی غریب کی غربت کو دیکھ کر اس پر ترس کھا کر اس کیلئے جھوٹی گواہی دیتا ہے یا پھر غریب کی غربت پر ترس کھا کر فیصلہ اس کے حق میں کر جاتا ہے جس میں ظلم اور زیادتی کا ارتکاب ہوتا ہے، جبکہ آجکل ہمارے معاشرہ میں یہ بہت کم ہوا ہے کہ لوگ غریب

کی غربت سے متاثر ہوئے ہوں۔ دوسری صورت میں انسان بعض اوقات مالدار کی مالداری کی وجہ سے ظلم پر آمادہ ہو جاتا ہے، مالدار سے کچھ طمع اور امید کی خاطر گواہ جھوٹی گواہی دے کر حاکم سے غلط فیصلے کا حکم صادر کراتا ہے جو یقیناً ظلم اور ناانصافی ہے، قرآنِ مجید نے اس کی نشاندہی یوں فرمائی ہے :۔

اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ (سورۃ النساء آیت ۱۳۵)	اگر کوئی مالدار ہے یا محتاج ہے تو اللہ ان کا خیر خواہ تم سے زیادہ ہے سو تم پیروی نہ کرو خواہش کی انصاف کرنے میں۔

شہادت کے اصول

شیخ الاسلام والمسلمین حضرت العلامہ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں :۔

"یعنی سچی گواہی دینے میں اپنی کسی نفسانی خواہش کی پیروی نہ کرو کہ مالدار کی رعایت کر کے یا محتاج پر ترس کھا کر سچ کو چھوڑ بیٹھو جو حق ہو، سو کہو اللہ تعالیٰ تم سے زیادہ ان کا خیر خواہ اور ان کے مصالح واقف ہے اور اس کے یہاں کسی چیز کی کمی نہیں ہے"۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :۔

"اور گواہی کے وقت یہ خیال نہ کرو کہ جس کے مقابلہ میں ہم گواہی دے رہے ہیں یہ امیر ہے اس کو نفع پہنچانا چاہیئے تاکہ اس سے بے مروتی نہ ہو، یا یہ غریب ہے اس کا کیسے نقصان کر دیں۔ تم گواہی دینے میں کسی کی امیری، غریبی یا نفع ونقصان نہ دیکھو کیونکہ وہ شخص جس کے خلاف گواہی دینی پڑے گی۔ اگر امیر ہے تو، غریب ہے تو، دونوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو زیادہ تعلق ہے اتنا تعلق تم کو نہیں، کیونکہ تمہارا تعلق جس قدر ہے وہ بھی انہی کا دیا ہوا ہے، اور اللہ تعالیٰ کا جو تعلق ہے وہ تمہارا دیا ہوا نہیں، پھر باوجود قوی تعلق کے اللہ تعالیٰ نے ان کی مصلحت اس میں رکھی ہے کہ گواہی میں حق بات کہی جائے، تو تم ضعیف تعلق کے باوجود اپنی شہادت میں ایک عارضی مصلحت کا کیوں خیال کرتے ہو"۔ (بیان القرآن)

چونکہ شہادت اور فیصلہ دونوں میں تسلط علی الغیر موجود ہے، جب گواہی دیتے وقت گواہ ان امور کو مدنظر رکھے گا تو قاضی اور فیصلہ کرنے والا حاکم بطریقِ اولیٰ ان امور کا پابند رہے گا۔

قاضی اور حاکم فیصلہ کرتے وقت جیب بھرنے کی انتظار میں نہیں بیٹھے گا بلکہ جو حق ہوگا اس کا امضاء کرے گا۔ اسلامی قوانین انصاف کی راہ میں حائل اس مانع اور رکاوٹ کا سخت نوٹس لیا گیا ہے جب صاحبِ عہدہ کسی عہدہ اور منصب پر فائز ہو تو اپنے اس منصب سے غلط فائدے نہیں اٹھائے گا، ایسی پارٹیوں (دعوتوں) میں شمولیت سے اجتناب کرے گا جو پارٹیاں صرف اس کے عہدہ کی وجہ سے اس کو دی جاتی ہوں۔

رشوت کی اقسام اور ان کے احکام

یہی وجہ ہے کہ رشوت کی تمام اقسام کو لینے والے کے لیے حرام ٹھہرایا گیا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ رشوت لینے والا اور دینے والا دونوں جہنمی ہیں۔ اور رشوت کا مال قبض کرنے سے بھی ملکیت میں نہیں آسکتا بلکہ رشوت میں لیا ہوا مال صاحبِ مال کو واپس کرنا واجب ہے۔ اس ضمن میں یہ ضروری ہے کہ رشوت کی جملہ اقسام اور ان کے احکام کے متعلق کچھ عرض کر دیا جائے۔

فقہاء کرام کے فرمان کے مطابق رشوت کی چار قسمیں ہیں:۔

(۱) رشوت کی پہلی قسم جس کا لینا اور دینا دونوں حرام ہیں یہ ہے کہ کسی ایسے منصب پر فائز ہونے کے لیے رشوت دے جس منصب کا یہ اہل نہ ہو، چونکہ غیر اہل کا کسی منصب پر فائز کرنا اور فائز ہونا دونوں ناجائز ہیں لہٰذا اس ناجائز کام کے لیے رشوت لینا اور دینا دونوں ناجائز اور حرام ہیں۔

(۲) دوسری قسم رشوت کی یہ ہے کہ کسی فیصلہ کرنے والے حاکم، قاضی، جج یا مجسٹریٹ کو کچھ رقم یا کوئی اور چیز اس لیے دی جائے کہ وہ اس کے حق میں فیصلہ کرے، یہ بھی طرفین کے لیے حرام ہے۔

(۳) رشوت کی تیسری قسم یہ ہے کہ کسی شخص کو کچھ رقم یا کوئی چیز اس لیے دی جائے کہ اس سے اپنا جائز کام کرایا جائے، لیکن اس میں بھی یہ شرط ہے کہ یہ کام جائز ہونے کے ساتھ ساتھ کسی دوسرے شخص کی حق تلفی کا سبب اور ذریعہ نہ ہو، لہٰذا ان شروط کے بعد رشوت دینے کی تو اجازت ہے لیکن رشوت لینا اس صورت میں بھی ناجائز اور حرام ہے۔

(۴) رشوت کی چوتھی قسم یہ ہے کہ کسی شخص کو کچھ رقم اس لیے دی جائے تاکہ اس کے شر اور فساد سے محفوظ رہا جا سکے۔ اپنی جان سے ظلم اور فساد کے دفع کرنے کے لیے کسی کو کچھ دینا تو جائز ہے لیکن لینا اس صورت میں بھی حرام ہے۔ (رد المحتار علی الدر المختار ج ۴ ص ۳۵۳، ۳۵۴)

جب ایک گواہ اور ایک حاکم یہ نظریہ قائم کرلے کہ مجھے کسی بھی مالدار سے کوئی سروکار نہیں، نہ وہ چائے پانی کے انتظار میں ہو اور نہ بخشش کی طمع اور لالچ میں، تو یہ ممکن ہی نہیں

کہ وہ کسی مالدار شخص کی وجہ سے اس سے کسی قسم کی رعایت کرے۔ اسلام میں تو آقا اور غلام، امیر اور غریب سب برابر ہیں۔

شرعی عدالت میں شاہ و گدا برابر ہیں

حضرت عمر رضی اللہ عنہ جہاں کہیں امیر اور غریب کے اس امتیازی سلوک کو دیکھتے تو اس سے منع فرماتے۔ اور یہی وجہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے ان تمام بے جا امتیازات کو مٹا کر شاہ و گدا، بلند و پست کو ایک سطح پر کھڑا کر دیا تھا جس کی ایک جھلک اس واقعہ میں موجود ہے کہ :۔

شام کا ایک نامور بادشاہ جبلہ غسانی مسلمان ہو گیا تھا، ایک دفعہ بیت اللہ کا طواف کرتے ہوئے اس کی چادر کا ایک کونہ ایک شخص کے پاؤں کے نیچے آ گیا، جبلہ نے غصہ میں آکر اس شخص کو تھپڑ مارا، اس شخص نے بھی برابر کا جواب دیا، جبلہ نے آکر حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے شکایت کی، حضرت عمرؓ نے فرمایا تم نے جیسا کیا ویسا پالیا۔

جبلہ نے جواب میں کہا کہ ہم تو وہ ہیں کہ اگر کوئی شخص ہم سے گستاخی سے پیش آئے تو وہ قتل کا سزاوار ہوتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہاں جاہلیت میں ایسا ہی تھا لیکن اسلام نے پست و بلند کو ایک کر دیا۔

جبلہ نے کہا کہ اگر اسلام ایسا مذہب ہے تو میں اس سے باز آتا ہوں لیکن حضرت عمرؓ نے اس کی کوئی پرواہ نہ کی۔ (تاریخ اسلام)

آج دنیا میں یہ نظارہ موجود ہے، معاشرہ مختلف قسم کی بے ضابطگیوں کا شکار ہے، امیر اور غریب ایک دوسرے کے مدمقابل بنے ہوئے ہیں۔ امیر اپنے آپ کو مال کی کثرت کی وجہ سے مختلف جرائم کا ارتکاب کرنا اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتا ہے، جرم کو معیوب نہیں سمجھتا، آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ اگر غور کیا جائے تو یقیناً یہ بات معلوم ہوگی کہ اُمراء کو صرف مال کی بہتات کی وجہ سے بے جا رعائتیں دی گئی ہیں، یہ اس کے نتائج اور اثرات ہیں جو معاشرہ کی تباہی کا سبب ہیں۔

قاضی عدالتوں کو کتاب و سنّت کا پابند کرانا ہوگا

۹ ر فروری ۱۹۸۳ء کو مجوزہ قاضی عدالتوں کے مسودہ پر عام بحث میں تقریر کرتے ہوئے آپ نے کہا :۔

مولانا سمیع الحق | نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم ، اما بعد !

جناب چیئرمین | جہاں تک قاضی کورٹس کے قیام کے سلسلہ میں حکومت کے اور جناب صدر پاکستان کے ارادوں اور عزائم کا تعلق ہے تو اس کی جتنی بھی تحسین کی جائے کم ہے۔ ایک اسلامی مملکت کا سب سے بڑا اور پہلا فریضہ اس ملک کے شہریوں کو عدل و انصاف آسانی سے مہیا کرنا ہوتا ہے، یہ مسلمانوں کی مدتوں سے ایک آرزو ہے، خاص کر ملکِ عزیز پاکستان کے شہریوں کی کہ یہاں انصاف سستا ہو جائے اس سلسلہ میں جو اصل مسودہ قانون ہے اور جو ہمارے سامنے ہے ایک تو اس کے بارے میں کچھ لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے کہ یہ شاید پہلے سے علماء اور اسلامی علوم پر عبور رکھنے والے حضرات کی نگاہ سے گذرا ہے، حالانکہ میرا خیال یہ ہے کہ یہ مسودہ اسلامی نظریاتی کونسل کو نہیں بھیجا گیا تھا اور نہ ہی اس پر اسلامی نظریاتی کونسل جو کہ ملک کے مختلف مکاتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے جید علماء پر مشتمل ادارہ ہے جس میں وکلاء بھی شامل ہیں، اُن سے کوئی استصواب رائے اس بارہ میں نہیں کیا گیا، دوسرا مرحلہ جو اصل مسودۂ قانون پر بنیادی توجہ کا تھا وہ یہ تھا کہ ہم قاضی کورٹس تو قائم کرتے ہیں جو بلاشبہ ایک نہایت مستحسن اقدام ہے، لیکن اصل مسودے میں یہ کہیں بھی واضح نہیں کیا گیا کہ یہ عدالتیں کن قوانین کے تحت فیصلے کریں گی؟ یہی مروّجہ قوانین، یہ فوجداری اور دیوانی ضابطے اور یہی پروسیجر اگر قائم رکھنا ہے تو اگر ہم قاضی کا نام جج رکھ دیں اور جج کا نام قاضی رکھ دیں اس سے تو عدالت اسلامی عدل و انصاف مہیّا نہ کر سکے گی اور نہ ہی عوام کو عدل و انصاف مل سکے گا۔ ہم اگر قاضی کو قاضی محمد احمد کہیں یا قاضی نکلسن کہیں یا قاضی ہر بندرائے کہیں، اس سے انصاف نہیں ملتا، یہاں اصل مسوّدۂ قانون میں یہ وضاحت ہونی چاہیئے تھی کہ ......

اخوندزادہ بہرہ ور سعید | پوائنٹ آف آرڈر، جناب والا ! یہ قاضی کی توہین ہے ان کو کہیں کہ اپنے الفاظ واپس لیں۔

مولانا سمیع الحق | جناب والا یہ قاضی کی توہین نہیں ہے۔

اخوندزادہ بہرہ ور سعید جناب والا! یہ قاضی محمد احمد، یا قاضی نکلسن یا قاضی ہر بندرائے، یہ قاضی کی توہین ہے، ان کو کہیں کہ یہ اپنے الفاظ واپس لیں، یہ قاضی کی توہین ہے۔

مولانا سمیع الحق کون سی توہین میں نے کی ہے؟

اخوندزادہ بہرہ ور سعید یہ قاضی نکلسن کیا ہوتا ہے؟

مولانا سمیع الحق آپ جسٹس نکلسن کہیں یا قاضی نکلسن کہیں بات ایک ہی ہے۔ اگر اس کے پاس قانون وہی ہوں جو موجودہ دیوانی یا فوجداری عدالتوں کے ہوتے ہیں یعنی انگریزی قانون ہو اور آپ اس کو علامہ نکلسن کہیں یا مولانا نکلسن کہیں یا جسٹس نکلسن کہیں تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہاں بنیادی بات سب سے پہلے یہی تھی کہ اصل مسودہ قانون میں یہ واضح ہونا چاہیے تھا کہ یہ تمام عدالتیں قرآن کے مطابق فیصلے کریں گی۔ یہاں متفرقات کے ضمن میں جو تعبیر کے عنوان سے کہا گیا ہے کہ اس سے آرڈیننس کے احکام کی تعبیر کرتے ہوئے قاضی عدالتیں قرآن پاک اور سنت رسولؐ میں مقرر کردہ اسلام کے احکام سے راہنمائی حاصل کریں گی۔ یہ قرآن اور سنت کے ساتھ ایک صریح مذاق ہے، راہنمائی کے لفظ سے قاضی عدالتوں کے قیام کے مقاصد کبھی حاصل نہیں ہو سکتے۔

سید معین الدین پوائنٹ آف آرڈر، جناب والا! THIS IS A MIS STATEMENT OF اس میں سیکشن نمبر ۵۳ اور ۶۴ جس میں یہ کہا گیا ہے کہ کوئی بات قرآن و سنت کے CLEARLY، خلاف نہیں ہو سکتی، دو سیکشن میں ایک نہیں دو سیکشن ہیں ۵۳ × ۶۴۔

اطلاقِ قوانین کے لیے راہنمائی نہیں پابندی لازمی ہے

مولانا سمیع الحق : ایک یاددہانی دے رہا ہوں، اسی کے متعلق کچھ عرض کر رہا ہوں۔ اس میں ایسی بات نہیں ہے۔ ابتداء میں یعنی مسودے کے آغاز میں جس قسم کے الفاظ ہیں اس میں یہی درج ہے اور یہاں بھی یہی ہے کہ عدالتیں راہنمائی حاصل کریں گی۔ اور آپ کو یہ بھی پتہ ہے، آپ قانون دان ہیں، وکلاء حضرات کو بھی پتہ ہے کہ اس سے کوئی قانون اسلامی قانون نہیں ہو سکتا جیسا کہ ہم تمام آئینوں میں ابتداء میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے بعد قرار دادِ مقاصد لکھ دیتے ہیں اسی طرح قرار دادِ مقاصد کی طرح یہ بھی ایک ابتدائیہ ہے، تو یہ ایک لازمی اور ضروری شرط ہے کہ تمام قوانین کا اطلاق جو ہے وہ قرآن و سنت کے مطابق ہوگا، اور کوئی طریقۂ کار دیوانی اور فوجداری ضوابط ہوں کہیں بھی قرآن و سنت کی مخالفت بالکل نہیں کی جائے گی۔ اصل قانون جس کو کہتے ہیں جب تک اُسے قرآن و سنت کے مطابق نہیں بنایا جائے گا اُس وقت تک

شرعی عدالتیں حق اور انصاف کے طریقہ پر نہیں بنائی جا سکتیں۔

اس لیے دوسری عرض یہ ہے کہ اصل مسودۂ قانون جس پر ہمارے وکلاء حضرات اور دوسرے دوستوں کے جو خدشات تھے اور میں سمجھتا ہوں کہ ان کے یہ خدشات بالکل بے جا ہیں، یہاں اسلامی نظامِ عدل کا نام لینے والوں نے کبھی سوچا بھی نہیں اور نہ ان کا یہ ارادہ ہے کہ یہاں عدالتوں میں وکلاء کی جگہ پر، مجسٹریٹوں کی جگہ پر علماء قبضہ کر لیں، مقصد ہمارا صرف یہ ہے کہ جب آپ اسلامی نظام اور اسلامی عدل و انصاف کا نعرہ بلند کرتے ہیں تو اس کے لیے آپ کو اسلامی قوانین جاری کرنا ہوں گے اور اس کے سمجھنے کی کوشش کرنا ہوگی اور اس کے مطابق کام کرنا ہوگا۔ اس کے بعد لاء کمیشن کے سامنے مسودہ قانون آیا اور لاء کمیشن کے بعد ہماری فاضل سلیکٹ کمیٹی نے جناب منٹو صاحب کی سرکردگی میں اس رپورٹ کے ساتھ جو کچھ کیا وہ بھی آپ حضرات بخوبی جانتے ہیں۔

تو اس پر میں ایک واقعہ عرض کرتا ہوں، غالباً مولانا رومؒ نے لکھا ہے کہ ایک شخص کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ میرے جسم پر بھی شیر کا نقشہ یا تصویر ہونی چاہیئے، تو وہ اس قسم کی چیزیں جسم پر بنانے والے ایک شخص کے پاس گیا اور اسے کہا کہ میرے جسم پر شیر کی شکل بنا دو، تو گودنے والے نے شیر کی شکل بنانے کی غرض سے جب اُسے سوئی چبھوئی تو اس شخص کو تکلیف ہوئی، وہ چیخا کہ یہ کیا بنا رہے ہو؟ اس نے کہا کہ شیر کی تصویر بنا رہا ہوں، اُس نے کہا کہ اس وقت کیا بنا رہے ہو؟ اُس نے کہا کہ مثال کے طور پر اس کے سینگ بنا رہا ہوں، مثال کے طور پر اُس نے کہا کہ ارے بھائی شیر بغیر سینگ کے بھی ہو سکتا ہے اس سینگ کو چھوڑیئے۔

جناب زیڈ اے سلہری | پوائنٹ آف آرڈر، جناب والا! شیر کے تو سینگ نہیں ہوتے یہ مثال ہی غلط دے رہے ہیں تو ان کی بات کو کیسے صحیح مان سکتے ہیں وہ بھی غلط ہی ہوگی، دیکھئے کہتے ہیں کہ شیر کے سینگ بنا رہا تھا۔

مولانا سمیع الحق | شیر یا کوئی دوسرا جانور، میں نے کہا ہے کہ مثال کے طور پر۔ بہر حال میں نے گدھے کا نام تو نہیں لیا، کیا تکلیف ہو گئی ان لوگوں کو، جیسے مثال کے طور پر کہتے ہیں کہ "گدھے کے سر سے سینگ غائب ہونا"، تو کیا واقعی گدھے کے سر پر سینگ ہوتے ہیں؟ بہر حال جب اُس نے دوبارہ سوئی چبھونی شروع کی تو اس شخص نے کہا کہ بھائی اب کیا بنا رہے ہو؟ اُس نے کہا کہ دُم بنا رہا ہوں، اِس نے کہا رہنے دو دُم کو، دُم کے بغیر بھی تو شیر ہو سکتا ہے۔ اور پھر جب اس نے تیسری بار سوئی چبھوئی تو اُسے پھر تکلیف ہوئی، کہنے لگا کہ اب کیا بنا رہے ہو؟ اُس نے

کہا کہ شیر کا سر بنا رہا ہوں، کہنے لگا کہ سر کو بھی چھوڑ دو، تو اُس نے سوئی وغیرہ پھینک دی اور کہا بھئی ایسا شیر تو ہم نے دنیا میں کہیں بھی نہیں دیکھا کہ جس کی نہ دُم ہو، نہ سر ہو، نہ پیر ہوں۔

تو، ہماری سلیکٹ کمیٹی نے بھی اس مسوّدہ کی ایک ایک دفعہ کو ایسا ہی مجروح اور فسخ کر کے پیش کیا ہے

جناب وائس چیئرمین | مولانا صرف ایک منٹ باقی ہے۔

مولانا سمیع الحق | اور آج یہ بڑھ چڑھ کر سلیکٹ کمیٹی کی تعریف کر رہے ہیں اور اس کی تائید کر رہے ہیں یہ بالکل شیر تو نہیں ایک ڈھانچہ ہے جس پر شیر کا صرف ٹھپہ لگے گا لیکن اس میں توانائی اور شجاعت نہیں ہوگی، تو یہاں ہر اس دفعہ میں ایسی ترامیم کی گئی ہیں جس سے عدل و انصاف مہیا کرنا اور بھی طویل ہو جائے گا۔

اخوندزادہ بہرہ ور سعید | جب وہ شیر کا صرف ڈھانچہ ہے تو یہ اس شیر سے ڈرتے کیوں ہیں؟

مولانا سمیع الحق | جناب ہم ڈرتے نہیں ہم اس شیر کو مکمل شیر انشاء اللہ بنا کر چھوڑیں گے۔

جناب وائس چیئرمین | تشریف رکھئے۔

جناب گرداری لال بھاٹیہ | پوائنٹ آف آرڈر، جناب والا! کیا انسانوں کے معاملہ میں جانوروں کی مثالیں دی جا سکتی ہیں؟

جناب وائس چیئرمین | آپ تشریف رکھیں۔

مولانا سمیع الحق | جناب والا! موجودہ جو مسودۂ قانون پیش کیا گیا ہے وہ اور بھی اسلامی عدل و انصاف کو دُور کر دے گا، ہمارے معزز رکن جناب عبیدالرحمٰن صاحب نے کہا تھا کہ ہمیں بڑی خوشی ہوئی ہے کہ اعلیٰ عدالتوں کی بالا دستی کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ تو اصل چکر وہی ہے کہ ایک عدالت کے بعد دوسری عدالت اور پھر اس کے بعد تیسری عدالت کے پاس جائے، جیسا کہ صدر صاحب نے ذکر کیا تھا کہ وہ کہیں پندرہویں صدی میں جا کر فیصلہ ہوگا۔ اس لیے خدا کے واسطے اس کے راستے میں رکاوٹیں نہ ڈالیے اور جو لوگ اس کے منتظر ہیں خدارا ان کے ساتھ تعاون کیجئے تاکہ ان کو عدل و انصاف مل سکے۔

جناب وائس چیئرمین | آپ مسوّدے کو اچھی طرح سے پڑھئے پھر سمجھ آجائے گی۔

مولانا سمیع الحق | جناب والا! ہم پڑھ چکے ہیں انشاء اللہ اس کی ایک ایک دفعہ کا کامیاب اپریشن کریں گے۔

کتاب
الشہادۃ

ومن اظلم ممن کتم

شهادة عنده من الله وما

الله بغافل عما تعملون۔

کتاب الشہادۃ

(گواہی کے احکام و مسائل)

سگے بھائی کے لیے گواہی دینا جائز ہے

سوال:۔ ایک شخص کی گواہی اپنے سگے بھائی کے حق میں قبول ہوسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ بھائیوں کی املاک چونکہ آپس میں مختلف ہوتی ہیں اس لیے ایک دوسرے کے لیے گواہی دینے میں تہمت لازم نہیں آتی، لہٰذا ایک بھائی کی گواہی دوسرے کے حق میں قبول ہوسکتی ہے۔

وتقبل شهادة الرجل لاخيه وعمه لانعدام التهمة لان الاملاك ومنافعها متباينة ولا بسوطة لبعضهم فى مال البعض۔ (الهداية ج۳ ص۱۶۱ كتاب الشهادة باب من يقبل شهادته الخ)

تاہم اگر ان کی املاک ایک ہوں تو پھر جس طرح شریک کی گواہی دوسرے شریک کے حق میں قبول نہیں ہوتی اسی طرح ایک بھائی کی گواہی دوسرے کے حق میں قبول نہیں ہوگی کیونکہ اس صورت میں یہ گواہی بعض وجوہ سے اپنی ذات کے لیے ہوگی۔

قال العلامة المرغينانیؒ: ولا شهادة الشريك لشريكه فيما هو من شركتهما لانه شهادة لنفسه من وجه لاشتراكهما۔ (الهداية ج۳ ص۱۶۱ كتاب الشهادة۔ باب من يقبل شهادته الخ) [1]

نابینا کی گواہی کی شرعی حیثیت

سوال:۔ نابینا شخص کی گواہی کی شرعی حیثیت کیا ہے اور کن امور میں اس کی شہادت قبول ہوگی؟

الجواب:۔ چونکہ شہادت (گواہی) کے اکثر امور کا تعلق معائنہ اور مشاہدہ سے ہوتا ہے

---

[1] قال العلامة طاهر بن عبد الرشيد البخاریؒ: ويقبل شهادة الاخ لاخيه من النسب وان كان ابوهما حيًا۔ (خلاصة الفتاوىٰ ج۴ ص۵۹ الفصل الثانى فى الشهادات۔ كتاب الشهادات)

ومِثلُهٗ فى الهندية ج۳ ص۴۷۵ الباب الرابع، الفصل الثالث فيمن لا تقبل شهادته

اور معائنہ کئے بغیر اس کا بیان کرنا ناممکن ہے ۔مثلاً اداۓ شہادت کے وقت اشارہ سے اس کی تمیز ہوتی ہو تو قوتِ بینائی کے بغیر ان میں تمیز ناممکن ہے اور بعض امور کا تعلق سماع سے ہوتا ہے لیکن مسموعات میں آپس میں خلط ملط اور ہم مثل ہونے کی وجہ سے اشتباہ لازم آتا ہے اور شہادت میں اشتباہ سے تحرز ضروری ہے' لہٰذا نابینا آدمی کی گواہی کسی حال میں درست نہیں ۔تاہم جس شہادت کا تعلق صرف سماع سے ہو مثلاً نکاح ،تو وہاں نابینا آدمی کی شہادت قابلِ قبول ہے۔

لماقال العلامة ابن عابدينؒ :ان الاداء یفتقر الی التمییز بالاشارة بین المشھود لہ والمشھود علیہ ولا یمیز الاعمیٰ الا بالنغمة وفیہ شبھة یمکن التحرز عنھا بجنس الشھود والنسبة لتمیز الغائب دون الحاضر وصار کالحدود والقصاص ۔

(رد المحتار ج ۵ ص۴۷۶ کتاب الشھادة -باب القبول وعدمہ) لہ

وعدہ معاف گواہ کی شرعی حیثیت

سوال :- وعدہ معاف گواہ کی گواہی کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کیا اس کی گواہی قبول ہوسکتی ہے یا نہیں ؟

الجواب :- وعدہ معاف گواہ کی گواہی شرعاً درست نہیں ، کیونکہ وعدہ معافی کی وجہ سے گواہی دینے والا خصم بن جاتا ہے اور اس گواہی سے اُسے فائدہ حاصل ہوتا ہے اور جس گواہی سے گواہی دینے والے کو فائدہ حاصل ہوتا ہو تو وہ گواہی قابلِ قبول نہیں ۔

لماقال الشیخ سلیم رستم بازؒ : یشترط ان لا یکون فی الشھادة دفع مغرم او جر مغنم یعنی ان لا تکون داعیة لدفع المضرة اوجلب المنفعة - (مجلة الاحکام -مادة ۱۷۰۰ ص۱۰۲۳ شروط فصل فی الشھادة الاساسیة) ۲ہ

لہ قال العلامة مرغینانیؒ :ان الاداء یفتقر الی التمیز بالاشارة بین المشھود لہ والمشھود علیہ ولایمیز الاعمیٰ الا بالنغمة وفیہ شبھة یمکن التحرز عنھا بجنس الشھود ۔

(الھدایة ج ۳ ص۱۵۹ کتاب الشھادة -باب من یقبل شھادتہ الخ)

وَمِثْلُہٗ فی بدائع الصنائع ج ۶ ص۲۶۸ کتاب الشھادة ، فصل فی الشرائط فی الاصل ۔

۲ہ قال العلامة الحصکفیؒ :ومن الشرائط عدم قرابة ولاد او زوجیة او عداوة دنیویة او دفع مغرم او جر مغنم - (الدر المختار علیٰ ھامش رد المحتار ج ۴ ص۴۱۱ کتاب الشھادة)

وَمِثْلُہٗ فی البزازیة علیٰ ھامش الھندیة ج ۵ ص۲۴۸ نوع فی الرجل متی تحل لہ الشھادة ۔

اُجرتی قاتل کی گواہی کی شرعی حیثیت

سوال:۔ ایسا شخص جو کہ اُجرتی قاتل ہو اور اپنے قاتل ہونے کا اعتراف بھی کر چکا ہو تو کیا اس کی گواہی کسی معاملہ میں قبول ہو سکتی ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ کسی کو بے گناہ قتل کرنا حرام اور کبیرہ گناہ ہے اس لیے اس حرام فعل کا مرتکب فاسق و فاجر ہے، خصوصاً جبکہ خود اس کا اعتراف بھی کر چکا ہو اور فاسق و فاجر کی گواہی شرعاً درست نہیں لہٰذا اجرتی قاتل کی گواہی شرعی لحاظ سے درست نہیں۔

لما قال العلامة الشیخ سلیم رستم باز ؒ: یشترط ان یکون الشاهد عدلاً۔

(شرح مجلة الاحکام - مادة ۱۷۰۵ ص۱۰۳۹ فصل فی الشهادة الاساسیة شروط) [1]

داڑھی منڈانے والے کی شہادت کا حکم

سوال:۔ داڑھی منڈانے یا ایک قبضہ سے کم داڑھی رکھنے والے کی گواہی کی شرعی حیثیت کیا ہے ؟

الجواب:۔ داڑھی منڈانا یا کترانا حرام ہے جو کہ موجبِ فسق ہے کیونکہ اس کی مشروعیت احادیث اور فقہاء کے اقوال کی روشنی میں وجوب کے درجہ کو پہنچ چکی ہے اس لیے اس فعلِ حرام کا مرتکب فاسق و فاجر ہے اور فاسق کی گواہی شرعاً درست نہیں۔

لما قال العلامة ابوبکر بن مسعود الکاسانی ؒ: ومنها العدالة لقبول الشهادة علی الاطلاق فانها لا تقبل علی الاطلاق دونها لقوله تعالیٰ: مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ وَالشَّاهِدُ المرضی هُوَ الشَّاهِدُ العدل۔ (بدائع الصنائع ج ۶ ص ۲۶۸ کتاب الشهادات فصل فی الشرائط فی الاصل)

لیکن موجودہ معاشرہ کے انحطاط کو مدنظر رکھتے ہوئے اگر داڑھی والا گواہ موجود نہ ہو اور حق تلفی کا اندیشہ ہو اور گواہی دینے والا داڑھی منڈا معتبر شخص ہو جس کے صدق پر قاضی کو اعتماد حاصل ہو تو پھر داڑھی منڈوانے کے باوجود اس کی گواہی قبول کی جا سکتی ہے۔

قال العلامة ابن عابدین ؒ: قال فی جامع الفتاوی واما شهادة الفاسق فان تحری القاضی

---

[1] قال العلامة ابوبکر بن مسعود الکاسانی ؒ: ومنها العدالة لقبول الشهادة علی الاطلاق فانها لا تقبل علی الاطلاق دونها۔ (بدائع الصنائع ج ۶ ص ۲۶۸ کتاب الشهادة، فصل فی الشرائط فی الاصل)

وَمِثْلُهُ فی الهدایة ج ۳ ص ۱۵۵ کتاب الشهادة۔

الصدق فی شہادتہ تقبل والا فلا ـــــ قال فی الفتاوی القاعدۃ ھذا اذا غلب علی ظنہ صدقہ وھو مما یحفظ درر اول کتاب القضاء وظاہر قولہ وھو مما یحفظ اعتمادہ۔ (رد المحتار ج۴ ص۴۱۴ کتاب الشہادۃ) [1]

قتل میں عورت کی گواہی کا حکم

سوال:۔ کیا قتل کے معاملہ میں عورت کی گواہی قبول ہو سکتی ہے یا نہیں، اور اس کی گواہی سے قاتل کو سزائے موت دینا درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ حدود کا نفاذ چونکہ یقینی امور پر ہوتا ہے جو کہ معمولی شبہ سے ساقط ہو جاتی ہیں، عورتوں کی گواہی میں بدلیت کے شبہ کا احتمال ہے، یہی وجہ ہے کہ عورتوں کی گواہی حدود کے نفاذ میں معتبر نہیں، لہٰذا عورت کی گواہی کی بنیاد پر قاتل کو قصاص میں سزائے موت دینا جائز نہیں۔

لما قال العلامۃ المرغینانیؒ: ولا یقبل فیہا شہادۃ النساء لحدیث الزہریؓ مضت السنۃ من لدن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والخلیفتین من بعدہ ان لا شہادۃ النساء فی الحدود والقصاص ولان فیہا شبہۃ البدلیۃ لقیامہا مقام شہادۃ الرجال فلا تقبل فیما یندرئ بالشبہات۔ (الہدایۃ ج۳ ص۱۵۳ کتاب الشہادۃ) [2]

دشمن کی گواہی کی شرعی حیثیت

سوال:۔ کیا ایک دشمن کی گواہی دوسرے دشمن کے خلاف قبول ہو سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ دشمنی عموماً باہمی ضرر رسانی اور ایک دوسرے کے خلاف معاندانہ رویہ اپنانے کا سبب بنتی ہے، اس لیے ایک دشمن اگر اپنے مخالف پر گواہی دے تو اس میں ضرر رسانی

---

[1] قال العلامۃ الشیخ سلیم رستم بازؒ: ویشترط ان یکون الشاہد عدلاً۔ (شرح مجلۃ الاحکام مادۃ ۱۷۰۵ ص۱۰۳۹ فصل فی شروط الشہادۃ الاسلامیۃ)
ومثلہٗ فی الہدایۃ ج۳ ص۱۵۵ کتاب الشہادۃ۔

[2] قال العلامۃ الکاسانیؒ: ومنہا الذکورۃ فی الشہادۃ بالحدود والقصاص فلا تقبل فیہا شہادۃ النساء۔ (بدائع الصنائع ج۶ ص۲۷۹ کتاب الشہادۃ)
ومثلہٗ فی شرح مجلۃ الاحکام للشیخ سلیم رستم باز اللبنانیؒ تحت المادۃ ۱۶۸۵ ص۱۰۰۳۔

کا احتمال موجود ہو کر شریعت کی رُو سے اس کی گواہی قبول نہیں کی جاسکتی اگرچہ یہ گواہ عادل ہی کیوں نہ ہو۔

قال العلامہ ابن عابدینؒ: ان شہادۃ العدو علی عدوہ لا تقبل وان کان عدلاً۔ (رد المحتار ج ۵ ص۴۸۰ کتاب الشہادات۔ باب القبول وعدمہ)[1]

گواہی کے لیے آمد و رفت کا خرچہ لینے کا حکم

سوال:۔ اگر کوئی شخص کسی معاملہ میں گواہی دینے کے لیے عدالت میں حاضر ہو اور حکومت اپنی طرف سے اس کو آمد ورفت کا خرچہ دینا چاہے تو کیا اس کے لیے خرچہ لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ کسی معاملہ میں گواہی دینا دراصل لوگوں کے حقوق کے تحفظ کا ایک اہم ذریعہ ہے اور ہر شخص کے حقوق کا تحفظ دوسرے پر فرض ہے تو شہادۃ دینا گویا اپنا فریضہ سرانجام دینا ہے، اس لیے اس پر اجرت کا مطالبہ کرنا اپنی ایک شرعی ذمہ داری پوری کرنے پر اجرت حاصل کرنا ہے لہٰذا اگر گواہان شہادت پر اجرت کا مطالبہ کریں تو اس صورت میں گواہی پر ذاتی منفعت کے حصول کا شائبہ لازم آتا ہے اور جس گواہی میں ذاتی منفعت کا شبہ ہو وہ شرعاً قبول نہیں لیکن شریعت نے اگر ایک طرف گواہوں کو اجرت لینے سے روکا ہے تو دوسری طرف مشہود لہ کو گواہوں کے اعزاز و اکرام کا درس بھی دیا ہے اس لیے اگر گواہوں کو آمد و رفت وغیرہ کا مسئلہ درپیش ہو اور مشہود لہٗ ان کو آمد و رفت کا خرچہ دینا چاہے یا ان کے لیے اپنی خوشی سے کھانے پینے کا بندوبست کرے تو گواہوں کو خرچہ وغیرہ لینا جائز ہے، اس لیے اگر حکومت قانون کے موافق خرچہ دینا چاہے تو اس کا لینا جائز ہے لیکن جو پیسے خرچہ سے زائد ہوں وہ حکومت کو واپس کرے۔

لما قال العلامۃ ابن نجیمؒ: لو وضع للشہود طعاماً فاکلوا ان کان مہیئاً من قبل ذلک تقبل وان صنعہ لاجلھم لا تقبل وعن محمد لا تقبل فیہما وعن ابی یوسف تقبل فیہما

---

[1] قال العلامۃ طاہر بن عبد الرشید البخاریؒ: ولا یجوز شہادۃ علی الرجل اذا کان بینہما عداوۃ یعنی من امور الدنیا فان کان من امور الدین لا تقبل۔
(خلاصۃ الفتاوی ج۴ ص۶۰ الفصل الثانی فی الشہادات۔
ومثلہٗ فی شرح مجلۃ الاحکام للشیخ سلیم رستم بازؒ، مادۃ ۱۷۰۲ ص۱۰۳۴۔

العادة الجارية باطعام من حل محل الانسان ممن يعز عليه شاهدا الا.......... وجزم فی الملتقط بالقبول مطلقاً وفی شرح منظومة ابن وهبان للمصنف الفتوی علی قول ابی یوسفؒ

(البحر الرائق ج ۷ ص۵۵ کتاب الشهادة) ؎۱

قبضہ اور ملکیت میں شہادت کا حکم

سوال:۔ ایک شخص کی زمین سے نہر گذرتی ہے اور دوسرا شخص اس نہر سے اپنی زمین کو مدتوں تک سیراب کرتا رہا، اب دونوں نے اس نہر پر ملکیت کا دعویٰ کیا ہے، مالکِ زمین کا کہنا ہے کہ چونکہ یہ نہر میری زمین سے گذرتی ہے اس لیے یہ میری ملک ہے جبکہ دوسرا شخص اس نہر سے استفادہ کی وجہ سے ملکیت کا دعویدار ہے، اگر دونوں گواہ پیش کریں تو کس کے گواہوں کو اعتبار دیا جائے گا؟

الجواب:۔ متنازع فیہ مقدار اگر معروف ومشہور نہ ہو تو اس کی حدود بیان کرنا ضروری ہے اور اگر معروف ومشہور ہو تو پھر حدود بیان کرنا ضروری نہیں۔ فقہاء کرام کی صریح عبارات کے مطابق صحتِ دعویٰ کے بعد طلبِ بیّنہ وغیرہ ہوگا۔ صورتِ مسئولہ میں بظاہر دونوں ملک اور ید کا دعویٰ کرتے ہیں۔ سب سے پہلے دونوں ید کو ثابت کریں اگر دونوں کا ید ثابت ہو جائے تو پھر ملک پر گواہ طلب کیے جائیں گے، تو ان دونوں میں سے جو بھی اپنے ملک پر گواہ قائم کرے تو فیصلہ اس کے حق میں ہوگا اور اگر دونوں گواہ قائم کریں تو پھر مُدعیٰ دونوں میں تقسیم کیا جائے گا اور نہر دونوں کے درمیان مشترک رہے گی کوئی ایک فریق کسی دوسرے کو انتفاع سے منع نہیں کر سکتا ہے۔

لما قال العلامة المرغینانیؒ: واذا ادعی الرجلان ارضاً یعنی یدعی کل واحد منهما انها فی یده لم یقض انها فی ید واحد منهما حتی یقیما البینة انها فی ایدیهما لان الید فیها

؎۱ قال العلامة خیر الدین الرملیؒ: (سئل) فیما اذا طلبت الشهود الشهادة فی مکان بعید مسافة یومین احتیج الی الرکوب فادی المدعی للشاهدین اجرة دابتهما هل تسقط شهادتهما بذلك ام لا، اجاب لا تسقط شهادتهما بذلك کما جزم به فی الملتقط۔

(الفتاوی الخیریة علی هامش تنقیح الحامدیة جلد ۲ ص۴۱ کتاب الشهادة)

ومثله فی خلاصة الفتاوی ج۴ ص۴۹ کتاب الشهادة۔

غیر مشاهدۃ لتعذر احضارها وما غاب عن علم القاضی فالبینۃ تثبتہ وان اقام احدهما البینۃ جعلت فی یدہ لقیام الحجۃ لان الید حق مقصود وان اقاما البینۃ جعلت فی ایدیهما لما بینا فلا تستحق لاحد هما من غیر حجۃ۔ (الهدایۃ ج۳ ص۲۲۴ کتاب الدعوی فصل فی التنازع بالایدی) [1]

شہادت غیر قابض کی قبول ہوگی

سوال:۔ کسی شخص کے زیر تصرف زمین پر دوسرے شخص نے ملکیت کا دعویٰ کیا، اب ان دونوں میں سے ہر ایک یہ دعویٰ کرتا ہے کہ یہ زمین مجھے میراث میں ملی ہے جبکہ دونوں کے پاس گواہ بھی موجود ہیں، ازروئے شریعت ان دونوں میں کس کے گواہ مقدم ہوں گے؟

الجواب:۔ زمین جس شخص کے قبضہ میں ہے وہ ذوالید ہے اور دوسرا شخص جو ملکیت کا دعویٰ کرتا ہے خارج ہے لہٰذا صورتِ مذکورہ میں اگر دونوں کے پاس ملکیت کے تاریخ کا ٹھوس ثبوت موجود نہ ہو تو عام معاملات کی طرح خارج کے گواہ ذوالید پر مقدم ہوں گے، ذوالید کے گواہوں کو اس وقت ترجیح دی جائے گی جب دونوں کے پاس ملکیت کی تاریخ کا ثبوت موجود ہو، اور اگر ذوالید کی تاریخ خارج کی تاریخ سے اسبق ہو تو اس وقت ذوالید کے گواہوں کو ترجیح دی جائے گی، اور اگر دونوں میں سے صرف ایک کے پاس تاریخ کا ثبوت موجود ہو تو اس صورت میں بالاجماع خارج کے گواہوں کو ذوالید پر ترجیح دی جائے گی اور فیصلہ اس کے گواہوں پر کیا جائے گا۔

لما قال العلامۃ طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ: ولو کان فی ید احدهما فهو للخارج الا اذا کان تاریخ ذی الید اسبق فهو اولیٰ عند ابی حنیفۃؒ وابی یوسفؒ وعند محمدؒ یقضی بہ للخارج لانہ لا عبرۃ للوقت فی المیراث عندہ وان ارخ

---

[1] قال العلامۃ فخر الدین القاضی خانؒ: فان اقام احدهما البینۃ انها فی یدیہ یقضی لہٗ بالید ویصیر هو مدعیٰ علیہ والآخر مدعیاً وان قامت البینۃ لکل واحد منهما فان القاضی یجعل الدار فی یدهما لانهما تساویا فی اثبات الید۔ (الفتاویٰ قاضی خان علیٰ هامش الهندیۃ ج۲ ص۳۹۱ فصل فی دعوی الدور والاراضی)

ومثلہٗ فی شرح مجلۃ الاحکام للشیخ سلیم رستم باز، المادۃ ۱۷۵۵ ص۱۱۱۰۔

احدهما ولم یورخ الآخر فهو للخارج بالاجماع ۔ (خلاصة الفتاوٰی ج ۴ ص۱۱۳ کتاب الدعوٰی الفصل الثالث عشر فی العین یتنازع فیها اثنان) [۱]

زیرِ کاشت زمین پر ملکیت کا دعوٰی کرنے میں گواہ خارج کے مقدم ہوں گے

سوال :- ایک شخص ایک زمین بطورِ کاشت کھاتا رہا، ایک دوسرے شخص نے دعوٰی کیا کہ یہ زمین میری ہے، اس نے جواب میں کہا کہ یہ تو پٹھانوں کا دفتر ہے، یہ کہنے سے اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ زمین نہ میری ہے نہ تیری، تو اس صورت میں گواہ کس کے معتبر ہوں گے ؟

الجواب :- اگر کاشتکار کے اس کہنے سے کہ "یہ زمین پٹھانوں کا دفتر ہے"، مطلب یہ ہو کہ زمین مجھے پٹھانوں نے دی ہے اور میری ملکیت ہے تو اس صورت میں دوسرے شخص کا دعوٰی صحیح ہے اور گواہ اس کے معتبر ہوں گے کیونکہ یہ خارج ہے اور ملک مطلق کا دعوٰی کرتا ہے، اور فقہاء کی تصریح کے مطابق ملک مطلق کے مطالبہ میں گواہ خارج کے مقدم ہوں گے اور اگر اس کے کہنے کا مطلب یہ ہو کہ یہ زمین پٹھانوں نے مجھے صرف کاشت کے لیے دی ہے اور میری ملکیت نہیں تو اس صورت میں کاشتکار خصم نہیں بن سکتا اور مدعی ان لوگوں پر گواہ پیش کرے جس کی اصل ملکیت ہو اور گواہ بہر حال اس کے معتبر ہوں گے کیونکہ خارج ہے۔

لما قال الشیخ سلیم رستم باز: بینة الخارج اولٰی فی دعوی الملک المطلق الذی لم یبین فیها تاریخ ۔ (شرح مجلة الاحکام، المادة ۱۷۵۷ ص۱۱۱۶ فصل فی ترجیح البینات) [۲]

---

[۱] قال العلامة ابن قاضی سماوةؒ: واذا کان العین فی ید احدهما ولم یورخا او ارخا سواء یقضی للخارج وان ارخا واحدهما اسبق فهو لاسبقهما وعند محمد للخارج لانه لاعبرة للتاریخ هنا وان ارخ احدهما لا الأخر فهو للخارج لاجماعًا ۔ (جامع الفصولین ج ۱ ص۷۷ الفصل الثامن فی دعوی الخارج مع ذی الید)

وَمِثْلُهٗ فی رد المحتار ج ۴ ص۴۸۶ باب دعوی الرجلین ۔

[۲] قال العلامة التمرتاشیؒ: تقدم حجة خارج فی ملک الخارج ۔

(الدر المختار علی هامش رد المحتار ج ۴ ص۴۸۶ باب دعوی الرجلین)

وَمِثْلُهٗ فی بدائع الصنائع ج ۶ ص۲۳۲ کتاب الدعوٰی ۔ فصل حکم تعارض الدعوتین مع تعارض البینتین ۔

نکاح کی مجلس میں بغیر حاضر ہوئے نکاح کی گواہی دینا جائز ہے

سوال :- جو لوگ نکاح کی مجلس میں حاضر نہ ہوں اور ان کو محض خبر سے نکاح کا پتہ چلا ہو اور وہ عقدِ نکاح کے بارے میں گواہی دینا چاہیں تو کیا ان کی گواہی قبول ہو سکتی ہے یا نہیں ؟

الجواب :- بعض احکامات کا دارومدار چونکہ گواہی پر ہے اس میں ذرہ برابر بھی ردوبدل آنے سے احکامات میں تبدیلی آجاتی ہے، اس لیے شریعت میں شہادت کو بڑی اہمیت حاصل ہے، شریعت نے اس کی حفاظت کے لیے بڑی احتیاطی تدابیر اختیار کی ہیں اور اس کو قبول کرنے کے لیے بہت سے شرائط عائد کیے ہیں، ان شرائط میں ایک یہ بھی ہے کہ گواہ جس معاملہ میں گواہی دینا چاہے اس کی پوری نوعیت اس کے سامنے ہو اور یہ نوعیت تب پوری طرح واضح ہوتی ہے جب گواہ خود موجود ہو، اس لیے شہادت میں شریعت نے دیکھنے اور حاضر ہونے کو شرط قرار دیا ہے لیکن بعض ایسے امور جو کہ شہرت سے متعلق ہو کر چشم دید گواہی دینا اس میں مشکل ہو اصل شرط سے مستثنیٰ قرار دیئے ہیں، اگر ان امور کی اطلاع معتمد ذرائع سے حاصل ہو تو ان میں گواہی دینا جائز ہے، ان ہی امور میں سے ایک نکاح بھی ہے لہٰذا اگر کوئی عقدِ نکاح کے وقت مجلس میں موجود نہ ہو اور اس کو معتمد ذرائع سے اس کا علم ہو جائے تو وہ شخص اگر اس پر گواہی دینا چاہے تو اس کی گواہی قبول کی جائے گی۔

لما قال العلامة المرغيناني ؒ: ولا يجوز للشاهد ان يشهد بشئ لم يعاينه الا النسب والموت والنكاح والدخول - (الهداية ج۳ ص۱۵۸ كتاب الشهادة ـ فصل من يقبل شهادته الخ) [1]

اثباتِ زیادتی کی وجہ سے خارج کے گواہوں کا حکم

سوال :- ایک شخص عرصۂ دراز تک زمین کے ایک ٹکڑے کی پیداوار

---

[1] قال العلامة ابن قاضي سماوةؒ : شهدا بنسب اونكاح وقالا سمعناه من قوم لا يتصور اجتماعهم على الكذب لا تقبل وقيل تقبل وفي (عده) اشادة الى ان القبول اصح على ما يأتي ـ (جامع الفصولين ج۱ ص۱۲۴ الفصل الثاني عشرة فيما تسمع فيه الشهادة بلا فصل)

وَمِثْلُهٗ في شرح المجلة للعلامة سليم رستم باز تحت المادة ۱۶۸۸ ص۱۰۲۷ ـ

کھاتا رہا، اس پر تعمیر بھی کرائی اور درخت بھی لگوائے، اب ایک دوسرے شخص نے یہ دعویٰ کیا ہے
کہ یہ زمین میں نے اس کو بطور امانت دی تھی اور اس نے مجھے ۹۰۰ روپے قرض اس شرط پر دیئے
تھے کہ جب وہ اس زمین سے ۹۰۰ روپے کے برابر پیداوار حاصل کرلے گا تو یہ زمین مجھے واپس کردے
گا، لیکن کاشتکار اب اس سے انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ زمین اس نے مجھے بیع قطعی پر دی تھی،
تو اس صورت میں گواہ کس کے مقدم ہوں گے؟

الجواب:۔ مذکورہ صورت میں کاشتکار جو کہ ذوالید ہے اور شراء کا دعویٰ کرتا ہے اور
ذوالید اگر ملک مطلق کے دعویٰ کی صورت میں شراء کا دعویٰ کرے تو اس کے گواہ مقدم کیے جائیں گے۔

لما قال العلامة المرغینانیؒ: وان اقام الخارج البینة علی الملك المطلق وصاحب الید
البینة علی الشراء منه کان صاحب الید اولیٰ۔ (الهدایة ج ۳ ص ۲۲۱ کتاب الدعویٰ باب ما یدعیه الرجلان)

لیکن دوسرا شخص چونکہ خارج ہے فعلِ زائد یعنی ودیعت کا دعویٰ کرتا ہے تو اس سے یہ معلوم
ہوتا ہے کہ دونوں کے ہاں اصل ملکیت خارج کے لیے[1] مسلّم ہے اور خارج چونکہ اثباتِ زیادتی کا
دعویٰ کرتا ہے، لہٰذا اگر یہ دوسرا شخص ودیعت پر گواہ قائم کرے تو اس کے گواہ مقدم کیے
جائیں گے۔

لما قال العلامة ابن نجیمؒ: اذ لو ادعی الخارج الفعل علی ذی الید کالغصب والاجارة
والعاریة فبینة الخارج اولیٰ۔ (البحر الرائق ج ۷ ص ۲۴۴ باب دعوی الرجلین)

زیادت کا دعویٰ کرنے والے کے گواہ مقدم ہوں گے

سوال:۔ دو آدمیوں نے ایک قومی مشترک زمین پر قبضہ کیا ہوا ہے
اور دونوں اس میں مالکانہ تصرفات کرتے رہے ہیں، اب ایک نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہ
ساری زمین میری ہے، مجھے وراثت میں ملی ہے، جبکہ دوسرے فریق کا دعویٰ ہے کہ یہ زمین

---

[1] قال العلامة الحصکفی رحمه الله: الا اذا ادعی الخارج علیه فعلا کغصب او ودیعة او اجارة ونحوها
فی روایة دررا وکان سببا یتکرر کبناء وغرس ونسج خز وزرع بر ونحوه او اشکل علی اهل
الخبرة فهو للخارج لانه الاصل وانما عدلنا عنه بحدیث النتاج۔
(الدر المختار علی هامش رد المحتار ج ۴ ص ۴۹۰ باب دعوی الرجلین)
ومثله فی شرح مجلة الاحکام، المادة ۱۷۵۸ ص ۱۱۱۸ کتاب الدعویٰ۔

میرے اور تمہارے درمیان مشترکہ ہے کیونکہ دونوں کا اس پر قبضہ ہے، ان دونوں میں کس کے گواہ مقدم ہوں گے؟

الجواب:۔ مذکورہ صورت میں جو شخص محض زمین آباد کرنے کی وجہ سے ملکیت کا دعویٰ کرتا ہے تو زمین آباد کرنا چونکہ سبب ملک نہیں اس لیے اس کا دعویٰ ناقابلِ سماعت ہے تاہم اگر یہ زمین موات ثابت ہو جائے جس میں آباد کرنے سے ملکیت ثابت ہو سکتی ہے تو پھر دونوں کا دعویٰ قابل سماع ہے لیکن صورتِ مسئولہ میں دونوں فریقین کے تصرفات اور دعویٰ کو مدِنظر رکھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ مدعی بعض نے زمین کے اس حصہ سے کوئی سروکار نہیں رکھا جس میں اس کا خصم تصرف کر رہا ہے بلکہ مدعی کل تصرفات کے ہوتے ہوئے مدعی بعض کے حصہ سے تصرفات میں خارجی اور اجنبی ہے، اس لیے اگر دونوں گواہ پیش کریں تو تمام جائیداد کا فیصلہ مدعی کل کے حق میں ہوگا کیونکہ آدھی جائیداد اس کو کسی کے دعویٰ نہ کرنے سے رہ گئی اور بقیہ جائیداد میں مُدعی کل خارج متصور ہو کر ذوالید کے مقابلہ میں خارج کے گواہوں کو اعتبار دیا جائے گا۔

لما قال الشیخ سلیم رستم بن باز رحؒ : اذا ادعی اثنان مالاً احدھما بالاستقلال والآخر بالاشتراك وكل منهما متصرف فيه اى ذو يد عليه فبينة الاستقلال اولیٰ يعنی اذا اراد كلاهما اقامة البينة ترجح بينة الذی ادعی الاشتراك۔ [۱]
(شرح مجلة الاحکام ، المادة ۱۷۵۷ ص ۱۱۱۲ فصل فی ترجیح البینات)

گواہوں کی عدم موجودگی میں محض شک کی وجہ سے سزائے موت دینے کا حکم

سوال:۔ کیا حدود کے جاری کرنے کیلئے گواہوں کا ہونا ضروری ہے یا محض شک کی وجہ سے کسی مجرم کو سزائے موت دینا درست ہے؟

الجواب:۔ شریعت مطہرہ نے لوگوں کے مال وجان اور عزت و آبرو کے تحفظ

---

[۱] قال العلامة الكاسانی رحمہ اللہ:۔ فالاصل فيه ان البينة المظهرة للزيادة اولیٰ ۔ (بدائع الصنائع ج ۶ ص ۲۴۱ كتاب الدعوى۔ فصل حكم تعارض الدعوتين۔ الخ)
ومثلهٗ فی الهداية ج ۳ ص ۲۰۸ باب التحالف۔

کا تہیہ کر رکھا ہے اور ہر حال میں ان کی عزت و آبرو اور مال و جان کی حفاظت ہر چیز پر مقدم ہے کیونکہ ان چیزوں کے تحفظ کے بغیر سکون و راحت کی زندگی کا تصور بھی محال ہے، ان امور کے تحفظ اور حقوق اللہ کے احیاء کے لیے حدود و قصاص وغیرہ کا اجراء عدیم المثال نظام ہے اس لیے اگر کسی کے وجود یا افعالِ بد سے دوسروں کے مال و جان وغیرہ کو خطرہ ہو تو جرم کے ثابت ہو جانے پر مجرم کو حدود و قصاص کے تحت سزا دی جا سکتی ہے لیکن اگر جرم کے اثبات میں معمولی سی غفلت بھی برتی جائے تو اس میں کسی بے گناہ کی جان یا اس کی عزت و آبرو کے ضیاع کا خطرہ ہے اس لیے جرم کے اثبات کے لیے شریعت نے شہادت میں سختی سے کام لیا ہے، یہاں تک کہ شبہ کے احتمال کی وجہ سے عورتوں کی گواہی غیر معتبر قرار دی ہے اس لیے صحیح گواہوں کے بغیر محض شک و شبہ کی بناء پر کسی کو سزائے موت دینا ناجائز ہے۔

کما فی الحدیث: عن عائشۃ قالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ادرؤا الحدود عن المسلمین ما استطعتم فان کان له مخرج فخلوا سبیله فان الامام ان یخطئ فی العفو خیر من ان یخطئ فی العقوبۃ۔ رواہ الترمذی۔ (مشکوٰۃ ج۲ ص۳۱۱ کتاب الحدود الفصل الثانی) [1]

شرکاء کاروبار کا ایک دوسرے کیلئے گواہی دینا

سوال:۔ دو آدمی ایک کاروبار میں شریک ہیں کیا وہ کاروبار کے معاملہ میں ایک دوسرے کے لیے گواہ بن سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب: اسلامی قانونِ شہادت کی رو سے ایک شریک دوسرے شریک کیلئے طرفداری کی تہمت کی وجہ سے گواہی نہیں دے سکتا اور نہ ان کی گواہی ایک دوسرے کے حق میں مقبول ہوگی۔

لما فی مجلۃ الحکام: وکذلک لا تقبل شہادۃ الشرکاء لبعضہم فی مال الشرکۃ ولا تقبل شہادۃ الکفیل بالمال للاصیل علی کون المکفول بہ۔ الخ (درر الحکام علی مجلۃ الاحکام ج۴ ص۳۹۳ کتاب الشہادۃ) [2]

---

[1] قال العلامۃ الکاسانی رحمہ اللہ: لان الحدود والقصاص مبناہما علی الدرء والاسقاط بالشبہات۔ (بدائع الصنائع ج۶ ص۲۷۹ کتاب الشہادات۔ فصل واما الشرائط فی الاصل الخ)

ومثلہ فی الہدایۃ ج۲ ص۵۰۷ کتاب الحدود۔

[2] قال العلامۃ علی حیدر: لا تقبل شہادۃ الشرکاء لبعضہم فی مال الشرکۃ۔ (درر الحکام علی مجلۃ الاحکام ج۴ ص۳۹۵)

باپ کا بیٹے کے لیے گواہی دینا

سوال :۔ جناب مفتی صاحب! اگر باپ عدالت میں جج کے سامنے بیٹے کے حق میں یہ گواہی دے کہ میرے بیٹے نے فلاں شخص سے دعویٰ میں درج شدہ اراضی قطعی بیع سے خریدی ہے، تو کیا باپ کی یہ گواہی بیٹے کے حق میں مقبول ہوگی یا نہیں؟ اور عدالت اس گواہی کی بنیاد پر فیصلہ کرنے کی مجاز ہے یا نہیں؟

الجواب :۔ اسلامی قانونِ شہادت کی رُو سے باپ بیٹے یا بیٹا باپ کیلئے گواہی نہیں دے سکتا اس لیے کہ اس میں طرفداری اور قرابتداری کی تہمت ہے کہ ہو سکتا ہے باپ بیٹے کے حق میں بلا جواز جھوٹی گواہی دے رہا ہو، تو اس تہمت کی وجہ سے اسلام اصول و فروع کی گواہی ایک دوسرے کے حق میں قبول نہیں کرتا اسلئے عدالت باپ کی گواہی کی بنیاد پر بیٹے کے حق میں فیصلہ دینے کی شرعاً مجاز نہیں۔

لما قال العلامة المرغینانیؒ: ولا شہادۃ الوالد لولدہٖ وولد ولدہٖ ولا شہادۃ الولد لابویہ ولا جدادہ والاصل فیہ قولہ علیہ السلام لا یقبل شہادۃ الولد لوالدہٖ ولا الوالد لولدہٖ ولا المرأۃ لزوجہا ولا الزوج لامرأتہ الخ (الھدایۃ ج۳ ص۱۶۰ کتاب الشہادۃ) [1]

ہیجڑے کی گواہی کا حکم

سوال :۔ کیا ہیجڑے کی گواہی شرعاً قبول کی جائے گی یا نہیں ؟ جبکہ وہ شادی بیاہ اور دیگر تقریبات میں ناچ گانے کا کام بھی کرتا ہو، قرآن وسنت کی روشنی میں جواب عنایت فرما کر مشکور فرمائیں ؟

الجواب :۔ جو ہیجڑا عورتوں کے ساتھ مشابہت رکھتا ہو، شادی بیاہ اور دیگر تقریبات میں ناچتا گاتا بھی ہو تو اس کی گواہی اس کے فسق کی وجہ سے شرعاً مقبول نہیں۔ تاہم جس کے اعضاء اور اداء و انداز میں نرمی ہو اور وہ فسق و فجور کا ارتکاب نہیں کرتا ہو تو وہ صرف نرمی کی بناء پر مردود الشہادت نہیں ہوتا بلکہ شرعاً اس کی گواہی کو قبول کیا جائے گا۔

لما قال العلامۃ وھبۃ الزحیلی: وقال فقہاء الحنفیۃ: لا تقبل شہادۃ مخنث لفسقہ وھو الذی یفعل الردی و یؤتی کالنساء اما الذی فی کلامہ

---

[1] وفی مجلۃ الاحکام: لا تقبل شہادۃ الاصل للفرع والفرع للاصل یعنی لا تقبل شہادۃ الآباء والاجداد والامہات والجدات لاولادھم واحفادھم وبالعکس اعنی شہادۃ الاولاد والاحفاد للآباء والاجداد والامہات والجدات۔ الخ (درر الحکام علی مجلۃ الحکام ج۴ ص۳۹۳ کتاب الشہادۃ۔ المادۃ ۱۷۰۰)۔

وفی اعضائہ تکسر فھو مقبول الشھادۃ۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ ج۶ ص۵۶۶ المطلب الثالث، شروط اداء الشھادۃ) [1]

تائب فاسق کی گواہی کا حکم

سوال:۔ ایک آدمی پہلے جُوا، چوری، زنا وغیرہ قبیح افعال کا ارتکاب کرتا تھا لیکن اب اس نے تمام تمام برائیوں سے توبہ کر لی ہے، تبلیغ میں بھی وقت لگانا شروع کر دیا ہے، صوم وصلوٰۃ کا پابند ہے۔ اب اگر وہ کسی مجرم پر گواہی دے تو کیا شرعاً اس شخص کی گواہی قبول کی جائے گی یا نہیں؟

الجواب:۔ فقہاء امت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ فاسق وفاجر جب اپنے فسق وفجور سے توبہ کرکے صراطِ مستقیم پر آجائے تو وہ شہادت دینے کا شرعاً اہل ہے۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں موصوف کسی بھی مجرم پر گواہی دینے کا اہل ہے اس کو سابقہ جرائم کی وجہ سے گواہی دینے سے نااہل قرار نہیں دیا جا سکتا۔

لما قال العلامۃ وھبۃ الزحیلی: واتفق الفقہاء علیٰ أن الفاسق اذا تاب من فسقہ تقبل شھادتہ واستثنی الحنفیۃ المحدود فی القذف فانہ لاتقبل شھادتہ عندھم وان تاب۔

(الفقہ الاسلامی وادلتہ ج۶ ص۵۶۷ المطلب الثالث فی شروط اداء الشھادۃ) [2]

بینائی سے محروم شخص کی گواہی کا حکم

سوال:۔ ایک شخص کسی کو قتل کر رہا تھا اور دو آدمیوں نے اسے عین قتل کرتے ہوئے دیکھ لیا، جب قاتل کے خلاف تھانے میں ایف آئی آر درج کرائی گئی تو اُس نے موقعہ کے ان گواہوں میں سے ایک کو قتل کر دیا اور دوسرے کو اغوا کرکے اس پر اتنا تشدد کیا کہ اُس کی بینائی ختم ہوگئی

---

[1] قال العلامۃ الحصکفی رحمہ اللہ: (ولا تقبل شھادۃ) مخنث بالفتح من یفعل الردی ویؤتی وأما بالکسر فالمتکسر المتلین فی اعضائہ وکلامہ خلقۃ فتقبل۔ (الدرالمختار علیٰ صدر ردالمحتار جلد۵ ص۴۷۹ کتاب الشھادۃ۔ باب قبول الشھادۃ وعدمہ)

[2] قال العلامۃ الحصکفی رحمہ اللہ: الفاسق اذا تاب تقبل شھادتہ الا المحدود بقذف۔ (الدرالمختار علیٰ صدر ردالمحتار جلد۵ ص۴۷۷ کتاب الشھادۃ۔ باب قبول الشھادۃ وعدمہ)

اب وہ قاتل گرفتار ہوگیا ہے اور عدالت میں اس پر مقدمہ چل رہا ہے تو دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ قاتل کے تشدد سے بینائی سے محروم ہو جانے والا شخص عدالت میں اُس قاتل کے خلاف گواہ بن سکتا ہے یا نہیں؟ جبکہ اس نے خود قاتل کو قتل کرتے ہوئے دیکھا تھا؟

الجواب:۔ حنفیہ کثر اللہ سوادہم کے ہاں اداءِ شہادت کے لیے چند شرائط کا خیال رکھنا ضروری ہے اور بدون ان شرائط کے گواہ اداءِ شہادت کا اہل نہیں ہو سکتا۔ ان شرائط میں عقل، بلوغ اور اسلام وغیرہ کے ساتھ ساتھ گواہ کا بینا ہونا بھی ضروری ہے، صورتِ مسئولہ کے مطابق گواہ اداءِ شہادت کے وقت چونکہ بینائی کی نعمت سے محروم ہے اس لیے وہ حنفیہ کے نزدیک اداءِ شہادت کا اہل نہیں۔

لما قال العلامة الشیخ وهبة الزحیلی: البصر: یشترط عند ابی حنیفةؒ و محمدؒ والشافعیة ان یکون الشاهد مبصراً فلا تقبل شهادة الاعمی لانه لابد من معرفة المشهود له والاشارة الیه عند الشهادة ولا یمیز الاعمی بین الناس الا بنغمة الصوت وفیه شبهة لان الاصوات تتشابه وتشدد الحنفیة فمنعوا قبول شهادة الاعمی وان کان بصیراً عند تحمل الشهادة۔ (الفقه الاسلامی وادلته، جلد ۶ ص۵۶۴ المطلب الثالث شروط اداء الشهادة) [1]

قوتِ گویائی سے محروم شخص (گونگے) کی شہادت کا حکم

سوال:۔ ایک آدمی جو کہ بات چیت کرنے کی نعمت سے محروم (گونگا) ہے، اگر وہ خود کسی شخص کو کوئی جرم کرتے ہوئے دیکھے اور اس کی آواز کو پہچانتا بھی ہو، تو کیا یہ شخص اس مجرم کے خلاف عدالت میں اشارہ کے ساتھ گواہی دے سکتا ہے یا نہیں؟ اور عدالت اس گواہی کے مطابق مجرم کو سزا وغیرہ دینے کی شرعاً مجاز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اسلامی قانونِ شہادت کے مطابق گواہ میں چند شرائط کا ہونا ضروری

---

[1] لما قال العلامة الحصکفی رحمہ اللہ: لا تقبل من اعمی مطلقاً۔ قال العلامة ابن عابدینؒ: ولنا ان الاداء یفتقر الی التمییز بالاشارة بین المشهود له والمشهود علیه ولا یمیز الاعمی الا بالنغمة وفیه شبهة۔ (رد المحتار والدر المختار ج۵ ص۴۷۶ کتاب الشهادة۔ باب قبول الشهادة وعدمه)

ضروری ہے مثلاً مسلمان ہونا، آزاد ہونا، عاقل بالغ اور بصیر ہونا وغیرہ، ان شرائط میں ایک شرط قوتِ گویائی کی بھی ہے، اگر کوئی شخص شہادت کی دیگر شرائط تو پوری کرتا ہو مگر وہ قوتِ گویائی سے محروم ہے تو وہ شہادت کا شرعاً اہل نہیں اور عدالت اُس کی دی ہوئی گواہی پر فیصلہ صادر کرنے کی مجاز نہیں ہے۔

لما قال العلامة وهبة الزحيلي: النطق! اشترط الحنفية والشافعية والحنابلة ان يكون الشاهد ناطقاً فلا تقبل شهادة الاخرس وان فهمت اشارته لان الاشارة لا تعتبر في الشهادات لانها تتطلب اليقين وانما المطلوب التلفظ بالشهادة۔ (الفقه الاسلامي وادلته ج ۶ ص ۵۶۴ المطلب الثالث، شروط اداء الشهادة)

گواہ کی خفیہ تحقیقات کرنے کی شرعی حیثیت

سوال:- جناب مفتی صاحب! ایک مسئلے کا حل مطلوب ہے وہ یہ کہ آجکل بعض لوگ سفید لباس پہن کر خود ساختہ معززبن جاتے ہیں، جس کی وجہ سے لوگ ان کی باتوں پر یقین کر لیتے ہیں لیکن پسِ پردہ وہ جرائم پیشہ افراد کے پشت پناہ ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ اگر عدالت میں جج کے سامنے کسی مجرم کے خلاف شہادت دینے کے لیے آئیں اور خود مجرم یا اس کا وکیل ان پر جرح کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرے کہ موصوف تو خود فلاں فلاں جرم کا مرتکب ہے۔ تو کیا جج حقیقت جاننے کے لیے خفیہ طور پر ان کی عدالت کی تحقیق کر سکتا ہے یا صرف ان کی ظاہری عدالت پر اعتماد کر کے فیصلے کر سکتا ہے؟ فقہاء کرام کی اس بارہ میں کیا رائے ہے؟

الجواب:- امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک گواہ کی ظاہری عدالت پر اکتفاء کر کے جج یا قاضی کسی مقدمہ کا فیصلہ کر سکتا ہے، گواہ کی خفیہ طور پر تحقیقات کرنا ضروری نہیں ہے البتہ حدود اور قصاص کے معاملے میں اس احتیاط کو بروئے کار لانا ان کے ہاں بھی ضروری ہے، لیکن امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہم اللہ کے نزدیک جملہ معاملات اور مقدمات میں گواہ کی خفیہ طور پر عدالتی تحقیق ضروری ہے، متأخرین علماء احناف نے اسی کو مفتی بہ قرار دیا ہے۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں تو امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک بھی گواہ کی عدالتی خفیہ تحقیق ضروری ہے، اس لیے کہ خصم (مجرم) یا اس کے وکیل نے گواہ پر اعتراض کیا ہے،

اس لیے جج یا قاضی ایسے گواہ کی خفیہ عدالتی تحقیقات کی روشنی میں فیصلہ صادر کرے صرف گواہ کی سفید پوشی پر اعتماد کرنا خطرے سے خالی نہیں۔

لما قال العلامة وهبة الزحيلي: واكتفى ابو حنيفة بظاهر العدالة فى المسلم ولا يسأل عن الشهود حتى يطعن الخصم بهم الا فى الحدود والقصاص فانه يسأل عن الشهود وان لم يطعن فيهم الخصوم ودليله على الاكتفاء بظاهر العدالة قوله عليه السلام: المسلمون عدول بعضهم على بعض الا محدوداً فى قذف۔ ومثله مروى عن عمر.........وقال الصاحبان والفتوى على قولهما لا بد عن ان يسأل القاضى عن الشهود فى السر والعلانية فى سائر الحقوق لان القضاء قائم على الحجة وهى شهادة الرجال فلا بد من التعريف على العدالة و فى ذلك صيانة للحكم القضائى عن النقض والابطال بسبب الطعن فى عدالة الشهود۔

(الفقه الاسلامى وادلته ج ٦ ص ۵٦۵، ص ۵٦٦ المطلب الثالث فى شروط اداء الشهادة)

علت زائل ہونے کے بعد اسی مقدمے میں شہادت کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے اپنی بیوی کے لیے قاضی کے سامنے یہ شہادت دی کہ میری بیوی کا اپنے بھائی زید پر ایک لاکھ روپیہ (جو کہ اُسے اپنے والد کے ترکہ سے نقدی کی صورت میں ملے تھے) قرضہ ہے لیکن قاضی نے اس کی شہادت کو ازدواجی رشتے کی بناء پر ردّ کر دیا۔ اب جبکہ اس شخص نے اپنی بیوی کو طلاقِ بائن دے کر رخصت کر دیا ہے تو کیا یہ شخص اسی مقدمہ میں شہادت دے سکتا ہے یا نہیں؟ کیونکہ وہ عورت اب اس کے لیے اجنبیہ بن گئی ہے؟

الجواب:۔ اسلامی قانونِ شہادت کے تحت جب ایک بار کسی شخص کی گواہی کسی علت کی بناء پر ردّ کر دی جائے تو اسی مقدّمے میں اس شخص کی شہادت علت زائل ہونے کے بعد بھی قبول نہیں ہو گی۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں طلاق دینے کے بعد بھی اثباتِ دعویٰ کے لیے اس شخص کی شہادت کار آمد نہیں۔

لما قال العلامة سليم رستم باز: متى ردت الشهادة لعلة ثم زالت العلة فشهد فى تلك الحادثة لا تقبل فلو شهد الزوج لزوجته بدعوى فردت

ثم ابانها و تزوجت غیرہ ثم شھد لھا بتلك الدعوٰی لم تقبل ۔
(شرح المجلہ لرستم باز ص۱۰۰۵ المادۃ ۵۵۸ کتاب الاکراہ ۔ الباب الثانی)

شہادۃ میں مشہود لہ یا علیہ کا نام مع ولدیت لینا

سوال:۔ ایک آدمی جب کسی کیلئے گواہی دے تو اس کا نام مع ولدیت لے گا یا نہیں؟ اسی طرح جس کے خلاف گواہی دے رہا ہو تو اس کا نام بھی مع ولدیت کے لے گا یا نہیں؟ شریعتِ اسلامی میں اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ گواہی دیتے وقت اگر مشہود لہ (جس کے لیے گواہی دیتا ہو) اور مشہود علیہ (جس کے خلاف گواہی دی جارہی ہو) عدالت میں موجود ہوں تو گواہ کے لیے ان کے نام مع ولدیت کے لینا ضروری نہیں، صرف اشارہ کرنے سے بھی تعیین ہو جائے گا۔ البتہ اگر دونوں موجود نہ ہوں یا کوئی ایک غیر حاضر ہو تو اس کا نام مع ولدیت کے لے کر گواہی دینا ضروری ہے صرف نام پر اکتفاء کرنے سے بات نہیں بنے گی، تاہم اگر وہ مشہور و معروف ہو تو شہرت کی وجہ سے صرف نام لینا بھی کفایت کر جاتا ہے۔

لما فی مجلۃ الاحکام: یجب ان یشیر الشاھد عند الشھادۃ الی کل من المشھود لہٗ والمشھود علیہ والمشھود بہٖ اذا کانوا حاضرین فان فعل ذٰلك کفی ولا یلزمہ ان یذکر اسم ابی المشھود لہٗ والمشھود علیہ ولا حدھما اما فی الشھادۃ المتعلقۃ بالمؤکل الغائب او بالمیّت فیلزم الشاھد ذکر ابیھما وجدھما ولکن اذا کان کل منھما مشھورًا ومعروفًا فحسب الشاھد ان یذکر اسمہ وشھرتہ لان المقصود الاصلی تعریفہ بوجہ یمیزہ من غیرہ۔[1] (شرح المجلۃ الاحکام لرستم باز ص۱۰۱۱ م ۱۶۹۰)

شہادت کیلئے خود مشاہدہ کرنا ضروری ہے

سوال:۔ اگر کوئی شخص گواہی دیتے وقت قاضی کے سامنے یہ کہے کہ میں نے لوگوں سے سنا ہے یا

---

[1] قال العلامۃ الحصکفیؒ: وھی ان علی حاضر یحتاج الشاھد الی الاشارۃ الی ثلاثۃ التی الخصمین والمشھود بہ لو عینا ولادینا وان علی غائب کما فی نقل الشھادۃ او میت فلا بد لقبولھا من نسبتہ الی جدہ فلا یکفی ذکر اسمہ واسم ابیہ وصناعتہ الا اذا کان یعرف بھا ای بالصناعۃ لا محالۃ بان لا یشارکہ فی المصر وغیرہ فلو قضی بلا ذکر الجد نفذ فالمعتبر التعریف لا تکثیر الحروف حتی لو عرف باسمہ فقط او بلقبہ وحدہ کفی۔ (الدرالمختار علی صدر رد المحتار ج۵ ص۴۶۶ کتاب الشھادۃ)
ومثلہٗ فی شرح المجلۃ لخالد اتاسی ج۵ ص۲ الباب الاول فی الشھادۃ۔

لوگوں میں مشہور ہے کہ فلاں شخص نے اس جرم کا ارتکاب کیا ہے، جبکہ گواہی دینے والا شخص صوم وصلوٰۃ کا پابند ہو اور تبلیغی جماعت کے ساتھ وقت بھی لگاتا ہو۔ تو کیا اس شخص کی یہ گواہی اثباتِ جرم کے لیے شرعاً کافی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ گواہی دینے والے کیلئے اگرچہ عادل، صوم وصلوٰۃ کا پابند ہونا بھی ضروری ہے مگر قبولِ شہادت کے لیے اس امر کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے کہ شاہد نے مجرم کو جرم کے ارتکاب کے وقت اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو، صرف لوگوں سے سُنکر گواہی دینا قابلِ قبول نہیں۔ لہٰذا اس قسم کی شہادت سے جرم ثابت نہ ہوگا، کیونکہ ہوسکتا ہے کہ وہ بات لوگوں میں غلط مشہور ہو چکی ہو۔

لمافی مجلۃ الاحکام: یلزم ان یکون الشھود قد عاینوا بالذات المشھود بہ وان یشھدوا علیٰ ذٰلک الوجہ ولا یجوز ان یشھدوا بالسماع یعنی ان یشھد الشاھد بقولہ سمعت من الناس۔ (مجلۃ الاحکام العدلیۃ۔المادۃ ۱۶۸۸) [1]

صرف عورتوں کی گواہی کا حکم

سوال:۔ کیا شہادت کے معاملہ میں صرف مرد گواہ کا ہونا ضروری ہے یا یہ کہ کہیں صرف خواتین کی گواہی بھی قابلِ قبول ہوسکتی ہے؟ فقہ حنفی کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں؟

الجواب:۔ لوگوں کے مابین پیدا ہونے والے تنازعات کے حل کے لیے شرعاً دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتوں کا بطور گواہ ہونا ضروری ہے لیکن جہاں کہیں مرد گواہوں کی رسائی ممکن نہ ہو یا وہ ان حالات پر مطلع نہ ہوسکتے ہوں تو اس مجبوری کے تحت صرف خواتین کی گواہی بھی قابلِ اثباتِ دعویٰ ہے اور شرعاً ان کی شہادت کو قبول کیا جائے گا۔

لمافی مجلۃ الاحکام: نصاب الشھادۃ فی حقوق العباد رجلان اورجل وامرأتان ولکن تقبل شھادۃ النساء وحدھن بحق المال فقط فی المحال التی لایمکن اطلاع الرجال علیھا۔
(شرح مجلۃ الاحکام لرستم باز، المادۃ ۱۶۸۵ ص۱۰۰۳ الباب الاول فی الشھادۃ) [2]

---

[1] لما قال العلامۃ محمد بن الحسین الحنفیؒ: لو قالوا اشھد انا لانی سمعنا من الناس فلا تقبل شھادتہ۔ (الفتاوی الانقرویۃ ج ۱ ص ۳۹۰ کتاب الشھادۃ۔الباب السادس فی الشھادۃ بالتسامع)

[2] لما قال العلامۃ خالد آتاسیؒ: کالولادۃ فان شھادۃ المرأۃ الواحدۃ فی حق الارث تقبل عندھما خلافاً لابی حنیفۃ وبقولھما قال الشافعیؒ واحمد وھو الراجح کما فی الفتح واما فی حق ثبوت النسب فتقبل اجماعاً۔۔۔ حاصلہ ان شھادۃ النساء بانفرادھن فیما لایطلع علیہ الرجال حجۃ۔
(شرح مجلۃ الاحکام ج ۵ ص ۲۰۸ الباب الاول فی الشھادۃ)

اثباتِ جرم کے لیے ریکارڈ شدہ شہادت کافی نہیں

سوال:۔ عصرِ حاضر کی سائنسی ایجاد ٹیپ ریکارڈ کی مدد سے ریکارڈ شدہ بیان کی بنیاد پر چوری، زنا، قتل وغیرہ کا جرم ثابت ہو سکتا ہے یا نہیں؟ یعنی کیسٹ کا بیان مثبت للحکم ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ چونکہ شرعاً گواہوں کا عدالت میں حاضر ہو کر قاضی کے سامنے گواہی دینا ضروری ہے اس لیے صورتِ مسئولہ میں ٹیپ ریکارڈ یا دیگر جدید آلات سے گواہ کا بیان مثبت للحکم نہیں اور نہ قاضی کو شرعاً یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ صرف ٹیپ ریکارڈ یا دوسرے آلات سے کسی کا بیان سنکر کوئی فیصلہ کرے، اس لیے کہ ایک آدمی کی آواز دوسرے کی آواز کے مشابہ ہو سکتی ہے۔

کما فی مجلة الاحکام: الشهادة هی الاخبار بلفظ الشهادة یعنی یقول اشهد باثبات حق احد هو فی ذمة الآخر فی حضور الحاکم ومواجهة الخصمین فیقال للمخبر شاهد وللمخبَر له مشهود له وللمخبر علیه مشهود علیه وللحق مشهود به۔

قال الشیخ خالد اتاسیؒ: وقوله فی حضور الحاکم المراد منه أن یکون الاخبار فی مجلس الحکم فاخبار الحاکم فی غیر مجلس الحکم لایعتبر شهادة۔

(شرح المجلة لخالد اتاسی ج ۵ ص ۱۹۹، ۲۰۰ الباب الاول فی الشهادة)

اثباتِ جرم کے لیے تصویر کا حکم

سوال:۔ ایک شخص کسی کو قتل کر رہا ہو یا زنا کر رہا ہو اور کوئی دوسرا شخص اچانک اس کی تصویر اتار لے تو کیا وہ تصویر اثباتِ جرم کے لیے قاضی کی عدالت میں پیش کی جا سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ تصویر اور اس سلسلہ کے دیگر جدید آلات کو فی زمانہ یکسر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور یہ ذرائع اثباتِ جرائم کے لیے کافی حد تک کارآمد بھی ہیں بشرطیکہ دیگر ذرائع و قرائن انکی تائید کرتے ہوں، اس لیے کہ آجکل کے تکنیکی دور میں تصاویر کے اندر جعلسازی کا قوی امکان موجود ہے۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں اتاری گئی تصویر اگرچہ کلی طور پر اثباتِ جرم کے لیے کافی نہیں لیکن اس کو نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا، اس لیے اگر دیگر ذرائع اس کی تائید میں نہ بھی ہوں اور قاضی کو مجرم پر قوی یقین ہو تو وہ اس پر کم از کم تعزیر جاری کر سکتا ہے۔

لما فی مجلة الاحکام: القرینة القاطعة هی الامارة البالغة حد الیقین

مثلاً اذا خرج احد من دار خالیۃ مدهوشاً وفی یدہ سکین ملوثۃ بالدم ودخلت الدار ورؤی فیہا شخص مذبوح فی ذلک الوقت فلا یشتبہ فی کونہ قاتل ذلک الشخص ولا یلتفت الی الاحتمالات الوھمیۃ الصرفۃ کالذھاب الی کون شخص المذکور بما قتل نفسہ ۔ (مجلۃ الاحکام، المادہ ۱۷۴۱) لہ

قاتل کے جسم یا کپڑوں پر مقتول کا خون لگا ہو تو

سوال: اگر قتل کی کسی واردات میں عین موقع پر کوئی شخص پکڑا جائے کہ اس کے ہاتھ میں خون آلود خنجر ہو اور اس کے کپڑوں پر خون کے دھبے بھی ہوں۔ ڈاکٹری تحقیق سے مقتول کا خون اور خنجر و کپڑوں پر لگا ہوا خون ایک ہی ہو تو کیا شرعاً اس شخص پر جرم ثابت ہو گا یا نہیں ؟

الجواب: مقتول کے خون اور قاتل کے جسم پر لگے ہوئے خون کا ایک ہونا قتل کے اثبات کا قرینہ ہے۔ صورت مسئولہ کے مطابق اگر مقتول اور قاتل کے کپڑوں اور خنجر پر لگا ہوا خون ایک ثابت ہو جائے تو شرعاً یہ شخص مجرم متصور ہو گا، اور اگر دیگر شواہد بھی تائید کرتے ہوں تو قاتل پر حد جاری کی جائے گی ورنہ قاضی اس پر تعزیر جاری کر سکتا ہے۔

لہ لما قال العلامۃ خالد اتاسیؒ: وفی معین الحکام قال بعض العلماء علی الناظر ان یلحظ الامارات والعلامات اذا تعارضت فما ترجح منہا قضی بجانب الترجیح وھو قوۃ التھمۃ ولا خلاف فی الحکم بھا ونبصرۃ الحکام، قال اللہ تعالیٰ: تَعْرِفُهُم بِسِيمَاهُمْ دل علی السیما المراد بھا حال یظھر علی الشخص والامارات ما خوذۃ من الشریعۃ قال اللہ: (وَجَاءُوا عَلَىٰ قَمِيصِهِ بِدَمٍ كَذِبٍ) قال عبد المنعم بن الفرس روی ان اخوۃ یوسف علیہ السلام لما اتوا بقمیص یوسف الی ابیہم یعقوب علیہ تاملہ فلم یجد فیہ خرقاً ولا اثر ناب فاستدل بذلک علی کذبھم وقال متی کان الذئب حلیماً یاکل یوسف ولا یخرق قمیصہ۔

(شرح المجلۃ ج ۵ ص ۳۹۱ فی بیان القرینۃ القاطعۃ۔ المادہ ۱۷۴۱)

مسوّدۂ قانونِ شہادت میں مولانا سمیع الحق کی بعض دیگر ترامیم اور تقاریر

اقرار اور اقبالِ جرم

مسودہ قانونِ شہادت میں دفعہ ۴۵ کا تعلق اقبالِ جرم اور اقرار سے ہے جس میں کہا گیا ہے کہ :۔

"ان معاملات میں جو تسلیم کیے گئے ہوں، اقبالِ جرم تصفیہ کن ثبوت نہیں لیکن امر عارض ہو سکتا ہے"۔

اس دفعہ کے متعلق مولانا سمیع الحق کی ترمیم (جو کہ فہرست ترامیم میں نمبر ۳۰ پر تھی) یہ تھی کہ اس دفعہ کو یوں بدل دیا جائے :۔

"ان معاملات میں جو تسلیم کیے گئے ہوں اقبال تصفیہ کن ثبوت بھی ہے اور مانع تقریر مخالف (ESTOPPIL) بھی، اگر کوئی شخص اقبال (اقرار) کرے تو کتب شریعت کے بیان کردہ احکام کے مطابق اس اقبال (اقرار) کو اہمیت دے کر فیصلہ کیا جائے"۔

جناب چیئرمین نے یہ ترمیم پڑھ کر ایوان کے سامنے رکھی تو اس کے بارہ میں میاں نعیم الرحمٰن صاحب نے نقطۂ اعتراض اٹھایا کہ یہ ترمیم تقاضوں کے مطابق نہیں تو مسودۂ قانون میں کیسے آسکتی ہے، جناب چیئرمین نے اس ترمیم کی اصل عبارت جو کہ اردو میں تھی کی طرف ان کی توجہ دلائی اور خود بھی پڑھی اور انگریزی میں اس کا ترجمہ بھی درست کیا اور پھر محرک کو اس پر بحث کی اجازت دے دی، مولانا نے کہا :۔

مولانا سمیع الحق | جناب چیئرمین صاحب ! یہ بالکل واضح ہے، ہمارے سامنے جو اصل دفعہ ہے اس میں یہ ہے کہ اقبال تصفیہ کن ثبوت نہیں لیکن امر عارض ہو سکتا ہے۔ تو میرا مقصد یہ ہے کہ اقبال کو ثبوتِ قطعی اس شہادت کی رُو سے نہیں سمجھا گیا ہے کیونکہ انہوں نے انگریزی شہادت ایکٹ کو جس مفہوم میں استعمال کیا ہے اس کا تو یہی تقاضا تھا، لیکن اسلامی قانون میں اقرار کو جس

مفہوم میں لیا گیا ہے وہ نتائج کے اعتبار سے قطعی ثبوت بھی نہیں یعنی اس سے انکار نہیں کیں (۱۹۹۱ء) بھی ہے، واضح اصول یؤخذ باقرارہ آدمی اس کے اقرار سے پکڑا جاتا ہے۔

اس مرحلہ پر جناب ملک محمد رمضان صاحب آف بلوچستان نے چیئرمین سے کہا کہ مولانا کی ترمیم کے الفاظ اور معانی کے چکروں میں پڑنے کی بجائے جذبے کو بھی دیکھنا چاہیئے، اگر یہ قرآن و سنت کی تعلیمات پر مبنی ہے تو اسے اور الفاظ کا جامہ پہنا کر قبول کر لیا جائے تو بہتر ہو گا۔

اس کے بعد چیئرمین نے جناب سید معین الدین شاہ کو اس پر اظہار خیال کی دعوت دی، انہوں نے کہا کہ قوانین آپس میں مربوط ہوا کرتے ہیں، ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ ہم نے قاضی کورٹس پاس کیا ہے، یہاں حقوق کی بات نہیں ہے، یہاں یہ ترمیم زائد ہے قانون میں آہی نہیں سکتی۔ اور بھی کئی مواقع پر ایسا ہوا کہ یہاں جو چیز لانا نہ چاہتے تو یہ حضرات قاضی کورٹس کا حوالہ دے دیتے، اقرار کے متعلق یہی انداز اختیار کیا گیا کہ قاضی کورٹ کا قانون یہی ہے۔ اس مرحلہ پر مولانا سمیع الحق نے جواب بحث دیتے ہوئے کہا کہ:

مولانا سمیع الحق | جناب والا! میں نے ابھی ایک حصہ بیان کیا تھا، یہاں بار بار ہمیں قاضی کورٹس کا حوالہ دیا جاتا ہے، یہ بڑا عجیب سا نظام ہے کہ اس مسئلے کو دوسری کتاب سے مربوط کیا جائے اور اس کو تیسری سے۔ قانون شہادت تو یہ ہے کہ شہادت کے سارے امور گواہوں کے متعلق ہوں یا حلف کے متعلق ہوں یا اقرار کے متعلق ہوں تو اسے یکجا رکھا جائے، اس طرح آسانی رہے گی۔ ہمارا مقصد تو یہ ہے کہ ایک صحیح اور مؤثر ڈھانچہ تیار ہو جائے تو یہاں اگر تفصیلات نہ بھی ذکر کی جائیں۔ تو میں نے ترمیم میں کہا ہے کہ ــــ "کتب شریعت کے بیان کردہ احکام کے مطابق" ــــ یہ اس لیے ضروری ہے کہ اقبال اور اقرار کو بھی شریعت نے کئی شرائط سے مشروط کر دیا ہے۔ مثلاً اقرار کرنے والا عاقل بالغ ہو گا، اگر نابالغ ہے اور ولی یا سرپرست نے اس کو کاروبار کرنے کی اجازت دی ہے تو وہ بھی بالغ کے حکم میں متصور ہو گا۔ اسی طرح اور کئی شرائط ہیں، تو میں یہ چاہتا ہوں کہ جب مقر اقرار کرے، اقبال کرے (بغیر کسی جبر و اکراہ کے) تو اس میں شریعت کے واضح احکامات کو ملحوظ رکھا جائے، جبکہ یہاں معاملہ بالکل مبہم ہے۔ اور دوسرا مانع امر مخالف کا مسئلہ ہے کہ اسلام اقرار کو ثبوت قطعی بھی قرار دیتا ہے، اگر یہاں ہم نے اسے ثبوت قطعی قرار نہ دیا تو شریعت کا ایک اصول اس سے متاثر ہو جائے گا ــــ اقرار ایک مستقل عظیم الشان باب ہے اسلامی قانون شہادت کا۔ اس کے تقاضوں کو بھی ہر جگہ ملحوظ

رکھنا ہوگا۔ یہ عام مسلمہ اصول ہے کہ المرء یوخذ باقرارہ ــــ اب ایک شخص نے اگر اقرار کرلیا تو یہاں تو اس کو مانع تقریر مخالف قرار دیا گیا، یعنی ایک شخص یہ کہتا ہے کہ فلاں شخص میرا بھائی ہے تو وہ اس کا بھائی تو ہو گیا مگر یہ ضروری نہیں کہ اس اقرار سے وہ اس کے باپ کا بیٹا بھی ہو جائے، خلاصہ تو یہی ہے۔ مگر یہاں تو اس کو ثبوتِ قطعی قرار ہی نہیں دیا گیا، اگر ایسا ہی ہو تو پھر اقرار کی کوئی بنیاد اور حیثیت ہی نہ ہوئی۔

اقرار کے شرائط دوسری گذارش میں نے یہ کی کہ اقرار کو شریعت نے کئی چیزوں سے پابند کر دیا ہے، جیسا کہ ہم نے شاہد کے لیے بھی اہلیت اور شرائط کو ملحوظ رکھا ہے، تو یہاں بھی اگر ہم تفصیلات میں نہیں جاتے تو شہادت کے بعد ایک درجہ تو اقرار کرنے کا ہے، اس کی بھی شرائط ہیں اور کچھ مستثنیات ہیں، وضاحتیں ہیں، تو ان کو میرے اس مختصر جملے میں ملحوظ رکھ دیا جائے کہ شریعت کے بیان کردہ احکام کے مطابق اس اقبال کو اہمیت دیں گے، اگر وہ شریعت کے احکام پر پورا نہیں اترتا تو جج کو اختیار ہو کہ وہ اس شخص کے اقرار کو اہمیت نہیں دے گا۔ صرف اتنا معاملہ ہے کہ اس دفعہ کو بھی کسی طرح اسلامی اصولوں کے قریب لایا جائے۔

اس کے بعد جناب چوہدری فقیر اللہ صاحب اور جناب چوہدری الطاف حسین صاحب اور بعض دیگر ارکان نے ترمیم کی مخالفت کی اور مولانا قاضی عبداللطیف صاحب نے ترمیم کی پُرزور تائید کی، اس پر رائے شماری کے بعد جناب چیئرمین نے اسے ساقط قرار دیدیا۔

شادی وغیرہ کا ثبوت دفعہ ۶۴ کا تعلق شادی وغیرہ کی رشتہ داری کے ثبوت سے ہے اس میں مولانا کی ترمیم یہ تھی کہ اس کے آخر میں یہ الفاظ بڑھا دیئے جائیں کہ: "یا قوانینِ حدود کی متعلقہ دفعات کے تحت ہو" تاکہ زناکاری کے انسداد کے سلسلہ میں یہ دفعہ بعض صورتوں میں رکاوٹ بن سکے۔ یہاں اصل دفعہ میں تعزیراتِ پاکستان کی دفعہ ۴۹۷ اور ۴۹۸ کا ذکر تھا جبکہ وہ کالعدم ہو چکی تھیں مگر حدود سے متعلقہ دفعات کو ملحوظ نہیں رکھا گیا۔

جناب حکیم محمد سردار خان صاحب، جناب چوہدری محمد الطاف حسین صاحب، وزیر قانون جناب پیرزادہ صاحب نے بحث میں حصہ لیا اور کہا کہ اس ترمیم کے جملہ تقاضے حدود آرڈی ننس سے پورے ہو رہے ہیں البتہ ۴۹۷ اور ۴۹۸ دفعات کا ذکر یہاں زائد ہے اسلئے کہ یہ ریپیل ہو چکی ہیں۔

جنابِ چیئرمین نے اس کے بعد محرک مولانا سمیع الحق کی رائے معلوم کی تو انہوں نے کہا کہ جنابِ چیئرمین!

ہم نے یہ بات مسودہ کو ترتیب دیتے وقت مفاہمتی مجلس میں بھی کہی تھی کہ اگر حدود آرڈیننس کے ذکر کی ضرورت نہیں تو پھر تعزیراتِ پاکستان کی ان منسوخ شدہ دفعات (۴۹۷ اور ۴۹۸) کے ذکر کی بھی ضرورت نہیں۔ تو میں حیران تھا کہ جو دفعات منسوخ ہیں ان کا تو ذکر ہے لیکن جو رائج الوقت ہے (یعنی حدود آرڈیننس) اس کا ذکر تک نہیں۔ اس پر جناب چیئرمین نے منسوخ شدہ دفعات کا ذکر ہٹا دیا اور مولانا نے ترمیم واپس لینے کی اجازت شرطیہ طور پر لینی چاہی تو چیئرمین نے کہا کہ شرطیہ اجازت نہیں لی جا سکتی، اس کے بعد ترمیم پر رائے شماری ہوئی اور گر گئی۔

دورانِ ازدواج بچے کی پیدائش

دفعہ ۱۲۸ کا تعلق دورانِ ازدواج بچے کی پیدائش سے ہے کہ ایسی پیدائش بچے کے جائز ہونے کا پختہ ثبوت ہوگا۔

مجوزہ ایکٹ ۱۸۷۲ء میں اسے بالکل مبہم چھوڑ دیا گیا تھا، صرف یہ کہ جائز شادی کے دوران بچہ پیدا ہونا اس کے جائز ہونے کا پختہ ثبوت ہے۔ گویا اگر عقدِ نکاح کے چند دن بعد بھی بچہ پیدا ہو جائے تو اسے حلالی سمجھا جائے گا، جبکہ اسلامی شریعت کی رُو سے عقدِ نکاح کے کم از کم ۶ ماہ گذرنے کے بعد پیدا ہونے والا بچہ جائز سمجھا جائے گا۔ اسی طرح یہ ایکٹ انفساخِ نکاح کی صورت میں دو سو اسّی یوم کے اندر بعد انفساخ ازدواج تولّد کو جائز ثبوت قرار دے رہا تھا جبکہ فقہاء کرام کے نزدیک کم از کم مدت دو سال ہے۔ یعنی فسخ نکاح (طلاق یا وفات) کے بعد دو سال تک پیدا ہونے والا بچہ بھی حلالی سمجھا جائے گا، سوائے استثنائی صورتوں کے ــــ (جو کہ نیچے دفعہ میں آرہی ہیں) ــــ

علماء کا اصرار تھا کہ اس دفعہ کو ہر حالت میں شریعت کے مطابق بنانا ہوگا، جبکہ مخالف گروپ وکلاء وغیرہ اس پر آمادہ نہیں تھے، مگر بعد میں مفاہمتی مجالس میں اس پر جناب وزیر قانون وغیرہ کی سعی سے وکلاء حضرات نے اتفاق کر لیا اور اس دفعہ کو علماء کرام نے از سرِ نو مرتب کر کے مسودہ میں شامل کرایا۔

مدتِ حمل

دفعہ ۱۲۸ دورانِ ازدواج پیدائش پختہ ثبوت جائز ہونے کا ہے۔ یہ واقعہ کہ کوئی شخص اپنی والدہ کے کسی مرد کے ازدواجِ جائز میں رہنے کے چھ ماہ یا اس کے بعد یا اس نکاح کے ختم ہونے سے دو سال کے اندر پیدا ہوا ہو اور اس اثناء میں اس کی ماں بے زوج رہی ہو تو یہ اس امر کا قطعی ثبوت ہوگا کہ وہ صحیح النسب بیٹا ہوگا، اِلّا یہ کہ عورت عدت گذر جانے کا اقرار کر چکی ہے اور بچہ کی پیدائش تاریخِ اقرار سے ۶ ماہ بعد ہوئی یا شوہر انکاری ہو۔

ایوان میں یہ دفعہ جب سامنے آئی تو حکیم محمد سردار خان اور بعض وکلاء نے پھر اسے ترمیم کے ذریعہ

بدلنا چاہا اور نکاح ختم ہونے کے بعد کی مدت کو ۲۹۵ دن تک محدود کرنا چاہا۔ یہ مسئلہ مدت حمل کی اکثر حد پر مبنی ہے۔ بعض ائمہ کے ہاں یہ مدت تین سال اور اس سے بھی زائد ہے، امام ابوحنیفہؒ کی رائے کم از کم میعاد پر مبنی ہے، مخالفت کرنے والوں کو یہ میعاد ناممکن اور مضحکہ خیز نظر آ رہی تھی جبکہ انگریزی ایکٹ میں عقدِ نکاح کے دو دن بعد بچے کی ولادت کو قانوناً جائز قرار دیئے جانے پر حیرت اور اچنبھا نہ تھا۔

علماء کرام نے بڑی شرح و بسط کے ساتھ اس میعاد کی حکمتوں پر روشنی ڈالی اور پیش کردہ ترمیم کی مخالفت کی، وکلاء حضرات نے اپنے مؤقف پر تقریریں کیں اور الحمدللہ کہ رائے شماری کے بعد مخالفانہ ترامیم ساقط ہو گئیں اور اکثریت سے علماء کی پیش کردہ دفعہ منظور ہو گئی۔

اس مسئلہ پر مولانا سمیع الحق نے اپنی مختصر تقریر میں کہا کہ:۔

جناب چیئرمین | مولانا سمیع الحق صاحب!

مولانا سمیع الحق | جناب چیئرمین! یہاں زیادہ زور اسی پر دیا گیا ہے کہ بظاہر یہ ناممکن نظر آتا ہے اور اس جدید دور میں اگر ہم دس مہینے سے زیادہ دو سال فرض کر لیں تو لوگ ہنسیں گے، گویا اس کے ناممکن ہونے کی وجہ سے ۲۹۵ دن پر زور دیا گیا ہے۔ میں مختصراً دو تین نکات بیان کرتا ہوں۔ ایک تو حکیم محمد سردار خان صاحب کی ترمیم میں بظاہر تعارض ہے، ابتداء میں تو انہوں نے یہ کہا ہے کہ ۲۹۵ دن میں تبدیل کیا جائے، اور سب مقررین اسی پر زور دے رہے ہیں کہ چونکہ یہ ناممکن ہے اس لیے ایسا ہونا چاہیئے، پھر یہ خود ہی آخر میں بارِ ثبوت والدہ پر ڈالتے ہیں تو وہاں کہتے ہیں کہ ۲۹۵ دن کے بعد اور دو سال کے اندر۔ میں کہتا ہوں کہ جو چیز ترمیم کی ابتداء میں واقعی ناممکن تھی تو پھر آخر میں وہ ممکن کیسے سمجھ لی گئی؟ اگر یہ بات بالکل ناممکن تھی تو پھر ایک ناممکن چیز کے لیے کسی دعویٰ کا بارِ ثبوت والدہ پر ڈالنا کتنے تعجب کی بات ہے، میں ابھی وضاحت سے بات کروں گا۔

چوہدری محمد ادریس تاج | پوائنٹ آف آرڈر! جناب چیئرمین! اگر میں قیاس سے یہ یہ کہوں کہ کسی خاتون کے پیٹ میں بچہ ہے تو آخر وہ میڈیکل چیک اپ آپ کروائیں گے تو پتہ چلے گا، اس طرح تو پتہ نہیں چلے گا۔

جناب چیئرمین | تشریف رکھئے، یہ پوائنٹ آف آرڈر نہیں ہے۔

اکثر مدتِ حمل میں اقوال اور حکمتِ خداوندی

مولانا سمیع الحق | تو اگر ایک چیز ترمیم کے آغاز میں مضحکہ خیز تھی تو وہ ترمیم کے آخر میں کیوں مضحکہ خیز نہیں بنتی؟ میری دوسری گذارش یہ ہے کہ اُس زمانے میں بھی بچے دو دو سال

ماں کے پیٹ میں نہیں رہتے تھے، اور عام حالات جو ہمیں ملتے ہیں اس میں ایسی مثالیں بہت کم ہیں اس کے باوجود بھی تمام ائمہ نے جو رائے اختیار کی تو یہ نہیں تھا کہ ان میں عقل، تدبر اور یہ ساری باتیں نہیں تھیں اور انہوں نے آنکھیں بند کر کے نعوذ باللہ ایسی جاہلانہ بات کہہ دی حالانکہ سب ائمہ بنیادی طور پر متفق ہیں کہ ایک سال نہیں ہے اور چاروں ائمہ میں اگر اکثر مدت حمل کے بارے میں اختلاف ہے بھی تو وہ دو سال سے زائد میں ہے، دو سال پر تو سب متفق ہیں، امام شافعیؒ تو تین سال کہتے ہیں، اور امام مالکؒ سے تو چار سے چھ سال تک کے اقوال ملتے ہیں (اس مرحلہ پر کئی ارکان نے مضحکہ خیز انداز میں ان اقوال کا مذاق اڑایا) اب آپ مذاق اڑائیں یا ہنسی کریں بہرحال یہ آپ کا دین ہے پھر سرے سے اس دین سے ہی دستبردار ہو جائیں، خواہ آپ جو بھی کریں آپ کو ان مسائل میں جرأتِ ایمانی کی بات کرنی چاہیے دین کی باتوں پر شرمندہ نہیں ہونا چاہیئے کہ دنیا کیا کہے گی، ایمانداری سے کلا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہ کہہ دیں آپ تو پھر آپ کو کتاب وسنت پر مبنی ہر رائے کو ماننا پڑے گا۔

الغرض اس کو اجماع مرکب کہتے ہیں، اب وجہ کیا تھی کہ میں نے ایسا کہا؟ وجہ یہ تھی کہ یہ کچھ مخصوص حالات ہیں، مثلاً ایک شوہر بیوی کو طلاق دیدیتا ہے یا کوئی خاتون بیچاری بیوہ ہو جاتی ہے تو وہ ہزاروں مصائب اور مشکلات سے دوچار ہو جاتی ہے، اگر اس نے عدت پوری ہونے کا اقرار نہ کیا اور کسی اور سے شادی بھی نہ کی یا شوہر زندہ ہے اور انکار نہیں کرتا، تو ان مخصوص حالات میں اللہ نے ہر جگہ اپنے نظام میں یہ گنجائش رکھی ہے اور احکام میں اسے ملحوظ رکھا کہ کسی انسان کو ناجائز اور حرامی نہ کہا جائے کیونکہ کسی کو ایک دفعہ ناجائز اور حرامی کہہ دینا اس کو زندہ مار دینے کے برابر ہے۔ اسی طرح ایک پاکدامن اور عفیفہ عورت کو اسلام حتی الوسع اس الزام، تہمت اور بدنامی سے بچانا چاہتا ہے، اب جو دو سال کی گنجائش رکھی گئی ہے تو ایک بیچاری پاکباز عورت جب تک اس کے خلاف ثبوت ثابت نہ ہو تو شریعت اس کو اپنے حال پر رکھتی ہے۔

تیسری گذارش میری یہ ہے کہ یہ امت جو ہے یہ صرف سائنس کے زمانے کے لیے نہیں ہے وہ چودہ سو سال سے ہے اور قیامت تک رہے گی اور ساری بنی نوع انسان کے لیے اسلامی تعلیمات ہیں، ہر جگہ نہ تو سائنس تھی نہ ایکسرے ہیں نہ لیبارٹریاں ہیں نہ اس قسم کے ٹیسٹ ہر جگہ ہو سکتے ہیں، آج بھی ہماری آبادی کا ۹۵ فیصد علاقہ دیہاتی ہے، جنگلات بھی ہیں، اُمتِ اُمّی کا معنیٰ یہ ہے کہ اسے دینِ فطرت میں تکلفات کا پابند نہ کیا جائے۔ شکریہ

وعدہ معاف گواہ کی شرعی حیثیت | مروجہ شہادت ایکٹ میں وعدہ معاف گواہ موجود ہے یعنی

کسی شریکِ جرم کا اقرار اور اس کے اپنے کسی دوسرے شریکِ کار مجرم کے خلاف بطور شہادت استعمال ہو سکتا ہے جس کی شرعی نقطہ نظر سے کوئی گنجائش نہیں، باہمی مفاہمت کی مجلس میں نئے مسودہ سے یہ شق حذف کرائی گئی تھی مگر ریٹائرڈ چیف جسٹس بشیر الدین خان صاحب اپنی ترمیم کے ذریعے اسے برقرار رکھنا چاہتے تھے، اس ترمیم پر بڑی زوردار تقریریں ہوئیں، ترمیم کی تائید کو کثرت سمجھا گیا اور وہ منظور ہوگئی۔ اس موقع پر مولانا سمیع الحق صاحب نے اپنی تقریر میں کہا :-

جناب چیئرمین | بہت شکریہ، مولانا سمیع الحق صاحب۔

جناب مولانا سمیع الحق | حضور والا! یہ واضح مسئلہ ہے کہ وہ خود ایک فریق مقدمہ بن گیا ہے اور اس کے بارے میں المغنی نے تصریحات نقل کی ہیں کہ کُلُّ مَنْ خَاصَمَ فِی حَقٍّ لَا تُقْبَلُ شَهَادَةٌ فیہ۔ (المغنی ج ۱ ص ۱۶۷) ایک اور روایت میں ہے: قضی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان لا تقبل شهادة لخصم۔ (المغنی ج ۱ ص ۱۶۹)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ فریق مقدمہ کی گواہی فریق مخالف کے لیے قبول نہیں کی جائے گی کیونکہ وہ ایک فریق مقدمہ ہے اور اس فریق کے مخالف کو استعمال کرنا ہے جو اس فریق پر بڑی زیادتی ہے، دوسری روایت الدرالمختار کی ہے: کل من صار خصماً فی حادثة لا تقبل شهادته فیها۔ (الدرالمختار ج ص کتاب الشہادات)

ترجمہ اس کا یہ ہے کہ: "ہر وہ شخص جو کسی شہادت میں فریق مخالف ہو تو اس میں اس کی شہادت قبول نہیں کی جائے گی"۔ تیسرا یہ کہ وہ گناہ کا اعتراف کرنے کے بعد عادل نہیں رہا۔ اور شہادت کے لیے صریحاً اصول ہیں کہ وہ عادل ہو، جب خود اس نے یہ اعتراف کیا کہ میں نے قتل کیا ہے، چوری کی ہے، زنا کیا ہے، تو اس کے بعد اس کی شہادت کا کیا اعتبار ہو سکتا ہے۔ چوتھی بات یہ کہ کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ اُس کو معاف کر دے، کیونکہ اس سے تو حقوق العباد کی حق تلفی ہوگی، حکومت کو بھی یہ حق نہیں ہے کہ وہ کسی ملزم کو معاف کر دے کہ چلو تم نے چوری کی ہے، قتل کیا ہے، تو کوئی بات نہیں تجھے معافی دی جاتی ہے، حقوق العباد کو تو حکومت بھی معاف یا ضائع نہیں کر سکتی جب تک کہ متاثرہ شخص اپنا حق خود معاف نہ کر دے ۔۔۔ یہاں ریاست اور اسٹیٹ کی حفاظت کا مسئلہ اٹھایا گیا ہے، تو اسلام کہتا ہے کہ اس کیلئے سخت سے سخت قوانین بنائے جائیں اور غدار کو سخت سزا دی جائے، مگر ۔۔۔۔

جناب چیئرمین | شکریہ (یعنی وقت ختم ہو گیا ہے)

اِسلام اور خواتین کی شہادت

مجلسِ شوریٰ (وفاقی کونسل) میں مسودہ قانونِ شہادت پر مولانا سمیع الحق صاحب کی تقریر جسے وفاقی کونسل سیکرٹریٹ نے ضبط کیا، فقہ اور قانونِ شہادت کے ساتھ مناسبت کی وجہ سے نذرِ قارئین ہے۔ (مُرتب)

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم ط بسم اللہ الرحمن الرحیم ط

واذا دعوا الی اللہ ورسولہ لیحکم بینھم اذا فریق منھم معرضون وان یکن لھم الحق یاتوا الیہ مذعنین ہ افی قلوبھم مرض ام ارتابوا ان یحیف اللہ علیھم ورسولہ۔۔ (سورۃ النور)

جناب مولانا سمیع الحق | جناب چیئرمین! قانون سے متعلق مسائل بہت گہرے اور ہمہ گیر ہیں، ان حالات میں دس منٹ کی جو پابندی رکھی گئی ہے اور یہ جو تلوار سر پر لٹک رہی ہے تو حیران ہوں کہ میں کس کس مسئلہ پر عرض کروں، بہرحال اگر آپ دس منٹ مزید دیدیں تو یہ آپ کی عنایت ہو گی۔

جناب چیئرمین | نہیں! اگر آپ ۹ منٹ میں ختم کر دیں تو میں شکریہ ادا کروں گا۔

جناب مولانا سمیع الحق | جو مسودہ ہمارے سامنے لایا گیا ہے اس میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن پر تمام معزز ارکان کو بلا کسی اختلاف کے گہری نظر ڈالنی چاہیئے تھی اور اسکی اصلاح کی کوشش کرنی چاہیئے تھی، لیکن بدقسمتی سے سارے مسودہ میں صرف یہ ایک مسئلہ ایسا اہم بن گیا ہے کہ سارے ایوان کی توجہات اس طرف ہی لگ گئی ہیں، یعنی ع

آہ بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

اور ہمارے مبصرین، وکلاء بھی قرآنِ کریم کی آیات اور مصحف الٰہی کی تفسیر اکبر الہ آبادی کی زبان میں "مصحفِ رخسارِ بتانِ مغرب" کی روشنی میں کرنے لگ گئے ہیں، اکبر نے کہا تھا ؎

کھل گیا مصحفِ رخسارِ بتانِ مغرب
شیخ حاضر بھی ہوئے ہیں نئی تفسیر کے ساتھ

شیعہ مسلک اور خواتین کی شہادت | تو ہمارے یہ شیوخ حاضر بھی ہوئے تو نئی تفسیر کے ساتھ۔ پیر اشرف صاحب جو اس وقت موجود نہیں ہیں اور ہمارے علامہ[1] رضی صاحب (شیعہ مجتہد) بھی، تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ ان کے اپنے اجتہادات ہیں، یہ ان کا حق ہے کہ جیسے چاہیں انہیں ظاہر کریں، لیکن میں یہ عرض کروں گا کہ یہ شیعہ مسلک بھی نہیں ہے، اہلِ سنت اور اہلِ تشیع اللہ کے فضل و کرم سے قانونِ شہادت میں خواتین کے مسئلہ پر متفق ہیں بلکہ شیعہ تو ہم سے بھی چند قدم آگے ہیں، میں یہاں صرف ایک حوالہ پیش کرتا ہوں کہ اس بارے میں شیعہ مسلک کیا ہے ؟

اسلامی نظریاتی کونسل نے قانونِ شہادت کا جو مسودہ ہمیں بھیجا ہے اس کے صفحہ ۵۹ ضمیمہ (الف) کے ماتحت کونسل کے شیعہ رکن علامہ طالب جوہری صاحب کے اختلافی نوٹ میں کہا گیا ہے کہ اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹ میں صرف حدود میں خواتین کی شہادت مسترد کی گئی ہے اور مقبول نہیں ہے لیکن علامہ طالب جوہری کے نزدیک حدود کے علاوہ طلاق، خلع، وصیت اور نسب میں بھی عورتوں کی گواہی کسی اعتبار سے قابلِ قبول نہیں ہے، عورتوں کے متعلق مخصوص امور میں ہمارے ہاں صرف ایک عورت کی شہادت کافی ہے، مگر انہوں نے ان امور میں بھی چار عورتوں کی گواہی کو ضروری قرار دیا ہے۔ (مسودہ قانونِ شہادت مرتبہ اسلامی نظریاتی کونسل ص ۵۹)

ایک رکن | پوائنٹ آف آرڈر ! جنابِ والا ! یہاں اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹ تو زیرِ بحث نہیں۔

جناب چیئرمین | تشریف رکھیئے، مولانا اس رپورٹ سے حوالہ پیش کر سکتے ہیں۔ مولانا ! آپ کی مراد یہ ہے کہ یہ علامہ جوہری کا مسلک ہے ؟

مولانا سمیع الحق | نہیں جناب انہوں نے تو لکھا ہے کہ یہ ہماری فقہ جعفریہ میں ہے۔

---

[1] ممبر مجلسِ شوریٰ اور مشہور شیعہ عالم دین علامہ سید محمد رضی آف کراچی نے مولانا سے قبل پُرجوش انداز میں ایک عورت کی گواہی کافی ہونے پر زور دیا اور کہا کہ عورت امامت کر سکتی ہے اور حکومت بھی، اور میں اپنے اجتہاد کی روشنی میں جرأت سے کہتا ہوں کہ گواہی میں ایک عورت کو کسی دوسرے سہارے کی ضرورت نہیں ہے اور بھول جانے سے متعلق آیت کو علت قرار دیا کہ اب نہیں بھولتی تو دو کی بجائے ایک کافی ہے۔ لاہور کے پیر محمد اشرف صاحب نے بھی اپنی تقریر میں ایسا ہی مؤقف اختیار کیا تھا۔ (مرتب)

عورت کی امامت اور حکمرانی

تو عرض یہ ہے کہ شیعہ مسلک خواتین کو معلوم نہیں ہے جس میں ہر مرحلہ پران کی شہادت کو قابلِ قبول نہیں سمجھا جاتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ علامہ رضی صاحب نے عورتوں کی امامت کے بارے میں کہا ہے جو کہ ہمارے ہاں بھی جائز ہے یعنی آپس میں خواتین اگر ایک کمرے میں جمع ہیں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ اکٹھی نماز پڑھیں اور ایک عورت ان کی امامت کرواسکتی ہے لیکن عورت مردوں کی امامت نہیں کرسکتی۔ پھر عورت کی حکومت کی مثال دی ہے، تو یہ ملکہ سبا کا واقعہ ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب تشریف لائے تو پچھلی تمام شریعتیں منسوخ ہوگئیں۔ تو ہمارے نزدیک عورت کی حکومت کے جواز میں پیش کی گئی اس دلیل کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے۔

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا واضح ارشاد ہے کہ لن یفلح قوم ولوا امورھم نساءھم (او کما قال علیہ السلام) یعنی اس قوم نے کبھی فلاح نہ پائی جس نے اختیار اور نظامِ اقتدار عورتوں کے سپرد کردیا۔

حکمت اور علتِ حکم میں فرق

پھر علامہ رضی صاحب نے سورۂ بقرہ کی آیت فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ کے بعد ارشاد ان تضل احداھما فتذکر احداھما الاخرٰی (کہ اگر ایک عورت بھول جائے تو دوسری یاد دلا دے) کو حکم کی علت قرار دیا ہے۔ تو میں سمجھتا ہوں کہ علامہ صاحب کو اس بارہ میں غلط مبحث ہوا ہے جبکہ اصل بات یہ ہے کہ ایک علت ہوتی ہے اور ایک حکمت۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہاں یاد دلانے کے مسئلہ کو بطورِ علت بیان نہیں کیا ہے بلکہ بطورِ حکمت بیان کیا ہے علت تو اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے کہ یہ چیز اس لیے لازمی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو قانون بنایا ہے۔ اب کسی قانون کی آپ حکمتیں بیان کریں تو اس حکمت کے ساتھ وہ چیز وابستہ نہیں ہوتی۔ اگر حکمت بیان کی گئی ہے تو بہتر، نہیں ہے تو پھر بھی وہی حکم ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے روزہ کے بارہ میں فرمایا: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ (الایۃ) کہ روزے سے تقویٰ حاصل ہوگا، تو روزے کی فرضیت کے لیے تقویٰ علت نہیں ہے، یہ حکمت ہے کہ شاید تم میں تقویٰ پیدا ہوجائے۔

نماز کے بارے میں فرمایا: اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ (الآیۃ) کہ نماز برائیوں سے روکتی ہے، تو یہ اس کی حکمت ہے علت نہیں، تو اگر ایک شخص کبیرہ گناہ کرتا

ہے تو کیا اُسے اب یہ کہا جائے کہ تم نماز مت پڑھو کیونکہ علت حاصل نہیں ہو رہی ہے، یا اگر تقویٰ آ گیا ہے تو تم نماز ہی چھوڑ دو کہ مقصد حاصل ہو گیا تو اب نماز کی کیا ضرورت ہے؟ ایک شخص کے اندر تقویٰ نہیں ہے تو اس کو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ تم روزہ ہی نہ رکھو۔ تو اللہ تعالےٰ نے بطور حکمت اسے بیان کیا، اور علامہ آلوسیؒ نے بھی اپنی تفسیر روح المعانی کی دوسری جلد میں ایسی ہی روشنی ڈالی ہے اور سارے مفسرین اسے حکمت قرار دیتے ہیں...... (یہاں مولانا نے کتاب سے اقتباس سنایا......) تو یہ حکمت اللہ تعالیٰ نے ایک مصلحت کے تحت بیان فرمائی ہے، یہ اللہ کی رحمت ہے اگر نہ بھی بیان فرماتے تو بغیر حکمت کے بھی مسلمان اللہ کے احکام ماننے کا پابند ہوتا ہے۔

بہر حال یہ گذارشات تو ضمناً آ گئیں اور میرے دس منٹ کا اہم حصہ تو ان کی نذر ہو گیا، اب اصل موضوع کا کیا کیا جائے؟ علامہ رضی صاحب تو اللہ کے فضل سے بہت وسیع الظرف انسان ہیں، ہماری آپس میں بات چیت ہوتی رہتی ہے، کھلے دل کے انسان ہیں ـــــ لیکن میرے لیے یہ ضروری تھا کہ اہلِ سنت کے مسلک کی رو سے اس کی بروقت تردید کروں، وہ اپنے مسلک کی وضاحت جس طرح چاہیں کر سکتے ہیں، ان پر کوئی قدغن نہیں ہے، یہ ان کا اپنا اجتہاد ہو تو ہو مسلک نہیں ـــــ

جناب چیئرمین صاحب | یہاں خواتین کو بار بار یہ مسئلہ سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے اور اگر ہم فرائض اور حقوق کو ملحوظ رکھیں تو پھر کوئی اختلاف باقی نہیں رہتا۔

شہادت فرض ہے حق نہیں

اللہ تعالیٰ نے کچھ چیزیں ہمارے لیے فرض قرار دی ہیں مثلاً عبادات میں نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج۔ اسی طرح شہادت بھی ایک فرض ہے جو کہ فقہ کا مسئلہ ہے اور سارے فقہاء اور علماء ابواب الشہادت کی کتابوں میں اس کی تصریح کرتے ہیں۔ یہ میرے پاس فقہ کی معتبر ترین کتاب ھدایہ ہے اس کے آغاز میں ہی ہے کہ الشھادۃ فرض...... الخ شہادت ایک فرض ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندہ پر عائد کیا گیا ہے ـــ یہ حق نہیں ہے کہ کسی کو دیدیا اور کسی کو نہیں دیا اور یہ اللہ تعالیٰ کو اختیار حاصل ہے کہ کسی کے لیے کوئی عبادت لازم کرے کسی کے ذمہ نہ کرے۔ تو اللہ تعالیٰ نے خواتین کی نازک ذمہ داریوں اور عقلی کمزوریوں کی وجہ سے ان کو تمام عبادات میں رعایت بھی دی ہے۔

فرائض اور احکام میں عورتوں سے رعایت

یہ شہادت کا مسئلہ بھی اگر وہ سوچیں تو اس میں بھی ان کے لیے رعایت ہے

مثلاً نماز فرض ہے حق نہیں ہے، اب نماز کے لیے بھی یہ کہا گیا ہے کہ دس دن مہینے میں تمہیں (عذر ہونے کی وجہ سے) چھٹی ہے کہ جب حضور اکرمؐ سے عورتوں کے نقصانِ دین کے بارہ میں پوچھا گیا تو حضور نے یہی بات دلیل کے طور پر پیش کی۔ اسی طرح روزہ ایک فرض ہے خدا نے روزے میں بھی ان کو رعایت دی ہے کہ جن دنوں میں ان کو عذر ہو وہ دس دن روزہ نہیں رکھیں گی سخت گرمی کے دن ہوں گے مگر انہیں روزہ نہ رکھنے کی رخصت ہے بعد میں اعادہ کریں گی۔ اسی طرح حج کا مسئلہ ہے، اس میں ہر مرد پر پابندی ہے کہ اگر وہ استطاعت رکھتا ہے تو لازمی طور پر حج پر جائے، مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيلًا ؕ (الآیۃ) اس کے ساتھی ہوں یا نہ ہوں مگر جائے گا ضرور، ہزاروں خطرات مرد کے لیے بھی راستے میں ہوتے ہیں لیکن عورت کے لیے یہ کہا گیا ہے کہ اگر تمہاری نگہداشت کرنے والا محرم مرد ہو تو تب تم پر حج فرض ہے ورنہ نہیں، تو یہ کتنی بڑی رعایت ہوئی۔ اور زکوٰۃ و عشر میں بھی میرا خیال ہے کہ اس میں بھی عورت سے رعایت ہے، مثلاً ڈھائی فیصد مرد پر بھی ہے اور ڈھائی فیصد عورت پر بھی ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اگر اس میں رعایت نہ ہوتی تو عورت پر زکوٰۃ پانچ فیصد ہوتی چاہیئے تھی کیونکہ مرد کے ذمے خدا نے خارجی ذمہ داریاں اور گھر کے تمام اخراجات لگائے ہیں، عورت کا نان و نفقہ اور رہن سہن سب کچھ مرد کے ذمہ ہے، مرد کے پاس اگر ہزار روپے ہیں تو اس پر دوگنی چوگنی ذمہ داریاں بھی عائد کی گئی ہیں اس کے برعکس اگر عورت کے پاس ہزار روپے ہیں اور کوئی ذمہ داری نہیں، نہ مرد کی کفالت کا فکر ہے اس کو، نہ بچوں کی اس پر ذمہ داری ہے، اس کے اپنے اخراجات بھی مرد پر ہیں، گھر کا نوکر چاکر بھی مرد کے ذمہ ہے، تو گویا پھر تو اس پر زکوٰۃ پانچ فیصد ہونی چاہیئے تھی لیکن خدا نے اس میں بھی انہیں ایسی کنسیشن (CONCESSION) دی کہ ان پر بھی مردوں کے برابر ڈھائی فیصد ہی ہے۔

کسی غیر مکلّف کو نصوص میں مخاطب نہیں بنائیں

اب آگے بات آتی ہے شہادت کی اور کہا جاتا ہے کہ جب اللہ نے شہادت کی ادائیگی کا حکم دیا ہے تو عورتوں کو اس میں کیوں روکا جاتا ہے؟ تو عرض ہے کہ شہادت کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے جب اسے مکلّف ہی نہیں بنایا اور آیاتِ شہادت متوجہ ہی نہیں ہوئیں ان کو، مثلاً وَاَقِيمُوا الصَّلٰوةَ کا حکم ہے، تو اب اگر ایک شخص نابالغ ہے اس کو اقیموا الصّلوٰۃ متوجہ ہی نہیں ہے، غیر مسلم ہو تب بھی متوجہ نہیں ہوتا ہے خواہ مرد ہو یا عورت۔ اسی طرح

انو الزکوٰۃ ہے۔ ایک شخص فقیر ہے اور صاحب نصاب ہی نہیں ہے تو وہ مرد ہو یا عورت ہو اس کو یہ آیت متوجہ ہی نہیں ہوتی، اللہ نے جب عورت کو مکلف نہیں بنایا اس فریضے کا، تو یہ آیات (۱) وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَاءُ إِذَا مَا دُعُوا۔ الآیۃ۔ (۲) وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ۔ الآیۃ۔ (۳) كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ۔ الآیۃ۔

یہ ساری آیات ان کو متوجہ ہی نہیں ہیں کہ وہ کہیں کہ ہمیں بھی اس میں مخاطب بنایا گیا ہے۔ جب کسی طبقہ کو مکلف ہی نہیں بنایا گیا ہو تو اس سے وہ آیت مطالبہ ہی نہیں کرتی۔ اور میں تو سوچتا ہوں کہ یہ تضادات خدا کے کلام میں کیسے ممکن تھے، جبکہ ایک طرف تو اللہ تعالیٰ عورتوں کو یہ فرماتے ہیں کہ وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ۔ الآیۃ کہ گھروں میں بیٹھی رہو اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ یہ فرماتے ہیں: وَإِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ مَتَاعًا فَاسْأَلُوهُنَّ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ۔ (الآیۃ) کہ کوئی بھی چیز ان سے مانگو تو پردے کے پیچھے سے مانگو۔ ایک طرف تو خدا وند تعالیٰ ان کو (عورتوں کو) پابند بناتا ہے گھر کا، پھر دوسری طرف ان پر فرض کیسے کرتا ہے کہ وہ عدالتوں میں جا کر گواہیاں دیتی رہیں اور پھرتی رہیں، اللہ کے کلام میں ایسا تضاد تو ہو نہیں سکتا۔ ان آیات کا سارا مضمون یہی ہے کہ وہ گھروں میں بیٹھی رہیں یعنی پردہ کا حکم دیا ہے، اور دوسری طرف وہ تمام آیاتِ شہادت پیش کی جا رہی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا ہے کہ عدالتوں میں گھومتی رہو۔ تو یہ کوئی انسانی قانون اور انسانی لائر (LAWYER) اور انسانی قانون دان تو نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے کلام میں کسی قسم کا کوئی تضاد نہیں ہے۔ تو ایسی تمام آیات کا مخاطب اللہ تعالیٰ نے صرف مرد کو بنایا ہے نہ کہ عورتوں کو۔

جناب چیئرمین | مولانا تشریف رکھیں آپ کا وقت ختم ہو گیا ہے۔

كتاب
القسمة
والأكراه

کتاب القسمۃ

(جائیداد کی تقسیم کے احکام و مسائل)

کسی ایک شریک کے مطالبہ پر جائیداد کی دوبارہ تقسیم کا حکم

سوال: چند ورثاء والد کی جائیداد میں اجتماعی طور پر حق رکھتے ہیں، ان کی رائے یہ ہے کہ تمام جائیداد کی تقسیم کی ضرورت نہیں اُس کا صرف منافع اور آمدنی لے کر آپس میں تقسیم کرتے رہیں گے، لیکن اب ایک وارث اصرار کر رہا ہے کہ میرا حصہ الگ کر دیں اس لیے کہ میں مشترکہ طور پر جائیداد سے منافع لینے کے حق میں نہیں ہوں، کیا اس وارث کے مطالبہ پر جائیداد تقسیم کی جاسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب: مورث کی وفات کے بعد متروکہ جائیداد میں ورثاء کا استحقاق پیدا ہوتا ہے، حقوقِ متقدمہ کی ادائیگی کے بعد ہر ایک وارث اپنے حصہ کے مطالبہ کا حقدار ہے، ایسی حالت میں جب تقسیم سے متروکہ جائیداد کے منافع ختم نہیں ہوتے ہوں تو ہر ایک وارث اپنے حصہ سے استفادہ کر سکتا ہے، لہٰذا کسی ایک شریک کے مطالبہ پر عمل ہو کر جائیداد تقسیم کی جائے گی۔

لما قال العلامۃ التمرتاشی رحمہ اللہ: وسببھا طلب الشرکاء او بعضھم الانتفاع بملکہ علیٰ وجہ الخلوص وقال شرطھا عدم فوت المنفعۃ بالقسمۃ۔
وقال ابن عابدینؒ تحت قولہ المنفعۃ ای المعھودۃ وھی ما کانت قبل القسمۃ۔
(رد المحتار ج ۵ ص۱۶۸ کتاب القسمۃ)۔[1]

---

[1] قال العلامۃ اکمل الدین البابرتیؒ: سببھا طلب احد الشرکاء الانتفاع بنصیبہ علی الخلوص ورکنھا ما یحصل بہ الافراز والتمیز النصیبین وشرطھا ان لا تفوت منفعۃ بالقسمۃ۔ (العنایۃ علیٰ ھامش فتح القدیر ج ۸ ص۳۴۸ کتاب القسمۃ)
ومثلہٗ فی الھندیۃ ج ۵ ص۲۱۴ الباب الثالث فی بیان مایقسم ومالایقسم ومایجوز من ذلک ومالایجوز۔

نابالغ کے حصّہ کی تقسیم کا حکم

سوال: چند ورثاء نے مشترکہ جائیداد کی تقسیم کا مطالبہ کیا اُن میں سے ایک شریک نابالغ تھا، حاکمِ وقت نے نابالغ کی طرف سے نمائندگی کرتے ہوئے دیگر شرکاء کے مطالبہ پران کی جائیداد تقسیم کر دی، شرکاء نے اپنے اپنے حصہ کی جائیداد لے کر مدت دراز تک اُس میں تصرفات کئے لیکن اب نابالغ لڑکا بالغ ہونے کے بعد دوبارہ تقسیم کا مطالبہ کر رہا ہے، تو کیا یہ تقسیم دوبارہ کی جائے گی یا نہیں ؟

الجواب: ورثاء کسی نابالغ وارث کے حصہ میں تقسیم کرنے کا حق نہیں رکھتے اور نہ نابالغ کسی کو وکیل مقرر کر سکتا ہے، تاہم اگر حاکمِ وقت نابالغ کی نمائندگی کر کے ورثاء سے جائیداد تقسیم کرے تو ایسی تقسیم نافذ ہے اسے توڑنا جائز نہیں، حاکمِ وقت نابالغ کی طرف سے نمائندہ متصور ہوگا۔

لما قال العلامة التمرتاشیؒ: وصحت برضاء الشرکاء الا اذا کان فیھم صغیر لا نائب عنه۔
وقال العلامة الحصکفیؒ: بعد هذا القول او غائب لا وکیل عنه لعدم لزومها حینئذٍ الا باجازة القاضی او الغائب او الصبی اذا بلغ۔ (تنویر الابصار والدر المختار علیٰ هامش رد المحتار ج۵ ص۱۸۰ کتاب القسمة)[1]

کسی ایک شریک کی غائبانہ حالت میں جائیداد تقسیم کرنا

سوال: چند ورثاء میں سے ایک وارث عرصہ دراز سے غائب ہے، اب اگر حاضر ورثاء مورث کی جائیداد تقسیم کرنا چاہیں تو اس غائب وارث کے حصہ کی تقسیم کس طرح ہوگی؟ جبکہ حاضر ورثاء کو جائیداد تقسیم کیے بغیر نقصان اٹھانا پڑ رہا ہے اور غائب شریک تک رسائی کا کوئی قابلِ عمل ذریعہ بھی نہیں ہے ؟

---

[1] قال العلامة فخر الدین الشھیر بقاضی خانؒ: اذا قسم الورثة الترکة فیما بینھم بغیر امر القاضی وفی الورثة صغیر او غائب او شریك المیت لا تصح القسمة الا باجازة الغائب او ولی الصغیر او باجازة الصبی بعد البلوغ او باجازة القاضی قبل البلوغ۔
(فتاوٰی قاضی خان علیٰ هامش الهندیة ج۳ ص۱۵۶ کتاب القسمة)
ومثله فی فتح القدیر ج۸ ص۳۵۱ کتاب القسمة۔

الجواب:۔ اگر غائب وارث تک رسائی ممکن ہو تو تقسیمِ جائیداد کیلئے اس کی ذاتی طور پر حاضری ضروری ہے، تاہم اگر وہ ذاتی طور پر حاضری سے قاصر ہو تو کسی کو اپنی طرف سے نمائندہ مقرر کرے اور اگر وہ حاضری سے بلا وجہ پہلو تہی کر رہا ہو تو حاضر ورثاء کے لیے حاکمِ وقت کا سہارا لینا ضروری ہے کیونکہ حاکمِ وقت غائب وارث کی طرف سے نیابت کا حق ادا کر سکتا ہے۔

لما قال العلامة التمرتاشیؒ: وفیھم صغیر او غائب قسم بینھم ونصب قابض لھما۔ وقال الحصکفیؒ تحت قول المذکور نظراً الغائب والصغیر ولا بد من البینة علیٰ اصل المیراث عندہٗ خلافاً لھما کما مر۔ (الدر المختار علیٰ ھامش رد المحتار ج ۵ ص۱۸۲ کتاب القسمة) [1]

قرعہ اندازی کے بغیر جائیداد تقسیم کرنا

سوال:۔ ایک وسیع رقبہ اراضی ایک قوم کی مشترکہ جائیداد تھی، رؤسائے قوم نے باہمی رضامندی سے یہ زمین تقسیم کی لیکن قرعہ اندازی سے کام نہیں لیا گیا، شرکاء میں سے بعض نے اپنے حصہ کی زمین آباد کر لی ہے اور بعض کی زمین تاحال غیر آباد پڑی ہے، اب سوال یہ ہے کہ کیا قرعہ اندازی کے بغیر یہ تقسیم جائز ہے یا دوبارہ تقسیم کی جائے گی؟

الجواب:۔ تقسیم کرنے کے لیے قرعہ اندازی صرف ایک احسن صورت ہے شرط کے درجہ میں نہیں، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں اگر قوم نے اپنے سرکردہ افراد کو باقاعدہ تقسیم کرنے کی اجازت دی ہو تو یہ تقسیم نافذ ہے، ہر ایک حصہ دار کو اپنے اپنے حصہ پر قائم رہ کر دوبارہ تقسیم کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

لما قال العلامة المرغینانیؒ: والقرعة لتطیب القلوب وازاحة تھمة المیل

---

[1] قال العلامة قاضیخانؒ: وذکر الخصاف اذا کان فی الورثة صغیر او غائب لم یکن فی ید الغائب ولا فی ید ام الصغیر شیٔ من الترکة بل کان الکل فی ید الحضور الکبار فطلبوا القسمة من القاضی فان القاضی یجعل للصغیر وصیا یقوم بالقسمة ویقبض حقه ویجعل للغائب وکیلا ویأمرھم بالقسمة ۔ (الفتاوٰی قاضیخان علیٰ ھامش الھندیة ج۳ ص۱۵۶ فصل فی قسمة الوصی والاب)

حتٰی لو عین لکل منھم نصیباً من غیر اقتراع جاز لانہٗ فی معنی القضاء فیملک الالزام۔
(الھدایۃ ج۴ ص۴۱۶ کتاب القسمۃ۔فصل فی کیفیۃ القسمۃ)[1]

غبن کی صورت میں تقسیم جائیداد کے اعادہ کا حکم

سوال:۔ چند شرکاء کے درمیان ایک مشترکہ جائیداد تقسیم ہوئی ہر ایک شریک اپنے اپنے حصہ میں مدت دراز تک مالکانہ تصرفات کرتا رہا، اب شرکاء اس خدشے کا اظہار کر رہے ہیں کہ تقسیم کرنے وقت احتیاط سے کام نہیں لیا گیا ہے جس کی وجہ سے شرکاء کے زیر قبضہ جائیداد میں تفاوت ہے، اب سوال یہ ہے کہ کیا اس کی تقسیم دوبارہ کی جائے گی یا نہیں؟

الجواب:۔ صورت مسئولہ میں جب ایک دفعہ شرکاء کی باہمی رضامندی سے تقسیم ہونے کے بعد جب ہر ایک نے اپنے اپنے حصہ میں مالکانہ تصرفات کرنے شروع کئے تو اب معمولی شبہات کی وجہ سے سابقہ تقسیم کو توڑ کر دوبارہ تقسیم کرنا بے سود سعی ہے، تاہم اگر غبن فاحش ہو تو شرکاء کے مطالبہ پر سابقہ تقسیم کالعدم قرار دے کر دوبارہ تقسیم کی جائے گی۔

لما قال العلامۃ التمرتاشیؒ: ولو ظھر غبن فاحش فی القسمۃ بطلت ولو وقعت بالتراضی فی الاصح۔ (تنویر الابصار علی ھامش رد المحتار ج۵ ص۱۸۷ کتاب القسمۃ)[2]

غلطی کی صورت میں تقسیم کا اعادہ

سوال:۔ ایک مشترکہ جائیداد تقسیم کر کے مالکان اس پر تصرف کرتے رہے، بعد میں

---

[1] وقال العلامۃ ابن عابدینؒ: (تحت قولہ تطییب القلوب) اشار الی ان القرعۃ غیر واجبۃ حتی ان القاضی لو عین لکل واحد نصیباً من غیر اقراع جاز لانہٗ فی معنی القضاء فیملک الالزام۔ (رد المحتار ج۵ ص۱۸۲ کتاب القسمۃ)
وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۸ ص۱۵۲ کتاب القسمۃ۔

[2] وقال العلامۃ المرغینانیؒ: ولو اختلفا فی التقویم لم یلتفت الیہ لانہٗ دعوی الغبن ولا معتبر بہ فی البیع فکذا فی القسمۃ لوجود التراضی الا اذا کانت القسمۃ بقضاء القاضی والغبن الفاحش لان تصرفہ مقید بالعدل۔ (الھدایۃ ج۴ ص۴۲۰ کتاب القسمۃ)
وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۸ ص۱۵۶ کتاب القسمۃ۔

معلوم ہوا کہ تقسیم میں غلطی ہوئی ہے، کیا اس غلطی کے ازالہ کے لیے دوبارہ تقسیم کی جاسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب: اگر تقسیم میں غلطی مبرہن یا مسلّم ہو اور تقسیم توڑنے کے بغیر غلطی کا ازالہ ممکن نہ ہو تو اس کے ازالہ کے لیے تقسیم دوبارہ کی جاسکتی ہے۔

لما قال العلامة الکاسانی رح: واما صفات القسمة فانواع منها ان تکون القسمة عادلة غیر جائرة الی ان قال فاذا وقعت جائرة لم یوجد التراضی ولا افراز نصیبه بکماله لبقاء الشرکة فی البعض فلم تجز وتعاد وعلی هذا اذا ظهر الغلط فی القسمة المبادلة بالبینة او بالاقرار تستانف لانه ظهر انه لم یستوف حقه فظهر ان معنی القسمة لم یتحقق بکماله۔ (بدائع الصنائع ج ۷ ص ۲۶ فصل فی صفات القسمة۔ کتاب القسمة)[1]

مشترکہ منافع کو تقسیم کرنے کا حکم

سوال: جناب مفتی صاحب! ہم دو بھائیوں نے مشترکہ طور پر ایک پلازہ بنایا اور اس کو کرایہ پر دیدیا، اب ہم اس کے کرایہ کو ہر ماہ بقدر حصہ آپس میں تقسیم کریں یا ایک ماہ کا کرایہ میں لے لوں اور دوسرے ماہ کا میرا بھائی لے، ان دونوں میں کون سی صورت جائز ہے؟

الجواب: جس طرح عین مال مشترک ہوتا ہے اسی طرح اس کے منافع بھی مشترک ہوتے ہیں، اس منافع کو بھی بقدر حصہ تقسیم کیا جائے گا۔ صورتِ مسئولہ میں کرایہ کی تقسیم شرکاء کی صوابدید پر موقوف ہے کہ وہ جس طرح چاہے کر سکتے ہیں، چاہے تو ہر ماہ کا کرایہ برابر تقسیم کرلیں یا ایک ماہ کا کرایہ ایک بھائی وصول کرے اور دوسرے ماہ کا دوسرا بھائی، دونوں طرح درست ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدین رح: (تحت قوله کذلک) ای یأخذ هذا شهرا والآخر شهرا او یاخذ هذا غلة هذه والآخر غلة الاخری۔ (رد المحتار ج ۶ ص ۲۶۹ کتاب القسمة، مطلب فی الرجوع عن القرعة)

---

[1] وفی الهندیة: عن محمد قاسم قسم دارا بین رجلین اعطی احدهما اکثر من الآخر غلطا وبنی احدهما فی نصیبه قال محمد رح یستقبلون القسمة فمن وقع بناؤه فی قسم غیره رفع بناءه ولا یرجعان علی القاسم بقیمة البناء ولکنهما یرجعان علیه بالاجر الذی اخذه کذا فی الظهیریة

(الفتاوی الهندیة ج ۵ ص ۲۲۸ الباب الحادی عشر فی دعوی الغلط فی القسمة)

ومثله فی خلاصة الفتاوی ج ۲ ص ۴۱۰ کتاب القسمة۔

ایک فریق کی عدم موجودگی میں جائیداد کی تقسیم کا مسئلہ

سوال:۔ دو بھائیوں مسمی محمد حنیف اور محمد صدیق نے کچھ زمین مشترکہ طور پر خریدی جس میں نو ہزار روپے (۹۰۰۰/-) محمد صدیق کے تھے اور تین ہزار روپے محمد حنیف کے تھے، بارہ ہزار روپے (۱۲۰۰۰/-) روپے کی ۲۴ کنال زمین آج سے تقریباً ۳۲ سال پہلے خریدی گئی اور یہ زمین دونوں بھائیوں کے نام انتقال بھی ہو گئی، اور کافی عرصہ تک یہ زمین دونوں بھائیوں کے والد صاحب کے تصرف میں رہی، والد صاحب کی وفات کے بعد آج تک ۱۳ سال سے مذکورہ زمین محمد صدیق کے قبضہ اور تصرف میں ہے، انتقال زمین کے وقت بڑے بھائی محمد حنیف نے تمام اندراجات محمد صدیق سے پوشیدہ رکھے۔

آج سے ۱۳ سال پہلے جب والد صاحب فوت ہوئے تو وفات کے تیسرے دن بڑے بھائی محمد حنیف نے مذکورہ زمین کی تقسیم کی بات کی جبکہ محمد صدیق نے اس تقسیم کی مخالفت کی اور کہا کہ والد صاحب کے چالیسویں کے بعد زمین کے تمام معاملات طے کر کے تقسیم کریں گے، اس کے بعد محمد صدیق کی موجودگی میں پانچ دن تک محمد حنیف نے پھر زمین تقسیم کرنے کی بات نہیں کی، تو محمد صدیق کسی کام کے سلسلہ میں پٹنا ور چلا گیا، اس کی غیر موجودگی میں محمد حنیف نے چند اشخاص کو جمع کر کے زمین مذکورہ نصف نصف یعنی بارہ بارہ کنال تقسیم کر دی جبکہ نہ تو مروجہ طریقہ کار اختیار کیا گیا اور نہ ہی اس تقسیم کی کوئی تنا ندہی یا حد بندی کی گئی، صرف زبانی معاملہ تھا۔

اس واقعہ کے دوسرے دن بعد جب محمد صدیق گھر آیا اور اسے اس تقسیم کا علم ہوا تو اس نے اس تقسیم اور طریقہ کار کو فراڈ اور دھوکہ دہی قرار دے کر مسترد کر دیا اور کہا کہ میں نے اس زمین کی خرید میں تین حصے قیمت ادا کی ہے لہٰذا میرا حق تین چوتھائی بنتا ہے اور محمد حنیف نے ایک ربع قیمت ادا کی ہے لہٰذا اس کا حق ایک چوتھائی بنتا ہے۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ:۔

(۱) آیا زمین کی تقسیم فریقین میں سے کسی ایک کی عدم موجودگی میں اس کی رضامندی کے بغیر ہو سکتی ہے؟

(۲) کیا ایک فریق اپنی مرضی کے چند اشخاص کو جمع کر کے گواہ بنا کر زمین تقسیم کر سکتا ہے؟ جبکہ تحریری اور مروجہ طریقہ کار کا کوئی ثبوت نہ ہو؟

(۳) محمد صدیق کا دعویٰ اس زمین میں تین چوتھائی کا ہے اور محمد حنیف نصف کا دعویدار ہے تو کیا زمین خریدتے وقت دی گئی رقم کی بنیاد پر اس دعوے کا استحقاق رکھا جا سکتا ہے؟

(۴) کیا اتنا عرصہ گذرنے کے بعد محمد صدیق اپنے دعوے کا استحقاق رکھتا ہے یا نہیں؟
شریعتِ مقدسہ کی روشنی میں جواب دے کر ممنونِ احسان فرمائیں۔

الجواب:۔ شراکتی کاروبار ابتداء ہی سے چلا آرہا ہے اور یہ ناگزیر ہے، مگر جملہ شرکاء کے لیے ایک دوسرے کا خیال رکھنا بھی فرض ہے، یہ اس لیے کہ اس مشترکہ مال کے ہر ہر جزء میں سب شریک ہوتے ہیں، کوئی بھی حصہ دار یقین سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ اس کا مال ہے یا اتنا حصہ ہے، جس کی وجہ سے تقسیم کے وقت سب شرکاء کا حاضر ہونا یا سب کی اجازت ہونا شرعاً ضروری ہے، بدون اجازت یا کسی ایک شریک کے غائب ہونے کی صورت میں دیگر شرکاء مشترکہ مال تقسیم نہیں کر سکتے۔

لما فی الهندية: ولو كانوا مشترين لم يقسم مع غيبة احدهم وان اقاموا البينة على الشراء حتى يحضر الغائب۔ (الفتاوى الهندية ج۵ ص۲۱۰ الباب الثالث فی بیان ما یقسم ما لا یقسم)

اسی طرح شرح المجلۃ میں ہے: قسمة الفضولي موقوفة على الاجازة قولاً و فعلاً فاذا قسم واحد المال المشترك بنفسه لا تكون القسمة جائزة ولكن اذا اجاز اصحابه قولاً۔ (شرح المجلۃ لرستم باز ص۶۲۳ الفصل الثانی فی شرائط القسمۃ)

فتاویٰ حامدیہ میں مرقوم ہے: اذا قسم الورثة التركة بينهم بغير امر القاضی وفی الورثة صغير او غائب اوشريك للميت لا تصح الا باجازة الغائب او ولی الصغير او اجازة الصبی بعد البلوغ۔ (بحوالہ شرح المجلۃ لرستم باز ص۶۲۴ الفصل الثانی فی شرائط القسمۃ)

صاحب درر الحکام نے بھی اس قسم کی تقسیم کو لا تجوز القسمة ولا تنفذ کے عنوان سے ذکر کیا ہے کہ اس قسم کی تقسیم ناجائز ہے، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں جو تقسیم ہو چکی ہے وہ کالعدم ہے اور نافذ العمل نہیں ہے۔

جو اشیاء مشترکہ طور پر خریدی جائیں اور ابتداءً کسی قسم کا معاہدہ نصف یا ثلث وغیرہ کا نہ ہوا ہو مگر راس المال کی ادائیگی کے وقت ایک شریک کے حصہ کی رقم زیادہ ہو اور دوسرے شریک کے حصہ کی رقم کم ہو تو پھر اس شے میں حصہ داری راس المال کے اعتبار سے ہوگی، جس کی رقم زیادہ ہو تو وہ زیادہ حصے کا حقدار ہوگا، اس لیے کہ اگرچہ زبان و قال سے انہوں نے حصہ داری کا تعین نہیں کیا مگر زبانِ حال اس بات کی گواہ ہے کہ انہوں نے رقم کی وجہ سے حصہ داری مقرر کی ہے۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں محمد صدیق کا راس المال ۹۰۰۰ روپے ہے

جو کل رأس المال کا تین چوتھائی ہے اس لیے محمد صدیق تین چوتھائی کا حقدار ہے اور محمد حنیف کا ایک چوتھائی رأس المال ہے اس لیے اس کا حصّہ زمین بھی ایک چوتھائی ہے، اگرچہ مطلقاً شراکت تنصیف کی صورت اختیار کرتی ہے۔

نظیرہ فی درر الحکام: اذا اختلط دینار احد بدینارین لآخر من جنسہ بصورۃ لاتقبل التمیز ثم ضاع اثنان منھما فیکون الدینار الباقی بینھما مشترکاً اثلاثاً ثلثاہ لصاحب الدینارین وثلثہ لصاحب الدینار۔

(درر الحکام ج۳ ص۱۷ المادۃ ۱۰۶۱۔الباب الاول فی بیان شرکۃ الملک)

کسی کے حق کے اسقاط میں طویل زمانے کا گذر جانا اسے متاثر نہیں کرتی بلکہ حق کسی صورت میں اور عرصہ دراز کے بعد بھی ساقط نہیں ہوتا لہٰذا محمد صدیق کا دعویٰ استحقاق اتنی مدت کے بعد بھی برقرار ہے اور اس کو دعویداری کا حق حاصل ہے۔

لما فی شرح المجلۃ: لایسقط الحق بتقادم الزمان۔(شرح المجلۃ لرستم باز ص۱۱۷۲ المادۃ ۱۶۷۴)

(ھٰذا ما ظھر لی واللہ اعلم)

مشترکہ اراضی کی تقسیم کا مسئلہ

سوال:۔ ہماری کچھ مشترکہ زمین ہے، اب اس کی تقسیم کا مسئلہ ہے کیونکہ یہ زمین فروع پر تقسیم کرنا ہے جبکہ فروع میں بہت اختلاف ہے اس لیے آسانی کے ساتھ ان پر تقسیم صحیح طریقے سے نہیں ہو سکتی، لہٰذا شریعتِ مقدسہ کی روشنی میں اس زمین کی تقسیم کا طریقہ مطلوب ہے؟

الجواب:۔ میرے نزدیک یہ مشترکہ اراضی اصل مالکان پر ارث کے قائدہ کے مطابق تقسیم کی جانی چاہیئے اور پھر ان اصل مالکان سے ان کے فروع کو میراث کے ضابطہ کے مطابق منتقل کی جائے گی اگرچہ فروع کثرت و قلت میں مختلف کیوں نہ ہو۔

کتاب الاکراہ

(مجبوری کے احکام و مسائل)

حکومت کا رعایا کی کسی چیز پر جبراً قبضہ کرنا

سوال:۔ ایک شخص نے آج سے پانچ سال قبل دس کنال زمین ایک لاکھ روپے کی بیع قطعی سے خریدی جس کا ثبوت حکومت کے متعلقہ دفتر میں موجود ہے، موصوف نے مذکورہ زمین پر پولٹری فارم کھولا، بعد میں حکومت نے مذکورہ زمین دس ہزار روپے کے عوض لینا چاہی لیکن مالکِ زمین نے انکار کردیا، حکومت نے جبراً اس کی زمین پر قبضہ کرلیا، توکیا حکومت کا اس طرح کسی کی ذاتی زمین پر قبضہ کرنا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ اگر حکومت کا یہ قبضہ کسی معاہدہ کے تحت نہ ہو تو حکومت کا اس طرح کرنا اکراہ کے حکم میں ہے اسلئے یہ بیع المکرہ ہے نافذ نہیں لہٰذا زوالِ اکراہ کے وقت خود مالکِ زمین یا اس کے ورثاء زمین کو واپس لے سکتے ہیں، تاہم جہاں کہیں حکومت اپنے کسی قرض کی وصولی کے لیے ایسا اقدام کرے تو اس میں اکراہ کی صورت باقی نہیں رہتی۔

قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: امر السلطان اکراہ وان لم یتوعدہ وامر غیرہ لا الّا ان یعلم المامور بدلالة الحال انهٗ لولم یمتثل امرہ یقتله او یقطع یدہ او یضربه ضربًا یخاف علیٰ نفسه اوتلف عضوہ۔

(رد المحتار ج۶ ص۱۳۲ مطلب بیع المکرہ فاسد وزوائدہ مضمونة بالتعدی)[۱]

---

[۱] قال العلامة سلیم رستم باز رحمه الله: لا یعتبر البیع الذی وقع بالاکراہ المعتبر ولا الشراء ولا الایجار ولا الهبة ولا الفراغ ولا الصلح عن مال والاقرار والابراء وتاجیل الدّین واسقاط الشفعة ملجئًا کان الاکراہ او غیر ملجئ۔ (شرح مجلة الاحکام، مادة ۱۰۰۶ ص۵۵۹ الباب الثانی فی بیان المسائل التی یتعلق بالاکراہ)

ومثلهٗ فی الهدایة ج۳ ص۱۱۳ کتاب الکفالة۔

جبراً نکاح کا حکم

سوال:۔ جنابِ مفتی صاحب! اگر کوئی شخص کسی لڑکی کو زبردستی اغواء کرکے لے جائے اور پھر بزورِ شمشیر اس کے ساتھ نکاح کرے اور وہ لڑکی جان جانے کے خوف سے مجبوراً اس کو قبول کرے، تو کیا شرعاً یہ نکاح صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ چونکہ اس قبول کرنے میں عورت کے اختیار کا بھی کچھ دخل ہے اسلئے یہ نکاح صحیح ہے اور یہ عورت مکرہ کی بیوی شمار ہوگی، اگرچہ ایسا کرنا شرعاً جائز نہیں۔

لما فی الهندیة: المرأة اذا اکرهت علی النکاح ففعلت صح النکاح۔

(الفتاوی الهندیة ج ۵ ص ۵۳ کتاب الاکراه۔ الباب الرابع فی المتفرقات)[1]

جبراً زنا میں عورت گنہگار نہ ہوگی

سوال:۔ جنابِ مفتی صاحب! اگر کوئی شخص کسی عورت کو جان سے مارنے کی دھمکی دے کر جبراً اس سے زنا کرے اور وہ اس پر ہرگز راضی نہ ہو اور حتی الامکان بچنے کی کوشش کی ہو جس کی وجہ سے وہ زخمی بھی ہوئی ہو تو کیا یہ عورت گنہگار ہوگی یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر عورت باوجود کوشش کے اپنی جان نہ بچاسکی اور نہ اس نے زانی کو تمکین (جگہ) دی ہو لیکن پھر بھی جبراً اس کے ساتھ زنا کیا گیا تو یہ عورت گنہگار نہ ہوگی۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ:۔ واما المرأة هل تأثم ذکر شیخ الاسلام ان اکرهت علی ان تمکن من نفسها فمکنت تأثم وان لم تمکن وزنی بها فلا وهذا لو بملجئ والا فعلیه الحد بلا خلاف لا علیها ولکنها تأثم۔ (رد المحتار ج ۶ ص ۱۳۷ کتاب الاکراه)[2]

---

[1] لما قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ: ولو اکره علی عقد من العقود ان کان عقداً لا یبطله الهزل کالنکاح والطلاق والعتاق جاز العقد۔ (خلاصة الفتاوی ج ۴ ص ۲۰۶ کتاب الاکراه)
وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج ۸ ص ۷۵ کتاب الاکراه۔

[2] لما فی الهندیة: اما المرأة اذا کانت مکرهة علی الزنا هل تأثم ذکر شیخ الاسلام فی شرحه فی باب الاکراه علی الزنا انها ان اکرهت علی ان تمکن من نفسها فمکنت فانها تأثم وان لم تمکن هی من الزنا وزنی بها لا اثم علیها وذکر ایضاً فی الاکراه اذا اکرهت علی الزنا فمکنت من نفسها فلا اثم علیها وهذا کله اذا کان الاکراه بوعید تلف۔
(الفتاوی الهندیة ج ۵ ص ۴۸ کتاب الاکراه۔ الباب الثانی)

اکراہ کی صورت میں کلمۂ کفر کہنا

سوال :۔ اگر کسی مسلمان کو قتل کی دھمکی دے کر کلمۂ کفر کہنے پر مجبور کیا جائے اور وہ اپنی جان جانے کے خوف سے کلمۂ کفر زبان سے نکال دے جبکہ اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو تو کیا ایسا آدمی کافر شمار ہوگا یا نہیں ؟

الجواب :۔ حالتِ اکراہ میں زبان سے کلمۂ کفر کہنے سے ایمان پر کوئی اثر نہیں پڑتا بشرطیکہ دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو، البتہ اگر ایسا شخص کلمۂ کفر کہنے سے انکار کردے اور قتل کر دیا جائے تو شہادت کا درجہ پائے گا۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ : وان اکرہ علی الکفر باللہ تعالیٰ اُو سبّ النبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم بقطع او قتل اخص لہٗ ان یظہر ما امر بہ علی لسانہ وقلبہ مطمئن بالایمان ...... ویوجر لو صبر لترکہ الاجراء المحرم۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۶ صفحہ ۱۳۴، ۱۳۵ کتاب الاکراہ) [۱]

حالتِ جبر میں زنا کا حکم

سوال :۔ جناب مفتی صاحب! آجکل معاشرے کے حالات اخلاقی طور پر انتہائی ناگفتہ بہ ہیں، عیاشی، فحاشی اور بے حیائی عروج پر ہے۔ اگر کسی شخص کو زنا کرنے پر مجبور کیا جائے اور نہ کرنے کی صورت میں اس کی جان کو یقینی خطرہ ہو تو کیا اس کو بصورتِ مجبوری زنا کرنا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ زنا کی حرمت شرعاً وعقلاً دونوں طرح ثابت ہے، کسی بھی صورت میں اس کی حرمت ساقط نہیں ہوتی اگرچہ کرنے والے کی جان کو خطرہ ہی کیوں نہ ہو۔ اس لیے بناءبر صورتِ مسئولہ ایسے شخص کے لیے زنا کرنا کسی طرح بھی جائز نہیں اور اگر وہ اس کا ارتکاب کر جائے تو عنداللہ مجرم ہوگا۔

لما قال الشیخ وھبۃ الزحیلی : وکذلک الزنا فانہٗ لا یرخص ولا یباح للرجل

---

[۱] لما قال العلامۃ الشیخ وھبۃ الزحیلی : التصرف الحسی المرخص بالاکراہ ھو کاجراء کلمۃ الکفر علی اللسان مع اطمینان القلب بالایمان او سبّ النبیّ صلی اللہ علیہ وسلم او الصلاۃ الی الصلیب او اتلاف مال المسلم فھذہ الامور لاتباح ولکن یرخص فعلھا عند الاکراہ التام وان امتنع المستکرہ عن فعلھا حتی قتل کان مثابا ثواب الجھاد۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہٗ ج ۵ صفحہ ۳۹۲ المبحث الثالث اثر الاکراہ فی التصرفات)

ومثلہٗ فی الفتاوی الھندیۃ ج ۵ صفحہ ۳۸ الباب الثانی فیما یحل للمکرہ۔

بالاکراہ مطلقاً ولو فعل اثم لان حرمۃ الزنا ثابتۃ عقلاً قال اللہ تعالیٰ: وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَا إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَسَاءَ سَبِيلًا ۔ وکذا المرأۃ لا یرخص لہا ایضاً عند الاکراہ ولو کان تاماً۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ ج ۵ ص ۳۹۵ المبحث الثالث اثر الاکراہ) [1]

کسی مسلمان کو حالتِ جبر میں قتل کرنا

سوال: اگر کسی مسلمان کو اس بات پر مجبور کیا جائے کہ وہ فلاں آدمی کو قتل کردے نہیں تو تجھے قتل کر دیا جائے گا، اب اگر یہ شخص اپنی جان بچانے کی غرض سے کسی کو قتل کر دے تو گنہگار ہوگا یا نہیں؟

الجواب: اکراہ اور جبر کی صورت میں اگرچہ بعض افعال مباح یا مرخص ہوجاتے ہیں مگر کسی مسلمان کو ناحق قتل اس حکم کے تحت داخل نہیں، اس لیے صورتِ مسئولہ میں ایسے مجبور شخص کیلئے ہرگز یہ جائز نہیں کہ وہ اپنی موت کے خوف سے کسی بے گناہ مسلمان کو قتل کر دے، اور اگر وہ اس فعل کا ارتکاب کر جائے تو عنداللہ گنہگار ہوگا۔

لما قال العلامۃ وھبۃ الزحیلی: التصرف الحسی الحرام الذی لا یباح ولا یرخص بالاکراہ ھو قتل المسلم بغیر حق او قطع عضو من اعضائہ ولو نملۃ لان القتل حرام محض، قال اللہ تعالیٰ: وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ ۔

(الفقہ الاسلامی وادلتہ، ج ۵ ص ۳۹۵ المبحث الثالث، اثر الاکراہ) [2]

جبراً شراب پینے پر حد نہیں

سوال: اگر کسی شخص کو زبردستی یعنی مجبور کر کے شراب پلادی جائے اور حکومت اسے گرفتار کرے تو کیا شرعاً اس شخص پر حد نافذ ہوگی؟ یعنی اسے سزا دی جائے گی یا نہیں؟

الجواب: اکراہ کی صورت میں جب کسی شخص کو شراب پلادی جائے اور حکومت اُسے

---

[1] لما قال العلامۃ الحصکفیؒ: ولو اکرہ علی الزنا لا یرخص لہ لان فیہ قتل النفس بضیاعہا لکنہ لا یحد استحساناً۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۶ ص ۱۳۷ کتاب الاکراہ)

[2] قال العلامۃ الکاسانیؒ: النوع الذی لا یباح ولا یرخص بالاکراہ اصلاً فھو قتل المسلم بغیر حق سواء کان الاکراہ ناقصاً او تاماً لان قتل المسلم بغیر حق لا یحتمل الاباحۃ بحال۔ (بدائع الصنائع ج ۷ ص ۱۷۷ کتاب الاکراہ)

وَمِثْلُہٗ فی الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۶ ص ۱۳۵ کتاب الاکراہ۔

گرفتار کرے تو شرعاً اس سے حد ساقط ہوگی۔

قال العلامة الکاسانیؒ: الحکم الذی یرجع الی الدنیا فی الانواع الثلاثة اما النوع الاول فالمکرہ علی الشرب لا یجب علیه الحد اذا کان الاکراہ تاماً لان الحد زاجراً عن المستقبل۔ (بدائع الصنائع جلد ۷ ص۱۷۸ کتاب الاکراہ) [1]

جبراً زنا کی صورت میں حد کا حکم

سوال:۔ اگر کسی شخص سے جبراً زنا کا ارتکاب کرایا جائے اور حکومت اسے گرفتار کرلے تو کیا شرعاً اس پر حدنافذ ہوگی یا نہیں؟ اگر بالفرض یہ عورت ہو پھر کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ حالتِ اکراہ میں بھی زنا کرنا حرام ہے اور اس کی شرعاً اجازت نہیں، تاہم اگر اکراہ کی صورت تام ہو یعنی یقیناً اس میں جان جانے کا خطرہ ہو تو ارتکاب کی صورت میں بناء برقول مفتی بہ حد نافذ نہیں ہوگی، چاہے وہ مرد ہو یا عورت، اگرچہ بعض ائمہ کرامؒ کے ہاں مرد پر حد جاری ہوگی۔

لما قال الشیخ وھبة الزحیلی: فاذا اکرھت المرأة علی الزنا فلا یقام علیھا الحد عند جمھور الفقھاء سواء کان الاکراہ تاماً ام ناقصاً...... فاذا اکرہ الرجل علی الزنا..... قال الصاحبان: لا یجب الحد حالة الاکراہ التام سواء کان الاکراہ من السلطان ام من غیرہ ورایھما ھو الراجح عند الحنفیة وھو رأی ابی حنیفة اخیراً۔ (الفقه الاسلامی وادلته ج۵ ص۴۰۱ المبحث الثالث، النوع الثالث) [2]

---

[1] لما قال الشیخ وھبة الزحیلی: الاکراہ علی شرب الخمر اذا کان الاکراہ تاماً فلا یجب الحد علی المستکرہ علی شرب الخمر اتفاقاً لان الحد شرع زاجراً من الجنایة فی المستقبل والشرب المکرہ علیه لیس جنایة بل ھو مباح۔
(الفقه الاسلامی وادلته ج۵ ص۳۹۵ المبحث الثالث فی اثر الاکراہ)
وَمِثْلُهٗ فی الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۶ ص۱۳۳ کتاب الاکراہ۔

[2] لما فی الھندیة: اذا اکرہ الرجل علی الزنا بامرأة فزنی بھا کان ابوحنیفة اولاً یقول یجب علیه الحد ثم رجع وقال لا حد علیه وھو قولھما.....واما المرأة فلا حد علیھا ولکنھا تاثم۔ (الفتاوی الھندیة ج۵ ص۴۸ کتاب الاکراہ۔ الباب الثانی)
وَمِثْلُهٗ فی الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۶ ص۱۳۷ کتاب الاکراہ۔

مجبورمزنیہ پرحدِزنا کا حکم

سوال :۔ اگر کسی عورت کو یہ دھمکی دی جائے کہ اگر وہ زنا نہ کرائے گی تو اُسے اور اس کے مال کو ہلاک کر دیا جائے گا اور وہ اپنی جان اور مال کی ہلاکت کے خوف سے زنا جیسے قبیح عمل کے لیے اپنے آپ کو پیش کر دے تو کیا اس پر حد جاری ہوگی یا نہیں ؟

الجواب :۔ اکراہ اور جبر چاہے تام ہو یا ناقص دونوں عورت کے حق میں برابر ہیں ، اگر وہ جبر کی کسی بھی صورت میں زنا کا ارتکاب کر جائے تو شبہ کی وجہ سے حد زنا اس سے ساقط ہو جائے گی ۔

لما قال العلامة الکاسانیؒ: واما فی حق المرأة فلا فرق بین الاکراہ التام والناقص ویدرأ بالحد عنها فی نوعی الاکراہ لانه لم یوجد منها فعل الزنا بل الموجود هو التمکین وقد خرج من ان یکون دلیل الرضا بالاکراہ فیدرأ عنها الحد ۔ (بدائع الصنائع ج ۷ ص۱۸۱ کتاب الاکراہ) [1]

جبراً ہلاک شدہ مال کے ضمان کا حکم

سوال :۔ جناب مفتی صاحب ! اگر مجبوری کی حالت (اکراہ) میں کسی کا مال ہلاک کر دیا جائے تو اُس مال کے تاوان کا ضامن کون ہوگا ؟ کیا جبر و اکراہ کرنے والا اُس مال کا ضمان دے گا یا ہلاک کرنے والا ضامن ہوگا ؟

الجواب :۔ صورتِ مسئولہ میں چونکہ اکراہ کی نوعیت بیان نہیں کی گئی ہے اسلیئے دونوں صورتوں کا جواب دیا جاتا ہے :

(۱) اگر اکراہ تام ہو یعنی ہلاک کرنے والے کی جان یا اس کے کسی عضو کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو تو ضمان مجبور کرنے والے کے ذمے ہوگا اس لیے کہ مال کو ہلاک کرنے والا آلہ کے مانند ہے ۔

(۲) اگر اکراہ ناقص ہو یعنی اس میں جان یا کسی عضو کے ضائع ہونے کا خطرہ و خوف نہ ہو تو

---

[1] لما قال العلامة وهبة الزحیلی : فاذا اکرهت المرأة علی الزنا فلا یقام علیها الحد عند جمهور الفقهاء سواء کان الاکراہ تاماً ام ناقصاً ۔

(الفقه الاسلامی وادلته ج ۵ ص۴۰۰ المبحث الثالث فی اثر الاکراہ)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج ۵ ص۴۸ کتاب الاکراہ ۔ الباب الثانی ۔

ضمان ہلاک کرنے والے کے ذمے ہوگا۔

لما قال العلامۃ الکاسانیؒ: المکرہ علی اتلاف مال الغیر اذا تلفہ یجب الضمان علی المکرہ دون المکرہ اذا کان الاکراہ تاماً لان المتلف ھو المکرہ من حیث المعنی وانما المکرہ بمنزلۃ الآلۃ علی معنی انہ مسلوب الاختیار...... وان کان الاکراہ ناقصاً فالضمان علی المکرہ لان الاکراہ الناقص لا یجعل المکرہ آلۃ المکرہ لانہ لا یسلب الاختیار اصلاً فکان الاتلاف من المکرہ فکان الضمان علیہ۔

(بدائع الصنائع ج ۷ ص ۱۷۹ کتاب الاکراہ) [1]

جبراً کھلائے گئے مال کے ضمان کا حکم

سوال:۔ اگر کسی شخص کو اس بات پر مجبور کر دیا جائے کہ وہ فلاں شخص کا مال (مرغی، بکری وغیرہ) کھا جائے ورنہ اس کو جانی نقصان پہنچ سکتا ہے، لہٰذا اس مجبوری کے تحت اس نے دوسرے کا مال بغیر اس کی اجازت کے کھالیا کیونکہ نہ کھانے کی صورت میں جانی نقصان کا قوی امکان تھا۔ اب جس آدمی کا مال جبراً کھایا گیا ہے وہ کھانے والے سے اپنے مال کے تاوان کا مطالبہ کرتا ہے، تو کیا شرعاً مالکِ مال اس شخص سے تاوان وصول کر سکتا ہے یا نہیں؟ یا وہ جبر کرنے والے سے مطالبہ کرے؟

الجواب:۔ اگرچہ جبر کی صورت میں مجبور شخص آلہ کی حیثیت رکھتا ہے مگر کسی کا مال کھانے کی صورت میں اس شخص کا اپنا فعل بھی پایا جاتا ہے اس لیے اس مال کا ضمان کھانے والے کے ذمے واجب الاداء ہے اور مالکِ مال اسی سے تاوان کا مطالبہ کرے گا۔

لما قال العلامۃ الکاسانیؒ: کذلک لو اکرہ علی ان یأکل مال غیرہ فالضمان علیہ لان ھذا النوع من الفعل وھو الاکل مما لا یعمل علیہ الاکراہ

---

[1] لما قال الشیخ وھبۃ الزحیلی: فان کان الاکراہ تاماً فالضمان علی المکرہ عند الحنفیۃ والحنابلۃ فی الارجح عندھم وبعض الشافعیۃ لان المستکرہ مسلوب الارادۃ وما ھو الا آلۃ للمکرہ ولا ضمان علی الآلۃ اتفاقاً........ وان کان الاکراہ ناقصاً فالضمان علی المستکرہ عند الحنفیۃ والمالکیۃ الخ

(الفقہ الاسلامی وادلتہٗ ج ۵ ص ۳۹۸ کتاب الاکراہ۔ المبحث الثالث)

لانہ لا یتصور تحصیلہ بآلۃ غیرہ فکان طائعاً علیہ فکان الضمان علیہ ۔
(بدائع الصنائع ج ۷ ص۱۷۹ کتاب الاکراہ) ؎۱

مجبور مفعول پر حد جاری کرنے کا حکم

سوال :۔ جناب مہتمم صاحب جامعہ حقانیہ! الحمدللہ آنجناب کی دعاؤں اور مساعی سے افغانستان میں امارتِ اسلامی قائم ہے اور شرعی قوانین کا اجراء بھی ہو چکا ہے، اب ایک مسئلہ درپیش ہے وہ یہ کہ اگر کسی کے ساتھ جبراً (یعنی اسلحہ کی نوک پر) لواطت کی جائے اور وہ دونوں اس قبیح فعل کے کرتے ہوئے پکڑے جائیں تو کیا حد دونوں پر جاری ہوگی یا صرف فاعل کو سزا دی جائے گی؟

الجواب :۔ صورتِ مسئولہ کے مطابق مفعول چونکہ مجبورِ محض ہے اور اس کے ساتھ یہ قبیح عمل جبراً (اسلحہ دکھا کر) کیا گیا ہے اس لیے سزا صرف فاعل کو دی جائے گی مفعول اس سے مستثنیٰ ہوگا۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ : ظاھر تعلیلھم أن حکم اللواطۃ کحکم المرأۃ لعدم الولد فترخص بالملجی الا ان یفرق بکونھا اشد حرمۃ من الزنا لانھا لم تبح بطریق ما ولکون قبحھا عقلیا ۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۶ ص ۱۳۷ کتاب الاکراہ) ؎۲

؎۱ قال العلامۃ شیخ زادہ المشھور بداماد افندی رحمہ اللہ : وان اکرہ علی اتلاف مال مسلم لاحدھما ای بالقتل او القطع رخص الاتلاف ای للمکرہ لان الاتلاف مال الغیر یستباح للضرورۃ کما فی المخمصۃ وقد ثبت والضمان علی المکرہ بالکسر لان المکرہ فی حق الاتلاف آلۃ للمکرہ فلم یلزم علیہ الضمان وفیہ اشارۃ الی الاحتراز عن الاکل والتکلم والوطء فان فیھا لا یصلح آلۃ ۔
(مجمع الانھر ج ۴ ص ۴۴ کتاب الاکراہ)

؎۲ قال العلامۃ محمد بن علی بن محمد الحصنی رحمہ اللہ : وعلی ھذا ظاھر تعلیلھم ان حکم اللواطۃ کحکم المرأۃ لعدم الولد فترخص بالملجیٔ الا ان یفرق بکونھا اشد حرمۃ من الزنا لقبحھا عقلاً ایضاً ۔
(الدر المنتقی فی ذیل مجمع الانھر ج ۴ ص ۴۹ کتاب الاکراہ)